ماہنامہ چراغ راہ کراچی
۹ لوٹیا بلڈنگ مقام ... روڈ
شمارہ ——— ✱
ماہ اکتوبر سنہ ——— ✱

مندرجات

سالانہ چندہ .... پانچ روپے — ادارۂ تحریر
قیمت فی پرچہ ۸ آنے — ۱۲- شاہ جمال-

سوچ بچار

ہماری صحافت کے مفسدات اور تدابیر اصلاح

اخبار نویس وہ معلّم ہے جس کا مدرسہ پورا ملک ہوتا ہے اور جس کے تلامذہ میں ایک دہقان اور مزدور سے لے کر وزیر اور گورنر جنرل تک تمام اکابر و اصاغر شامل ہوتے ہیں۔ اخبار نویس وہ مبلغ ہے جس کی دعوت ہر روز گھر گھر، دکان دکان اور دفتر دفتر گونجتی ہے۔ اخبار نویس وہ خطیب ہے جو اپنے کاغذی منبر پر کھڑے ہو کر بر خامہ کی زبان سے جو وعظ روزانہ کہتا ہے اُسے لاکھوں افراد سننے پر مجبور ہوتے ہیں اخبار نویس دُنیائے سیاست کا صرّاف ہوتا ہے جس کی کسوٹی اصولوں کو پرکھتی اور جس کی ترازو حوادث کو تولتی رہتی ہے ... اخبار نویس ... اختلافات سے بھری ہوئی دُنیا میں عدالت کی کرسی جما کر بیٹھتا ہے اور فریضۂ قضا سر انجام دیتا ہے۔

یہ ہے صحافت کی اہمیت! اور اس اہمیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر صحافت حق، عدل، خیر اور فلاح کے لئے کام کرے ... اس سے مفید طاقت کوئی نہیں، لیکن اگر صحافت میں بگاڑ آجائے اور وہ کذب، باطل، شر اور فساد کے لئے بر سر ... کے لئے اُس سے زیادہ مہلک کوئی دوسری قوت نہیں!

آپ ذرا غور فرمایئے کہ اگر کسی شہر کا ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ خود گندگی اور اسباب مرض کو پھیلانے کی مہم شروع ... کارکنانِ عدلیہ خود جرائم کے سرپرست بن جائیں، اگر مدارس خود جہالت کے سرچشمے بن جائیں، اگر صرّاف خود کھرے ... شروع کر دیں تو نتائج کیا نکلیں گے! جو کچھ نتائج ان صورتوں میں نکلیں گے، عین وہی نتائج صحافت کے اختلال ... ہوتے ہیں۔ صحافت اگر آلۂ خیر ہو تو نعمتِ عظمیٰ ہے اور اگر آلۂ شر بن جائے تو لعنت کبریٰ ... جاتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے جو قوت جتنی بڑی ہوتی ہے، اتنی ہی اس کے بارے میں ذمہ داری شدید ہوتی ... اللہ کے سامنے اپنے ایک ایک لفظ کا حساب دینے کے لئے کھڑا کیا جائیگا، اور اس کی تحریروں سے جتنے ... اثرات فکری پہلو سے یا اخلاقی پہلو سے مترتب ہوتے ہوں گے اتنی ہی بڑی جزا و سزا اس کے حصّے میں آئے گی۔ ایک صحافی کا ایک کلمۂ خیر نہ معلوم نتائج کا کتنا بڑا چمن آخرت میں اُس کے سامنے لا رکھے گا، اور اس کا ایک کلمۂ شر کون جانے کہ کتنا بڑا آتشکدہ آراستہ کر کے اس کی تواضع کے لئے پیش کر دے گا! لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو سنوارنا یا بگاڑنا کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے۔ یہ بہت ہی نازک ذمہ داری ہے!

ایک سچا [redacted] سے حکام اور پبلک کے درمیان ایک ذریعہ ربط بنتا ہے۔ وہ ایک طرف عوام کو تعلیم دیتا ہے کہ ان پر شہریت کے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور دوسری طرف حکام کو درس دیتا ہے کہ حکمران کی ذمہ داریاں کیا ہیں اسے بیک وقت دونوں طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا ہوتا ہے۔ عوام میں بگاڑ آجائے تو وہ ان کی اصلاح بھی کرتا ہے اور حکمران کی طرف سے مفسدات ظہور کریں تو ان کی روک تھام بھی کرتا ہے۔ پھر جب کبھی رائے عام اور سلطانی کے درمیان کشمکش پیدا ہو جائے تو وہ دونوں کے درمیان ثالث بن کر ایک فیصلہ دیتا ہے اور دونوں کو اس پر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اگر صلح نہ ہو تو پھر وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ پورا وزن حق کے پلڑے میں ڈال دے ——— چاہے

حق سلطان کی طرف ہو یا رائے عام کی طرف! اپنے اس موقف کے لحاظ سے درحقیقت اخبار نویس رائے عام کا "دماغ" ہوتا ہے۔ وہ اس کی جگہ سوچتا، سمجھتا اور حکم لگاتا ہے۔

یہ دماغ ہی اگر مختل ہو جائے تو پھر چارۂ کار کیا ہے؟ ——— فی الواقع پھر کوئی راہِ نجات نہیں۔

یہ بات لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ ہماری صحافت احساسِ ذمہ داری سے بڑی حد تک بے نیاز اور ادائے فرض میں انتہائی کوتاہ ہے۔ اگر اخبار نویس برادری اس سچائی کے اظہار پر رنجیدہ نہ ہو تو صفائی سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا یہ مہلیقہ ڈیپارٹمنٹ خود گندگی پھیلانے پر اتر آیا ہے۔ کوچۂ صحافت سے آج کوئی سلیم الطبع آدمی ناک پر رومال رکھے بغیر نہیں گذر سکتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چاروں طرف گوبر کے ڈھیر لگے ہیں۔ کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا ہے، پیپ اور کچ لہو سے لتھڑے ہوئے پھاہے پھیلے ہیں، مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں، مچھر اڑ رہے ہیں، کینچوے رینگ رہے ہیں، اور بس ایک عجیب سماں ہے۔ یہاں سے گذر یئے تو نہ کپڑوں کی صفائی کی خیر ہے، نہ پگڑی کی سلامتی کی ضمانت ہے، نہ حواس کے بجا رہنے کا بھروسہ ہے اور نہ ذوق کی عافیت کا یقین ہے۔

ہماری صحافت چمن زاروں کا مجموعہ نہیں کہ جس میں رنگا رنگ کیاریاں حسنِ سلیقہ اور کمالِ ہنر کا ثبوت دے رہی ہوں، بلکہ اندھا دھند جھاڑ جھنکاروں کا ایک جنگل کا جنگل اگ رہا ہے۔ اگر کہیں بدبختی کے طفیل کوئی گلاب اگ آیا ہے تو اس کے چاروں طرف بھٹ کٹیلے نے ہجوم کر رکھا ہے، اگر شومئ قسمت نے کسی گوشے میں یاسمین کو جگہ دلا دی ہے تو اس کا منہ چڑانے کو اس کے اوپر سے آکاس بیل چھائی ہوئی ہے۔ غرض یہ خطۂ صحافت افریقہ کا ایک جنگل ہے، نہ کہ لارنس گارڈن۔

ہمارے عوام کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ان کی تربیت و اصلاح کی ذمہ داری جن عناصر پر عائد ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک مفسدات کا شکار ہے۔ فلاحِ عوام کی ذمہ داری کا بوجھ سب سے زیادہ جس گردن پر ڈالا گیا ہے وہ حکومت و قیادت کی گردن ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ ہمارے حکمرانوں اور ہمارے لیڈروں کا حال کیا ہے۔ حکومت و قیادت کے بگڑ جانے پر یہ ذمہ داری علماء، سیاسی ورکرز اور صحافیوں کے سر عاید ہوتی ہے کہ وہ ایک طرف عوام کی تربیت کا کام ہاتھوں میں لیں اور دوسری طرف حکمرانوں کی اصلاح اور قیادت کی تبدیلی کے لئے اپنا پورا دباؤ استعمال کریں۔ لیکن علماء قِل اور چالیسویں کے مسائل میں محو ہیں اور سیاسی ورکر اپنی اغراض پسندانہ دھڑے بندیوں کے مورچوں پر مصروفِ جہاد ہیں۔ اب رہ جاتی ہے صحافت کی قوت ——— اور ساری ذمہ داریاں اسی کے سر آپڑتی ہیں کہ وہ علماء کو اور سیاسی ورکرز کو بھی، حکمرانوں کو بھی اور عوام کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرے اور ہر ایک کو اپنے اپنے حصے کے فرض کی ادائی پر آمادہ کرے۔ لیکن صحافت خود بھی انہی دباؤں کی شکار ہے جنہوں نے ذہنی رہنمائی کرنے والے دوسرے عناصر پر اپنا پرتو ڈال رکھا ہے۔

یہ صورتِ حالات انتہائی تشویشناک ہے، اور اس کی اصلاح کے لئے جلد از جلد فکر کی جانی چاہئے اور فوری طور پر کوئی موثر اقدام کرنا چاہئے کہ ہماری قوتِ صحافت فلاحِ عوام کے لئے استعمال ہو۔

یہ ضروری معلوم ہوتا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پہلے ان مفاسد کا جائزہ لیا جائے جن کا شکار [illegible] صحافت [illegible] کر رہا ہے۔

صحافت کے مفاسد یا وجوہِ اختلال میں سے ایک یہ ہے کہ اخبار اور اخبار نویس کے درمیان بڑے بڑے فاصلے پائے جاتے ہیں۔ اخبار نویس کا قلم جو کچھ لکھتا ہے، اس کی ذہنی و عملی زندگی اُس سے مطابقت نہیں رکھتی۔ ہمارے اخبار نویسوں میں سے کون ہے جو اچھی باتیں نہ لکھتا ہو، لیکن وہ اچھی باتیں بے کار اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ اس کی اپنی عملی زندگی ان باتوں کے اچھا ہونے سے انکار کرتی ہے۔

وہ عوام کو شہریت کے جس نمونے کی تعلیم دیتا ہے، بسا اوقات خود اس نمونے کا شہری نہیں ہوتا، وہ لوگوں کو جس قربانی کی دعوت دیتا ہے، خود اس کا نمونہ نہیں رکھتا، وہ اسلامیات پر قلم اٹھاتا ہے تو جن چیزوں کی حمایت کرتا ہے ان پر خود عامل نہیں ہوتا اور جن چیزوں کی مذمت کرتا ہے ان سے خود باز نہیں رہتا۔ اسی طرح وہ حکمرانوں کو جس طرزِ فکر اور جس طرزِ عمل کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے، اسے خود اختیار نہیں کرتا۔ وہ اپنے اخبار میں تاریخِ عالم اور تاریخِ اسلام سے اچھے اچھے جذبہ انگیز واقعات چھانٹ چھانٹ کر شائع کرتا ہے، لیکن محض اخبار کے صفحات کی رونق بڑھانے کے لئے ——— وہ خود ان واقعات کے سانچے میں کبھی نہیں ڈھل پاتا۔ وہ خلافتِ راشدہ کی زریں روایات سے اپنے کالموں کو آراستہ کرتا ہے، لیکن اس کے دفتر اور اس کے گھر میں خود ان روایات کا خون کیا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کو جن باتوں پر ٹوکتا ہے خود اُن کو دانتوں سے پکڑے رہتا ہے۔

صحافت کی ایک بلا بے اصولا پن ہے۔ ہمارے اکثر اخبارات وہ ہیں جو بے اصولے پن کی کوکھ سے پیدا ہوئے، بے اصولے پن کی چھاتیوں سے دودھ پی کر پلے، اور بے اصولے پن کی اتا نے انہیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ مراد یہ کہ ایک نیا اخبار جب نکلتا ہے تو شاذ ہی ایسا ہوتا کہ وہ کسی خاص اصول یا مقصد کے مطلبے کے لئے باقاعدہ اسکیم بنا کر نکالا گیا ہو، بلکہ بالعموم اخبار کاروباری نقطۂ نظر سے جاری کئے جاتے ہیں، اور ان کے لئے اگر کوئی اصول و مقصد اختیار کیا جاتا ہے تو صرف یہ سوچ کر کہ اس اصول و مقصد کے ذریعے اخبار چل جائے گا۔

یہ کاروباری نقطۂ نظر جو اخبار کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہوتا ہے، زندگی بھر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ ہمارے بیشتر اخبارات وہ ہیں جن کی پالیسی برابر متغیر رہتی ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف ادوار کو سامنے رکھئے تو ان کے مجموعے سے ایک مسلسل تاریخ وجود میں نہیں آتی، بلکہ ہر دور دوسرے کا نقیض ہوتا ہے۔ ایسے اخبارات کی ہسٹری بتائے گی کہ جس شخص کو انہوں نے خود ہی اچھالا اسے پھر خود ہی گرایا، جس پارٹی کی انہوں نے حمایت کی اس کی خود ہی مخالفت بھی کی، جس اصول کی انہوں نے کبھی دعوت دی تھی اس کی خود ہی نے تردید بھی کی، جس سطالبے کے وہ ایک دور میں حامی تھے دوسرے میں اس کے مخالف ہو گئے، اور جن مسائل کے وہ ایک زمانے میں علمبردار تھے دوسرے زمانے میں اس کے خلاف مناظرہ کرتے پائے گئے۔

کاروباری اخبارات کی بنیادی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ منڈی کا مال ہوتے ہیں اور ہر وقت ہر ہاتھ میں بکنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ بات بڑے افسوس سے کہنی پڑتی ہے کہ ہمارے اخبارات میں سے بہت ہی قلیل تعداد کو مستثنیٰ کر کے بقیہ کے متعلق بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی قیمت ہے۔ جو بھی اُس خاص قیمت کو ادا کر سکتا ہو وہ ان کو خرید سکتا ہے۔

اصول وہ نا ہے جو ایک اخبار کی تمام تحریروں کو پرو کر ایک لڑی بناتا چلا جاتا ہے، اسی کی وجہ سے یہ پیشینگوئی کی جا سکتی ہے کہ فلاں اخبار فلاں معاملے میں فلاں رویّہ اختیار کرے گا۔ لیکن بے اصول اخبارات کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس بہانے کس طرف مڑ جائیں گے۔

صحافت کی بے اصولے پن کا بہت ہی برا اثر ہے جو لاشعوری عام پر پڑتا ہے۔ یہ بد بلا عوام کو ایک ایسے ذہنی انتشار میں مبتلا کرنے والی ہے جسے یکسوئی سے بدلنا انتہائی مشکل کام ہے۔

بے اصولے پن کی بیماری کے نتیجے کے طور پر ارباب صحافت کا یہ مسلک وجود میں آیا ہے کہ وہ اشخاص کے لئے دھڑے بندیاں بنانے کے عادی ہیں۔ چنانچہ اخبارات کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ فلاں اخبار ممدوٹ کا ہے۔ فلاں دولتانے کا ہے' فلاں صحافی کھوڑو کا حمایتی ہے اور فلاں جی ایم سید کا تھا۔

بے اصولے پن کی لعنت کا اس سے مکروہ تر مظاہرہ اور کیا ہوگا کہ اخبار نویس ہر اخبار کے ادارے میں ملازمت قبول کر سکتا ہے بلکہ بیک وقت کئی کئی مختلف الخیال اخبارات کے اداروں میں حصہ دار بن سکتا ہے۔ پھر یہ بھی بے اصولے پن کا مظاہرہ ہے کہ اخبار نویس جن مفاسد کے خلاف اپنے قلم سے خود ہی نوٹ لکھتا ہے' عین انہیں کے اشتہارات کو اپنے اخبار میں جگہ بھی دیتا ہے۔

اس طرح عوام کو برابر بے اصولے پن کی تعلیم اخبارات کے ذریعے مل رہی ہے

کاروباری نقطۂ نگاہ کا ایک خطرناک اثر یہ ہے کہ بہت سے اخبارات میں پبلک کی پستیٔ ذوق سے ناجائز فائدے اٹھانے کی خصلت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہر اخبار بیں کے سامنے ہیں۔

مثلاً جب حیدر آباد میں اتحاد المسلمین کی گرما گرمی تھی تو میر عثمان علی خاں کا نام ایسے ایسے القاب کے ساتھ لیا جاتا تھا کہ سلیم الطبع لوگوں کو کراہت ہوتی ہے' اتحاد المسلمین کے لیڈروں کی تقاریر کو شاعرانہ سرخیوں کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا کہ "لال قلعے پر جھنڈا گڑنے رہے گا" وغیرہ۔ لیکن جب حالات نے پلٹا کھایا تو اسی میر عثمان علی خاں کے شجرۂ نسب کی تحقیق شروع ہوئی اور اس کے لئے لعنت کے اس حصے کو کریدا گیا جسے سٹڑاس کہنا چاہیئے۔ اتحاد المسلمین کی قوت کا متعلق عوام کو مبالغہ آمیز اور شاعرانہ تعلیوں کے ساتھ محض اس لئے مبتلائے خود فریبی کیا جاتا رہا کہ اُن کا ذوق اسی سے تسکین پا سکتا تھا۔ حالانکہ دیانت اور صحافت کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنے عوام کو بروقت آگاہ کر دیتی کہ حیدر آباد میں مسلمانوں کی اصل قوت کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عوام سقوط حیدر آباد پر افسردگی (demoralization) کا شکار نہ ہوتے۔

لیکن ہمارے اخبار نویسوں نے اپنے عوام کی نشہ پسندی کا جائزہ لے کر انہیں خوب خوب افیون اور بھنگ پلائی۔ صرف اس لئے کہ ان کی جیب سے پیسہ اور ان کی زبان سے مرحبا کے نعرے وصول کر سکیں۔

ایسے ہی عوام میں جو سال پہلے ہندوستانی لیڈروں کے خلاف جو جذبات تھے' اُن کو بالکل بچگانہ انداز میں تسکین دینے کے لئے ان لیڈروں کے نام بگاڑ بگاڑ کر لکھے جاتے تھے' ان کے لئے "صاحب" یا "جی" کا لفظ لکھنا تو گویا خلاف اخلاق تھا۔ کشمیر کے راجے کو "میاں ہری سنگھ" لکھ کر بعض اخبارات اپنے قارئین کی تسکین جذبات کا سامان کرتے تھے۔ ایک اخبار نے ایک مرتبہ ہندوستان کے کسی گاؤں کے پٹیل (نمبردار) کی موت کی خبر کی سُرخی یہ لگائی کہ "پٹیل مر گیا" (الفاظ یاد نہیں)۔ ——— اور پیرا کر گئی کہ ... کا ... تھے۔ بے شمار لوگوں نے مغلوب جذبات ہو کر اخبار خریدا' لیکن ان کو اصل خبر پڑھ کر سخت مایوسی ہوئی۔

بطور اجمال معاملہ بیان یہ ہے کہ اخبار نویس بجائے اس کے کہ ایک حکیم معلم کی طرح یہ سوچ کر اخبار مرتب کرے کہ ... دینی چاہئیں اور کس چیز کا درس دینا مفید ہوگا' وہ یہ سوچتا ہے کہ عوام کے ذوق اور رجحان کے تقاضے کیا ہیں۔ ...

ہی کرتا کہ کونسی دوا مریض کیلئے مفید ہوگی، بلکہ وہ ساری توجہ اس پر دیتا ہے کہ مریض کو کس دوا کا رنگ اور ذائقہ زیادہ پسند ہے۔ اس کا نتیجہ
ہے کہ عوام کی ذہنی سطح کا بلند ہونا تو کجا، الٹا ان کی فکری صحت برباد ہو رہی ہے۔ ان کی بیماریوں کو صحت سے بدلنے کے بجائے ان
ماں بیماریاں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ "مطب" چلتا رہے۔ کئی کئی اخبار باہم اس معاملے میں مقابلہ و تنافس کرتے ہیں کہ کون عوام کو زیادہ
ہے ایکسپلائٹ کرتا ہے۔ اس طرح کے اخبار نویس غالباً عوام کی خاطر یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ کچھ عرصے کے لئے اگر ان کے اخبار کی اشاعت
ی تعداد گرتی ہے تو گر جائے، لیکن وہ کہیں گے صرف وہی کچھ جو کہ کہنا چاہئے۔

اخبار نویس اپنے اوپر اور معاملات میں تو شاید کوئی حدود عاید کر بھی لیتا ہو، لیکن جب اپنے مخالفین (یعنی جن سے اسے اختلاف ہو)
معاملہ اس کے سامنے آتا ہے تو وہ تمام حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر قلم چلاتا ہے۔ اختلاف کا جذبہ اسے بالکل انتقام کے مقام
پہ لے آتا ہے جہاں اصول و اخلاق کا کوئی سوال اس کے سامنے نہیں رہتا۔ عام طور پر ہماری صحافت کا جو طرزِ عمل اختلاف کی صورت
میں ہوتا ہے اس کے چند پہلو یہ ہیں:۔

۱) عام طور پر ایک اخبار نویس جس سے اختلاف کرتا ہے سو فیصدی کرتا ہے، پھر دوسرے کی سو باتوں میں سے
کوئی ایک بات اور سو افعال میں سے کوئی ایک فعل بھی ایسا نہیں رہتا جس پر وہ کوئی کلمۂ تحسین کہہ سکے یا جس سے اظہارِ اتفاق
کرسکے۔ اسے اختلاف پیدا ہو جانے کے بعد پھر بھلائی کبھی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ مخالف کے خیر کے اعتراف میں انتہائی بخل سے کام
لیتا ہے اور اس کی غلطیوں کو واضح کرنے میں پکا مسرف۔ قابلِ تحسین پہلوؤں کو وہ چھوٹے سے چھوٹا کرکے دکھاتا ہے اور قابلِ
نفرین پہلوؤں کو انتہائی حد تک enlarge کرتا ہے۔

۲) مخالف کے بیانات کو شائع کرنے سے بالعموم ہمارا اخبار نویس کتراتا ہے، اور اگر شائع کرتا ہے تو ایسی قطع و برید کے ساتھ
بیانات کے روشن پہلو کبھی سامنے نہ آسکیں۔

۳) پھر وہ مخالف کی تصریحات پوری طرح شائع کئے بغیر ان کی تردیدیں شائع کرتا ہے اور پوری فراخدلی سے شائع کرتا ہے۔
وہ پبلک کے سامنے ہمیشہ ایک ہی رُخ لاتا ہے۔

۴) مخالف کی مہم میں زور پیدا کرنے کے لئے وہ مخالف کی کہی ہوئی بات کو مسخ کرتا ہے، بلکہ خود اپنی طرف سے کچھ باتیں اس
منہ میں ڈالتا ہے، پھر ان کی تردید کرتا چلا جاتا ہے۔

۵) مخالف کے خیالات کی تردید کے لئے استدلال سے کم سے کم کام لیتا ہے اور جذبات کا مظاہرہ زیادہ سے زیادہ کرتا ہے۔

۶) جانتے بوجھتے ایسے مراسلات، ایسی اطلاعات، ایسے مضامین کو شائع کرتا ہے جن میں اسکے مخالف پر کھلے کھلے جھوٹے الزام
لگائے گئے ہوں۔

۷) غلط فہمی پھیلانے والی چیزیں شائع کرنے کے بعد اپنے مخالف کی طرف سے تردیدوں کی اشاعت میں ہمیشہ ٹال مٹول سے
لیتا ہے۔

۸) مخالف کے کام کو واقعہ سے کم، اس کی تحریک کی وسعت کو اصل سے محدود، اس کے جلسوں کی حاضری کو واقعی حاضری سے
کرکے دکھاتا ہے۔

اور سب سے زیادہ خطرناک حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی رَو میں اخبار نویس تمام حدودِ اخلاق کو پھاند جاتا ہے۔ وہ سیدھی صاف بات کرنے کے بجائے گالیوں پر اُتر آتا ہے، پگڑی اچھالنے لگتا ہے، کیچڑ کے چھینٹے ڈالتا ہے، رکیک استہزا کرتا ہے، نام بگاڑتا ہے، نئے نئے القاب وضع کر کے تنابز بالالقاب کرتا ہے ——— اور مخالف کو نکالات کے کالم میں گھرا کر کے اُس کا مُنہ نوچتا ہے یعنی بدتمیزی کی کوئی قسم ایسی نہیں جو اختلاف کی سزا دینے کے لئے دُنیائے صحافت میں استعمال نہ کر ڈالی جاتی ہو۔

اس خرابی نے فضا کو اتنا گندہ کر دیا ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ صحافی کے لئے اپنے آپ کو وقار و علم کے موقف پر جمائے رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ بسا اوقات اخبارات جو گھر میں آتے ہیں اُن کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ ان اخبارات کو اگر عورتیں اور بچے پڑھیں گے تو نہ معلوم ان کی ذہنیت و سیرت میں کتنا فسادِ خون پیدا ہو گا اور چند برس بعد ان کے کردار پر کیسے کیسے پھوڑے پھنسیاں نمودار ہو چکیں گے۔ ایسے الفاظ جن کے بارے میں ہم اپنے بچوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ یہ شریف آدمیوں کی زبان پر نہیں آنے چاہئیں، اُن کے گلدستے سجا کر اخبار نویس ہمارے گھر وں میں پہنچاتا ہے کہ ہمارے بچے بھی ان گلدستوں کو طاقِ ذہن کی زینت بنا لیں۔ جن سخافت آمیز حرکات پر ہم بچوں کو ٹوکتے ہیں اُن میں سے کوئی حرکت نہیں جس کی تبلیغ اخبارات میں نہ ہوتی ہو۔ اس قسم کے اخبارات بالیقین ہمارے بچوں کے لئے ذہنی غنڈہ ازم کی تربیت کا ذریعہ ہیں اور ان سے اُن کی زبان، اُن کے جذبات، ان کی قوتِ برداشت، ان کے ذوق اور رجحان کا ستیاناس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کسی اخبار کے چند کالم پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے معدے میں کھٹی نکل لی ہے اور وہ کلبلا رہی ہے اور متلا رہا ہے۔

اخبارات کی اس قسم کی تحریروں میں کبھی کبھار کسی شریف آدمی کی تحریر کا کوئی اقتباس بطورِ حوالہ اگر درج کر دیا جاتا ہے تو دونوں کے اقوال کا فرق بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ جیسے بھوسے کے ایک ڈھیر پر شاخِ گلاب رکھ دی گئی ہو۔

بہر حال یہ صحافت کا مستقل فسادِ خون ہے اور اس کی اصلاح کی فکر اگر نہ کی گئی تو یہ فسادِ خون ہماری آئندہ نسلوں کو ورثے میں ملے گا اور قوم کی قوم اخلاقی صحت کو ہمیشہ کے لئے برباد کر لے گی۔

بخلاف اس کے ہمارے ارباب صحافت کا معاملہ اپنے ممدوحین کے لئے اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے اور ان کی سادی باتوں کو الٹ پلٹ کر جو صورت ذہن میں آتی ہے وہ اہلِ صحافت ممدوحین کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ممدوحین کی مدافعت میں ایک اخبار نویس سنتری کی طرح سرگرمِ عمل رہتا ہے۔

ان کے خیالات کو پھیلانا، اُن کی شرح کرنا، اُن کی خوبیوں کا پروپگنڈہ کرنا، ان کی برائیوں کو ڈھانپنا، ان کی طرف سے وکالت کرنا، ان کی خدمات کو پھیلا کر دکھانا، ان کی کمزوریوں کے لئے عذرات پیش کرنا، انکی سرگرمیوں کو وسیع الاثر ثابت کرنا، ان کی تقاریر کو تفصیل سے شائع کرنا، ان کے جلسوں کی حاضری بڑھا چڑھا کر بیان کرنا، وغیرہ ذمہ داریاں ہیں جو ایک اخبار نویس اپنے ممدوحین کے بارے میں اپنے سر لیتا ہے۔

اخبار نویسوں میں کاروباری زاویہ نگاہ رکھنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے وہ حکمران طاقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے فرض سے بردار ہو کر اپنے معیاری فرائض سے غافل ہیں یا بار بار غافل ہو تی رہتی ہے۔ ان حالات میں صورتِ حالات ایسی ہی ہے۔ جیسے دیکھئے

میں "ظل اللہ" اپنے گرد سرکاری مفتیوں اور بھاٹوں اور شاعروں کی ایک فوج جمع کر کے دربار لگاتے تھے۔ بھاٹوں اور شاعروں کا فرض یہ ہوتا تھا کہ وہ ظل اللہ کا دل خوش کرنے کے لئے اُس کے سامنے "نحن نسبح بحمدک ونقدس لک" کا مصحف بجا لائیں اور روزانہ قصیدہ گوئی اور خوشامدگری سے یہ ثابت کرتے رہیں کہ حضور عزوجل حق کے مظہر ہیں، بے عیب ہیں، کوئی غلطی نہیں کرتے اور شک و شبہ اور تنقید سے بالاتر ہیں۔ مفتیوں کی ذمہ داری یہ ہوتی تھی کہ "حضور والا" کی نگاہ سے جو کوئی بھی گر جائے اُس پر کفر و موت کا فتویٰ لگائیں اور حکمران اُن پر کوئی زیادتی کرنا چاہے تو اُس کو سزا و احتساب اور زیادتی کو برحق ثابت کرنے کے لئے دلائل و براہین کے سیلاب بہا دیں۔ یہ مقام افسوس ہے کہ موجودہ جمہوری دور میں یہ مناصبِ جلیلہ اربابِ صحافت کے حصے میں آگئے ہیں۔

حکام کی قصیدہ گوئی، اُن کی نامستحسن حرکات کی بے حد فخر نشر و اشاعت، ان کی اسلام کُش تقریبات کی تصاویر سے اوراق کی آراستگی، ان کے کام کے خاص خبروں کی اشاعت، ان کے استبدادی ہتھکنڈوں کے لئے وجوہ و جواز کی فراہمی، اُن کے ناقدین کے خلاف محاذ کا قیام اور اسی قسم کی دوسری گھٹیا حرکات ہمارے متعدد اخبارات کا امتیازی وصف بن چکی ہیں

ہماری صحافت کا ایک سخت معنوی عیب یہ ہے کہ راست فکری (Straight thinking) کے جوہر کا قحط پڑا ہوا نظر آتا ہے۔

راست فکری کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے موضوع کو متعین کر کے ایک سیدھی راہِ استدلال پا کر مقصدِ کلام کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ اصولی بحث و صحافت کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

لیکن ہمارے صحافیوں میں سے اکثریت ایسوں کی ہے، بلکہ مجموعی طور پر صحافت کا مزاج اس طرح کا ہے کہ وہ راست فکری کے وصف سے عاری ہے۔ موضوع کچھ اور ہوتا ہے، باتیں کچھ اور کہہ دی جاتی ہیں۔ ایک خاص مسئلے پر قلم اُٹھایا، لیکن بیچ میں یاد آگیا کہ فلاں فلاں سے کد ہے اور ان سے چھیڑ چھاڑ جاری رہنی چاہئے تو اس مسئلے سے ہٹ کر اُن کے خلاف گفتگو بازی شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے چند روز پہلے ایک مضمون لوگوں کو لاٹری نکالنے کی عادت کی ترغیب دلانے کے خلاف لکھا، لیکن اسی کے تحت مجلس احرار، جماعت اسلامی، نواب صدیق، میاں ممتاز دولتانہ کو چٹکیاں بھی لے ڈالیں۔ آخر یہ لوگ اپنے اخبار کو لاٹری نکالنے سے کیسے روکیں، وہ عوام کو لاٹری نکالنا کیسے سکھا [illegible] عنوان جمہوریت کے موضوع پر لکھا جائے گا۔ لیکن بحث اس میں یہ آ جائے گی کہ "مولانا مودودی کیوں جاگیرداروں کے حامی ہیں"۔ پھر یہ ایک عام تماشا ہے کہ ایک متعین سوال پر گفتگو کر کے اسے صاف کرنے کے بجائے "انہار و بیان" کا قلم جہاں چاہے [illegible] مسائل کی طرف [illegible] جو عوام کی توجہ کو اس سوال سے ہٹا کر کسی دوسرے سوال پر جا پڑتا ہے۔ اس طرح کے جھگڑے [illegible] عام طور پر بڑی [illegible] صحافت [illegible]

[illegible]

ذہنی انتشار کے رنگ میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ کچی دماغوں کو منافقت کا درس دیتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ اسلوب بہت مقبول ہو رہا ہے۔ لاہور اور کراچی کے اکثر اخبارات میں اس اسلوب کے نمونے نہایت آب و تاب سے شائع ہوتے ہیں، اور اس اسلوب کے علمبردار صحافیوں کی قیمت منڈی میں خاصی گراں ہے۔

سیدھا چلنے کی بجائے "اگر، مگر" "لیکن" اور "اگرچہ" وغیرہ کے استعمال سے اخبار نویس بالکل عقرکتا ہوا اور پہلو بدلتا ہوا حرکت کرتا ہے، وہ صاف گوئی کی شجاعت اور ایک صداقت کا سامنا کرنے کی جرأت سے محروم ہونے کی وجہ سے سنجیدہ طرزِ بیان کو ترک کر کے ادبی چٹکلوں، چھپے تشتول لطیفہ آمیز کہانیوں، مبہم اشاروں وغیرہ کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اس طرح نہ خود کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچتا ہے، نہ عوام کو پہنچنے دیتا ہے۔ صحافی لگا کر سکتا کہ مسائل پر غور و فکر تفریح کے لئے ہونا چاہئے، نہ کسی نتیجے پر پہنچ کر کسی خاص عملی مسلک کے اختیار کرنے کے لئے۔

میں کسی کا نام نہیں لینا چاہتا" لیکن ایک مقبول اخبار نویس نے حال ہی میں موجودہ قیادت کے بارے میں ایک صحافیانہ مضمون لکھا ہے، اس مضمون میں دو باتیں ثابت کی ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ قیادت مقبولیت کی سطح سے بہت نیچے گر رہی ہے، اور دوسرے یہ کہ اسی قیادت پر نگاہ احترام قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ دو متضاد باتیں ہیں، لیکن دو رنگی کے جدید صحافیانہ اسلوب کے تحت ان کو ایک خاص طریق سے نبایا گیا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس لاہور کے ایک نوجوان صحافی جو اپنے حلقے میں بہت ہی نمایاں ہیں اس اسلوب کے خاص ماہر ہیں اور ان کی تحریریں مزے مزے لے لے کے پڑھی جاتی ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر تحریر اسی "شتر گربگی" کی مظہر ہے۔

اگر گستاخی نہ ہو تو میں اس اسلوب کو "صحافتی مداری پن" یا صحافتی شعبدہ بازی کا نام دوں۔ یہ محض الفاظ کی ایک تماشاگری ہے جو شعبدہ باز کے کمالات سے عوام کو مرعوب کر سکتی ہے اور ان کو ورطۂ حیرت میں ڈال سکتی ہے، لیکن ان کو مسائل کی گرہ کشائی کا درس نہیں دے سکتی۔

راست فکری کا یہ قحط صحافت کے واسطے سے سیاسی اسٹیج اور مذہبی منبر تک میں سرایت کر چکا ہے۔ شاذ ہی کوئی تقریر ایسی سننے میں آتی ہے جس میں راست فکری کا جوہر موجود ہو، اور کبھی ہی نصیبہ اتنا یاور ہوتا ہے کہ کسی اخبار کے کالم میں کوئی ٹکڑا ایسا سامنے آ جائے کہ جس سے فکر کی صحت و توازن کے آثار نمایاں ہوں۔ بسا اوقات ایک اخبار میں ہفتوں کوئی صالح تحریر یا سنجیدہ مقالہ دیکھنے میں نہیں آتا۔

اس مہلک وبا کا پرتو عوام پر بری طرح پڑ رہا ہے۔ ہمارے عوام راست فکری کی تربیت حاصل کرنے کے بجائے اخبارات کے مطالعے سے برابر ژولیدہ خیالی، پریشان دماغی اور انتشارِ ذہنی کا درس لے رہے ہیں۔ آپ دس بیس آدمیوں سے بات کر کے دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ سیدھے راستے پر گفتگو کو لے چلنا کتنا مشکل کام ہے۔ یہاں تک کہ اچھے اچھے اونچے تعلیم یافتہ لوگوں میں کثرت سے وہ لوگ پائے جاتے ہیں جنہیں یہ سلیقہ نہیں کہ وہ کسی گفتگو یا بحث کے لئے سیدھا راستہ اختیار کر کے دو قدم بھی چل سکیں۔

ایک مصیبت جو صحافت کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے وہ بہت سے اخبار نویسوں کی دماغی ناپختگی ہے۔ اخبار نویسی جتنا ذمہ داری کا منصب ہے، اتنی ہی زیادہ وہ علمی قابلیت چاہتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بہت سے اخبار نویس ایسے ہیں جو دماغی پختگی کے بغیر میدانِ صحافت میں داخل ہو گئے ہیں اور ساری عمر اسی حال میں گزار دیتے ہیں۔ وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں کہ ان کی تعلیم کس درجہ کی ہے یا کم مطالعہ کافی ہے یا نہیں، بلکہ وہ قلم چلانے کی مشق کو صحافت کی کرسی پر بیٹھ کر قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی

سمجھتے ہیں۔

بعد میں جب ایسے لوگ صحافت کا کاروبار چلاتے ہیں تو اُن کی عادت ہمیشہ قلم برداشتہ لکھنے کی ہوتی ہے۔ ہر موضوع پر لکھیں گے، بے لکھیں گے، بے سوچے لکھیں گے، اور بے مطالعہ کئے لکھیں گے۔ ان کی معلومات کے سارے خزانے صرف ان اخبارات سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ جو ان کو تبادلۂ معاصرانہ کے اصول کے تحت ہم پہنچتے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کسی ٹھوس مطالعہ کی توفیق ان کو نہیں ہوتی، الغا کو دُنیا کے پیچیدہ ترین مسائل پر لتاڑ دینگے، لیکن یہ جانے بغیر کہ ان مسائل کے دور رس تقاضے کیا ہیں۔

دوسرے معاملات کو تو درکنار رکھئے، غریب اسلام پر جو ستم دُنیائے صحافت میں ڈھائے جاتے ہیں، اُن سے خُدا کی پناہ۔ ایک شخص نے اسلام کے اصل مآخذ کو عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی ترجمہ تک کے ساتھ نہیں پڑھا ہوتا، لیکن وہ برابر اجتہاد کئے چلا جاتا ہے۔ وہ اسلامی سیاسیات پر داستے دیگا لیکن اسے یہ تک معلوم نہ ہوگا کہ اس موضوع میں کونسا لٹریچر دیکھنا چاہئے۔ وہ اسلامی معاشی مسائل پر قلم اٹھائیگا لیکن اُن کتابوں کے نام تک نہ جانتا ہوگا جن میں ان مسائل پر علمی بحثیں موجود ہیں۔ وہ اسلامی فلسفہ بیان کریگا، وہ فتوے دیگا، اور وہ اجتہاد کرے گا، لیکن کچھ پڑھے بغیر! کوئی ٹوکے تو کہہ دے گا کہ اسلام میں ہر شخص کو سوچنے اور رائے دینے کا حق ہے، یہاں کوئی ملائی طبقہ (Priest class) قابل تسلیم نہیں ہے۔ وغیرہ۔

مطالعہ سے بے نیازی کی اس عادت نے اخبار نویسوں کو یہ سکھا دیا ہے کہ وہ جس شخص کی مخالفت کریں اسکے خیالات کو پوری طرح سمجھے بغیر کریں، جس جماعت کے خلاف قلم اٹھائیں، اس کے لٹریچر کو ملاحظہ فرمائے بغیر اٹھائیں۔

اس طرح عوام کا ذہنی معیار تباہی کا شکار ہو رہا ہے۔

سب سے بڑی آفت صحافت کی حدودِ اخلاق سے بے نیازی ہے۔ یعنی پوری دُنیائے صحافت کے لئے مجموعی طور پر بھی، اور ایک ایک اخبار کے لئے انفرادی طور پر بھی کوئی ایسے حدودِ اخلاق عوام کے علم میں نہیں ہیں کہ یہ اخبار چاہے ختم ہو جائے لیکن فلاں فلاں حرکات یہ کبھی نہ کرسکے گا۔ اخبارات کے سامنے کوئی ایسی حدود نہیں کہ جن کے متعلق معلوم ہو کہ وہ کسی کی حمایت میں فلاں حدود سے آگے قطعاً نہیں جائیں گے یا کسی کی مخالفت میں فلاں خط کو وہ کبھی نہیں پھاندیں گے۔

یہ بے ضمیری کی حالت سخت مفسدہ انگیز ہے ——— اور اس کی وجہ سے اخبار نویس میں ایک استکبار پایا جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قبضے میں ایک بے پناہ قوت ہے جس کے ذریعے جس کو چاہے بڑی سے بڑی عنایت کر دے اور جس پر چاہے بڑے سے بڑا ستم توڑ دے۔ اس میں وہ قوت باقی نہیں رہی جو اسے غلطی پر ٹوک سکے اور غلط سمت میں اقدام کرنے سے روک سکے۔ چنانچہ آپ کو اپنے اکثر اخبارات کے سالہا سال کے فائلوں میں اس کی مثالیں بہت ہی شاذ ملیں گی کہ اخبار نویسوں نے دوسروں کی غلطیوں کو اچھالنے کے ساتھ ہوئے کبھی اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا ہو۔ غلطی کا احساس تو جبھی ہو سکتا ہے کہ کوئی حدودِ اخلاق آدمی اپنے لئے قائم کرے۔ جب یہ نہیں تو اعتراف خطا کا کیا سوال۔

ان مفاسد کو سامنے رکھ کر اگر ہم اپنے اخبارات کو دیکھیں تو راست گوئی، صداقت، ذوقِ سلیم یہ کہتا ہے کہ ان سے اس طرح بچا جائے جیسے چھوت کی بیماریوں سے ... [illegible] ... اپنے آپ کو اور پبلک کو اس طرح بچانا چاہئے جیسے [illegible]

غیرے اور دق وسل کی وباؤں سے بچنے بچا سکتے ہیں۔

لیکن بائیکاٹ کوئی طریق اصلاح نہیں! ——— اخبار کے بغیر ہم اپنی سیاسی زندگی کو نشوونما نہیں دے سکتے!

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان احوال کا علاج کیا ہے؟

دراصل حالات کی کسی بھی اصلاح کے لئے خود "انسان" کا بدلنا اور اس کی ذہنیت کا بدلنا واحد وسیلہ ہے۔ باہر سے اخبار نویس پر ہم کوئی مکمل اصلاح مسلط نہیں کر سکتے، بلکہ اصلاح صرف وہی ہے جو اُس کے اپنے ضمیر کے اندر سے اُٹھے۔

ہمارا اخبار نویس اس بات کا محتاج ہے کہ اس میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو اکسایا اور ابھارا جائے۔ اس کے اندر یہ شعور تازہ کیا جائے کہ صحافت کا منصب اور قلم کی قوت اس کے پاس خدا تعالیٰ کی امانت ہے جس کا صحیح استعمال وہ ہے جو اصل مالک کی رضا اور اس کے مقررہ ضوابط کے مطابق ہو۔ پھر اس میں تقویٰ کی یہ اسپرٹ پیدا کی جائے کہ وہ ہر لفظ لکھے تو یہ سوچ کر لکھے کہ خدا کی کسوٹی پر کھرا نکلتا ہے یا کھوٹا۔ پھر اس میں ذمہ داری کا یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ اپنی تحریروں کے بارے میں آخرت کی جوابدہی کو پیش نظر رکھے۔

بجز اس تبدیلی کے کوئی اور صورت ایسی نہیں ہے جو ہماری صحافت کو مغربی فن صحافت کے مفسدات سے پاک کر سکے۔

دوسری صورتیں محدود اثرات ڈالنے والی ہو سکتی ہیں، اور ہم یہاں اُن کا تذکرہ بھی کئے دیتے ہیں۔

(۱) جو لوگ صحافت کو سنئے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، وہ پبلک کو موجودہ صحافت کے مفاسد سے برابر آگاہ کرتے رہیں۔ وہ صحافت کے کرشموں کا بار بار تجزیہ کر کے یہ دکھائیں کہ ان کرشموں کی اصل حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام اور انسانیت سے گری ہوئی صحافت کی قدر اور مانگ ذہنی منڈی میں گر جائے، اور اخبار نویس میں احساس پیدا ہو کہ اسے بدلنا چاہئے۔

(۲) دوسری طرف صالح صحافت کے ایسے نمونے پبلک کے سامنے لائے جائیں جنہیں فاسد صحافت کے مقابلے میں بار بار پرکھنے کے بعد عوام پر خود یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ان کی فلاح صالح صحافت میں ہے، نہ کہ فاسد صحافت میں۔ اس طرح ایک مسلسل جدوجہد کے بعد صالح صحافت کی قدر اور مانگ پیدا ہو سکتی ہے جو بالآخر صحافتی دنیا میں انقلاب لائے گی۔

(۳) اسلام پسند صحافیوں کی ایک ایسی مجلس تشکیل پذیر ہو جس کا مقصد صرف اپنے حقوق کی حفاظت نہ ہو، بلکہ اپنے فرائض کی فکر کرنا بھی ہو۔ یہ انجمن صالح صحافت کے لئے اصول اور اخلاقی حدود متعین کرے، ان پر لٹریچر فراہم کرے، اور نئے صحافتی اسالیب کے نمونے صحافیوں اور پبلک کے سامنے لائے۔

ان تدابیر سے ایک گونہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

(بقیہ از صفحہ ۷۷)

یہ ہمیں ایک نسل سے کاٹ کر دوسری نسلوں میں بانٹتی ہیں۔ آدم کے بیٹوں کے حصے بخرے اس طرح سے کر دئے ہیں کہ جیسے وہ آدم کے بیٹے نہیں بلکہ حشرات الارض ہیں — ساری نوع انسان کو دنیا میں بھیڑیوں کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے کہ اپنے اپنے بھٹوں کی تقسیم میں لڑ کر مر جائیں۔ ... مذہبوں کے بڑے بڑے نام لیواؤں کے پاس بھی صرف دعوے اور نعرے۔ ... میں اور ان میں بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے کوئی پیغام ... معلوم کیا ہے۔ کیا بات ہے۔ کون جانتا ہے؟ دنیا کے اس چڑیا خانے میں اتنی آوازیں ہیں کہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے والا سر پکڑ کر ... (باقی آئندہ)

مرکزِ محبت کے نام

نعیم صدیقی

مدتیں گذریں کہ جنت سے چلا تیرے لئے
لے کے آ پہنچا ہوں تسلیم و رضا تیرے لئے

جا بجا طاغوت کے نرغے میں گھر گھر کر بچا
ہر قدم پر غولِ صحرا سے لڑا تیرے لئے

معصیت کی کھائیوں میں بارہا گرتا رہا
لے کے توبہ کا سہارا پھر اٹھا تیرے لئے

کتنے ہی بازار تھے جن میں بکا تیرے لئے
بارہا اندھے کنوؤں میں گر چکا تیرے لئے

چھوڑ کر کتنی زلیخاؤں کو پیچ و تاب میں
میں جھٹک لایا ہوں دامانِ حیا تیرے لئے

کتنے چوروں سے بچا کر لا رہا ہوں دور سے
داغِ سینہ کی متاعِ بے بہا تیرے لئے

خود الٹ دی جاہ و منصب کی بساطِ مکر و فن
داؤں میں جو کچھ لگا تھا ہار دیا تیرے لئے

کیسے کیسے قدرداں تھے، کیسے کیسے رازدار
جن کو اک لمحے میں دشمن کر لیا تیرے لئے

عہدِ طفلی سے رہا جو خوگرِ حسنِ خطاب
گالیوں کا لے رہا اب مزا تیرے لئے

جس کو کلیوں کی نزاکت بھی چبھا کرتی تھی کل
خار زاروں میں ہے وہ آبلہ پا تیرے لئے

کن کمینہ کیش لوگوں سے پڑا ہے واسطہ
کیسی کیسی حرکتوں کو سہہ لیا تیرے لئے

شاعرِ حساس جس کو آبرو کا پاس تھا
پھبتیاں سن کر بھی اب ہنس دیا تیرے لئے

شہر کے فتنہ فروشوں کی عنایت کے طفیل
کہلوایا "کافرِ مسلم نما" تیرے لئے

نام جب تیرا لیا اس دیس میں، پتھر پڑے!
اور دی چوٹوں کی قیمت میں دعا تیرے لئے

قوتیں کیں صرف جن جن کی بھلائی کے لئے
اُن سے ہی الزامِ غداری سنا تیرے لئے

تیرے دینِ پاک کی خدمت کے سنگین جرم پر
پُر تعفن طنز کو پیہم سہا تیرے لئے

کیسے کیسے کور ذوقوں کا ادب کرتا ہوں میں
مردِ خود بیں ہو کے مٹی میں ملا تیرے لئے

دیکھ کر اربابِ دانش کی حماقت خیزیاں
گر ہنسی آئی مگر رو کے رہا تیرے لئے

مسلموں کی کافر آشنی پہ بھر آتا ہے دل
اشک ابلنے کو، لیکن پی گیا تیرے لئے

[illegible] کے نام

وہ مساجد جن میں فتنے ہوں، باقی تو نہیں
اُن مساجد میں کیا سجدہ ادا تیرے لئے

وہ ائمہ جن کی قیمت ہے طوائف سے بھی کم
کی گوارا اُن کے پیچھے اقتداء تیرے لئے

سامنے فرعون کے تیرا پیامِ انقلاب
سایۂ شمشیروں میں کھل کر کہا تیرے لئے

جو پہاڑوں پر ہے بھاری وہ ترا "قولِ ثقیل"!
اُسکو دی سینے کے اندر میں نے جا تیرے لئے

کر لئے ہیں دوزخِ نمرود کے شعلے قبول
جنّتِ شداد کو ٹھکرا دیا تیرے لئے

"بدر" سے تو نے پکارا جب تو پھر کیسا گریز
ترک کر دی خلوتِ "غارِ حرا" تیرے لئے

جب تری دعوت پہ اہلِ زہد دبکے رہ گئے
رندِ عصیاں کیش یہ آگے بڑھا تیرے لئے

کشمکش؟ اور وہ بھی طوفانِ فجور و فسق سے
کس غلاظت کے سمندر میں گھرا تیرے لئے

وہ قیادت جس کی فتنہ خیزیوں پر شور ہے
اُس سے میں دست و گریباں ہو گیا تیرے لئے

عشق کے جلتے توے پر صورتِ تخمِ سپند
میں تڑپ کر بن گیا یکسر نوا تیرے لئے

جن کو فکر و شعر کی دنیا میں برسوں خود گھڑا
توڑ ڈالے ایک دن وہ سب "خدا" تیرے لئے

سیرت و کردار کو پہلے ادھیڑا، پھر بٹا
از سرِ نو فکر کی رکھی بنا تیرے لئے

بارہا تپتی کٹھالی میں مجھے ڈالا گیا
بارہا حسّاس کانٹوں پر ٹُلا تیرے لئے

میرے جذبوں کا زمانہ کر رہا ہے قتلِ عام
بخشتا ہوں میں قصاص و خون بہا تیرے لئے

ایک ذہنی موت ہے یاں قیمتِ موجِ نفس
کیا بتاؤں کیسے مر مر کر جیا تیرے لئے

صید گاہِ آرزو میں آمد آمد تھی تری
توڑ کر بندِ نشیمن کو اُڑا تیرے لئے

ہاں مگر بندہ نوازی دیکھتا ہوں جب تمری
جھک کے نادم سوچتا ہوں کیا کیا تیرے لئے

کلماتِ تخیّل افروز

(اسعد گیلانی کے ناول کے اقتباسات)

(ادارہ)

"بگولے میں پیپل کے بے بس خشک پتے کی قوتِ ارادی اسے کب تک فضا کی بلندی سے بچا سکتی ہے یا اس کی مرضی بگولے کی سمت کو تبدیل کر سکتی ہے۔ جب میں نے زندگی میں جھجکتے جھجکتے قدم رکھا تو بے بسی میرے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے وہاں پہنچا دیا۔ جہاں سے انسان پر اسی دنیا میں جہنم کے دروازے کھلتے ہیں۔

مجھے اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر اس سیل میں کود جانا پڑا۔ جو میرے گھر کی بنیادوں سے ٹکرا رہا تھا۔ میرے دروازے پر طوفان دستک دے رہا تھا۔ اور مجھے اتنی فرصت نہ تھی کہ پناہ کا کوئی راستہ تلاش کر سکوں۔ میری زندگی میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور میرے خیالات فضا میں ہوائی جہازوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہے تھے۔ میرے مستقبل کے خواب چور چور ہو کر میرے سامنے بکھرے پڑے تھے اور میں نے جب مادرِ علم کو آخری بار الوداع کہا تو میرے ہاتھ میں مسئلہ معاشیات پر لکھی ہوئی کسی کی ایک کتاب تھی۔ اور دوسرے ہاتھ میں ایمپلائمنٹ کا ایک پمفلٹ۔ مختلف دفاتر کے دروازے میرے سامنے کھلے پڑے تھے۔ اور انسانی خرید و فروخت کی اس منڈی میں میری پیشانی پر بھاری روپیہ کا لیبل لگا ہوا تھا۔" صفحہ ۱۱۔

"ہمارے دل و دماغ پر تلخ حقائق کا پرتو نہیں پڑنے دیا جاتا کہ کہیں ہم زندگی کی عریانی کو اس کے اصلی روپ میں نہ دیکھ لیں۔ جہاں کا نوجوان اس وقت ڈرامے میں شہزادے کا پارٹ ادا کر رہا ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے گھر کی نیلامی بولی جا رہی ہوتی ہے۔" صفحہ ۱۷

"ایک واضح غم میرے پیچھے تھا۔ ایک دھندلی مسرت میرے آگے تھی۔ اور میں اس غم و مسرت میں معلق کسی بدقسمت مکڑی کی طرح اپنی قسمت کا جالا تنتا چلا جا رہا تھا۔" صفحہ ۲۲

"ہماری جیبوں میں ابھی چند سکے باقی تھے۔ ہماری ٹانگوں میں ابھی چند قلانچیں موجود تھیں۔ ہمارے دلوں میں ابھی چند بیباک حوصلے کار فرما تھے۔" صفحہ ۳۱۔

"ایک تند جذبہ مجھ میں چیخ رہا تھا۔ کہ دنیا میں اطمینان اور مسرت کا واحد چشمہ مایوسی ہے۔ دنیا میں مایوس آؤ۔ مایوس زندہ رہو مایوسیوں میں گھرے رہو اور مایوس ہی مر جاؤ۔ اپنے دل کے دروازے مضبوطی سے بند رکھو۔ کہ اس میں کوئی امید کی شعاع داخل نہ ہو جائے۔ کوئی آرزو اس میں گھر نہ کر لے۔ ورنہ تمہاری زندگی اس نیم مردہ سانپ کی سی ہوگی۔ جس کے جسم پر لاکھوں چیونٹیاں چمٹ گئی ہوں اور ہر لمحہ اس کے جسم میں ہزاروں اور لاکھوں ڈنک چبھ رہے ہوں۔" صفحہ ۶۲۔

ایک چنگاری سی میرے ذہن میں سلگتے سلگتے یکایک بجھ گئی۔ ایک شعلہ سا بھڑکتے بھڑکتے یکایک سرد پڑ گیا۔ ایک شیطان سا میرے ذہن میں چلاتے چلاتے خاموش ہو گیا۔ پھر جیسے چاند کی سی آہستگی سے اپنے نرم ریشمی پاؤں ٹکاتا ہوا کوئی لطیف وجود میرے دل میں گھس آیا۔ پھر جیسے کسی نرم و نازک ہاتھ نے میرے دل کو گرفت میں لے لیا۔ ایک گہرے رفیق کی سی محبت سے کوئی میرے دل میں عجیب عجیب خیالات بھرنے لگا۔ کسی نے مجھے قائل کرنا شروع کر دیا۔ کسی نے طبیعت کی ہر بغاوت پر اطاعت کا پھاہا رکھنا شروع کر دیا۔ کوئی برے رو کو کہنے لگا۔ جس کا میرے پاس فقط ایک البتہ

کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔" صفحہ ۶۳

"گناہ کرتے ہو اور کہتے ہو اس نے تمہیں روکا کیوں نہیں۔ یتیم کے منہ سے نوالہ چھینتے ہو اور کہتے ہو اس نے قوتِ بازو سے رزقِ حلال کمانے کا حکم دیا ہے۔ بیوہ کی پھٹی ہوئی ساری تک چھین کر اپنے عشرت کدوں کی کھڑکیوں کے پردے بنا لیتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اس نے اسے بے سہارا ہی کیوں کیا۔ گمراہی کے راستے پر جاتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ چاہے تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا سکتا ہے۔ مشیت اور رضا کے معمولی فرق تک سے ناواقف ہو۔ اور زندگیوں کی تعمیر اپنے پھیپھسے استدلال اور شہادت کی بنیادوں پر اٹھاتے ہو۔ آگ کے پھولوں سے بھی زیادہ کمزور تمہارے دلائل ہیں۔ اور یہی دلائل کے سلسلے تمہارے دل و دماغ کو بے خبری بے حضوری اور جہالت کی زنجیروں میں جکڑتے چلے جاتے ہیں۔" صفحہ ۶۶۔

"کرائے کا سپاہی اور مزدور جسے سرمایہ دارانہ نظام نے تیار کیا ہے اپنی جفاکشی کے ساتھ نہایت شدید غلامانہ ذہنیت رکھتا ہے اسکے اجتماعی شعور کو کسی سیدھی راہ پر لگانا آسان نہیں ہوتا۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے اصلی انسانی قوت (Man Power) کہا جا سکتا ہے۔ یہ جب کسی مقصد کے لئے سوجھ بوجھ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو تو اس گروہ کا بپھرا ہوا سیل کئی نپولین اپنی ٹھوکر میں لے کر چلتا ہے کئی سکو اس کی چنگاری سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ کئی اسپین اس کے کارواں کی گرد میں لپٹ جاتے۔ لیکن جب یہ روٹی کے لئے اپنی قسمت بیچ رہا ہوتا ہے تو اس کے خون کی زہریلی خنکیوں میں گرمی پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا یہ کسی ہمدرد کو ذلیل بھی کر سکتا ہے۔ اس کا مضحکہ بھی اڑا سکتا ہے اور کسی بھیڑیے کو سر آنکھوں پر بھی بٹھا سکتا ہے۔ یہ اپنے ہی غریب بھائی کے منہ میں پانی کا قطرہ تک ٹپکانا پسند نہ کرے گا۔ اور کسی پتا کھلانے والے شخص کی رضامندی۔ نگاہ التفات اور خشک شکریے کا ایک لفظ سننے کے لئے اپنا خون تک نچوڑ دے گا۔ اس کی پیدا کردہ ذہنیت میں جہالت اور تنگ ظرفی زیادہ ہے اور خلق اور خودداری کم۔ اسے ابھارنے اور اٹھانے کے لازمی ہے کہ پہلے اس میں وہ انسانی اخلاق پیدا کئے جائیں جن سے وہ عزتِ نفس کا مفہوم سمجھ سکے۔" صفحہ ۸۲۔

ہماری حمیت کی رگیں کچھ تو جل چکی تھیں اور جو کچھ باقی تھیں کبھی ان کے پھڑک اٹھنے پر اچھا خاصہ ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ خودداری تھی تو اسے ہم نے ترقی دے کر خودی بنا لیا تھا۔ ٹھکریں کھاتے کھاتے دل میں خوف اور ڈر صرف ایک ہی بلند و برتر ہستی کا رہ گیا تھا۔" صفحہ ۸۳۔

"اس نظام فاسد کے تحت پروپیگنڈے کے لئے بڑے بڑے نمکزادے بھی اسی لئے رکھے جاتے ہیں کہ وہ مقتول کی لاش پر اطلس و کمخواب کے پردے ڈالے رہیں۔ کیونکہ ظلم چھپا لینا اس دنیا میں معصومیت سمجھا جاتا ہے۔ اس زراعتی ملک میں غلے کی فراوانی کا پروپیگنڈہ یہاں کی ارزانی کا شہرہ اور یہاں کی سادہ زندگی کا چرچا ایک عمدہ پردہ تھا۔ جس کے نیچے بھوکے پیٹ۔ ننگے جسم اور افلاس زدہ چہرے چھپ سکتے تھے۔" صفحہ ۹۰

"اور پھر ہم گلے مل رہے تھے۔ ایک عجیب کیفیت تھی۔ جیسے میں ماضی کے پردوں میں دفن کر آیا تھا۔ وہ ان پردوں کو چیرتا ہوا پھر سے حال میں آ شامل ہوا تھا۔ احساس رفاقت کی رسی یقیناً اتنی مضبوط ہو سکتی ہے کہ اسے تھام کر کوئی ہزاروں میلوں کی مسافتیں کر جائے۔" صفحہ ۹۶

"تجربات کا جواب پہلے ہی سوچ کر رکھ لیا گیا تھا گویا ہر شکار کے لئے مختلف نمبروں کے کارتوس شکاری نے اپنے تھیلوں میں جمع کر رکھے تھے۔" صفحہ ۹۷۔

"اقتدار طول ہونے کی ضرورت نہیں۔ زندگی کے یہ دو مختلف دھارے کب تک ایک ساتھ رہیں گے۔ حادثات اور تلخ واقعات کے پہاڑ جب

یہاں آ جاتے ہیں تو ندیوں کے رخ بدل جاتے ہیں ایک مشرق کو چل جاتی ہے اور دوسری مغرب کو۔" صفحہ ۱۱۲

" عافیت کا راستہ اسی میں بہتر اور کوئی نہ تھا کہ فرمودات کا قلع قمع کریں اور جو ارشاد ہوا سے بردام بخرید یں۔ زندگی کی کشمکش گھاٹ خطوط سے ہٹا کر نئے خطوط پر لگائیں۔ خودداری کسی بھنگی کے پاس گروی رکھ دیں۔ ماضی کو بھول جائیں۔ مستقبل کے خواب نہ دیکھیں۔ حال پر جھکیں اور گالیوں دھمکیوں اور چارج ماردینے کی دھمکیوں کے درمیان گرتے پڑتے دن گزارتے جائیں۔ رگ حمیت کو کاٹ کر کسی گندی نالی میں پھینک دیں۔ جی جی کہتے رہیں رات کو اٹینشن سوئیں اور خواب میں بھی اٹینشن ہو کر سیلوٹ کرتے رہیں۔ بس یہی مسودہ نجات کی تھی۔ پھر عظم "ہم دفتر جانے لگے۔ دفتر ایک باڑہ تھا۔ جس میں ملک کے مختلف حصوں سے پڑھی لکھی بھیڑیں گھیر گھیر کر لائی جاتی تھیں اور ان سے دو جنگ کے لئے خطِ غلامی لکھایا جاتا تھا۔" صفحہ ۱۱۳۔

" اور اس وقت میری نیلی خاکی جیسے میرے گلے میں تنگ ہو گئی تھی اور مجھے احساس ہوا تھا کہ میرا سلکی کوٹ میرے جسم سے اتر کر زمین پر گر پڑا تھا اور میں برہنہ ہو کر رہ گیا تھا۔" صفحہ ۱۱۳۔

" دام کے حلقوں کی سختی ان میں پھنس کر معلوم ہوتی ہے دور سے تو بکھرے ہوئے دانے ہی نظر آتے ہیں۔" صفحہ ۱۱۴۔

" انسان کا دوسروں کے ساتھ برتاؤ اس کی فطرت کے رذیل یا بلند ہونے کا گواہ ہوتا ہے اور یہ گواہی اس وقت وضاحت سے سامنے آتی ہے جب اس کے ہاتھ میں کچھ اختیار دے دیا جائے۔ آج تہذیب کی لغت میں تو انصاف اسی فیصلے کا نام ہے جو قوی صادر کرے۔ اسے یہ بھی پہنچتا ہے کہ وہ انصاف اور حق پرستی کے پرانے معنی بدل دے۔ دھوکے اور فریب سے کسی کے حقوق غصب کرنے کو ڈپلومیسی اور گن کے سرگن کر حکومت کرنے کو جمہوریت کہہ سکے اس کی عدالتوں میں سب سے زیادہ مکار سب سے زیادہ معصوم قرار دیا جائے اور سب سے زیادہ بے گناہ پھانسی کے تختے پر لٹکایا جائے۔ اس کی عدالتوں کا قانون ہماری جیبوں پر اثر انداز نہ ہو سکے اور سوجھی ہوئی معصوم گردنوں میں پھندا ڈال دے۔ وہاں انصاف ہمیشہ وکلاء کی طراری اور چرب زبانی میں پوشیدہ رہے اور گناہ بے بسی کا دوسرا نام رکھ دیا جائے اسے حق حاصل ہے وہ الفاظ کے پرانے معنی بدل کر انہیں نئے معنی پہنا دے۔" صفحہ ۱۲۳۔

موجودہ دنیا کے انسان میں بنیادی اخلاقیات کی اتنی کمی ہے کہ ہم اب تک حیوانی درجے سے ہی نہیں نکل سکے اور اب تک ہمیں پیٹ اہمیت ہی دم نہیں لینے دیتی۔ ہم پیٹ کی عینک لگا کر زندگی کے ہر مسئلے پر نظر ڈالتے ہیں اور جہاں کہیں کوئی خرابی پاتے ہیں چلا پڑتے ہیں کہ بھوک ہی ہم غلامی کا سبب ہیں۔ حالانکہ غلامی بھوک کا سبب نہیں بلکہ بھوک غلامی کا نتیجہ ہوتی ہے اور ذہنی غلامی کا اصلی سبب ہماری اخلاقی پستی ہے۔ صفحہ ۱۲۴۔

" مظلوم آنکھیں جھک گئیں۔ ستم رسیدہ دل ٹھٹھر گئے۔ بے بس زبانیں مفلوج ہو گئیں اور کمزوروں نے قوی کے سامنے سر جھکا دیئے۔ پھر اس کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ ایک ہی لاٹھی سے تمام بھیڑوں کو ہانک لے جائے۔" نمبر صفحہ

" انصاف اور آزادی کے علمبرداروں کی حکومت میں وہ منظر ایک بے آواز لاٹھی کی حرکت کا منتظر تھا۔ اور یہی احساس وقت کے سامنے مریضِ مختصر محسوس ہو رہی تھیں۔" صفحہ ۱۳۱۔

" میں ان پیچیدہ جذبات کو نہ سمجھ سکتا تھا نہ کہہ سکتا تھا جو اس خطے سے وابستہ ہو کر رہ گئے تھے۔ جب اس خطے کے بوجھ تلے میری کوئی [illegible] ساتھی کہیں گنا ہی [illegible] جو چھپا چلا تھا اور میں اس بوجھ سے نجات کی [illegible] اس نے مجھ پر تھا کہ انہیں میں سے ایک وہ [illegible] خلاف میں کر میں نے گھر کا نام [illegible] کتنا عجیب [illegible] کا احساس تھا جسے میری عقل [illegible]

[illegible]

ماضی کی دنیا میں بسنے والے ایسے ملکیت یا الفت رکھتا تھا کہ جنہیں باہر کی ہوا بھی نہیں لگا سکتی تھی۔" صفحہ ۱۴۰۔

"میاں اقبال" یہ شعر ہمارے نوجوان کے لئے کہہ گیا ہے جس کے ملک کی زمین پر آسمان نہیں بلکہ پیٹ چھایا ہوا ہے۔ جہاں کے شاعروں کو چاند سورج بھی روٹیاں نظر آتے ہیں اور جہاں کی فضاؤں میں۔ ہواؤں میں اور زندگی کے ہر پہلو میں انتڑیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے جہاں کے بھری دفتر غلامی کے اڈے ہیں جہاں اس ملک کے نوجوان کی قیمت جاہل پندرہ روپے۔ کچھ پڑھا لکھا پچیس روپے۔ میٹرک ایف۔ اے بی اے۔ ایم۔ اے چالیس پچاس ساٹھ روپے اور یوں یہاں کا نوجوان علی الاعلان بکتا ہے۔ یہ نوجوان دوسرے آسمانوں کی جستجو کب کرے گا؟ اسے کب پیٹ کے چکر میں سے نکال کر تحقیقات اور نئے آسمانوں کی جستجو کے لئے بھیجا جائے گا؟ کب اس ملک کا نظام اپنے نوجوان کو پیٹ کے پھندے میں سے نکال کر غیرت۔ جرأت۔ خودداری اور بلند ہمتی کی متاع دے گا؟ معاش۔ معاش۔ صبح معاش۔ شام معاش۔ شب معاش یہ پیٹ کی مخروطی عینک اس کی آنکھوں سے کب اترے گی؟ یہ کب اپنے آپ کو حیوانیت کی صف سے انسانیت کی صف میں لائے گا؟ کب۔ کب؟؟؟" صفحہ ۱۴۹۔

"میں تو کہتا ہوں کہ اس دنیا کی گولائی میں انسان کو ایک ہی مقام سے اتنی بار گزرنا پڑتا ہے کہ وہ اس سے اکتا جاتا ہے اور اس تنگ فضا میں وہ اپنی محبوب ہستیوں سے اتنی دفعہ ملتا ہے کہ وہ ان کے لئے مار ہو جاتا ہے۔ لطف تو جب آئے کہ آدمی اس وسعت میں کھو جائے اور پھر ڈھونڈے سے نہ ملے ——!" صفحہ ۱۴۹۔

"آور یہ سن کر تم اور بھی حیران ہو گے کہ یہی دُنیا جسے میں اس قدر تنگ سمجھتا ہوں۔ کبھی مجھے اتنی خوفناک۔ اتنی بھیانک اور اتنی لامحدود وسعتوں کی حامل نظر آتی ہے کہ مجھے انسانوں کی موجودہ حالت پر رحم آنے لگتا ہے۔ دنیا کے ایک اتھاہ سمندر کے مقابلے میں انسان اس کمزور بچے کی طرح ہے جو ندی کے کناروں کے، چھلے پانیوں میں ہی چھلانگیں لگاتا رہتا ہے۔ کبھی جرأت نہیں کرتا کہ ندی کی گہرائیوں کو ناپنے کے لئے کسی بھنور میں کود جائے یا اس کی تیزی اور تندی کو چیلنج کرتے ہوئے یہ کہہ کر اس میں چھلانگ لگا دے کہ ہمت ہے تو مجھے بہا لے جا۔" صفحہ ۱۵۰۔

"آخر کس مخلوق کے اخراجات کے حساب سے وہ تین روپے ہمیں لاہور سے کلکتہ کے سفر کے لئے دیئے گئے تھے۔ لیکن یہ کس سے پوچھتا کیا اس سے جو یہ تقسیم کر رہا تھا۔ جو خود ڈگڈگی کی تال پر ناچنے والا ایک بے بس بندر تھا۔ وہ خود حکم کا غلام تھا۔ فرنگی نے تین روپے دے کر ہماری معاشرت۔ ہماری سوسائٹی ہماری گھریلو زندگی اور ہماری انسانیت کی توہین کی تھی۔ انہیں گرا ہوا اور ذلیل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اپنی اس پلید ذہنیت کا ثبوت دیا تھا۔ جو قوم پرستی نے ان میں پیدا کر دی ہے۔" صفحہ ۱۵۱۔

"میں اس کارخانۂ کائنات کی مصلحتوں سے ناواقف محض ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ زخم ہو لے پر درد کا احساس ہوتا ہے اور درد کا احساس انسان کو رلا دیتا ہے۔ انسانیت کی موجودہ بے بسی اور بے چارگی نے دکھ کا ایک سمندر ہر فرد کے سینے میں بھر دیا ہے۔ انسانیت پر ایک سکرات کا عالم طاری ہے اور ہر فرد کرب و درد سے کراہ رہا ہے۔ سوسائٹی میں سے کوئی اخلاقی قوت نہیں ابھرتی کہ ہمیں سہارا دے اور ہماری ان الجھی گتھیوں کو سلجھا سکے۔ کہیں ان گتھیوں کو سلجھانے کے لئے مہدی کا انتظار کیا جاتا ہے اور کہیں کسی مسیح کا۔ کہیں کسی امام حاضر و معصوم کا لیکن نہ معلوم ان انسانوں میں وہ انسان کیا کچھ مختلف ہوگا جو ان گتھیوں کو سلجھائے گا جو ان سب لوگوں کے مشترکہ فرائض کو تنہا ادا کرے گا۔ جو اپنا کام صرف معجزوں سے ہی شروع کرے گا۔ نہ معلوم کون ہوگا وہ ——— ابھی تو تنگ ہیں جو ہمیں اٹھنے نہیں دیتے پہاڑوں کی دیواریں ہیں جو ہمیں روک کر کھڑی ہیں۔ سمندروں کے آغوش [illegible] ہیں جو ہمیں ہیبت ناک ہو کر ڈراتے ہیں۔ ملکوں کی سرحدیں ہیں جو ہمارے مخالف ہو کر کھڑی ہیں۔ صدیاں ہیں جو ہمارے بیچ حائل ہیں"

(باقی بر صفحہ ۱۱)

افکار جوانوں کے ......

فروغ احمد بی اے (علیگ)

ایک ڈرامائی خاکہ جسے تقریب "یوم اقبال" مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء بمقام
رحمۃ اللہ ماڈل ہائی اسکول ڈھاکہ اسٹیج کیا گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

نوائے غیب: ——

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں
پوشیدہ نہیں مردِ قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو ترے احوال کہ میں بھی
مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے

افکار جوانوں کے ....

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے!

افکار جوانوں کے ....

پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے

افکار جوانوں کے ....

جس معنیٔ پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

افکار جوانوں کے ....

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

افکار جوانوں کے ....

ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں قالین پر چند [illegible] بیٹھے ہوئے ہیں۔ [illegible] اقبال اور فلسفۂ [illegible] کے [illegible]

فلٹ ہیٹ ایک طرف ڈال دیتا ہے۔ اور ایک صوفے پر دراز ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد گنگنانے لگتا ہے۔ اور جھوم کر اقبال رہ کی یہ نظم الاپتا ہے ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

(دستک)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

(زور سے دستک)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
تیرے صوفے ...... (جھپٹ کر دروازہ [illegible])

(دستک) ...... کون ؟

(ڈاکٹر کو آواز دیتا ہے) —— [illegible] ——

[illegible]

[illegible]

ع :- ادہ ہو! وعلیکم السلام مولانا عزمی! (دونوں مصافحہ کرتے ہیں)

ن :- اتنی دیر سے کواڑ پیٹ رہا ہوں۔ لیکن حضرت کو خبر نہیں ہوئی!

ن :- بس بیٹھو گے بھی یا اپنی تقریر ہی کہتے جاؤ گے!

ی :- (بیٹھتے ہوئے) میں کہتا ہوں تمہارا اقبالؒ کے عشق کا دعویٰ ہی لغو ہے۔ حال یہ ہے کہ افرنگی صوفوں اور ایرانی قالینوں میں دھنسے جا رہے ہیں اور جھوم جھوم کر گاتے ہو (منہ چڑاتے ہوئے) "ترے صوفے ہیں ...." یا داجان کے قصرِ عالیشان میں ٹھاٹ ہوتے ہیں اور لہک لہک کر الاپتے ہیں "نہیں تیرا نشیمن ...."

ی :- ہاں چپ بھی رہو! کہاں کی لے بیٹھے۔ خواہ مخواہ موڈ خراب کر ڈالا۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ قدیم اردو شاعری کے مجنوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر جنگل بیاباں کی خاک چھانتا پھروں یا غاروں میں بیٹھ کر تپسیا کیا کروں؟

(آہٹ —— اور مرزا کی گرجدار آواز "رہے نام اللہ کا!")

ی :- الا اللہ! ایک نہ شد دو شد!

(مرزا نمودار ہوتا ہے)

ن :- بیا برادر آ ذرے بھائی!

:- ارے یار مرزا! —— دیکھنا یہ ملا چاہتا ہے ہم اس محل کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لیں اور یہ اس میں بسنا چلے۔

:- خانۂ خالی را دیو می گیرد —— لیکن معاملہ کیا ہے؟ تم میں تو نہیں لڑ لی ہی رہتی ہیں (پس منظر کے گیت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے)

[illegible]

مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ کر
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے!!!
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!!
بے تاب نہ ہو..................

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!
بے تاب نہ ہو ....

کھول آنکھ........ (آواز آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتی ہے)

عزمی :- بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ! (سلسلۂ کلام کو دوبارہ جاری کرتے ہوئے) مرزا! یہ رند تمہیں سمجھتا ہے آج کل مکان کی قلت کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر اس نے اقبال کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے شاہین بننے کے لئے۔ کالے پہاڑوں میں بسیرا کر لیا تو چالاک "ق" محل میں ٹھاٹ کرے گا!

عزمی :- (ہنستے ہوئے) اس وقت میں تمہارے ساتھ ہوں عوامی تقاضے بھی یہی ہیں! انقلابی قوتوں کے آگے سر جھکانا ہی پڑے گا۔ رند تمہیں برا دوست ہے۔ لیکن [illegible]

رزمی:- بس بند کرو بھی اپنے یہ نعرے! عوامی تقاضے! انقلابی نوبیں! بورژوا! ان الفاظ سے ہم دھونس نہیں کھاتے جناب یہاں اقبالؒ کی شاعری ہے اقبالؒ کی [illegible] ماخذ یا حجاز کی ڈھینچوں ڈھینچوں نہیں ہے۔

مرزا:- اچھا تو کیا اقبالؒ کسی کی جاگیر ہیں! (کافی سنجیدہ بن کر) میں کہتا ہوں اقبالؒ کو تم لوگ غلط طور پر پیش کر رہے ہو! اس کی بعض اصطلاحات اور انداز بیان سے تمہیں یہ دھوکہ ہے کہ اقبالؒ ایک مذہبی شاعر ہے۔ حالانکہ احترام آدمیت اس کا عقیدہ ہے ؎

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

عزمی:- جی! اقبالؒ کے یہاں "احترام آدمیت" کا پیغام "ماسکو" کا پیغام نہیں "مکہ" کا پیغام ہے۔ یہ شعر سنا ہے آپ نے؟ ؎

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

مرزا:- (جیسے کچھ سنا ہی نہیں) "من اوّل آدم بے رنگ و بوم (دوسرے مصرعہ کو ذرا نرم ہو کر) از آں پس ہندی و تورانیم من"۔

رزمی:- بس جانے دو فارسی دانی کی دھونس! پڑھو فارسی پر تیل یہ ہے قدرت کا کھیل!"

عزمی:- سچ کہتے ہو! فارسی کی مہارت زیادہ سے زیادہ سفیر پاکستان متعینہ ایران کو [illegible] سکتی ہے۔ اور وہاں [illegible] تیل کی سیاست کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے۔

(وقفہ.......)

رزمی:- تو کیا احترام انسانیت کے موضوع پر اقبالؒ کے یہاں اور شعر نہیں ہیں [illegible] یہ شعر بھی تو اقبالؒ ہی کا ہے ؎

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوع انساں کو
اخوت کی زباں ہو جا! محبت کا بیاں ہو جا

عزمی:- بس بند بھی کرو! معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ ماہرین اقبالیات ہو! مگر ایک کا یہ حال کہ انتہا درجہ کا اقبالؒ پرست ہے دوسرا کلام اقبالؒ کی "کارگہ فکر" کا معائنہ کرتا ہے۔

رزمی:- تم بار بار میری بے عملی کا طعنہ دیتے ہو۔ حالانکہ اقبالؒ نے کہا تھا ؎

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

مرزا:- خیر تم دونوں لڑتے ہی رہو گے! لیکن عزمی میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تمہیں ہمیشہ میری آنکھوں پر سرخ عینک چڑھی ہوئی کیوں نظر آتی ہے؟ (ذرا گرم ہو کر) زندگی کے ٹھوس حقائق سے تم لوگ نگاہیں چراتے ہو اور جب بے موقعہ دھر لئے جاتے ہو تو سرخ عینک وغیرہ کے طعنوں سے مرعوب کرنا شروع کر دیتے ہو!

رزمی:- تو گویا ہو گئے مرعوب ایسی ملا سے!

مرزا:- ہاں نہیں! مرعوب کی بھی ایک ہی رہی۔ آخر میں نے غلط کیا کہا؟ کیا تم بھی عزمی کی طرح اقبالؒ کو قدامت پسند کہتے ہو؟ اقبالؒ ترقی پسندوں کا امام تھا صرف مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ عوام سے بھی ہمدردی رکھتا ہے۔ وہ [illegible] انسانیت کے حال زار کو دیکھ کر وہ چیخ اٹھتا ہے ؎

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو!!!

عزمی:- جی! پیغمبر ان خدا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات!

مرزا :۔ جہاں بات ہو رہی ہے عوام دوستی کی۔ لے بیٹھے بیچ میں خدا کا ذکر!

عزمی : اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا بس پوجے جانے کے لئے ہے۔ زندگی کے امور میں اس کو کوئی دخل نہیں۔ یہی تم لوگوں کا تصورِ مذہب ہے۔ اس لحاظ سے تو واقعی اقبالؒ مذہبی شاعر ہے بھی نہیں۔ وہ اسلامی شاعر ہے اور اسکے نزدیک اسلام نظامِ حیات ہے۔ جس کی اساس عملی توحید پر استوار ہے اقبالؒ کا ابلیس اپنے مشیر سے کہتا ہے:

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

رزمی :۔ (اکتا کر) بس بھئی بس! (مڑ کر دیکھتا ہے) وہ دیکھو ایک اور ختر بے مہار چلا آرہا ہے اور میاں نجمی بھی ہیں اس کے ساتھ!

عزمی :۔ کون ہے؟

رزمی :۔ ارے وہی۔ فہمی دہمی۔ کل تک پاکستان کا نام نہیں سنتا چاہتا تھا۔ اور آج جناح کیپ پہنے پھرتا ہے۔ لوگ بھی کیسے کیسے ابن الوقت ہوتے ہیں۔

(فہمی مع نجمی کے داخل ہوتا ہے)

مرزا :۔ فہمی! یہ لوگ تمہیں کیا کہتے ہیں؟

فہمی :۔ (اخباروں کا پلندہ پٹختے ہوئے) جی ہاں! میں تنگ ہوں میں پہلے بھی غدارِ قوم تھا اور نہ جانے کیا کیا تھا اور اب بھی ابن الوقت ہوں۔ کسی حال میں چین ہی نہیں۔

مرزا : مگر بات بھی کچھ ایسی ہی ہے فہمی! آخر ۱۵ اگست کے بعد ہی تم میں یہ انقلاب کیسے آگیا؟

فہمی :۔ انقلاب کیسے آجاتا ہے؟ انقلاب انقلاب کہتے کہتے تمہاری تو زبان خشک ہوتی ہے اور ایک معمولی سے انسان کے انقلاب پر حیرت کرتے ہو اور اسے ابن الوقتی قرار دیتے ہو!

رزمی :۔ لیکن یار! یہ پاکستان ہے!! یہاں رنگ جمنے کا نہیں۔

فہمی :۔ جی ہاں! یہ پاکستان ہے اور پاکستان اسلام کے نام پر حاصل ہوا ہے۔ یہاں اسلام کو چھا جانے کا موقع نہ ملا تو اقبالؒ کا خواب اب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں۔ الہ آباد والا خطبۂ صدارت پڑھو۔ اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام پڑھو۔ اور تصورِ مملکت پر اقبالؒ کے افکار کا مطالعہ کرو۔ پھر تم پر یہ روشن ہو جائے گا کہ اقبالؒ کا خواب کیا تھا اور اس کی تعبیر کہاں تک ہوئی ہے۔

نجمی :۔ کیا بار تم نے قسم کھائی ہے اور طے کر لیا ہے کہ ہر جگہ فلسفہ طرازی ہی کئے پھرو گے؟ میں کہتا ہوں حقائق سے تمہیں کیوں کد ہے؟ ملک تقسیم ہو گیا۔ اور کیا ہے کیا ہو گیا! پاکستان قائم ہے۔ اور پھر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ —— اقبالؒ کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے —— آخر مطلب کیا ہے تمہارا!

فہمی :۔ جذبات سے کام نہ لو! بے شک جذبات عملی افادیت کے اعتبار سے ضروری ہیں لیکن معاملہ فہمی کے لئے ٹھنڈے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ میں پوچھتا ہوں پاکستان کس لئے بنا ہے؟ اور وہ مقصد کہاں حاصل ہو رہا ہے؟

رزمی :۔ پاکستان کس لئے بنا ہے۔ یعنی اسلام.........

مرزا :۔ (مداخلت کرتے ہوئے) بس! لے دے کے اسلام رہ گیا ہے۔ ہر جگہ اسلام اسلام۔

عزمی : تم اسلام سے کیوں خوفزدہ ہوتے رہو؟ یہ تمہارے نزدیک تنگ نظری ہے اور تمہارا ترقی پسند قلم اسلام کا نام لیتے ہوئے ذرا بھی نہیں شرماتا!

فہمی :- یہی میں بھی کہہ رہا تھا کہ اقبالؒ کے نزدیک اسلام اگر ایک زندہ قوت کی حیثیت سے دوبارہ دنیا میں قائم نہیں ہوتا تو ساری تگ ودو بیکار ہے اور اگر اسے اپنی تشکیل کے لئے کسی خطے میں قدم جمانے کا موقع مل جائے تو پھر رفتہ رفتہ سارے عالم پر چھا جائے گا۔

نجمی :- لیکن تم نے یہ کیوں کہا کہ اقبالؒ کا خواب ہنوز بیگانۂ تعبیر ہے! کیا "قراردادِ مقاصد" کی زبان میں اس نوزائیدہ مملکت نے اپنے اسلامی ہونے کا اعلان نہیں کر دیا ہے؟

فہمی :- بے شک اور یہی سبب ہے کہ ہم اس "مقدس امانت" کی حفاظت کے لئے ہر قسم کی قربانیاں کرنے پر کمربستہ ہیں۔ لیکن اس زبانی اقرار سے کیا فائدہ اگر عمل اس سے متضاد ہو؟ اور جب تک قول وفعل ہم آہنگ نہ ہوں گے اقبالؒ کا خواب خواب ہی رہے گا!

ق :- تم فلسفہ ہی بگھارتے رہو گے! اور یہاں پاکستان کو جو خطرات لاحق ہیں۔ ان کی خبر ہی نہیں۔ یہ خطرات دور ہو لیں تو سب کچھ ہو گا سہی، سب کچھ! سب سے پہلے پاکستان کو مستحکم اور خوش حال بنانا چاہیئے!

مرزا :- ٹھیک کہتے ہو! اور یہی بات جب میں کہتا ہوں تو..

فہمی :- (مداخلت) یہی بات خواہ تم کہو یا کوئی اور گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنے کی مصداق ہے۔ گویا اسلام محض زمانۂ امن کی اسکیم ہے۔ جب تک اسٹیٹ آف ایمرجنسی قائم رہے اسلام کا نام نہیں لینا چاہیئے میں کہتا ہوں اگر یہ ہمارے وقت کا ساتھی نہیں تو پھر زمانۂ امن میں اسے چومنے اور چاٹنے سے کیا فائدہ! جب یہ ہمارے موجودہ امراض کی دوا نہیں تو زمانۂ امن میں کیوں اس کے کڑوے کسیلے گھونٹ پئیں! میں کہتا ہوں اگر اسلام آج کے لئے بیکار ہے تو کل کے لئے بیکار تر ہے۔

مرزا :- ہاں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

فہمی :- آپ ہیں پے۔ غین۔ دال!.....

رزمی :- (مداخلت) سولہ آنے!

فہمی :- (جاری رکھتے ہوئے) میرا اور آپ کے ترقی پسند اقبالؒ کا یہ ایمان ہے کہ ؎

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

البتہ یہ میاں نجمی جیسے محبِّ پاکستان کا خیال ہے کہ پہلے خطرات کو دوسری تدبیروں سے دور کیا جائے۔ تب اسلام کا نام لیا جائے۔ یہ تم جیسے سرخ عینک پوشوں کا اندھا عقیدہ ہے (مرزا منہ پھیر لیتا ہے) کہ "ماسکو" کے الہامات پر پاکستانی ایمان لائے اور ایک موہوم جنت تیار کرے۔ ہم میاں نجمی کے خطرات سے لرزہ براندام ہیں، نہ تمہاری "جنتِ دجال" کے حریص!

نجمی :- خطرات سے لرزہ براندام کون ہے؟ کیا جہادِ کشمیر پاکستانی مجاہدوں کے خوف وہراس کا مظاہرہ ہے؟

فہمی :- شاباش! دیکھو لگا مرید مرزا، جادو یوں سر چڑھ کے بولتا ہے۔ آخر آ گیا نا اسلام! پاکستان میں خطرات سے لڑنے کی جو تدبیر بھی اختیار کی جائے گی اس پر اسلام کی مہرِ تصدیق ضرور ثبت ہو گی۔ البتہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ نام کا لیبل ہمیشہ خالص جنس پر چسپاں کرنا چاہیئے۔ پاکستان میں عوامی تقاضے بھی یہی ہیں کہ اسلام پیش کیا جائے۔ اور اگر ہم نقلی جنس پر اسلام کا لیبل چڑھا چڑھا پیش کرتے رہے تو گویا عوامی تقاضے کو فریب دیں گے۔

نجمی :- تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ جہادِ کشمیر ایک فریب ہے؟

فہمی :- لاحول ولا قوۃ! تم بھی عجیب ہو! جہادِ کشمیر ایک اسلامی مملکت کا اعلانِ جنگ ہے اور پاکستان

شہری پر فرض ہے کہ اس میں شریک ہو۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو خطرات کے ایام میں بھی اسلام ہی کام آتا ہے اور یہ تمہاری سادگی ہے جو کہتے ہو کہ خطرات دور ہولیں تو اسلام کا نام لیا جائے۔

عزمی:۔ خوب! خوب! (فہمی سے مصافحہ کرتے ہوئے) جزاک اللہ! نفس حقیقت الامر کو ذہن نشین کرانے میں کافی مہارت رکھتے ہو۔ مجھے تمہارے طرزِ استدلال پر رشک ہے۔

نجمی:۔ ابھی ابھی فہمی نے پاکستان کو اسلامی مملکت کہا ہے۔ پھر یہ اسلام اسلام کی چیخ پکار کیوں؟ — سمجھ میں نہیں آیا۔

عزمی:۔ اُفوہ! تم بھی عجیب ہو نجمی! اچھا ذرا یہ تو بتلانا یہ تمہارے کامریڈ مرزا اپنے آپ کو کیا کہتے ہیں؟ ذرا پوچھو ان کا نام کیا ہے۔ مذہب کو خواہ صلواتیں ہی سناتے رہتے ہیں لیکن پاکستان کے عوامی تقاضے سے مجبور ہو کر اپنے آپ کو مسلمان ہی کہہ کر پیش کریں گے۔ راستے میں جب کسی سے ملیں گے تو سلام علیکم ہی عرض کریں گے۔ کم و بیش ہمارا تمہارا سب کا یہی حال ہے۔ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ زبان سے ادا کرتے ہیں تو پھر کس کی مجال ہے جو ہمیں کافر کہے گو ہمارا عمل ہمارے قول سے ہم آہنگ نہیں (رزمی کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا ہے)

رزمی:۔ یہ جملہ راست مجھ پر چوٹ ہے!

نجمی:۔ خیر تو آپ مانتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ الحمدللہ! اور قومی ترقی کی ذمہ داری ہر شہری پر عائد ہوتی ہے۔

عزمی:۔ "قومی ترقی"؟ یہ ایک مبہم فقرہ ہے مجھے ڈر ہے کہ جس قومیت کے خلاف اقبالؒ آخر دم تک جہاد کرتے رہے اس پر اسلام کا لیبل چپکا کر مسلم قومیت کی عمارت کھڑی کی جا رہی ہے ....

مرزا:۔ (مداخلت، قطع کلام ہوتا ہے۔ حضرت! ذرا یہ تو بتلائیے اقبالؒ "وطنیت اور قومیت کے مخالف تھے لیکن پھر مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن ان کی علیحدہ قومیت کی بنا پر کیوں طلب کیا؟

فہمی:۔ اشتراکیت ایک اصولی تحریک ہے۔ اور آفاقیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ "دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ" کا نعرہ بلند کرتی ہے۔ لیکن کسی نہ کسی شکل میں پہلے پہل وہ روس ہی میں نشو ونما پاتی ہے اور اس کے بعد دائیں بائیں پاؤں پھیلاتی ہے۔ اس اعتبار سے وطنی قومیت سے بہت کچھ مشابہ ہے۔

مرزا:۔ اشتراکیت کی تمثیل پیش کر تو سکتے ہو! لیکن اس طرح یہ وطنی قومیت پاکستانی اسلام میں بھی آسکتی ہے۔

عزمی:۔ (ہنستے ہوئے) یہ تو آپ میاں نجمی سے کہئے! فہمی کو بھی ان لوگوں سے یہی اندیشہ ہے کہ یہ لوگ پاکستان میں اگر اسلام کو قائم کر بھی لیں گے تو وہ وطنی قومیت کی خصوصیات کا حامل ہوگا۔ حالانکہ اقبالؒ نے کہا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

رزمی:۔ یہ ہندی وہ خراسانی یہ ایرانی وہ افغانی!
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بیکراں ہو جا

مرزا:۔ ہاں! پاکستان میں اتحاد یقین محکم تنظیم کے موجود ہونے سے تو یہی اندیشہ ہے جس کی طرف فہمی احمد نے اشارہ کیا ہے۔ جیسے انقلاب فرانس کے بعد اخوت مساوات کی مٹی پلید ہوئی تھی۔ وہی حال قائد "اتحاد یقین محکم تنظیم" کا پاکستان میں ہو سکتا

فہمی:۔ خدا نہ کرے! میں کہتا ہوں اگر عمل تو جیسے پاکستان کی جدوجہد کی روح رواں بن جائے ....

عزمی:۔ ..... تو وہ دور نہیں جب سے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

عجمی :- آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

فہمی :- شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ توحید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

رزمی :- (جوش میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ـــ
اٹھ کہ پھر اک انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

عزمی :- جی! ایرانی قالین پر رقص کرتے ہوئے ٹھک ٹھک کر گانے
سے وہ "انقلاب تازہ تر" نہیں آجائے گا ـــ
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

عجمی :- یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مرزا :- اماں گیا ـــ گیا دور سرمایہ داری گیا، تماشہ دکھا کر مداری گیا!

عزمی :- زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مرزا :- سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو!

عزمی :- جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(مرزا ایک کتاب اٹھالیتا ہے ـــ "پس چہ باید کرد" ـــ اور
ورق گردانی کرنے لگتا ہے)

رزمی :- عزمی! بھئی تم جیسے پیارے دوست اور فہمی جیسے مرتبہ
[illegible] حاصل ہے۔ میں تم لوگوں کے خلوص کا شیدائی ہوں
[illegible] ہوں۔ میں خصوصاً آج کے دن کا قائل
[illegible] "اقبال" پہ مٹی کرتا ہوں

عمل سے بیگانہ اور فاقوں سے بیتاب ہیں مگر رازی سے
حالانکہ یہ "شیرستان" کا زمانہ ہے

فہمی :- (اٹھ کر رزمی کو سینے سے لگاتے ہوئے) ـــ
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!!!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں
دوست! ہم سب کے سب نامکمل ہیں۔ تمہارے احساسات
غنیمت ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہم لوگوں کو مکمل اور باعمل
مسلمان بنائے

عزمی :- (مرزا سے) کیوں بھئی تم کیوں خاموش ہو؟

مرزا :- ("پس چہ باید کرد" کی ورق گردانی کرتے ہوئے) میں محسوس
کرتا ہوں کہ تم لوگوں سے بہت دور ہوں.........

رزمی :- چل ہٹ! رہنے بھی دے (ذرا رک کر) اُفوہ! بہت سیریس
(SERIOUS) نظر آرہے ہو!

مرزا :- سیریس نہیں رزمی! میں سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگ کس قدر
جذباتی ہیں!۔ آج تم لوگوں کی گفتگو اور خصوصاً عزمی اور
اور فہمی کی باتوں نے مجھے کافی متاثر کیا ہے ـــ
آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
سب کے سب متاثر ہیں۔ مرزا سبھوں کی نگاہ کا مرکز
بنا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر بڑے احترام
سے فہمی اور عزمی کو دیکھتا ہے اور مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوتا
ہے۔ دونوں سے معانقہ کرنے کے بعد باری باری عجمی
اور رزمی سے مصافحہ کرتا ہے۔

رزمی :- تم دل کے برے کبھی نہ تھے مرزا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہاں ہم
لوگ سب کے سب جذبۂ عمل سے پاک اور خلوص سے
سرشار ہیں۔ تھوڑی بہت غلط فہمیوں کے جو بادل چھائے
چھٹ چکے ہیں۔ [illegible]
[illegible]

کر رہے ہیں۔

بخشی:۔ اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا
(سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے) پھر ملیں گے اگر خدا لایا!

(سب رخصت ہو جاتے ہیں ....)

رزمی اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے متصلہ فوٹو کو تہ کرکے میز ہی پر رکھ دیتا ہے۔ چند لمحوں کے لئے ایک گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ پھر سر اٹھا کر ملازمین کو پکارتا ہے۔

رزمی:۔ امین! عزیز!

عزیز۔ امین:۔ جی صاحب! آیا جناب

رزمی:۔ دیکھو یہ صوفے یہاں سے ہٹا دو! قالین تہ کر دو! اور یہ تصویریں کہیں رکھ دو!

(رزمی چلا جاتا ہے)

امین:۔ کیوں میاں! صاب کیا بولا؟

عزیز:۔ صاب بولا! ای سوب صوپھ کالین نکال پھینکو۔

امین:۔ نکال پھینکو؟ صاب کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟

عزیز:۔ کیا جانے میاں! صاب پگلا ہو گیا کی سمتا ہو گیا۔ ہم تو کچھ نئی جانتا! جو صاحب کا ہوکوم ہو گا ہم کرے گا۔

امین:۔ ارے تم کچھ نہیں جانتے ہو۔ ہم سب کچھ جانتے ہیں وہ صاب کے دوست آتے ہیں نا! وہی جو صاب سے بہوت محبت کرتے ہیں۔ اور ہم لوگوں سے بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں۔ وہی آج آئے تھے۔ صاب غزل گا رہے تھے کہنے لگے شعر تو پڑھتے ہو۔ مطلب بھی سمجھتے ہو؟

عزیز:۔ ڈکیا پتا؟ ——— اکبال ڈے کا گانا تو ہم بھی ریڈیو پر سنتے تھے۔ صاب بھی جوش میں آ کے گر گاتا ہوگا۔

امین: اقبال ڈے؟

عزیز:۔ ہاں ہاں! اکبال ڈے! آج کا لج بند تھا۔ صاب آج کالج نئی گیا۔

امین:۔ ارے میں سمجھا! اقبالؒ لاہور میں رہتے تھے (سوچتا ہے) ہاں ہاں لاہور میں۔ بہوت بڑے شاعر تھے میرا بھائی بولتا ہے کہ ان کی غزل میں مسلمان کو پکا مسلمان ہونے کو کہتا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمان اب بھی نہ بنا تو پاکستان بنا کہ نہ بنا — سب برابر ہے۔

عزیز:۔ چار ٹکا کا چاکری کورتا ہے۔ پاکستان! مسلمان! بڑو کا بات کورتا ہے کام کورو کام! نئی تو صاحب گم ہو گا۔

امین:۔ کیا کہا؟ پاکستان! مسلمان! بڑوں کی بات؟ ارے سمجھو تو سہی! ہم غریب ہیں لیکن اللہ سے تو ڈرتے ہیں اور ہمارے صاب لوگ؟ ہونہہ! کیا کہیں!

عزیز:۔ بوس! بوس! کام کورو کام! صاب سون لے گا تو چاکری کھا جائے گا۔

امین:۔ چاکری کھا جائے گا؟ ہونہہ!

(دونوں صوفے قالین وغیرہ ہٹاتے ہیں۔ پس منظر سے آواز آتی ہے)

جا کے ہوتے ہیں مساجد میں صف آرا تو غریب
زحمتِ روزہ جو کرتے ہیں گوارا تو غریب
نام لیتا ہے اگر کوئی ہمارا تو غریب!
پردہ رکھتا ہے اگر کوئی تمہارا تو غریب
امرا نشۂ دولت میں ہیں غافل ہم سے
زندہ ہے ملتِ بیضا غربا کے دم سے

آواز رفتہ رفتہ مدہم ہو جاتی ہے ——— رزمی دوبارہ کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اور بڑی درد بھری آواز میں گاتا ہے ؎

تیرے صوفے ہیں افرنگی تیرے قالیں ہیں ایرانی

(آہٹ ——— فہمی واپس آجاتا ہے)

ہوئے) آؤ تم کچھ عجیب سے دکھائی دے رہے ہو!

زندگی :- (اس کی صفائی کا دن ہے یعنی قلبی صفائی! اور اسکے بعد کبھی میل و آلائش کی گندگی پیدا نہ ہوگی (گردن کی مٹی جھاڑتے ہوئے) کہو واپس کیوں آگئے؟

:- (خاموش ہے ---- چند لمحوں کے بعد) ذرا اخبار دل کا بقیہ تو اٹھا دینا (میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے)

:- جب گریزاں ہوئی اخوت و توحید

یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

:- (جوش میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے) ؎

زندگی :- جو اشعار تم ابھی گا رہے تھے وہ میں سن رہا تھا۔ اب

(ماخوذ از شاہین ...)

تمہارے سامنے ... ایک ... صداقت! (زندگی) سر جھکا لیتا ہے ... اللہ بڑا ... دونوں معانقہ کرتے ہیں ... رخصت ہوتا ہے ... آواز فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اور مطلع صاف ہو جاتا ہے روشنی بڑھ جاتی ہے ......)

چراغ راہ کا

اسلامی معاشیات نمبر

اپنے ساتھ کیا لائے گا؟

- مقالات
- نظمیں اور افسانے
- نقشے اور اعداد و شمار
- جائز آرٹ کے قیمتی نمونے

ہمارے عزائم اونچے ہیں

اور

ہم ان کو پست کرنے پر تیار نہیں ہیں

اس لئے ممکن ہے کہ نمبر ... ہم ... خاص ... کر سکیں

لیکن

... اشاعت ... ہوگا

اسلامی حکومت کی ماہیت

(وہ کیا نہیں ہے؟ وہ کیا ہے؟)

نعیم صدیقی

مبحث پنجم —— [منقسم (dualistic) نہیں / وحدانی (Unitarian) ہے!]

ریاستوں کی بعض اقسام ایسی ہوتی ہیں جو انسانی زندگی کو توحید کے زاویۂ نگاہ کے بجائے شرک کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اُن کی نگاہ میں زندگی ایک ناقابلِ تقسیم اکائی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اس کے ٹکڑے کرنے کی قائل ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ریاستوں کی دو نوعیتیں ہیں:

ایک وہ جو زندگی کو اس معنی میں تقسیم کرتی ہیں کہ انفرادیت اور اجتماعیت دونوں بالکل الگ الگ شعبوں کی صورت میں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ افراد کی نجی، مذہبی، کاروباری اور اخلاقی سرگرمیوں کا ایک خاص دائرہ کھینچ کر وہ اس میں فرد کو کامل الاختیار قرار دیتی ہیں اور اجتماعیت کے ایک متعین میدانِ حیات کو وہ اپنے کنٹرول میں لیتی ہیں۔ وہ اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرتیں کہ افراد کس طرح کماتے ہیں، کس طرح کھاتے ہیں، کس طرح صرف کرتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں اور ناچتے ہیں یا فضولیات سے پرہیز کرتے ہیں، زنا کرتے ہیں یا نکاح کرتے ہیں، گرجا جاتے ہیں یا کلب میں کھیل مناتے ہیں، ایک خدا کو پوجتے ہیں یا تین سو ساٹھ ارباب والہہ کے پجاری ہیں، جھوٹ بولتے ہیں یا راستباز ہیں۔ تربیتِ اولاد کی ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں یا برتھ کنٹرول کی پناہ لیتے ہیں —— ان معاملات سے ریاست بڑی حد تک بے تعلق رہتی ہے۔ گویا زندگی کا ایک حصہ ایسا تھا جس کا اقتدار انفرادیت کے قبضے میں ہے۔ جن ریاستوں میں اقتدار اس طرح تقسیم شدہ ہو، وہ وحدانی نہیں، بلکہ منقسم کہلاتی ہیں اور ان کی فطرت شرک کے خمیر سے بنی ہے۔

موجودہ جمہوری ریاستیں اگرچہ ہمہ گیریت کے خصائل رکھتی ہیں، لیکن ان میں انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان نمایاں تقسیم پائی جاتی ہے۔ فطری طور پر اجتماعیت اگرچہ انفرادیت کو ختم کرنے کے لئے برابر جارحانہ اقدام کرتی رہتی ہے، لیکن انفرادیت بھی مدافعت میں کمی کچھ بھی نہیں کرتی، بلکہ دونوں طاقتوں کے درمیان ایک غیر منقطع تسلسل کے ساتھ تصادم جاری رہتا ہے۔ یہ تصادم خود تقسیمیت کے وجود کی شہادت دیتا ہے۔

منقسم ریاستوں کی دوسری نمایاں قسم وہ تھی جس میں زندگی کو مذہب اور سیاست کے دو دائروں میں باقاعدہ طور پر بانٹ کر پھر [illegible] ایک کے ساتھ دو متوازی اقتدار قائم کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ گویا "سلطان" اور "پوپ" کے درمیان یا یوں کہئے کہ حکومت [illegible] حیثیت سے [illegible] محض [illegible]۔ دربار صرف سیاسی امور میں عوام کی زندگی میں [illegible] کرنے کا حق نہ ہوتا تھا۔ دوسری طرف کلیسا مذہبی امور میں حکم چلاتا اور سیاسی معاملات [illegible] [illegible]

بہرحال ہر وہ ریاست جو زندگی سے ایک اکائی کی حیثیت سے معاملہ نہ کرے، جو انسانی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بعض پہلوؤں سے الگ کرکے تقسیمِ اقتدار کو کسی بھی شکل میں گوارا کر لے، وہ دوگُلی (dualism) سے آلودہ ریاست ہوتی ہے اور اس کی نوعیت کو "منقسم" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان دونوں صورتوں کے بخلاف اسلامی ریاست و حکومت کا نظام دوگُلی کی آلودگی سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ وہ مذہب و سیاست کے لئے ایک ہی اقتدار کو تسلیم کرتی ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں بناتی۔ اس کا حکمران اگر سیاست کا امیر ہوتا ہے تو دین کا بھی امام ہوتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف صلح و جنگ کے معاملات طے کرنے کے لئے آخری اتھارٹی ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ اقامتِ عبادات اور نفاذِ حدودِ شرعیہ کے لئے بھی انتہائی ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت میں فرد کو زیادہ سے زیادہ وسعت کے ساتھ شہری حقوق اور آزادی کی نعمت تو دی جاتی ہے لیکن انفرادیت اور اجتماعیت کو الگ الگ دائروں کی صورت نہیں دی جاتی کہ فرد اجتماعیت کے دائرے میں جن حدود کا پابند تھا، وہ حدود انفرادیت کے دائرے میں اس سے ساقط ہو جائیں اور نجی "کاروباری" مذہبی اور اخلاقی سرگرمیوں میں اسے خود مختار قرار دیا جائے کہ وہ جس کیش اور مسلک کو چاہے اختیار کرے۔ فرد کی زندگی میں اگر اسلام ہر پہلو سے مداخلت کرتا ہے تو ان تمام پہلوؤں میں اسلامی حکومت بھی مداخلت کرنے کی حقدار ہے، کیونکہ اس کا مقصدِ وجود اسلام کو نافذ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

اسلامی حکومت کی یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے ہم اس کو منقسم حکومتوں کے مقابلے میں وحدانی حکومت کا نام دیتے ہیں

دورِ حاضر میں روس کی اشتراکی حکومت بھی "وحدانی" نوعیت کی ہے لیکن وہ وحدانی کے ساتھ ساتھ جبارانہ بھی ہے، وہ اس کی ہمہ گیرانہ (totalitarian) فطرت ایک ایسی ضابطہ بندی (codification) کی مقتضی ہے جس کے تحت فرد کے بنیادی حقوق کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ریاست کا اشتراکی نظام دراصل انفرادیت اور اجتماعیت کی ہم آہنگی سے وجود میں نہیں آیا، بلکہ اجتماعیت نے انفرادیت سے جنگ لڑ کر اس کو شکست دی ہے اور پھر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا "جنگی قیدی" بنا لیا ہے۔ یہ ریاست خود نتیجہ ہے اجتماعیت و انفرادیت کی تفریق ہی کا! یہ وہ فرق ہے جو اشتراکیت کی وحدانی ریاست اور اسلام کی وحدانی ریاست میں پایا جاتا ہے۔

خلاصہ :-

(۱) منقسم حکومتیں وہ ہوتی ہیں جو زندگی کو مذہب و سیاست یا انفرادیت و اجتماعیت کے دو دائروں میں بانٹیں اور پھر ان کے لئے تقسیمِ اقتدار پر راضی ہو جائیں۔

(۲) وحدانی حکومتیں وہ ہوتی ہیں جو زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت دے کر وحدانی اقتدار کے تحت اسے منظم کریں۔

(۳) اسلامی حکومت فطرتاً انقسام پذیری سے پاک ہے۔ وہ مذہب و سیاست اور انفرادیت و اجتماعیت کے درمیان کوئی لکیر کھینچے بغیر وحدانی اقتدار کے بل پر چلتی ہے۔

بحث ششم —— [مطلق العنان (Unlimited) نہیں !
[پابندِ حدود (Limited) ہے !

کوئی بھی خود مختار ریاست، جہاں تک کہ دوسری ریاستوں کے بالمقابل اس کا معاملہ ہے، اپنے آپ کو پوری طرح آزاد قرار دیتی ہے

اسلامی حکومت کی ماہیت

ور ہوتی ہے۔ چنانچہ ریاستیں اس بات سے سخت انکار کرتی ہیں کہ کوئی دوسری ریاست ان کے اوپر بھی اقتدار رکھنے والی ہے۔ اس معاملے میں ین حکومتوں اور اسلامی حکومت سب کا موقف یکساں ہے۔ لیکن آگے چل کے دونوں کے درمیان اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لادینی متیں اپنے آپ کو یکسر مطلق العنان قرار دیتی ہیں، لیکن اسلامی حکومت پابندِ حدود رہتی ہے۔

کسی حکومت و ریاست کے مطلق العنان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسی اٹل حدود نہ ہوں جن کے اندر وہ اپنی سرگرمیاں محدود رکھنے پر مجبور ہو۔ دستور اس کیلئے جو حدود فراہم کرتا ہے وہ اسٹیٹ کی خود عائد کردہ ہوتی ہیں اور اسٹیٹ جن ذرائع سے ان کو وجود میں تا ہے، انہیں ذرائع سے ان میں تغیر و تبدل بھی کر سکتا ہے اور ان کو برطرف بھی قرار دے سکتا ہے۔ اس کی دستور یہ اور اس کی مقننہ جو دستور و نون چاہے آج بنا دے اور جسے چاہے کل موقوف کر دے۔ ایسی کوئی چیز نہیں ہوتی جس کے بارے میں ریاست اصولی طور پر اپنے آپ کو بس تسلیم کرے کہ اب یہ حد ایسی آگئی ہے کہ اسے توڑنے کا مجاز کوئی نہیں ـــــــ نہ صدرِ حکومت نہ کیبنٹ نہ دستور یہ و مقننہ، نہ ام الناس!

دوسری طرف پابند حدود حکومت کی تعریف یہ ہے کہ اس کے سامنے کچھ دستوری اور اصولی حدود ایسے ہوں جن کے بارے میں وہ یہ سمجھتی ہو کہ ان حدود کو بدلنے یا موقوف کرنے کا اختیار نہ اسے ہے نہ اسکے عوام کو ہے۔ بلکہ وہ بھی اور عوام بھی اپنی تمام سرگرمیوں میں ان کو جوں کا ں قائم رکھنے کے پابند ہیں۔

اسلامی حکومت پہلی قسم کی نہیں، بلکہ دوسری قسم کی ہے۔

اسلام کی ریاست چونکہ خدا کی حاکمیت پر مبنی ہوتی ہے، لہذا اس کے تحت جو حکومت قائم ہوتی ہے وہ خدا کی حدود اور خدا کے قانون و نافذ کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ وہ آزادی و اختیار جو کچھ بھی رکھتی ہے ان حدود و قوانین کے اندر اندر رکھتی ہے، ان سے باہر نہیں۔ خدا و اس کے رسول نے اگر کسی معاملے میں کوئی حد قائم کر دی ہے یا کوئی قانون بنا دیا ہے تو اب اس کو بدلنا یا منسوخ کرنا نہ اسلامی حکومت صدر کے اختیار میں ہے، نہ اس کی کیبنٹ کے اختیار میں، نہ اس کی پارلیمنٹ کے بس میں، نہ اس کے عوام کے ہاتھ میں!

مثلاً اسلامی ریاست کے اندر رہنے والے غیر مسلموں کو اسلام نے جس وسعت کے ساتھ حقوق عطا کئے ہیں، اس کو اگر کسی زمانے کے مسلمان سکیڑ کرنا چاہیں تو اندرونِ اسلام ان کا یہ فعل خلافِ دستور، خلافِ آئین اور خلافِ قانون ہوگا۔

یا مثلاً افراد کو جو حقوقِ ملکیت شریعتِ اسلامیہ نے دئے ہیں، ان میں ریاست دخل اندازی کرنا چاہے تو وہ اسلام سے انحراف کئے بغیر یہ سلب کر سکے گی۔

یا مثلاً جن اخلاق کو اسلام نے مطلوب قرار دیا ہے یا جن کو اس نے نامطلوب قرار دیا ہے، ان کو باہم ادلنے بدلنے کے لئے اسلامی حکومت قانون سازی کرنا چاہے تو یہ فعل اسلامیت کا ترک ہوگا اور دستور کی خلاف ورزی میں شمار ہوگا۔

مختصر یہ کہ اسلامی حکومت، قانون اور پالیسی بنانے کے لئے جو اختیارات اللہ تعالٰی کی حاکمیت کے تحت حاصل کرتی ہے وہ حدود اللہ کے ذریعہ محدود کئے گئے ہیں، اور ان حدود اللہ میں کسی قسم کی مداخلت کرنا حکمران افراد یا عوام الناس کے اختیارات سے بالاتر رکھا گیا ہے۔

اسلامی حکومت و ریاست کا نظام اپنے اوپر کسی دوسری ریاست یا کسی غیر الٰہی اقتدار کی طرف سے تو کوئی حد و قیود قبول کرنے سے ... انکار کرتا ہے ... ریاست کو کرتا چاہئے، لیکن لادینی ریاستوں کی طرح وہ "حدود اللہ" سے اپنے آپ کو بے نیاز نہیں

شمار ہو سکتا ہے۔

خلاصہ :-

(۱) مطلق العنان حکومت وہ ہوتی ہے جو قانون اور پالیسی بنانے کے سلئے کوئی ایسے حدود در کھتی ہو جن کو بدلنا یا موقوت کرنا اُس دستور اُس کے اختیار سے باہر ہو۔

(۲) پابند حدود حکومت وہ ہوتی ہے جو قانون اور پالیسی بنانے کے لئے چند ایسے حدود رکھتی ہو جن کو بدلنا یا موقوت کرنا دستوراً اس کے اختیار میں نہ ہو۔

(۳) اسلامی حکومت چونکہ قانون اور پالیسی بنانے میں دستور اللہ کے مقرر کردہ حدود کی پابند اور اس کے بنائے ہوئے قانون کا احترام کرنے والی ہوتی ہے، لہٰذا وہ لادین ریاستوں کی طرح مطلق العنان نہیں بلکہ پابند حدود قرار پاتی ہے —— اگرچہ وہ دوسری ریاستوں کے بالمقابل کاملاً خود مختار ہوتی ہے۔

قندِ نمک

آخری دلیل

مسلم لیگ کیمپ نے ملّت کی جو خدماتِ جلیلہ انجام دی ہیں، ان کی وجہ سے رائے عام کی طرف سے اظہارِ بے اعتمادی کا ایک رجحان پیدا ہو گیا ہے، اس رجحان نے پورے کیمپ میں دو سال سے بوکھلاہٹ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ ایک عجیب سماں ہے کہ جس جماعت کو موت و حیات کی آخری کشمکش سے سابقہ درپیش ہے، اس کی اندرونی گروہ بندیوں میں پہلے سے زیادہ ہڑبونگ مچی ہوئی ہے، اور صدارتوں کے لئے کشتیاں ہو رہی ہیں۔ ان کشتیوں سے غالباً مطلوب یہ ہے کہ عوام کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرایا جا سکے۔ لوگ دیکھیں کہ ان کے پہلوان اختیار سے ٹکرا جانے کے لئے "ریہرسل" کر کے کن کن کمالاتِ فن کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جیسے عام طور پر دنگل قومی ضروریات کے لئے چندہ کرنے کا اچھا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح یہ سیاسی دنگل ان شاء اللہ ووٹوں کا چندہ مسلم لیگ کو دلوانے کے لئے مؤثر ثابت ہوں گے۔

اس کیمپ کے پاس اپنی بقاء کے لئے جو گوناگوں دلائل تھے وہ ختم ہو چکے ہیں۔ اب صرف ایک ہی دلیل باقی ہے۔ یہ ہارتے ہوئے جواری کا آخری پانسہ ہے، یا تو یہ ہارے ہوئے داؤں کو بھی واپس لے آئے گا اور یا جو کچھ اب آخری داؤں میں لگا یا گیا ہے وہ بھی ہاتھ سے جائے گا اور بساط الٹ دی جائے گی۔ یہ آخری دلیل کیا ہے؟ ——— صرف یہ کہ ہم نے پاکستان بنایا تھا!

لوگ پوچھتے کہ حضرت جب آپ پاکستان بنانے والے تھے تو ہم آپ کے قدم چومتے تھے، لیکن اب جبکہ آپ ہی اس کی جان کا روگ بن گئے ہیں تو اب ہم آپ پر دل و جان کیوں نثار کریں؟ امرود کا گودا بڑی لذیذ چیز ہوتا ہے، لیکن اگر وہ کم بخت اپنے آپ کو کیڑوں میں [illegible] کر دے تو ان کیڑوں سے کام و دہن کی تواضع کوئی احمق ہی کرے گا۔ کیڑے بھی بڑے فلسفی ہوتے ہیں، وہ امرود کے گودے سے کہتے ہیں کہ صاحب ہم کیڑے سہی، گندے سہی، بیماری کا سرچشمہ سہی، امرود کے دشمن سہی، لیکن آخر ہم ایک دن امرود کا لذیذ گودا ہی تو تھے، گودے ہی میں جان پڑ گئی، گودا ہی اب گودے کو کھا رہا ہے، لگا بھی اپنی، لگا ڈھانے والے بھی اپنے، تو پھر مقامِ اعتراض کیا؟ خریدار کہتا ہے کہ اے امرود کے گودے سے بنے ہوئے محترم کیڑو! انسان آنکھوں سے اگر ایک گھناؤنے "حال" کو دیکھ رہا ہو تو وہ اس کے [illegible] کے حسین ماضی کے دل خوش کن تصورات سے محو نہیں کر سکتا۔ حال کو چھوڑ کر محض ماضی کو دیکھنا انسانی نگاہ کے لئے ممکن ہوتا تو پھر [illegible] ہوتا ہے!

آپ حال کے بازار میں خیالِ ماضی کا سودا بیچنے کے لئے اگر شیخ چلی کی ذہنیت کے ساتھ کوئی "شوروم" قائم کرتے ہیں تو پھر آپ ایک دن اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ یا تو اس بازار کے سارے گاہک پاگل ہیں یا خود آپ کا دماغ چل گیا ہے۔

پھر معاملہ یہ ہے کہ فلسفہ ہر سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ نے [illegible] کے لئے جنگ کی [illegible] جاری کیوں ہے؟ جواب [illegible] کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم نے پاکستان بنایا تھا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ رشوت کیوں؟ ناجائز الاٹمنٹیں کیوں؟ اموالِ متروکہ کی لوٹ [illegible] یہ ختم بدعنوانیاں کیوں؟ بڑی بڑی تنخواہیں کیوں؟ عیاشانہ مصارف کیوں؟ ——— تو ہر اعتراض [illegible] کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ دیکھتے نہیں ہم [illegible] پوچھا جاتا ہے کہ صاحب کیا اسلامی نظام آپ کی [illegible] کے ذریعے تعمیر ہو گا اور کیا [illegible] ہے! [illegible] پاکستان [illegible] استھان [illegible]

آپ نے پاکستان کیا بنایا؟ اپنی جاگیر بنائی کہ اس کے مالک تو ہیں آپ اور باقی سب مزارعے ہیں' اور جاگیردار کا یہ احسان بھی مزارعین ہی کے سر ہے کہ اس نے اپنے لئے کتنی نفع آور جاگیر بنائی ہے۔

صاحب پاکستان عوام کا ہے' عوام نے اس کے نظم و نسق کے لئے جب تک آپ کو اہل سمجھا تو آپ کو آگے کیا' اب آپ خود ہی نااہل نکلے تو وہ مجبور ہیں کہ آپ کو ہٹا کر دوسرے خادم فراہم کریں۔ یہ کیا استدلال ہے کہ لوگ آپ کی خدمات کی قیمت ادا کرنے کے لئے سارا پاکستان آپ کے پاس ہمیشہ کے لئے گروی رکھ دیں۔ آپ کے استدلال سے جس مطالبہ کی بو محسوس ہوتی ہے وہ گویا یہ ہے کہ ہم نے چونکہ پاکستان بنایا تھا لہٰذا اب ہم کو اس کے عہدوں کی اجارہ داری دے دو' ہمیں رشوت کھانے دو' ہمیں کنبہ پروری کرنے دو' ہمیں لوٹ مچانے دو' ہمیں عیش و نشاط کی محافل جمانے دو' ہمیں اسلام کا تیا پانچہ کر لینے دو۔ اگر آپ نے پاکستان خدا کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے بنایا تھا تو پھر اپنے احسان کا سارا گٹھڑ اٹھا لے جائیے اور اسے ٹرک پر لاد کر جہاں سینگ سمائیں تشریف لے کے چلے جائیے۔ لیکن اگر یہ کام آپ نے فی سبیل اللہ کیا تھا تو عوام کو سیدھی طرح ان کے سوالات کا جواب اور اپنے اعمال کا حساب دیجئے۔

یاد رکھئے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو مستری کسی مسجد کی بنا رکھتا ہے وہ اس کے لئے اچھا امام بھی ثابت ہو سکے اور جو مزدور اس کے چونے گارے کا انتظام کرتا ہے وہ مناسب مؤذن بھی بن سکے۔ اب اگر وہ تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد کہیں کہ ہم نے محنت کی ہے' لاؤ ہماری مزدوری کا حساب چکانے کے لئے مسجد کے مناصب کا پٹہ ہمارے اور ہماری نسلوں کے نام لکھ دو تو ظاہر ہے کہ نمازیوں کو اس معاملے میں غور کرنا پڑے گا۔ مستری صاحب اور مزدور صاحب کے اس مطالبے کے جائز ہونے کے لئے صرف یہ دلیل تو کافی نہیں کہ چونکہ مسجد بنانے والے ہم ہیں لہٰذا اس کے نظم و نسق کو چلانے کے لئے بھی اہل ہم ہی شمار ہونے چاہئیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے مستری صاحبان اور مزدور صاحبان تین سال سے مسجد کے نظم و نسق پر قابض چلے آ رہے ہیں اور اس دوران میں انہوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ اگر اس پہلے مرحلے کے کام کے لئے موزوں تھے بھی تو اس دوسرے مرحلے کے فرائض کے لئے نااہل ہیں۔ اب اگر لوگ نظام مسجد کے لئے نیا انتخاب کرنے پر تل گئے ہیں تو یہ آخری دلیل بڑی ہی بودی ہوگی کہ ہم نے مسجد کی دیواریں بنانے میں بڑی محنت کی ہے' ہماری اجرت کا تو خیال رکھو۔

آخری ہتھیار

جس گلے سے جھوٹ باہر نہیں آ سکتا تھا' اُس سے الاسٹیر کو اختلاف کرنے والوں کے لئے حسب ذیل گالیاں برآمد ہوئی ہیں:۔

(۱) گھٹیا (۲) غدار (۳) نمک حرام (۴) جھوٹے (۵) دغا باز۔

جن لوگوں کی طرف روئے سخن کر کے یہ کلمات طیبہ نشر فرمائے گئے ہیں آج اُن سے زیادہ مبارکباد کا مستحق کوئی نہیں۔ آج حالات نے گواہی دے دی ہے کہ وہ انقلاب قیادت کی مہم کو سر کر لینے کے آخری مرحلے میں آ پہنچے ہیں۔

گالیاں وہ آخری ہتھیار ہیں جو ہمیشہ استدلال کے ترکش کے خالی ہو جانے اور بوکھلاہٹ کی حالت طاری ہو جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہتھیار آخری ہی نہیں ہوتا بلکہ انتہائی ناکام بھی ثابت ہوتا ہے۔

ہم اُن سب لوگوں کی خدمت میں اس موقع پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں جنہیں وزیر اعظم کی زبان نے گھٹیا' غدار' نمک حرام' جھوٹے اور دغا باز کے القاب سے نوازا ہے۔

ہماری اطلاع کی حد تک ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اگر مخالفین کو گالیاں دلوانے کے لئے مسٹر محمد علی بازاری صحافیوں اور کرائے کے سیاسی ورکر ...

کھیل —— اسلامی نقطۂ نگاہ سے!

(چند سال پہلے کا لکھا ہوا ایک خط)

نعیم صدیقی

یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ نے ایک ایسے سوال کو میرے سامنے لا رکھا ہو اگرچہ بظاہر غیر اہم سمجھا جائیگا، مگر میں اس کا جواب میں جو کچھ عرض کرنے کا موقع پا رہا ہوں اس سے انشاءاللہ کھیل ہی کے متعلق نہیں بلکہ خود اسلام کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی۔

آپ کھیل کو ایک ایسا لہو سمجھتے ہیں جو مومنانہ سنجیدگی کے منافی ہے۔ لیکن خود اس مومنانہ سنجیدگی کی کوئی تصویر آپنے بطور معیار پیش نہیں کی جس سے آپ کا مدعا سمجھا جا سکتا۔ مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آپ ایمان و اسلام کے ساتھ ہنسنے مسکرانے، دوڑنے اچھلنے، ہاتھ پاؤں ہلانے، چستی دکھانے اور مقابلہ کرنے کا جوڑ صحیح نہیں سمجھتے، بلکہ آپ کا تصور یہ ہے کہ اسلام افسردگی کا، سستی اور کاہلی کا، سکون اور سکوت کا دین ہے۔ مگر بخلاف اس کے یہ دین سرگرمی اور ہنگامے کا دین ہے، ہوشیاری اور چستی کا دین ہے، لپکنے اور بڑھنے کا دین ہے، مقابلہ اور مسابقت کا دین ہے، صفائی اور ستھرائی کا دین ہے، باقاعدگی اور نظم کا دین ہے، خوش ذوقی اور جمالیت کا دین ہے، ترقی اور انقلاب کا دین ہے، اور یہ انسانوں کو پتھر کے زمانے میں منتقل کرنے یا زمانہ قبل مسیح کی یادگاروں میں بسانے نہیں آیا، بلکہ زندگی کے قافلے کو نئے نئے آئندہ مراحل طے کرانے کے لئے آیا ہے۔

مومن ہونے کے معنی "مولوی" ہونا جو بن گئے ہیں تو اس معنی کے لئے ہمیں کوئی سند اور نص قطعی ایسی نہیں ملتی کہ جس کی وجہ سے کوئی شخص اس معنی کے سامنے دم نہ مار سکے۔ برسوں سے اس غلط تصور کا دلوں پر غلبہ قائم ہو گیا ہے۔ اس نے یہ لازم کر دیا ہے کہ دینداری کا میلان پیدا ہوتے ہی آدمی اپنے ذوق کا جنازہ اٹھائے، اپنے احساسات کی قبر کھودنے میں لگ جائے، اس کے اعصاب ڈھیلے ہونے لگیں، اس کی صورت افسردگی کی ایک مکمل تصویر بن جائے، اس کا لباس مضحکہ انگیز سا ہو، اسکے بال بکھرے ہوئے، اس کے دانت میلے، اس کی بھویں تنی ہوئی، اس کی ڈاڑھی میں غبار ہی نہیں تنکے تک اٹکے ہوئے ہوں، بات کرنا اسے نہ آتا ہو، مجلس میں اس کا زندگی کی نہیں، ماتم کی لہر دوڑائے، خود اسے کوئی کھیل کھیلنا آتا نہ ہو اور دوسرے کھیلیں تو ان کی تفسیق کر سکے۔ معاف کیجئے گا، اس سنجیدگی کی اس تصویر کا ہر خدوخال محو کئے جانے کے قابل ہے۔

لہو کا اطلاق ان کھیلوں پر ہو سکتا ہے جو محض دماغی عیاشی کے طور پر کھیلے جاتے ہیں اور جن سے کوئی بڑا فائدہ حاصل نہیں ہوتا لیکن بیرون خانہ، کھیلے جانے والے کھیل (Out-door games) جو ورزشی فطرت رکھتے ہیں، اسلام میں کسی طرح ممنوع نہیں کہے جا سکتے اور نہ لہو کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان سے نہ صرف جسم کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ ذہن اور روح کے لئے بھی یہ قوت کا تحفہ ہیں، بشرطیکہ ذہنی اور روحانی فوائد حاصل کرنے کی فکر کی جائے۔ ورزشی کھیل خود دور نبوی میں کھیلے گئے ہیں، ان کا خود حضور نے حضرت عائشہ کے ساتھ تفریحاً دوڑ کا مقابلہ کیا ہے اور ان مشاغل کو لہو میں شمار کئے جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

[illegible] اس صورت میں بنتا ہے جب کہ وہ اصول، نظم اور اجتماعی اخلاق سے آزاد ہو یا اس کا اصول منظم [illegible]
[illegible] لیکن اگر کھیل کے ادارے کو اسی طرح تابع اسلام کر دیا جائے اور اس پر اخلاقیات اسلام کو طاری کر دیا جائے جس طرح
تعلیم، ادارۂ خاندان اور ادارۂ حکومت پر حدود اسلامی کو تسلط دیا جاتا ہے تو کھیل ایک پاکیزہ فرض بن جاتا ہے۔

اہل مغرب نے کھیل کو با اصول بنا کر بالکل ایک "کام" بنا دیا ہے، اور اس سے وہ بہت بڑے ذہنی فوائد اخذ کرتے
مثلاً کھیل کے ذریعہ وہ اپنے پابندیٔ اوقات کے رجحان کو تقویت دیتے ہیں کہ جو وقت کھیل کے لئے مقرر ہے اسے بہرحال
[illegible] کھیل ہی پر صرف کرتے ہیں، جس طرح دوسرے فرائض اور مشاغل کے اوقات کو انہیں فرائض اور مشاغل کے لئے وقف رکھتے
ان لوگوں کے لئے میدان میں بھی لیٹ پہنچنا ویسا ہی موجب شرم ہوتا ہے جیسا دفتر یا کارخانے یا عبادت گاہ میں لیٹ پہنچنا؛
کھیل کے ذریعہ اپنے اندر ڈیوٹی کے احترام کے جذبہ کو بیدار رکھتے ہیں اور کھیل کا حق ادا کرنے کے لئے ویسے ہی فکرمند رہتے
جیسے ایک معلم مدرسہ کے فرائض کو، ایک کلرک دفتری ذمہ داریوں کو اور ایک جج عدالتی مصروفیات کو صحیح طور پر انجام دینے کے
[illegible] فکرمند رہتا ہے۔ یہ لوگ وائسرائے اور گورنر اور جنرل بن کر اگرچہ مصروفیات کے پہاڑ کے پہاڑ پشت پر لادے ہوئے ہوں، لیکن
[illegible] ایک مصروفیت دوسری مصروفیت کو نگل نہیں سکتی، یعنی نہ مطالعہ، ملاقاتوں کا وقت لے گا، نہ ملاقاتیں خط و کتابت سے
[illegible] پا جائیں گی، نہ خط و کتابت کا وقت دفتری ذمہ داریوں پر محیط ہو سکے گا، نہ دفتری ذمہ داریاں کھیل کا وقت ہضم کر لیں گی
[illegible] زندگی جن مختلف فرائض کے تسلسل کا نام ہے اس میں کھیل بھی اپنی جگہ پر رہے گا۔

پھر یہ لوگ کھیل کے ذریعہ اپنے اندر احساسِ رفاقت و اجتماعیت کو سرگرم رکھتے ہیں، یعنی ایک کھلاڑی بہ شدت یہ بات
[illegible] کرے گا کہ دوسروں کا کھیل، دوسروں کی ورزش اور دوسروں کی تفریح اس پر منحصر ہے اور اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ٹیم کے
[illegible] نظام سے وہ اپنے آپ کو بلند و غیر متعلق سمجھے اور جب چاہے غیر حاضری کر لے۔ نہیں، بلکہ وہ ہر حال میں سب کے ساتھ ہے، سب
[illegible] کے فیصلوں کا پابند ہے، سب کے بنائے ہوئے نظام کا مطیع ہے۔ ٹیم کی ٹیم جدھر جائے گی، ادھر ہی وہ بھی جائے گا۔ یہی نہیں
[illegible] جماعت بندی اور نظامِ سیاست کے جو اصول ان کی سوسائٹی میں رائج ہوں گے، ان سب کو یہ کھیل کے میدان میں بھی [illegible]
[illegible] کریں گے۔ مثلاً ان کا نظامِ اجتماعی جمہوریت پر چلتا ہے تو کھیل کا نظام بھی جمہوری ہوگا۔ ٹیم کثرتِ آراء سے کسی کو اپنا صدر
[illegible] مقرر کرے گی اور پھر اس کے احکام کا پوری طرح اتباع کرے گی اور اسی طرح کھیل کے لئے جج مقرر کرے گی اس کے
[illegible] کو چون و چرا کے بغیر قبول کرے گی۔ کھیل کا نظم اور اوقات اور ٹیم کی رکنیت کے قواعد و ضوابط جمہوری اصول پر طے ہوں
[illegible] ان سے انحراف نہ کرنے پائے گا۔ یوں یہ لوگ ایک منظم اجتماعی زندگی کی تربیت کھیل کے میدان میں اپنے آپ کو
[illegible]

[illegible] اگر ہمارے ہاں بھی کھیل کی اہمیت کو سمجھا جائے اور اس کے لئے اسلامی اخلاقی نظام متعین کیا جائے اور [illegible]
[illegible] اس جماعت کا ایک ایر ڈسپلن ہو۔ اس کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے ایک "قاضی" [illegible]
[illegible] اخلاقی شعور اپنے اندر پیدا کر لیں تو کھیل ایک پاکیزہ ادارہ بن کے رہ جائے گا۔ لیکن یہاں حال یہ ہے کہ اگر [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] جائے گا [illegible] نظر [illegible] جو [illegible] اور [illegible]

پھرا ن کی چلتیں، ان کی گفتگوئیں، ان کا کھانا پینا، ان کا مطالعہ، انتہائی غیر سنجیدگی کا نقشہ پیش کرے گا۔ کہاں غریب کھیل کا میدان —— جہاں ہر طرح کا شور، ہر طرح کی فقرہ بازی، ہر طرح کی بے آئینی، ہر طرح کی بدنظمی روا ہے۔ نہ رفقاء کے جذبات کا لحاظ، نہ اجتماعیت کا احساس رہے گا، نہ اطاعت امر رہے گی اور نہ کوئی اور چیز ایسی رہ جائے گی جسے اسلامی کہنے کی جرأت کی جا سکے۔ کسی کھیل کو دیکھ کر اگر آپ نے اسے "لہو" کا نام دیا ہو تو آپ نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ ایسا کھیل کھیلنا مسلمان کے لئے روا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کھیل کا میدان ایک ایسی میزان ہے جس پر آدمی کا حقیقی ضمیر تُل جاتا ہے۔ یہاں جو شخص تفریح کی فضا میں پابندئ نظم نہیں کر سکتا، اس سے سنجیدہ فضا میں کسی انضباط کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ یہاں ایک ہلکے پھلکے مشغلے میں جو آدمی رفقاء کے جذبات کا لحاظ کرنے اور جماعتی شعور کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام ہو رہا ہے وہ خشک مشاغل میں یہ باتیں کیسے کرے گا؟ یہاں جو شخص اپنی ٹیم کے "پوائنٹ" بڑھانے کے لئے اپنے ہر "فاؤل" کو چھپاتا ہے، وہ کیا سیاست میں اپنی قوم کے لئے اور کاروبار میں اپنی فیملی کے لئے جرائم کر کے انہیں نہ چھپاتا ہوگا؟ جو شخص یہ اپنے امیر اور قاضی کی اطاعت نہیں ہو سکتی، وہ زندگی کے کھیل میں کسی امیر اور قاضی کی اطاعت کہاں کر سکے گا؟ —— کھیل کے میدان میں نمائش کی دنیا کے سارے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں اور صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کون آدمی اخلاقی اصولوں کو نگل گیا ہے، اگر ہضم نہیں کر سکا۔ آدمی ایک ہی سیرت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ اگر کھیل کے میدان میں گھٹیا ثابت ہوتی ہے تو پھر یہ مسجد اور حرم میں جا کر بھی گھٹیا ہی رہے گی۔

کھیل کے فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ دماغی اور ذہنی کام کرتے کرتے آدمی میں خلوت پسندی اور انفرادیت کا جو غلبہ ہو جاتا ہے، یہ اس کا ازالہ کرتا ہے اور احساسات کے نازک ہو جانے سے جو چڑچڑاپن سی بعض لوگوں میں ابھر آتی ہے اس کا سا تھ ساتھ علاج ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کے خطرناک ترین امراض ذہنی میں سے ایک مرض خود پسندی کا مرض ہے جس کے ساتھ "ذکاوتِ حس" ابھر آتی ہے اور آدمی کو خبط اور چڑچڑا بنا کر چھوڑتی ہے اور جس کی وجہ سے آدمی میں ایک فوق العام سنجیدگی کا احساس بھر رہا ہے۔ کھیل کا میدان اس مرض کو دور کرنے کے لئے بہترین "سینی ٹوریم" یا دارالعلاج ہے۔ یہاں آدمی میں رفیقانہ مساوات کا احساس بیدار ہوتا ہے اور اپنے جذبات کی طوافت کی عادت چھوٹتی ہے اور دوسروں کے جذبات کا احترام پیدا ہوتا ہے۔ مگر جو لوگ ان فوائد کو کھیل سے حاصل نہ کر سکیں ان کے لئے بہتر یہ ہے کہ کھیل سے باز رہیں اور اس سنجیدہ ادارے کو بدنام نہ کریں۔

آپ نے یہ بھی غلط مشورہ دیا ہے کہ کیوں نہ کھیل کے وقت کو کام میں صرف کیا جائے۔ میں عرض کروں گا کہ کھیل خود کام ہے۔ صرف تفریح یا آرام کے عناصر کو اگر زندگی سے یہ سمجھ کر خارج کیا جانے لگے کہ ان کی جگہ کام کرنا فائدہ بخش ہے تو بجائے اس کے کہ آدمی زیادہ کام کر سکے اس کی قوتِ کار کردگی کم ہوتی جائے گی۔ مثلاً آپ کے مشورہ کے جواب میں اگر میں یہ مشورہ آپ کو دوں کہ آپ سونے کی جگہ پڑھا کیجئے کیونکہ پڑھنا مفید کام ہے تو آپ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں گے، وجہ ظاہر ہے کہ نیند کام کے لئے قوت جمع کرنے کا ذریعہ ہے اور خود بھی مستقل کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح کھیل بھی کام کے لئے قوت جمع کرنے کا وسیلہ ہے اور خود ایک مستقل کام ہے۔

کھیل کی نفسیات یہ ہیں کہ آدمی کے مشاغل زندگی کے لحاظ سے اس کے بعض اعضاء و اعصاب تو زیادہ مصروفیت کا در چہ [illegible] اور [illegible] دن گزارنے کے بعد زیادہ کام کرنے والے حصص قوت کا خزانہ خالی کر کے یہ چاہتے ہیں کہ انہیں آرام [illegible] قوت جمع کرنے [illegible] کم استعمال ہونے والے حصص دن بھر میں جو ذخیرۂ قوت جمع کر چکے ہیں اسے کسی طرف [illegible] ہو جاتا ہے تو پھر ان حصص میں قوت پیدا ہونے کا کام بالکل رک جاتا ہے اور ایک مستقل جمود سا

ہو سکتا ہے کہ چونکہ جسم کی یہ دوسری ضرورت کھیل یعنی تفریح آمیز ورزش کی ایک اکساہٹ پیدا کرتی ہے۔ اب جو طرح طرح کی حرکات مسکرانے اور بول چال کا موقع پیدا ہوتا ہے اور ایک خاص طرح کی سوچ کے گورکھ دھندے میں جٹا ہوا فکر کا بیل ذرا آزادی سے حرکت کرتا ہے تو سکون ملتا ہے ——— اور یہ سکون اسے فرائض کا کولہو چلانے کے لئے از سر نو تیار کر دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کھیل کھانے پینے، سانس لینے اور سونے کی طرح ایک ایسی فطری ضرورت ہے۔ جسے ہر جاندار پورا کرنے پر مجبور ہے۔ ان کھیلتی ہیں، چڑیاں اور کبوتر کھیلتے ہیں، بندر اور بلیاں کھیلتی ہیں، اور آدمی بھی کسی نہ کسی صورت میں کھیلتا ہے، چاہے باقاعدگی سے کھیلے یا بے قاعدگی سے! بچوں کو جبلت خود کھیلنا سکھاتی ہے، جوان اپنی اپنی پسند کے کھیل کھیلتے ہیں، اور اور چھوڑ، بوڑھے بھی کھیل کا تقاضا پورا کر لیتے ہیں۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کلرک صاحب کرسی پر بیٹھے ٹانگ کو ہلا رہے ہیں یا کوئی ڈاکٹر صاحب گھومنے والی کرسی کو ہلا رہے ہیں، یا کوئی ماسٹر جی اپنے ہونٹوں سے بڑبڑا رہے ہیں، یا کوئی پروفیسر صاحب چلتے چلتے انگلیاں چٹخا رہے ہیں، یا کوئی صاحب اپنی مونچھ کو مروڑ رہے ہیں، یا کوئی بنئے صاحب گھر جاتے ہوئے روپے اس ہاتھ سے اس ہاتھ میں بجا بجا کر منتقل کر رہے ہیں، یا کوئی صاحب بستر پر پڑے اپنے سر پر بار بار ہاتھ پھیر رہے ہیں، ان سب لوگوں کی حرکات بتا رہی ہیں کہ یہ اپنا ایک طبعی فریضہ باقاعدگی سے نہ دینے کی وجہ سے مجبور ہیں کہ کچھ بے معنی حرکات سے اس کے خلا کو پورا کریں۔ ان لوگوں کی حالت ویسی ہی ہے جیسے کسی شخص کو سخت بھوک رہی ہو اور وہ بیٹھے کھا رہا ہو! پس جس مطالبۂ ذہن و جسم کو پورا کرنا ہی پڑے، اسے مکروہ طریقوں سے کیوں پورا کیا جائے، کیوں نہ ذوقی طور پر استعمال کر کے پورا کیا جائے۔

کھیل کام کرنے کی اہلیت کو بڑھاتا ہے۔ یہ بات اگر آپ دماغ میں رکھ لیں تو پھر ہمارے آپ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا۔

والی بال کھیلنے کو آپ نے تشبہ بالکفار قرار دے کے ایک اور ظلم کیا ہے۔ تشبہ بالکفار دراصل اس ہیئت و حالت کا نام ہے جس میں کسی کو مبتلا پا کر اسے مومن نہ سمجھا جا سکے، بلکہ اس کے ہندو یا عیسائی یا سکھ یا یہودی یا پارسی ہونے کا شبہ ہو۔ کیا والی بال کھیلنے والوں پر ایسا ہی شبہ ہوتا ہے ——— یقیناً نہیں! تو پھر آپ زیادہ سے زیادہ سخت اور تند لفظ جو استعمال کر سکتے تھے، وہ "تماثل" کا لفظ ہے۔ اب ہم فرض کرتے ہیں کہ آپ نے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

اسلام میں صرف دو قسم کی تماثلیں ممنوع ہیں، ایک وہ جن کا مقصد یہ ہو کہ اغیار کے وہ مذہبی یا سیاسی شعار اختیار کئے جائیں جن سے آدمی ان میں کا شمار کیا جا سکے اور دوسری وہ جن میں "خذ ما صفا ودع ما کدر" کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ ہر الا بلا ان سے لے لی جائے۔ اب آپ بتائیے کہ کیا والی بال یا فٹ بال یا ہاکی کا کھیل کیا عیسائیوں یا ہندوؤں یا کسی قوم کی ایسی ہی کوئی مذہبی و قومی علامت ہے جیسی صلیب ہے یا جنیو ہے یا جیسے سکھوں کے "پنج ککے" ہیں یا ہندوؤں کی کرشن مورتی ہے یا گاندھی ٹوپی ہے یا جیسے ٹروس کا واضح جھنڈے کا نشان ہے؟ ظاہر ہے کہ ان کھیلوں میں ایسی کوئی بات نہیں تو اس قسم کی تماثل تو ہو نہیں سکتی۔ اب یہ دیکھئے کہ یورپی کھیلوں میں سے ایک وہ کھیل ہیں جن میں قمار شامل ہوتا ہے، ایک وہ تفریحات ہیں جن میں بے حیائی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور یہ کھیل ہیں جن میں ایسی کوئی افسوسناک بات نہیں ہے۔ اب اگر تو ہم لوگ ان کے سارے اچھے برے کھیل [illegible] حرکات کے ساتھ اٹھا لاتے ہیں تو ہمارے اقبال کے نقصان میں شبہ نہیں، لیکن ان کے کھیل [illegible] تماثل میں کہہ سکتے۔ پھر تماثل یہ بھی ہو سکتی تھی کہ ان کے کھیل ہر [illegible] نظام سے منظم ہوتے [illegible]

[illegible] ... سے اوقات کو قربان کرتے، لیکن ایسا بھی نہیں، پھر آخر کونسی بنا انقال کا الزام لگانے کے لئے ہو سکتی ہے؟

اگر محض دنیا کی دوسری اقوام سے کسی شے کی بات کا اخذ کرنا انقال ہے تو پھر اسے روکنے کے لئے صرف یہی تدبیر ممکن ہے کہ اسلام والوں اور دوسری قوموں کے درمیان آہنی اور ہر طرح کی دیواریں کھڑی کرنے کے لئے کسی ذوالقرنین کو بھیج دے۔ پھر یہ ممکن ہوگا کہ ہر وہ آلہ اور وسیلہ کار جو دوسری قوموں نے ایجاد کیا ہو، ہر وہ قوت جسے اختیار نے برتا ہو، ہر وہ علمی حقیقت جس کا انکشاف وہاں ہوا ہو، تعمیرات، فرنیچر اور لباس کے ڈیزائننگ میں ہر وہ جدت جو کسی بھی غیر مسلم ملک سے نمودار ہو، اسے قبول کرنا مسلمانوں پر حرام ٹھہرایا جائے۔ جو کھیل ایک دفعہ مغرب میں کھیلا گیا ہو، وہ مشرق میں نہ کھیلا جائے، جو کھانا برطانیہ میں پکایا گیا ہو، وہ ہندوستان میں نہ پکے، جو سبزی امریکہ میں اگائی گئی ہو، وہ حجاز میں کاشت نہ کی جا سکے، جو جامہ فرانس میں تراشا گیا ہو، اسے اگر کوئی درزی تراشے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔

ایجادات و اختراعات کسی بھی میدان میں ہوں، ساری دنیا کی مشترک ملکیت ہیں، چاہے انہیں کوئی بھی قوم سامنے لائے۔ سب کچھ جو طبعی وحی کے نتیجہ میں رونما ہوتا ہے وہ پوری نوع کے لئے نازل ہوتی ہے، اگرچہ اس کا اولین نزول اس قوم میں ہوتا ہے جو اسے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر چکی ہو، اور ٹھیک اس شخص پر ہوتا ہے جو اسے عالم بالا سے اخذ کرنے میں اپنے معاصرین سے پیش پیش ہو۔ اس وحی سے اگر مسلمان استفادہ کرنے سے انکار کر دیں تو وہ اپنے ایک حق سے خواہ مخواہ دست بردار ہونے کی حماقت کریں گے۔

درحقیقت آپ جس طرز فکر سے کام لے رہے ہیں، وہ صرف کھیل ہی کے معاملے میں تو مداخلت نہیں کرتا، وہ تو یہ کہتا ہے کہ موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، ٹینک، بوٹ، کوٹ، کالر، سولیفر، برش، بٹن، صابن، کیک، ڈبل روٹی، بسکٹ، چائے، قمیص، پتلون، جرابیں وغیرہ میں سے کسی بھی شے کو استعمال نہ کیا جائے ورنہ نقالی ہو جائے گی۔ میرے خیال میں آپ اس کی تبلیغ کرنے سے پہلے اس پر نظر ثانی فرمالیں تو پوری امت پر، بلکہ ساری دنیا پر ایک کرم ہوگا۔

بقیہ صفحہ ۲۲

کرنے پر اکتفا کیا جاتا تو بہتر تھا، ہمارے ملک کی ایک اہم شخصیت کا ایسی سطح پر آ گرنا ہمارے لئے سخت درجہ تکلیف دہ ہے۔ آپ کو بہ حالی ظرف لوگوں کی صف میں کھڑے ہونا چاہئے تھا جو مخالفتوں کا خیر مقدم ہنستے مسکراتے کرتے ہیں اور جو تبدیلی کی بڑھتی ہوئی رو کو دیکھ کر نہ زبان کو بگاڑتے ہیں، نہ ذہن کو بگڑنے دیتے ہیں۔

باقی اگر گالیوں سے معرکے سر ہو سکتے ہوں تو انسانی ڈکشنری میں مغلظات کا بڑا بھاری ذخیرہ محفوظ پڑا ہے اور اس کی کلید بردار کرنے والی لکھنوی بھٹیاریاں بھی مہاجرین کر پاکستان آ چکی ہوں گی۔ کیوں نہ یہ سارے کا سارا استعمال میں آئے۔ جب یہی آخری ہتھیار ہے تو پھر کھل کر اس کے ذریعے معرکہ لڑا جائے اور ماں بہن کی گالیوں سے پوری فضا کو دھواں دھار کر دیا جائے۔

[illegible] گالی کے [illegible] سے آدمی [illegible] آج تک نہیں آیا سکتا، گالی کی تخم ریزی سے گالیوں کے خار زار اگا کرتے ہیں، اور ہمیں اندیشہ ہے کہ [illegible] آج جو صدا بلند کی ہے اس کی صدائے بازگشت کہیں گھٹیا ہو کر [illegible] جواب سے کے ساتھ نہ ہو جائے۔ پھر کوئی ہے جو اللہ [illegible] سکے گا؟

رخ جلوے کی ہے حسن جلوہ گر کی آزمائش ہے
نقاب اٹھا ہے اور اپنی نظر کی آزمائش ہے

گل و لالہ بھی ہیں سرو رواں بھی برق و باراں بھی
مگر گلشن میں صرف اک شجر کی آزمائش ہے

خدایا عزت خیر البشرؐ کا خود نگہبان تو
جہاں میں امت خیر البشر کی آزمائش ہے

قیامت ہے خزف ریزے بکے جاتے ہیں بے پرکھے
مگر تابانیٔ لعل و گہر کی آزمائش ہے

بنام عدل دھوکے کھا رہی ہے آج یہ دنیا
اب ایسے میں غلامان عمرؓ کی آزمائش ہے

حیا و علم کا گلشن لگا کر چل دیئے عثمانؓ
اور اب ہم باغبانوں کے ہنر کی آزمائش ہے

مبارک ہو ذبیح اللہ اور شبیرؓ کے وارث
زمانے میں ترے سودائے سر کی آزمائش ہے

بہر فاراں اشارے کر رہا ہے آج بھی رہبرؐ
اور اب یاران سرگرم سفر کی آزمائش ہے

ہم اپنا امتحاں تو عرصہ گاہ دہر میں دے لیں
پھر اس کے بعد رحمت کی نظر کی آزمائش ہے

یہ کعبہ ہے یہ بت خانہ یہ کوچۂ یار کے در ہے
دل پر شوق ہے اب آج سر کی آزمائش ہے

اب اپنا قافلہ پہنچا ہے اس منزل پہ اے ہمدم
جہاں رہبر کو کیا ہر ہم سفر کی آزمائش ہے

رہا عزم عمل کو [illegible] کی ضرورت ہے
[illegible] جنگ کی آزمائش ہے

[illegible]

گلگشت

(تعارف کتب و جرائد)

حلقۂ ادبِ اسلامی کراچی جس کی سرگرمیوں کے چرچے عام ہو رہے ہیں اور جس کی مجالس میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی حاضری روز افزوں ہے آپ کے سامنے [illegible] کے ادبیات کا ایک گلدستہ سجا کے پیش کر رہا ہے۔ اس گلدستے کو پیش کرنے کا بنیادی مقصد ہے کہ آپ کو اندازہ ہو کہ "ادبِ اسلامی" کے علمبردار [illegible] کیا ہے۔ اس مختصر سے مجموعۂ نگارشات کو "صبح آ رہی ہے" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اس نام کا مطلب ہے کہ ایک [illegible] آپ کے سامنے آئے، نئی امیدوں اور امنگوں سے آپ ادبِ اسلامی کی صبح کا خیر مقدم کریں اور کچھ یہ کہ تاریکیوں کو چھٹ کے رہ جائیں۔ یہ عنوان در اصل ایک افسانے سے مستعار لیا گیا ہے جو اس گلدستے میں شامل ہے۔

۱۲۔ مارچ ۱۹۶۳ء(?) کو صبح کراچی کے حلقۂ ادبِ اسلامی نے اپنا ایک اجلاس عام خالق دینا ہال میں منعقد کیا تھا جس میں عام پبلک کو [illegible] پسند ادیبوں کی تخلیقات سے متعارف کرایا گیا۔ اس اجلاس میں محمد صدیق المحسن، عماد الحق صدیقی، شمیم جاوید، آباد شاہپوری، اسعد گیلانی، ماہر القادری، منظر حسین اور نعیم صدیقی نے اپنے تازہ افکار پیش کئے تھے۔ انہیں کو ترتیب دے کر "صبح آ رہی ہے" کا مجموعہ بنایا گیا ہے۔

[illegible] کو اس طنزیہ فقرے سے نوازا گیا ہے:- "جاہلی ادب کی شب پاش تاریکیوں کی خدمت میں!"

ہماری رائے یہ ہے کہ ابتداءً کار اس نوع کے چیلنج انداز میں کرنا کبھی مفید نہ ہوگا۔ ہم "تخلیق" سے زیادہ "جنگ" پر متوجہ ہو جائیں گے۔ ہمارا اپنا نظریۂ ادب بجائے خود ایک چیلنج ہے، بس آگے بڑھ بڑھ کر تیز تیز فقروں سے حریف کو چھیڑنا اس جائز چیلنج کا وزن گرا دے گا۔

یہ کتاب آپ کو مرکزی مکتبہ حلقۂ ادبِ اسلامی، کراچی سے مل سکتی ہے، مگر خدا ہی جانے کس قیمت پر!

سنت کہتے ہیں اس کو کہ دینِ اسلام کو جن کاموں، اُن بنیادوں پر اور اس ڈھانچے کے ساتھ قائم رکھ کر اس کی پیروی کی جائے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] برپا فرمایا۔ اس کے مقابلے میں بدعت کہتے ہیں اس حرکت کو کہ دین سے باہر کی چیزوں کو اپنی پسند کی وجہ سے داخل دین [illegible] جن کا [illegible] خود دین ذکر کرتا ہو۔ بدعت در اصل خدا اور رسول کے تشریعی کام میں "اصلاح" دینے کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] مسلمان کو اس کی ماہیت سے آگاہ ہونا چاہئے۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ ان کی قیادت [illegible] جسارت حد [illegible]۔

[illegible] اس مقصد کے لئے ایک مختصر کتاب "بدعت تحقیقی رنگ میں" کے عنوان سے تحریر فرمائی ہے۔ آپ نے بدعت کی ماہیت [illegible] نیز "فقہ" "اجماع" کے شرعی اصول پر معلومات افزا بحث [illegible]۔

[illegible] فقہ [illegible] نہیں جا سکتی، مندرجہ اسلامی اسٹیٹ کی فوری کے [illegible] آگے دیکھئے

کلشیت

معاشی کے اندازِ بیان اُس زہنی جدیدیت کے مطابق ہوتا جو بدعت کے مرض میں مبتلا ہے اور جو شدید طور پر زہنی "فسٹ ایڈ" کا محتاج ہے۔ اور لیفیسر ہیکہ وہی اس کوشش سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

یہ کتاب صرف ۶ آنے میں نورالرحمٰن صاحب اور رشید جنرل اسٹور، علابازار، گلبرگہ (دکن) سے مل سکتی ہے۔

اسلامی نظام کیلئے پاکستان کے مسلمانوں کی تڑپ جس رفتار سے ترقی پذیر ہے، اسی رفتار سے ذہنی دنیا میں اسلامی ادب و فکر کی پیاس بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس پیاس کے تقاضے سے جو ادارے ایک ادبی محاذ قائم کرتے جا رہے ہیں جس کی قوت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ ابھی ابھی ایک نیا جریدہ "شاہین" کے نام سے ڈھاکہ سے "پاک وطن، پاک زندگی، پاک ادب" کے بنیادی نظریئے کو لے کر نمودار ہوا ہے۔ اس نظریئے کے اجراء میں مسلم فکر کی جو جھلک محسوس ہوتی ہے اس کے پیش نظر ہم اس کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان میں نہ صرف اردو کے فروغ کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگا بلکہ توقع ہے کہ اس کے ذریعہ بنگالی مسلمانوں کا جذباتی اور روایاتی اسلام شعوری اسلام میں بدل سکے گا۔ ابھی ہم یقین سے کوئی بات بھی اس کے متعلق نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اس کے جو دو نمبر دیکھنے میں آئے ہیں وہ حوصلہ افزا ہیں۔

چندہ سالانہ ۵ روپے، فی پرچہ ۸ آنے کے بدلِ اشتراک کے تحت آپ اسے مکتبہ رحمت اللہ ماڈل ہائی اسکول لال باغ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) حاصل فرمائیے۔

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی علاج

اور

دوسرے مضامین

از نعیم صدیقی

(ترامیم اور اضافوں کے ساتھ)

● لاہور کا ایک بہترین کاتب اس کی کتابت کر رہا ہے!

ناگزیر التوائے اشاعت کے لئے

ہم

معافی چاہتے ہیں!

مکتبہ چراغ راہ
[illegible]
[illegible]

جدلیات

مارکسیت اور اس کا نشوو ارتقاء

جیلانی۔ بی۔ اے۔

ہیگل کا فلسفہ وحدت الوجود کا فلسفہ ہے۔ ابن عربی کی طرح وہ بھی کائنات کے ہر ذرّے میں قوامِ ازلی کا پرتو دیکھ رہا ہے۔ جس طرح ابن عربی کے فلسفے کا مفہوم "ھو الکل" میں ادا ہو سکتا ہے اسی طرح ہیگل کا فلسفہ بھی ایک لفظ میں سما سکتا اور وہ لفظ (absolute) ہے یعنی مطلق۔ ہیگل کے نزدیک یہی ذات ہے اور یہی صفات۔ یہ عرض بھی ہے اور جوہر بھی۔ یہ نہ صرف عین ہے بلکہ منظر ظاہر بین کے لئے وجود۔ کائنات میں جتنی بھی کثرت نظر آرہی ہے اس کی حیثیت ایک سراب سے زیادہ نہیں۔ یہ دراصل ایک ہی وحدت کا پھیلاؤ ہے اور ایک ہی صفت کی ذاتیں ہیں جو عالمِ وجود میں آکر کثیر ہو جاتی ہیں۔

یہ کثرت کیسے وحدت ہے؟ اس کو ہم ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کوئی پوچھے مالٹا کیا ہے؟ تو اس کو سمجھانے کیلئے ہم یوں کہیں گے "مالٹا گیند کی مانند گول ہے۔ سنگترے کی طرح زرد ہے۔ لیکن سنگترے کی طرح نرم نہیں" مالٹے کی یہی صفات اسے مالٹا بناتی ہیں۔ لیکن مالٹے کی نوعیت کو پوری طرح تصور میں لانے کے لئے یہ جاننا بھی لازمی ہے کہ گیند کیا ہوتی ہے؟ سنگترہ کیا ہوتا ہے؟ گویا کسی شے کی حقیقت سمجھنے کے لئے دوسری اشیاء کی حقیقتوں کا سمجھ لینا لابدی ہے۔ کائنات کی ہر شے کائنات کی دوسری اشیاء سے کسی نہ کسی قسم کا علاقہ ضرور رکھتی ہے۔ خواہ وُہ مشابہت کا ہو یا مخالفت کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت ایک ناقابلِ تقسیم کل یا وحدت ہے۔ اور دُنیا میں یہ جو اشیاء کے درمیان بظاہر امتیازات و اختلافات نظر آتے ہیں وہ محض فریب ہیں۔ دراصل سب اشیاء ایک ہی کل کی اجزاء ہیں اور ایک ہی وحدت کی کثرت۔

اسی نقطہ کو دوسرے طریقے سے سمجھنے کے لئے فکرِ انسانی کو سامنے لایئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر سچائی جو ہم اپنے عمل [illegible] نقش کرنا چاہتے ہیں اپنے ساتھ ایک مخالف سچائی بھی لے آتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم کو نصیحت کی جاتی ہے کہ مفلس کی مدد کرنی چاہئے لیکن کسی مفلس کو دیکھ کر معاً یہ خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے کہ اکثر مفلس حقیقتاً مفلس نہیں ہوتے۔ وہ فریب دہی کے لئے افلاس کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہم ٹھٹک جاتے ہیں کیونکہ پہلی حقیقت کی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے۔ اِس طرح ہر سچائی کی ضد موجود ہوتی ہے۔ انسانی اختیار کا یقین ہمیں نشۂ اقتدار سے سرشار کر دیتا ہے۔ لیکن واقعات کا ورود فوراً ہمیں یاد دلا دیتا ہے کہ مجبور ہیں۔ اب غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی اختیار کا عقیدہ جتنی دلیلوں کے ساتھ ہمیں مطمئن کرتا تھا۔ قریب قریب اتنے ہی [illegible] سے [illegible] ہمیں مجبور تسلیم کرتا ہے۔ لیکن مواد انسانی کچھ اس فطرت کا بنا ہے کہ یہ کبھی ادھوری سچائیوں پر مطمئن نہیں ہوگا۔ چنانچہ [illegible] ایسی سالم سچائیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا جو ان ناکمل سچائیوں کو اپنی وسعتوں میں سمو لیں۔ جب ایک وسیع تر اور مکمل تر سچائی [illegible] کی طرف [illegible] اور مکمل تر سچائی کی طرف [illegible] سلسلہ یونہی چلتا جائے تو بالآخر ہم کسی ایسی سچائی پر [illegible]

[illegible] سے جس [illegible] سب سے وجودی اور [illegible] کل سچائیاں اس [illegible] ہو جائیں گی۔ وہ ابھی سچائی میں کل کا کوئی حصہ نہ ہوگی اور ابھی سچائی ہوگی جو [illegible] سچائی کو پا کر ہم کائنات کے کل اسرار کو پالیں گے۔ یہی [illegible] مطلق تک پہنچنے کا صعودی طریقہ ہے۔ انسانیت آخری سچائی تک پہنچی اضداد سے الجھتی ہوئی بستی سے اور [illegible] گی۔ اب فضا پر بھی سن لیجئے کہ آخر ہم زندگی کی اس بھائی اور اجادث تک پہنچے کیونکر۔

ہیگل کہتا ہے۔ جب کچھ نہ تھا اس وقت مطلق تھا۔ وہ اس وقت حالت میں Idea میں تھا۔ اور اس کے بطن میں پوشیدہ صور میں معرض وجود میں آنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ یعنی یہ عمل تخلیق کئی میلوں سے نہیں جدلیات سے تھا۔ عین نے اپنے لئے سب سے پہلے وجود کا قالب تیار کیا۔ یہ وجود پہلے غیر نامیاتی صورت میں تھا۔ جب یہ نامیاتی صورت یعنی پودوں میں آیا تو زندگی جاگ اٹھی۔ پھر وجود حیوانات کے سانچے میں ڈھلا تو عین نے عقل کو نیم ابھاسے میں پایا۔ جب عین انسانی وجود میں منتقل ہوا تو عقل کی [illegible] ہوئی۔ اور پہلی دفعہ اس نے اپنا شعور حاصل کیا۔ اپنا شعور حاصل کرنے کے بعد عین نے اپنے آپ کو آرٹ، مذہب، آرٹ، فلسفہ اور انسانی اداروں مثلاً خاندان اور قانون میں ظاہر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ درجہ ریاست کو پہنچ گیا اور ریاست اس عین یا مطلق کا موجودہ ترین اور اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ اگر ہیگل اس زمانے تک زندہ رہتا تو ضرور کہتا کہ اب روس کی قومی ملکیت ذات مطلق کی ہے۔ ترین اور اعلیٰ ترین منزل ارتقا ہے۔

آپ کو یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سارا سلسلہ جدلیاتی عمل سے ظاہر ہوا۔ یہ کہ اضداد اٹھے اور اور صورتی سچائیوں سے ٹکرا کر نئی سچائیوں کی بنیاد بنتے گئے۔ کائنات ہر وقت معروف عمل ہے اور ذہن انسانی کا کام اس جدلیاتی عمل کو سمجھنا ہے۔ فلسفے کا کام کثرت کے اعتبار سے وحدت کو چھانٹ الگ کرنا ہے۔ اخلاقیات کا کام سیرت کو ہدایت سے پختہ کرنا اور سیاسیات کا کام افراد کو ریاست کے ساتھ متحد کرنا ہے۔ اور مذہب کا مقصد اس ذات مطلق تک رسائی حاصل کرنا ہے جس کے اندر تمام اضداد مدغم ہوتی ہیں۔

ہیگل کا یہ فلسفہ دراصل ہوشمند نظریہ کائنات کا ترجمان تھا۔ ہیگل سے پہلے اٹھارویں صدی کے آخر تک کائنات کے متعلق جو تصورات خواص و عوام میں رائج تھے وہ قریب قریب وہی تھے جو ہزاروں برس قبل یونانیوں میں مقبول تھے۔ یہ کہ کائنات کسی خالق کا کارنامہ ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر یہ ایک کل ہے جو [illegible] ایک بار چل پڑنے کے بعد ہمیشہ یونہی چلتی رہے گی۔ یہ نظریہ کائنات کو اس چٹان کی طرح [illegible] کرتا تھا جو [illegible] ہے اور جس کی آخری صورت ہے۔ معرض وجود میں آجانے کے بعد یہ اپنے سکون و عین کے [illegible] کو کسی قسم کا تغیر یا کسی طوفان کا [illegible] زیر زمین [illegible] حرکت پر مجبور نہیں کر سکتا۔ یہ کائنات شروع [illegible] ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی یہ سکونی نظریہ کائنات نئے حقائق کے انکشاف سے [illegible] ہونے لگا۔ کہا جاتا [illegible] چکا تھا کہ [illegible] اب [illegible] نظر [illegible]

[illegible] معرض وجود میں آگئی اور نہ ایک کل کی طرح ایک رفتار پر ہے۔ [illegible] چل رہی ہے۔ بلکہ [illegible] اور ارتقا کا [illegible] اس [illegible] ہے۔ اس [illegible] میں اسے کئی انقلابوں اور کئی [illegible] کا سامنا کرنا پڑا [illegible] یہ زمین پہلے صرف ایک [illegible] تھی [illegible] پھر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] پتھروں پر چکنا رہا جب کہیں زندگی کا بیج پھوٹا۔ یہ تخم حیات ہزاروں بلکہ لاکھوں برس پانی کی لہروں پر [illegible] بنتا رہا۔ اس دوران میں وہ اپنے اندر قوت نشوونما بہم پہنچاتا رہا۔ بالآخر وہ جیلی جیسی جھلی بننے میں کامیاب ہو گیا۔ جھلی سے اس نے ایسے حیوان کی شکل اختیار کر لی جس کی نخاع نہیں ہوتی۔ اس سے ترقی کی تو پوری مچھلی بن گیا۔ مچھلی سے آگے [illegible] ایسے درجے میں پہنچ گیا جس میں ایک حیوان خشکی اور تری دونوں میں رہ سکتا ہو۔ پھر رینگنے والے حیوانات کی شکل میں پہنچا۔ اس [illegible] تک پہنچ جانے کے بعد دو شاہراہیں کھل گئیں۔ ایک فضائی اور ایک زمینی۔ رینگنے والے حیوانات کی نسل سے بعض نے پرواز اختیار کر لی اور بعض نے زمین ہی پر رہنا پسند کیا اور ذی الثدی (دودھ پلانے والے حیوانات) بن گئے۔ اس کے بعد انسان کا [illegible] آتا ہے۔ جو آج بزعم خود اشرف المخلوقات ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ زندگی کے پہلے خلیے کو انسان کی منزل تک پہنچنے میں کتنے کروڑ [illegible] لگے۔

ارتقا کا یہ سلسلہ جس طرح عالم وجود میں کام کر رہا ہے اسی طرح عالم افکار اور اس کے قائم کردہ اداروں میں بھی سرگرم کار [illegible] فلسفہ، مذہب، تہذیب اور سیاست یہ سب تابع قانون ارتقا ہیں اور ابھی کسی آخری حالت پر نہیں پہنچے۔ یہ نظریہ سکونی [illegible] خلاف کائنات کو ایک بہاؤ کی صورت میں پیش کرتا ہے جو حالت اہتزاز میں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قدیم زمانے میں سکونی نظریہ کائنات کے مطابق جب سوچا جاتا تھا تو وہ سوچنے کا ڈھنگ کہ اور تھا۔ وہ سمجھتے [illegible] کائنات غیر متبدل ہے۔ ایک شے جس حالت میں آج موجود ہے ویسے ہی پہلے تھی اور ویسے ہی بعد میں بھی رہے گی۔ چنانچہ [illegible] قوانین فکر کا علم یعنی منطق تیار کی گئی۔ یہ منطق انسان کو مدلل طریقے سے سوچنے کا ڈھنگ سکھاتی تھی۔ اور یہ کہ [illegible] نے کیونکر تصورات (مثلاً پتھر، آدمی، غیر، شر وغیرہ کے تصورات) قائم کئے۔ پھر ان تصورات کی بنیاد پر کلیات اور مسلمات [illegible] (مثلاً زید آدمی ہے، میز لکڑی کی ہے) بنائے اور ان مسلمات سے نتائج اخذ کئے۔ اس عمل استنتاج کو قیاس کہتے ہیں ایک [illegible] مثال کے طور پر درج ذیل ہے:-

آدمی فانی ہے۔	(کبریٰ)
زید آدمی ہے۔	(صغریٰ)
لہٰذا زید فانی ہے۔	(نتیجہ)

یہ قوانین فکر ارسطو نے ساڑھے تین سو برس قبل مسیح مرتب کئے تھے۔ اور انیسویں صدی تک یہ جوں کے توں تسلیم کئے جاتے [illegible] فکر اپنی روح میں خالص پر [illegible] تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جو چیز استدلال سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے وہ عالم واقعی میں [illegible] ہے۔ ارسطو جیسا حکیم یہ سمجھا کہ عورت کے دانت بتیس نہیں اٹھائیس ہوتے ہیں کیونکہ استدلال سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ [illegible] منطق [illegible] مشاہدے سے پرکھنا یہ عقل کی توہین ہے۔ چنانچہ یہ منطق اپنے فوائد اور نقصانات سمیت ہزار [illegible] [illegible] کی صداقت پر لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی۔

[illegible]

[illegible] آپ ہے۔ جیسے الف بار ہے الف کے۔ یا [illegible]

[illegible] تناقض۔ یہ کہ الف بیک وقت الف اور غیر الف نہیں ہو سکتا۔ یعنی زید یا چاہئے کہ وہ زید ہی رہے اور بکر بھی بکر ہی رہے اور اپنے فکر کو ایسے اضداد سے نہیں اُلجھانا چاہئے۔ اگر ایک چیز اپنے آپ کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی ضد بھی بن جائے تو [illegible] یہ تو ایک مذاق ہوگیا۔

(۳) تیسرا قانون وسط مخرجہ کا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ الف یا تو الف ہے یا غیر الف۔ اس کے سوا تیسری کوئی صورت نہیں۔ زمین ٹھوس ہے۔ اگر ٹھوس نہیں تو پھر یہ زمین ہی نہیں۔ اس کے درمیان کوئی درمیانی واسطہ نہیں۔

اب یہ تینوں قوانین عقل اس کائنات میں تو مباح تھے جو غیر متبدل تھی لیکن ایسی کائنات میں کیونکر صحیح ہو سکتے تھے جو ہر آن بدلنے والی تھی۔ جس میں تغیر ہر ساعت مصروف عمل ہے اور ارتقاء وقت کے ہر قدم میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہو۔ ایسی کائنات کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے تو ایک نئی منطق کی ضرورت تھی جو عقل کو مرا ارتقاء حقیقت سے ہمکنار کر دیتی اور فکر کو متغیر کائنات سے ہم آہنگ بنا دیتی۔ منطق محض خیالی میدانوں کی شہسواری کے لئے نہیں بلکہ کائناتی ارتقاء اور حقیقت کل کو سمجھنے کے لئے ہونی چاہئے۔ اس عظیم کام کا بیڑا ہیگل نے اٹھایا اور اسے کر دکھایا۔ اس نے نہ صرف فکر کے قوانین تخلیق کئے بلکہ کائناتی ارتقاء کے بنیادی اصول بھی واضح کر دیئے۔ چونکہ یہ قوانین اور اصول اس کائنات سے متعلق تھے جو قدیم کائنات سے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل جداگانہ تھی۔ اس لئے اس نئی کائنات کے اصول و قوانین کی تشریح کے لئے اسے ایسی زبان استعمال کرنا پڑی جو قدیم کائنات کے ماننے والوں کے لئے قریب قریب ناقابل فہم تھی۔ چنانچہ ایک نقاد نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ "کہ ایسی مہمل اور لا یعنی باتوں کو جو صرف پاگل خانہ کی چار دیواری کے اندر ہی سنی جاسکتی ہیں الفاظ کی پیچیدہ فصاحت میں پیش کرنے میں ہیگل سب سے بازی لے گیا ہے" بعضوں نے کہا "ہیگل کا فلسفہ جرمن حماقت کی عظیم الشان یادگار ہے" خود ہیگل کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ جب وہ نزع کے قریب پہنچا تو اس کا چہرہ کچھ ملال ہوگیا۔ اس کے تلامذہ اور احباب اس کی دلجوئی کرنے لگے مگر اس نے آہ بھر کر کہا۔ "مجھ کو افسوس ہے کہ میرے فلسفہ کو کوئی نہ سمجھ سکا۔ صرف ایک نے سمجھا ہے اور اس نے بھی غلط سمجھا ہے" لیکن بالآخر دنیا نے اسے سمجھ ہی لیا۔

ہیگل کی منطق جدلیات ہے۔

یہ جدلیات وہی فن ہے جس کو یونانی حقیقت کی کنہ تک پہنچنے کے لئے استعمال کیا کرتے تھے۔ اس فن کی ایک جھلک آج بھی مکالمات افلاطون میں مل جاتی ہے۔ جہاں ارسطو اپنے شاگردوں اور طالبان حق کے بحر مبحث میں چھپا باطل کے ابہام کو جھانٹتا اور حقیقت کے موتیوں کو رولتا نظر آتا ہے۔ یونانی اس فن سے مخالف کی دلیل رد کرتے تھے۔ یہی فن علم مناظرہ کی صورت میں منتقل ہو کر ہم میں آگیا۔ ہیگل نے اپنی منطق کو یہ نام اسی لئے دیا کہ کائنات میں جو بھی تغیر ہو رہی ہے وہ سلسلۂ اضداد کے عمل سے ہو رہی ہے۔ اور جب تک ہم اس جدلِ اضداد کو نہ سمجھ لیں اس وقت تک ہم حقیقت کو پا نہیں سکتے۔

ہیگل نے اپنے اذہان کی ترجیح سے پہلے منطق صوری (formal logic) کا ابطال کیا۔ جا ابسے وہ تصورات اور عقلیات جن کو ہم اپنے تئیں آخری اور یقینی سمجھتے ہیں آخری اور یقینی نہیں۔ چونکہ کائنات کی ہر شے حالت تغیر میں ہے اس لئے کوئی آخری صورت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود ارتقاء ہی نہ رک جائے۔ لہٰذا وہ قدیم تصورات و کلیات [illegible] سے ہماری [illegible] نظریات کے متارع ہیں۔ یہ منطق آج بھی ہمارے کا [illegible] اور [illegible] [illegible]

[illegible] قانون فکر کی [illegible] [illegible] [illegible]

ہے۔ جو جب کسی شے کو دیگر اشیاء سے الگ کر کے مجرد حالت میں پرکھتا ہے تو گویا وہ اس شے کے ان تمام رابطوں اور رشتوں کو قطع کر دیتا ہے جن سے کہ وہ باقی کائنات سے جڑی ہوتی ہے۔ اگر کوئی زمین کا نام لے تو قدرتی طور پر سننے والا توقع کرے گا کہ کہنے والا زمین کا وہ خاصہ بیان کرے کہ جس سے وہ باقی اشیاء سے ممتاز ہے۔ اور اگر کہنے والا کہہ دے کہ زمین زمین ہے تو سننے والا خاک سمجھے گا۔ جب تک کہ کہنے والا یہ نہ کہے کہ زمین ایک سیارہ ہے جو سورج کے گرد گھومتا ہے۔ دوسرے قوانین یعنی قوانین ضد اور وسط محذوف تو قطعی جھوٹ ہیں۔ یہ تو کسی شے کے تصور کو بالکل ہی مسخ کر دیتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان سے تجرید اور نفی کا کام لیا جائے کیوں نہ ان سے تعمیری کام لیا جائے۔ کیونکہ ضد ہی وہ قوت ہے جو فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ اور حقیقتوں کے بند دروازے کھولتی ہے۔ اگر زمین یونہی آتشیں مادہ بنی رہتی تو کیا اس پر زندگی کی بہار آ سکتی تھی؟ یہ باہر کی ٹھنڈک تو تھی جس نے ٹھنڈک پہنچا کر اس کے سینے سے زندگی کی کونپلیں نکالیں۔

گویا اگر قدیم منکرین کے خیال میں ہر شے اپنی مثال آپ ہے اور کوئی شے دنیا میں ایسی نہیں جو اپنی ضد آپ ہو تو ہیگل کے نزدیک کوئی شے اپنی مثال آپ نہیں اور ہر شے اپنی ضد آپ ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہاں ہیگل منطقی اضداد سے بحث نہیں کر رہا بلکہ ان اضداد کا ذکر کر رہا ہے جو اشیاء کی نمو اور ارتقاء میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اب ہیگل کے مرتب کردہ قوانین فکر بھی دیکھ لیجئے۔

(۱) وہ شے یا وجود جو سب سے پہلے ظاہر ہوتا ہے اور جس کے خلاف ضد سرگرم عمل ہوتی ہے۔ ہیگل کی زبان میں مثبت کہلاتا ہے۔ فشٹے (Fichte) ایک جرمن فلاسفر جو ہیگل کا ہم عصر ہی تھا اسے (Thesis) کہتا تھا۔ ہیگل نے عمل ارتقاء کی تینوں کڑیاں فشٹے سے اخذ کر کے اپنے نظام میں جوڑ دیں۔

(۲) کائنات ارتقاء کی طرف صعود کر رہی ہے اور عمل صعود اس وقت ہوتا نہیں جب تک کہ ایک شے کی ضد سامنے نہ آ جائے یعنی یا مخالف عنصر یا جسے (Anti Thesis) بھی کہہ سکتے ہیں منفی ہے۔ یہ ضد محض تخریبی عنصر نہیں بلکہ مثبت کی باطنی صلاحیتوں کے ظہور کا ایک موقع ہے۔ ہیگل کہتا ہے۔ اس سے پہلے منطق کا دعویٰ تھا کہ ضد عین یا وجود کا اتنا ضروری اور لازمی خاصہ نہیں جتنا کہ اس کا تمثل (Identity) لیکن اگر مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ضد ایک جاندار وجود کا خاصہ ہے اور تمثل ایک بے جان' مردہ اور بے حرکت زیست کی خاصیت ہے۔ ضد بہر حال سب حرکت اور زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اور ہر وہ چیز جو اپنے اندر ضد کی ہلکی سی رمق بھی رکھتی ہے حرکت' قوت اور اثر حاصل کر سکتی ہے آگے چل کر ہیگل لکھتا ہے۔" صرف عقلِ فاعل ہی اس تشتت اور کثرت کو ایک (Anti Thesis) میں ڈھال سکتی ہے۔ اور جب یہ تشتت اور کثرت اس سانچے میں ڈھل کر منفی بن جائے گی تو وہ قوت فاعلہ ہوگی جو ارتقاء اور حیات کی دھڑکنوں کو تیز تر کرنے میں ممد ہوگی۔ اب جس میں ضد پیدا کرنے اور اسے برسرکار لانے کی قوت نہ ہوگی وہ شے یا وجود اپنے ضد کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی"۔

ہیگل کے یہ خیالات مارکس نے موتیوں کی طرح چن لئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی سرمایہ داری کے اضداد ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہا ہے تاکہ ان سے ایک ایسی قوت مجتمع ہو سکے جو سرمایہ داری کے جہانِ فرسودہ کو مسمار کر کے جہانِ نو کی تعمیر کرے۔ اسی بنا پر اس نے پیش گوئی کی کہ صرف مزدور طبقہ ہی انقلاب لا سکتا ہے۔ اور یہ سرمایہ دار مزدور کی اجرت جیسے تیسے کم کر کے اپنے منافع

شکل دے دی جائے گا۔ لیکن یہ دیکھا جائے کہ یہ بات صرف مارکس ہی کو سوجھی یا اس سے پہلے پرودھون فرانسیسی مفکر کی
بھی اضداد کو سمجھنے میں مصروف تھا۔ ۱۸۴۰ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا (What is Property)
چھان بین کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہیگل کی راہ پر چل رہا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے ایک اور کتاب
لکھی جس کی تردید میں مارکس نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ اس کتاب کا نام تھا "معاشی اضداد یا فلسفۂ افلاس" اس میں پرودھون
نے سرمایہ داری کا تجزیہ کر کے اس کے اضداد کی وضاحت کی۔

(۳) تیسرا قانون منفی منفی ہے۔ ایک وجود کی ضد ابھرتی ہے تو اس سے ٹکرا کر نہ تو خود باقی رہتی ہے اور نہ اس کو چھوڑتی ہے اس کی جگہ ایک نیا وجود وقتاً شہود پر آتا ہے۔ مثلاً آتش گرفتہ زمین پر بارش ہوئی وہ زمین میں جذب ہوگئی اور اس کی بجائے زمین کی سطح پر ایک نئی صلابت آگئی جو پہلی دونوں حالتوں سے مختلف تھی۔ یا اس معاملے کو سمجھانے کے لئے عام طور پر انڈے کی مثال دی جاتی ہے انڈے میں ایک جرثومہ (منفی) ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ زردی اور سفیدی (مثبت) کو چاٹتا جاتا ہے۔ جب یہ منفی جرثومہ پوری طرح نشوونما پاکر چوزہ بن جاتا ہے تو انڈے کا خول توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ یہ ہے منفی منفی

(۴) یہ عمل تبدل تدریجی تحول ہی سے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات طفرے (Leap) سے بھی ہو جاتا ہے ہیگل اس نظریے کی خود وضاحت کرتا ہے۔ "یہ کہا گیا ہے کہ طبیعیات میں کوئی طفرہ نہیں ہوتا اور یہ خیال عام طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ اشیاء کی پیدائش اور فنا بتدریج ترقی یا تنزل سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کمیت (quantity) کیفیت (quality) میں دفعتاً بدل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پانی جمانے کے لئے اگر ٹھنڈا کیا جائے تو یوں نہیں ہوتا کہ پہلے پتلا ہو پھر درجہ بدرجہ برف کی حالت اختیار کرے۔ بلکہ جونہی اسے ٹھنڈک پہنچتی ہے وہ یک بیک منجمد ہو جاتا ہے۔ پھر درجہ حرارت جب گرے گا پانی دفعتاً برف بن جائے گا۔ گویا کمیت (درجہ حرارت کا عدد) کیفیت (یعنی شے کی ماہیت میں تغیر) میں بدل گئی"

مارکس اسی قانون سے استخراج کرتے ہوئے کہتا ہے کہ روپیہ بڑھ کر یک بیک سرمایہ بن جاتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے؟ یہ مسئلہ بڑا دلچسپ ہے۔ فرض کیجئے ایک کارخانہ دار کو ۱۰ سیر سوت بنانا ہے۔ اس پر جو خرچ اٹھے وہ درج ذیل ہے

۱۰ سیر روئی ایک روپیہ فی سیر کے حساب سے	=	۱۰ روپے
کاریگر کی ایک دن کی مزدوری (دس گھنٹے کا فرض کر لیجئے)	=	۳ روپے
مشین کا گھساؤ	=	۲ روپے
کل خرچ جو سوت کی تیاری پر آیا	=	۱۵ روپے

اب اگر اسی کارخانہ دار کو بیس سیر سوت بنانا ہے تو۔۔

۲۰ سیر روئی	=	۲۰ روپے
دو دن کی اجرت	=	۶ روپے
مشین کا گھساؤ	=	۴ روپے

مولیامہ

اگرچہ اشیا طور پر تیار سوت کی بنوائی پر تیس روپے ہی خرچ اٹھنا چاہئے تاہم اس کارخانہ دار نے حقیقت میں مزدور کو تیس روپے نہ دے بلکہ بارہ روپے، ایک خرچ سکتے ہیں۔ وہ مزدور سے جس سیر سوت مشین کی مدد سے صرف ایک دن میں تیار کروا کے مزدور کو مزدور کی ایک دن کی اجرت اسے منافع میں ملا گئی۔ مارکس کہتا ہے۔ "سوت کی اصل قدر تیس روپے ہے۔ چونکہ پیداوار کی اس قدر سے ⅓ حصہ زیادہ ہے جو اس کی پیدائش کے لئے پیشگی ادا کی گئی ہے اس لئے ستائیس روپے تیس روپوں میں بدل سکا اس طرح تین روپوں کی قدر منافع پیدا کر لی گئی۔ اور اس عیاری سے روپیہ سرمایہ بنتا ہے" گویا جب اس نے پندرہ روپے پہلی تیاری کے لئے دیئے تھے تو اس وقت روپیہ محض روپیہ تھا۔ لیکن جب ستائیس روپے دوسری تیاری میں لگا دیئے تو یہی روپیہ وہ سرمایہ بن گیا۔

ہیگل کی نگاہ باطن کے سامنے تصورات ہنگامہ آرا تھے جو بالقوہ کو بالفعل لانے کے لئے کشمکش کر رہے تھے۔ اس لحاظ سے ہیگل کی منطق بھی الگ تھی اور نظام فکر بھی الگ۔ اگر منطق صوری کا قیاس صغریٰ کبریٰ اور نتیجہ پر مشتمل تھا تو ہیگل کا قیاس دعویٰ جوابِ دعویٰ اور ترکیب سے بنتا تھا۔

مارکس اور انجلز نے ہیگل سے ہیولیٰ لیا اور صورت اپنی دے دی۔ مارکس نے ہیگل کا یہ اذعان بعینہٖ تسلیم کر لیا کہ کائنات سکون نہیں حرکت ہے۔ یعنی جو کچھ موجود ہے وہ حالت ارتقاء میں ہے نتیجتاً اس نے یہ بھی قبول کر لیا کہ اس نظریہ کے تقاضوں کے ساتھ صرف منطق حرکی (dynamic logic) ہی عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ اس بات کو تسلیم نہ کر سکا کہ اشیاء کا تحول و تغیر کسی خارجی اثر کا نتیجہ ہے۔ یہ ہمیں کی تاثیر نہ تھی اور نہ اس کی قالب وجود میں جلوہ نمائیاں ہیں بلکہ اشیاء کا یہ تغیر ان کے داخلی تغیر کا نتیجہ ہے مارکس کا دعویٰ ہے کہ جن اشیاء کا تجربہ ہم واقعی دنیا میں کرتے ہیں وہ کسی مثالی عالم کا عکس یا کسی ایسی حقیقت کا پرتو نہیں ہیں جو دنیائے مکان و زمان سے ماوراء ہو۔ بلکہ وہ اشیاء جن کو ہم دیکھ ٹٹول سکتے ہیں اپنی حقیقت آپ ہیں۔ ان کے ماوراء ہم جا سکتے ہیں نہ ہم کو جانے کی ضرورت ہے اور نہ وہاں پر کچھ ہے ہی۔ عالم محسوس ہی سب کچھ ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی راہرو۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جس سے سب اعیان و تصورات پھوٹتے ہیں۔ چونکہ اشیا حقیقی ہیں اور کسی "عین" کا پرتو نہیں ہیں لہٰذا وہ منطق جو ہیگل نے عالم اعیان کی مناسبت سے تیار کی تھی عالم واقعی کی اشیاء پر منطبق کی جانی چاہئے۔ کیونکہ تغیرات کی لہریں آتی ہیں تو اشیاء میں اور ارتقاء رواں دواں ہے تو اشیاء میں۔ اب سوال یہ ہے کہ اشیاء متغیر ہوتی ہیں تو کن قوانین کے ماتحت؟

مارکس جواب دیتا ہے۔ "انسانی کشمکش کے جدلی قانون کے ماتحت"

اس بات کو سمجھنے کے لئے ہمیں مارکس کے پہلے اذعان کی طرف پھر رجوع کرنا پڑے گا۔ اس نے کہا تھا کہ جب اشیاء ہی آخری اور فیصلہ کن حقیقت ہیں تو انسان کی زندگی پر یہ اشیاء ہی آخری اور فیصلہ کن انداز میں اثر ڈالیں گی۔ یہ جب اثر ڈالیں گی انسان اثر قبول کرے گا کیونکہ وہ بے جان کائنات کا سب سے اہم عامل ہے۔ وہ اثر قبول کر کے پھر اشیاء کو متاثر کرے گا کیونکہ اس کے پاس فکر و عمل کی سحر انگیز قوت ہے یہ بھی نہ بھول جانا کہ کائنات کی بعض اشیاء میں قوت تاثیر نہیں۔ یہ شرف صرف پیدا آور اشیاء یا بالفاظ دیگر قوائے پیدائش ہی کو حاصل ہے۔ اب ہیگل کی جدلیات کا آغاز انسان اور فطرت کی کشمکش سے ہوگا؟ مارکس کہتا ہے۔ ہرگز نہیں فطرت تو ایک مردہ شے ہے۔ وہ حرکت نہیں کر سکتی جب تک کہ انسان اس کے اندر اپنے عمل سے جان نہ ڈالے۔ اس لئے یہ فطرت انسان کی حریف نہیں ہو سکتی اس کی [illegible] ہی انسان کا حریف — انسان ہی ہے۔ وہ قوائے پیداوار سے متاثر ہو کر

عمل میں لاتا ہے۔ اس طرح تہذیب کی نئی شاہراؤں کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ لیکن اسی تہذیب وتمدن کے ساتھ وہ ایسے معاشی تعلقات بھی پیدا کر دیتا ہے جو اسکے لئے اس کے حریف مہیا کر دیتے ہیں۔ یہ تعلقات انسانوں کو گروہوں، طبقوں اور فرقوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ انہی تعلقات سے ان کا ہر مجلسی اور سیاسی تعلق متاثر ہوتا ہے۔ اور یوں جدلیات کا آغاز ہوتا ہے۔ مارکس کے نزدیک دعویٰ اور جواب دعویٰ یہی طبقات ہیں اور ترکیب ایک ایسی جماعت ہے جو غیر طبقاتی معاشرہ تخلیق کرے گی۔ مارکس کہتا ہے۔ صرف اسی معاشرے کی وجود کی وجود پذیری سے تاریخ شروع ہوگی۔ اس سے پہلے اندھیرا ہے۔

فلسفیانہ طور پر یہ نظریہ ہر اس اذعان کا رد ہے جس کا مفہوم یہ ہو کہ حقیقت کا علم خارج سے ہوتا ہے۔ سیدھے الفاظ میں یوں سمجھئے یہ نظریہ عینی فلسفے اور مذہب کی بنا دہی کے خلاف ہے۔ لیکن یہ کوئی عجوبہ نہیں۔ اور نہ ہم اس کے لئے مارکس کی جانب سے کوئی الزام قبول کرنے کو تیار ہیں۔ وہ جس ماحول اور جس عہد میں پیدا ہوا تھا وہ سارا ایک ہی طرز کا تھا۔ ہیگل کی وفات کے بعد اس کی تعلیم کو مادی جامہ پہنانے میں جن نوجوانوں نے حصہ لیا وہ بائیں ہیگلی کہلاتے تھے۔ آپ اس حلقے کے متعلق اس سے قبل پڑھ چکے ہیں۔ اس حلقہ میں ایک ذہین نوجوان ڈیوڈ فریڈرک سٹراس تھا۔ سب سے پہلے اسی نے ترقی پسندانہ انداز میں مذہب پر وار کیا۔ اس نے ایک کتاب "حیات مسیح" لکھی جس میں اس نے نہایت انوکھے انداز سے یہ ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ نہ تو خود معجزہ تھے اور نہ وہ معجزے باز تھے۔ اور انجیل مقدس کے وہ ابواب جن میں زندگی بعد موت اور معاد کا ذکر ہے وہ تو محض تخیلات ہیں جن کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس گراں بہا اور نادر تحقیق کی وہ دھوم مچی کہ اٹھتی ہوئی جوانیاں بے اختیار متاثر ہونے لگیں۔ انجلز ایک شریف اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا تھا وہ سٹراس کی حیات مسیح ہی پڑھ کر گمراہ ہوا تھا۔ اسی سوسائٹی کے ایک اور رکن باؤر صاحب تھے۔ وہ بھی فلسفہ میں درک رکھتے تھے وہ سٹراس سے دو قدم اور آگے بڑھے اور انجیل کے ڈانڈے یونانی اور رومی ادب سے جا ملائے۔ اور فیورباخ کے متعلق تو آپ پہلے ہی سن چکے ہیں کہ وہ مذہبی کیفیت کا کمال جنسی تعلق کو سمجھتا تھا۔

یہ تو مارکس کا وہ ماحول تھا جس کے اندر اس کا شباب اٹھا۔ وہ خود مذہب کے خلاف شاید کچھ ذاتی عداوت بھی رکھتا ہو لیکن اس کا نظام فکر کی اساس ہی اس امر کی متقاضی تھی کہ وہ مذہب کے خلاف جہاد کرے۔ ہیگلی فلسفہ کی تنقید پر تعارف لکھتے ہوئے اس نے مذہب کے موضوع پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ وہ لکھتا ہے۔ "آدمی مذہب بناتا ہے۔ مذہب آدمی نہیں بناتا"

مارکس نے خود جدلیات کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ تنقید اقتصادیات کے دیباچے میں چند جچے تلے الفاظ میں اس کے بیان لکھے ہیں یا پھر "سرمایہ" میں کہیں کہیں اشارے مل جاتے ہیں۔ البتہ انجلز نے اس طرح جدل کے متعلق "قاطع ڈیورنگ" میں لکھا ہے۔ ڈیورنگ ایک جرمن پروفیسر تھا جس نے ایک کتاب میں ایک نیا نظام فکر پیش کیا جو اشتراکیت، مادیت اور ثنویت سے بالاتر ہو کر بھی اشتراکیت کا دعویٰ رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے خیالات اشتراکیوں میں سرایت کرنے لگے۔ چونکہ اس کے خیالات بے حد جاذب تھے اس لئے خطرہ تھا کہ کہیں اشتراکی بدراہ نہ ہو جائیں۔ اس پر انجلز کو سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کی فرمائش پر اس کی تردید میں کچھ لکھے۔ اس کتاب میں انجلز نے مادی جدلیات کے بنیادی اصول وضاحت سے بیان کئے ہیں۔ فقط۔

اس دور میں کتابیں پڑھنے کا شوق عام ہے۔ فرق صرف کتابوں کے انتخاب اور ان کی نوعیت کا ہے —— مولانا مسعود عالم ندوی —— (دیار عرب میں)

سیرت سید احمد شہید	از مولانا ابوالحسن ندوی	ساڑھے چار روپے
ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	از مولانا مسعود عالم ندوی	۲/۸
اشتراکیت اور اسلام	از مولانا مسعود عالم ندوی	۲/۸
محمد بن عبدالوہاب	از مولانا مسعود عالم ندوی	۲/۱۲
دیار عرب میں	از مولانا مسعود عالم ندوی	۴/۸
قومی ملکیت	از نعیم صدیقی	-/۱۲
[illegible] قرآن	از مولانا امین احسن اصلاحی	-/۴/-
مسلمان اسلام کی کسوٹی پر	از نذیر الحق میرٹھی	۱/۸
اور لیڈر (انگریزی)	از چوہدری محمد اکبر	۴/-
اسلام اور سود	از ڈاکٹر انور اقبال قریشی	۳/۸
مکتوبات حضرت امام غزالی	مترجمہ عبدالوہاب ظہوری	۳/۸
امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	از مولانا مناظر احسن گیلانی	۹/۱۲
فلسفہ علم	از علامہ اقبال	۳/۲
عہد نبوی میں نظام حکمرانی	از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب	۳/۸
قانون بین الممالک	از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب	۳/۸
[illegible]	مترجم محمد عبداللہ المسعودی	۴/-
[illegible]	مناظر احسن گیلانی	۳/۴
[illegible]	اسعد گیلانی	۳/۸
اسلام کا نظام [illegible]	یعقوب الرحمن عثمانی	۲/۱۲

اذکار آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	۳/۸
ارشادات رسول	عبدالرحیم اشرف	۱/۴
دیدار الٰہی	امام ابن رجب حنبلی	۱/-
قانون مکافات	ضیاء الہدیٰ	۱/-
اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں	اصغر علی عابدی	۳/-
عرب کا چاند	سوامی لکشمن جی	ساڑھے تین روپے
تعمیر انسانیت	رقیہ بنت خلیل	آٹھ آنے
سید البشر	قاضی محمد سلیمان سلمان	۱۲/
کنز المجربات جلد اول	حکیم محمد عبداللہ	چار روپے
کنز المجربات جلد دوم	حکیم محمد عبداللہ	چار روپے
خواص دودھ	"	۱/۴
پھلوں سے علاج	"	دو روپے
خواص گیکوار	"	دو روپے
کنز الاطباء	"	۳/-
کنز المفردات	"	۲/-

بچوں کیلئے (الحسنات)

ابتدائی تعلیم کا سلسلہ جس میں قاعدہ، پہلی کتاب، دوسری کتاب اور تیسری کتاب شامل ہے۔ چوتھی بار شائع ہوا ہے۔ قیمت ۱۲/ عبادت ۱۲/ انسان کی کہانی ۸/ انصاف کا چور ۸/ کون بھلا ہے ۸/ گاؤں والے ۸/ نمازنہ ۸/ آپ کیا ہیں ۱۳/ نسرین کی پہیلی ۸/ رفار والے ۸/ سنیچر والے ۸/

ہماری ہر دلعزیز مطبوعات

اسلامیات

تاریخ اسلام طبری	علامہ عبداللہ العمادی	۸/۱۲
اسلامی معاشیات	علامہ مناظر احسن گیلانی	۶/۱۲
اسلامی تہذیب کیا ہے؟	غلام دستگیر رشید ایم اے	۳/
قصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریابادی	۱/۱۲
حضرت ابوذر غفاریؓ	علامہ مناظر احسن گیلانی	۳/۴
النبی الخاتم	" "	۲/۱۲
مکالمات ابوالکلام	مرتبہ عقیل احمد جعفری	۳/۱۲
خدا اور کائنات	ماہر القادری	۰/۹

اقبالیات

روح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خان	۵/۱۲
اقبال کا تصور زمان و مکاں	ڈاکٹر رضی الدین	۰/۱۲
آثار اقبال	مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے	۳/۶
شعر اقبال	سید اشفاق حسین ایم اے	

سیاسیات

[illegible] ہندوستان	مترجمہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی	۲/۸
[illegible]	مترجمہ عثمان صحرائی	۲/۰
سیاسیات [illegible]	عبدالقادر ایم اے	۰/۱۰
[illegible]	قدوس صہبائی ایم اے	۰/۱۲
[illegible]	مرتبہ [illegible]	۰/۶
[illegible]	عبدالقادر ایم اے	[illegible]

افادات محمد علی	رئیس احمد جعفری	۳/۱۲
نگارشات محمد علی	" "	۳/۱۲
مطائبات محمد علی	" "	۲/۸

تاریخ ۔ تدریس ۔ ادب ۔ تنقید ۔ فلسفہ

مختصر تاریخ ادب	سید اعجاز حسین ایم اے	۵/۴/-
تدریسی طریقے	سید عبدالحکیم ایم اے	۴/۰
ان پڑھ ہندوستان	ملا فخر الحسن ایم اے	۳/۴
سبیل کی سرگزشت	رشید احمد صدیقی ایم اے	۲/۱۲
روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین ایم اے	۲/۰
تنقیدی جائزے	" "	۲/۱۲
تنقیدی حاشیے	مجنوں گورکھپوری ایم اے	۲/۱۲
ترقی پسند ادب	عزیز احمد بی اے	۲/۱۲
داستان اردو	نصیر حسین خاں خیال	۰/۱۲
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم ایم اے	۲/۰
تاریخ سادات امروہہ	جمیل احمد نقوی	[illegible]
اردو غزل	از ڈاکٹر [illegible]	[illegible]

نفسیات

تعمیر حیات	ترجمہ فیروز شاہ [illegible]	[illegible]
شخصیت و کردار	شبیر محمد اختر	[illegible]
بچوں کی نفسیات	" "	[illegible]
نفسیات [illegible]	" "	[illegible]

مطالبہ مکتبہ رزاقی ۔ نبیر روڈ کراچی



دستور پاکستان میں شامل ہے
اس کو اسلامی نقطہ نظر
سے جانچنے کے لئے
"دو دستوری خاکے"
(از نعیم صدیقی)
کا مطالعہ بہت ضروری
ہے۔
دوسرا ایڈیشن اہم ترمیمات
اور اضافوں کے ساتھ شائع
ہو گیا ہے

اشتراکی اخلاق کی اقدار
اشتراکیت معاشرہ
کی بنیاد میں کن اخلاقی قدروں
پر رکھنا چاہتی ہے۔ اس کے
نزدیک مذہب، عائلی زندگی
صنفی اخلاق اور لٹریچر و ادب کی
کیا حیثیت ہے۔ اس حقیقت
کو جاننے کے لئے نذر محمد خالد آپ کی
خدمت میں "اشتراکیت، مذہب
اور اخلاق" پیش کرتے ہیں۔

پاکستان میں سوشلسٹ [illegible]
[illegible] انقلاب کا نمونہ آپ [illegible]
[illegible] انقلاب میں دیکھئے
کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ اشتراکی
[illegible] انقلاب کس طرح ہوتے ہیں
اشتراکی روس میں [illegible]
[illegible]

جب کبھی آپ بیمار ہوں

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوائی لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں قیمتی اور اصلی ادویہ نسخوں کے صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے۔ کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپ کے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی اس دور کاذب اور اشتہاری زمانہ میں بھی اس دعوے کے معیار پر پورا اتر رہا ہے

عالیجناب امام طب حکیم نذیر احمد دہلوی کی سرپرستی دواخانہ اس کی

صداقت کی بہترین دلیل ہے

حکیم صاحب موصوف کسی نئے تعارف کے محتاج نہیں۔ ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات خصوصاً عرصے دراز سے صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ فن طبابت میں وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے قیمتی سال مسلسل طور پر **مسیح الملک** حکیم **اجمل خاں** صاحب مرحوم دہلی کے طبیب خصوصی کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں گزرے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ کے [illegible] مسلسل چھ سال تک نگران رہے ہیں **کتاب حاذق** اور **مطب کامل** آپ کی دو مایہ ناز اور مقبول عام تالیفات [illegible] ہیں۔ آپ **طبیہ کالج دہلی** کی اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں آپ کی طبی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج نے آپ کو امام الطب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکیم صاحب موصوف بہ نفس نفیس حاذق دواخانہ کے جملہ امور کے نگران ہیں۔ اور مطب کے علاوہ اپنا تمام وقت اور توجہ دواخانہ ہذا کی اصلاح و درستی میں صرف کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی نگرانی میں تیار کرائے ہوئے اس دواخانہ کے مرکبات آپ کی صحت کے بہترین ضامن ہیں۔

ملنے کا پتہ

مینیجر۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

Only Title Printed at the Shan Electric Press, Arambaugh Road, Karachi,

Print [illegible] & Publish [illegible] Moh [illegible] Chaudhri



ماهنامه

چراغِ راہ

۳ ـ عدد ۸ —— ۹ لوٹیا بلڈنگ ـ آرام باغ روڈ ـ کراچی ۱ —— ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء

سالانہ: ـــ پانچ روپے　　　قیمت فی پرچہ: ـــ ۸ آنے

(ادارہ تحریر)

[illegible]

سوچ بچار

ہمارے "اسلامی ادب" کے کمزور پہلو

ایک وقت تھا کہ ہمارا ادب صرف مقالات کے میدان تک محدود تھا، یا پھر زیادہ سے زیادہ ہمارے پاس کسی قدر سرمایہ صحافتی ادب کا موجود تھا۔ لیکن شعر، افسانے اور تمثیل کا میدان خالی پڑا تھا۔

ہماری آنکھوں کے سامنے تفریحی ادب کے میدان میں تمام تر تاخت الحاد، اشتراکیت اور فرنگیت کے افکار کی ہو رہی تھی۔ اور ہم سر میدان کھڑے یہ سوچ رہے تھے کہ اس میدان میں ہم داخل ہوں تو کدھر سے، اور معرکہ کا آغاز کریں تو کیسے!

ہمارے سامنے کوئی راہ بنی بنائی موجود نہیں تھی! اسلامی آرٹ کے کوئی نمونے نہ تھے، جن کی تقلید سے ہم آغاز کار کرتے، فن کے لئے کوئی اصول و نظریہ مدون نہیں تھا۔ چنانچہ اچھے اچھے لکھنے والے جو جاہلی ادب کے میدان میں شہسوار رہ چکے تھے اسلام لانے کے بعد قلم ہاتھوں میں ساکت و صامت بیٹھے تھے، جیسے وہ بالکل خام فکر ہوں جیسے ان کو اپنے دل کی بات کہنا نہ آتا ہو جیسے وہ بالکل بے مشق ہوں!

آخر ہمارے اِکا دُکا ساتھی پہلے پہل شعر کے میدان میں نکلے، انہوں نے ٹھوکریں کھائیں، انہیں چوٹیں آئیں۔ وہ کئی کئی بار گرے، اور کئی کئی بار سنبھلے، کبھی آگے بڑھے تو کبھی پیچھے پلٹ آئے۔ اسی جدوجہد کے نتیجے میں نقوشِ پا بنے، ایک دھندلا سا راستہ نمودار ہوا، اس راستے کے لئے کچھ نشانات سنگ میل بننے لگے، اور پھر یکایک محسوس ہوا کہ افراد کی ایک ٹولی کی ٹولی نکل کھڑی ہوئی ہے، اور اس کے سامنے حد نگاہ پر ایک منزل مقصود کے آثار محسوس ہونے لگے۔

ٹولی جب نکل کھڑی ہوئی تو کچھ راستہ طے کرنے کے بعد اس میں سے بعض لوگوں نے شعر کے راستے کے آس پاس افسانہ و تمثیل کی وادیوں کو بھی پامال کرنے کی جسارت کا آغاز کیا اور ان وادیوں میں بھی نئے راستے پیدا ہونے لگے ـــ نئی لکیریں، نئے نقوش، نئے نقاط اور نئے خطوط اور اب چاہے فنی لحاظ سے ہم کوتاہ ہوں، مقصدی لحاظ سے ہم اسلامی ادب کی ماہیت کا ایک متعین تصور رکھتے ہیں اور آہستہ آہستہ وہ قدریں ہماری نگاہوں کے سامنے واضح ہو رہی ہیں جو اسلامی ادب کو جاہلی ادب سے امتیاز دلاتی ہیں۔

آغاز کار سے اب تک کا مرحلہ حوصلہ افزائی کا متقاضی تھا، اور اس میں ہمارا ادب کے ساتھیوں کو گامزن کرنے کی ضرورت تھی لیکن اب ہم جس مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اس کا تقاضا دوسرا ہے یعنی اب ہمیں اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینے اور تنقیدی صلاحیتوں کو بیدار کرنے سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ان دونوں مرحلوں کی درمیانی سرحد پر کھڑے ہو کر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنے تخلیق کردہ ادب کا کچھ جائزہ لیں اور پھر آگے بڑھیں تو سوچ سمجھ کر اور جانچ بوجھ کے بڑھیں۔

اس سے پہلی چیز جس کا مجھے شدت سے احساس ہے وہ "جدت" کی کمی ہے۔ تفریحی ـــ شعری و افسانوی ادب کی ساری قدر و قیمت پر منحصر ہے کہ لکھنے والا جو کچھ لکھ کے لائے اس میں ہر پہلو سے ایک "نیا پن" ہو، وہ دل و دماغ کے نئے دریچے کھولے، وہ تشبیہ و استعارہ کی نئی جولانیاں دکھائے، وہ جب کبھی بزم میں وارد ہو تو فکر و تخیل کے نئے جواہر لٹاتے جائے۔ اس کا ہر امروز دوش سے آگے نکل جانے والا ہو اور فردا اس کے امروز سے کئی میل آگے واقع ہو۔ الغرض ہمارے ادب کے لئے "کل یوم هو فی شان" کا اصول پیدا کرنا بہت ہی ضروری ہے۔

آج کی ضرورت فکر و تخیل ہی کو نہیں، بلکہ عنوان بندی، اسلوب، پلاٹ، مکالمہ، منظر کشی، واقعہ نگاری، جذبات کی تصویر کشی، غرضیکہ ادب کے ہر پہلو کو ہے۔ لیکن ہمارے حلقۂ ادب میں فکر، اسلوب اور عنوان میں سے ہر ایک کا حال یہ ہے کہ گویا کولھو کے گرد بیل جتا ہوا ہے اور وہیں کا وہیں گھوم رہا ہے ——— جو چلنے کو چاہے تو سو میل کی مسافت طے کر جائے مگر منزل اور مرحلہ دس سال بعد بھی وہی ہے جو اول روز تھا۔

نئے نئے راستے نکالنے کی صلاحیتوں کو نشو و نما نہ دینے سے بہت سی خرابیاں ہیں جو ہمارے ہاں کے ادبی کارناموں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً آپ اپنے ادب کے پورے عجائب گھر کی سیر کر جائیے، آپ کو گوناں گوں موضوعات فکر کا ایک چمن کھلا ہوا نہ ملے گا۔ بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ایک وقت میں آپ کے تمام شعراء اور تمام افسانہ نگاروں کا موضوع کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ ایک ہی ہو گا۔ موضوع کی اس یکسانی کا اثر یہ ہے کہ اگر آپ کے کسی رسالے کو اٹھا کر کوئی شخص ایک آدھ نظم اور ایک آدھ افسانہ پڑھ لے تو بقیہ کو پڑھنے کی ضرورت اسے نہ رہے گی۔ ان دنوں ہمارے ادیبوں نے قیادت کے موضوع کو نوک قلم پہ دھر لیا ہے اور اب اس موضوع سے ہٹ کر سوچنے اور لکھنے والا کوئی نہیں رہا۔۔۔ الا ماشاء اللہ

ستم کی حد یہ ہے کہ بعض نظمیں، بعض خاکے اور بعض افسانے باہم پوری طرح منطبق ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں کہیں تو الفاظ اور بندشیں، تشبیہیں اور استعارات، اور قوافی، پلاٹ اور کردار تک اتنے یکساں ہیں کہ کسی بیرونی مبصر کی طرف سے اگر ہم میں سے بعض لکھنے والوں پر "سرقہ" کا الزام عائد کر دیا جائے تو ہمارے لئے اسے توارد ثابت کرنا ممکن نہ ہو گا۔ یہ صورت عام نہ سہی، تاہم اتنی بات تو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہمارے دو ایک ادیبوں کا رنگ پوری فضا پر مسلط سا ہوا جا رہا ہے۔ جو طرز انہوں نے ایجاد کیا ہے اس کو اختیار کرنا گویا لکھنے والے کے نزدیک واجب ہوتا جا رہا ہے۔ محض پہلے لکھنے کی بنا پر اور چند قدم زیادہ راستہ طے کرنے کی بنا پر ان کو امام تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اور ان ائمہ کرام کی تقلید ادب اسلامی کی شریعت روایات میں غیر شعوری طور پر واجب ہوتی جا رہی ہے۔ اندیشہ ہے کہ ہمارا حلقۂ ادب "دنیائے ادب کا ایک "حنفی فرقہ" نہ بن جائے، حالانکہ ہم اسلامی ادب کی ایک امت ہیں، ہمیں کے اندر مسالک کے اختلافات کی ان تمام گنجائشوں سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیئے۔ جو بنیادی اصولوں کی وحدت کے تقاضوں سے محدود ہیں۔ الغرض ادب میں "اجتہاد" اور "انفرادیت" کی اشد ضرورت ہے۔

علی ھذا القیاس ہمارے ادب میں سیاسی موضوعات ایسے گھسے ہیں کہ پوری فضا پر ان کا تسلط ہو چکا ہے۔ بلاشبہ سیاسی مسائل کا مقام ادب میں ہے جیسے تمام دوسرے انسانی مسائل کا ہے، لیکن نہ اس حد تک کہ ہر نظم اور افسانہ "سیاسی جلسہ" ہو کر رہ جائے، اور بقیہ مسائل حیات نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں۔

درحقیقت ادب کو سیاسی مسائل سے زیادہ معاشرتی مسائل پر اپنی توجہ دینی چاہیئے، ہماری مجلسی زندگی، ہماری خاندانی زندگی اور ہماری کاروباری زندگی میں اخلاقی مفاسد کی وہ بھرمار ہے کہ اس نے سوسائٹی کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ ایک صالح سیاسی نظام کو چلانے کے امکانات ابھریں اور سیاست کے اسٹیج پر کام کرنے کے لئے بھلے کردار پرورش پا سکیں۔

وہ ادیب کبھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جو اپنے قریبی ماحول میں روزمرہ زندگی کے احوال و واقعات سے آنکھیں بند کر کے صرف اسمبلی ہال اور کیبنٹ ہاؤس کے گرد طواف کرتا ہے، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سڑکوں سے گذرتے ہوئے، بازاروں میں لین دین کرتے ہوئے، مجلسی تعلقات کے تقاضے پورے کرتے ہوئے دن رات انسانیت کی جو ہولناک لغزشیں دیکھتے ہیں اور ضعف و قوت کی کشمکش کے جن دردناک نتائج سے دوچار ہو جاتے ہیں، ان میں بھی کوئی سرمایۂ فکر ادب نہیں ملتا۔ اس طوفان حوادث سے دور ساحل

پر ارباب سیاست کی جو گرفت ہی ہے ہم صرف اس کی تصویر کشی کو آرٹ کا فرض سمجھ بیٹھے ہیں۔

یقیناً ہم ایک سیاسی کشمکش سے بھی دوچار ہیں اور اس کے اثرات ہمارے ذہنوں پر گہرے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کچھ جذبات اندر پیدا ہوتے ہیں اور وہ ظہور کے لئے ادبیات میں اپنا راستہ نکالتے رہیں گے۔ لیکن ہمیں یہ کبھی بھولنا نہ چاہیئے کہ ایک ادیب فرد بھی نہیں ہوتا وہ ادیب بھی ہوتا ہے اور بہ حیثیت ادیب اس کے فرائض دائرہ سیاست سے باہر بھی ہیں ——— اور وہ کچھ زیادہ ہیں

سیاسی موضوعات پر توجہ منعطف کر دینے کا ایک نمایاں اثر یہ ہے کہ ہمارے ادب میں کھلے کھلے پروپیگنڈے نمایاں ہے۔ ہماری نظمیں اور افسانے اگر ایک اصول کی طرف بلاتے اور ایک اصول سے نفرت دلاتے، بعض مقاصد سے اور بعض مقاصد کی طرف بلاتے، ایک نقشۂ سیرت کے خلاف جذباتِ کراہت پیدا کرتے اور دوسرے نقشۂ سیرت سے پیدا کرتے تو یہ صرف درست ہی نہیں تھا' بلکہ یہی عین مقصد و مدعا تھا ہمارے ادب کا! اور اس چیز کو پروپیگنڈا نہیں کہا! پروپیگنڈہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کچھ اشخاص سے نفرت دلائیں اور کچھ اشخاص کی طرف بلائیں، کسی پارٹی سے لوگوں کو توڑ لیں اور کسی خاص پارٹی سے ان کا رشتہ جوڑنے کے لیے کھلے کھلے طریق سے دعوت دیں۔ بعض یہ چیز پیدا ہوئی، ادب تمام تر پروپیگنڈہ اور اس معنی میں ہم نے فی الواقع اپنے ادب کو تمام تر پروپیگنڈہ بنا دیا ہے۔

جو ادب پروپیگنڈے کی تعریف میں داخل ہوتا ہے اس کی مثال بالکل ویسی ہوتی ہے جیسے لاؤڈ اسپیکر تانگے پر فٹ کر کے ا میں کسی جلسۂ عام کی شمولیت کے لئے منادی کی جا رہی ہو، یہ منادی چاہے کتنے ہی خوبصورت، پُر جوش اور جذبہ انگیز الفاظ میں ہو آر کے نقطۂ نظر سے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ پروپیگنڈہ چاہے ادب کا کتنا ہی خوشنما جامہ پہن کے آئے اسے دنیائے انسانیت کی ذم ہمشری میں کوئی دوامی قدر حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ گناہ نہیں کہ آپ وقتی تقاضوں کے تحت اپنے قلم سے پروپیگنڈہ کی کوئی چیز لکھ ڈالیں اور اس سے ایک خاص طرح کے ما میں کسی قدر فائدہ حاصل کر لیں، لیکن اگر ادبیات کا مستقل انداز ہی یہی بنا ڈالا جائے تو پھر مقامِ تشویش ہے، آج اسی مقامِ تشویش سے دوچار ہیں۔

مطالعہ و تفکر دونوں اوصاف ادیب کے بنیادی لوازم میں سے ہیں، مگر ہم لوگ اس معاملے میں بھی پیچھے ہیں۔

مطالعہ سے مراد کتابی مطالعہ بھی ہے اور عملِ زندگی کا مطالعہ بھی!

اوّل الذکر پہلو سے اسلام ناشناس ادب پر، اس کے اصول و نظریات پر، اس کی فکری جڑوں پر، اس کی تاریخِ ارتقا پر، اس کے مختلف ادوار پر، اس کے مدارسِ فکر کے اختلاف پر، اور اس کی تازہ ترین تخلیقات پر ایک مسلم ادیب کی نگاہ ہونی چاہیئے ——— پھر ملکی حد تک بین الاقوامی حد تک۔

موخر الذکر پہلو سے ہم روزمرہ زندگی کے احوال و شئون، ماحول کے مدوجزر، سوسائٹی کے محاسن و مفاسد، تہذیب کی کشمکش نیز انسانی کرداروں کے نقوش و نگار، جذبات و احساسات کی تحریکات وغیرہ سے ادیب کا قریب ترین ——— بلکہ تازہ ترین واقفیت رکھنا سکتے ہیں۔ اس کے بغیر نگارشات میں نہ جدت پیدا ہوتی ہے، نہ واقعیت، نہ گہرائی، نہ توازن!

تفکر سے مراد یہ ہے کہ ایک ادیب عام انسانوں کے مقابلے میں جہاں مشاہدہ کی قوتوں سے زیادہ کام لیتا ہے۔ وہاں وہ مطالعۂ احوال کے بعد ان کے تجزیہ میں، ان کے وجوہ و اسباب کا کھوج لگانے میں، ان کے نتائج کا اندازہ کرنے میں، ان کے مفاسد کی اصلاح کے راستے نکالنے میں، ان میں مطلوبہ تغیرات کے متعلق رائے قائم کرنے میں حساس تر ہوتا ہے۔ ایک ماحول میں ایک ہی واقعہ کو ہزاروں آدمی دیکھتے ہیں لیکن وہ کوئی ادب اس سے پیدا نہیں کر سکتے، دوسری طرف اسی واقعہ کو ادیب دیکھتا ہے۔ لیکن وہ اس میں سے ساری نوعِ انسانی کے لئے کوئی شعر یا افسانہ تراش کے لے آتا ہے، یہ اس کے قوائے فکر کی پرکاری کا کرشمہ ہے۔ اگر یہ قوائے کند ہوں تو آدمی ادیب نہیں ہو سکتا، اور زبردستی ادیب بنے تو اس کے ادب میں جان پیدا نہیں ہو سکتی۔

مطالعہ و تفکر کے ان اوصاف میں ہماری کمزوریوں کا ایک کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے شعر و افسانہ میں گہرائی مطلقاً ناپید ہے، ہم صرف ابتدائی قسم کے جذبات، سرسری قسم کے احساسات جو ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو سادگی سے آگے منتقل کر دیتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ ہماری نظمیں اور افسانے ہمارے قارئین کے سامنے غور و فکر کی ایسی شاہراہیں کھول دیں جن پر چلنے والے کو نو بہ نو منازل کا سراغ ملتا چلا جائے۔ ہماری نگارشات دوسروں کو سوچنا نہیں سکھاتیں۔ ان کے قوائے ذہن کا زنگ نہیں کھرچتیں، خود ان کے اپنے استدلال کو جگا کر اسے تحریک نہیں دلاتیں۔ بلکہ وہ صرف جذبات میں لہریں اٹھا کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے پاس شاید ہی چند ادبی نمونے ایسے ہوں جن کو پڑھ کر لوگ سوچنا سیکھیں، اور سوچنے کو اپنا فرض سمجھیں

ادبیات میں حقیقت نگاری اور واقعیت کی بڑی اہمیت ہے، تخیل کا مقام اپنی جگہ اگر تخیل واقعیت کی حدود کو پھاند کر اپنے حالات دکھائے تو نگارشات کی قدر و قیمت دیرپا نہیں ہوتی، لیکن بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت نگاری یا واقعیت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی خاص واقعہ کو جو عمل میں آیا ہو نمک مرچ لگا کے ـــــ اور نام و مقام بدل کے ـــــ بیان کر دینے سے ایک آدمی واقعیت نگار بن جاتا ہے، یہ بالکل غلط ہے،

یہ کام وقائع نویس کا ہے یا مورخ کا! ـــــ اور جو یہ کرے وہ وقائع نویس اور مورخ تو بن سکتا ہے، افسانہ نگار یا ادیب یا تمثیل نگار نہیں بن سکتا۔

بدقسمتی سے ہمارے حلقے کے بہت سے ادیب وقائع نویسی اور تاریخ نگاری کا کام افسانہ و تمثیل سے لے رہے ہیں لیکن کام بھی اس غلط صورت میں خود بھونڈا ہو جاتا ہے، ـــــ کجا کہ اس طرح اچھے افسانے اور تمثیلات پیدا ہوں۔

ادب میں واقعیت نگاری کا مفہوم یہ ہے کہ ایک افسانہ و تمثیل کو اس طرح لکھا جائے کہ وہ انسانی ذہن اور ماحول کے لحاظ سے پہلو سے نامانوس، ناممکن، غیر متناسب اور خیالی محسوس نہ ہو، بلکہ جن مفاسد کے خلاف وہ تحریک دلائے وہ گرد و پیش میں موجود ہوں اور جن محاسن کو وہ اجاگر کرنا چاہے وہ ماحول کی ذہنی سطح کے لحاظ سے "معروف ہوں" اور جن کرداروں کو وہ استعمال کرے وہ سوسائٹی میں پائے جاتے ہوں۔

نہ یہ کہ ایک افسانہ یا تمثیل لکھنے کے لئے ادیب اس تلاش میں رہے کہ کہاں سے اسے بنا بنایا ایک واقعہ مل جائے اور اسے وہ اس سے اس طرح سے جوں کا توں قلمبند کر کے پیش کر دے، اور جب تک حسنِ اتفاق اس کی ضرورت پورا کرنے پر تیار نہ ہو وہ قلم لئے رہے۔

[illegible]

یہ خوب سمجھ لیجئے کہ واقعات کبھی افسانہ وتمثیل کے تقاضوں کے مطابق مرتب نہیں ہوا کرتے اور واقعات کو جوں کا توں بہ کر دینے سے کامیاب افسانہ وتمثیل وجود میں نہیں آ سکتے۔ انسانی سوسائٹی افسانے نہیں لکھتی اور وہ ڈرامے نہیں کیا کرتی ——— وہ افسانہ نویس ہے، نہ تمثیل نگار۔ افسانہ وڈرامہ کو وجود دینا تو صرف ادیب کے ذہن وقلم کا کام ہوتا ہے۔ اور وہ شخص کوتاہی عقل مبتلا ہے جو کسی افسانہ وتمثیل کو پڑھنے کے بعد سوسائٹی میں اس کی جستجو کرنے نکلتا ہے سوسائٹی کے پاس جو واقعیت ہوتی ہے نری ٹھوس واقعیت ہوتی ہے، لیکن ادیب واقعیت کے ساتھ تخیل کو جب گوندھ دیتا ہے اور پھر اسے ایک سانچے میں ڈھالتا ہے تو پھر افسانہ یا تمثیل کا وجود ظہور پاتا ہے۔ اس طرح کے واقعاتی افسانہ وتمثیل کو سوسائٹی میں تلاش کرنے کے لئے اگر آپ نکلے پہلے آپ کو اسکی وہ "خاص صورت" اس سے الگ کرنی پڑے گی، جو ادیب کے بنائے ہوئے سانچے نے اسے عطا کی ہے، پھر جو ہوا جائے گا اس میں سے تخیل کی آمیزش کو چھانٹنا ہوگا، اب آخر میں جو نری ٹھوس واقعیت رہ جائے گی وہ آپ کو اپنے ماحول جا بجا مل سکتی ہے۔ یہ فرق ہے واقعات کی واقعیت اور ادبیات کی واقعیت میں۔

واقعیت پسند ادیب کا ذہنی طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کے بے شمار واقعات کو حواس کے ذریعے جمع کرتا رہتا ہے پھر ان جمع شدہ واقعات کو وہ کڑھاؤ میں ڈال کر جذبات کی آنچ سے کھولاتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کا قوام تیار ہو جائے، وہ اس قوام گرفتہ مواد کو کسی خاص پلاٹ کے شیشۂ نازک میں بھرتا ہے، اس شیشے کی ایک خاص ہیئت ہوتی ہے اور اس ہیئت کو تخیل ایک خاص رنگ سے رنگین کرتا ہے، ادیب کی آزمائش اسی میں ہوتی ہے کہ اس نے مواد کیا جمع کیا۔ اس کا قوام کیسا، اس کے لئے شیشے کی ہیئت کیا منتخب کی اور اسے کس رنگ سے رنگین کرنا مناسب سمجھا۔ اگر ان آزمائشوں میں وہ کامیاب رہا تو افسانے میں اس کی واقعیت پسندی کا معیار قائم رہتا ہے، ورنہ نہیں،

ایک ادیب جن واقعات کی کڑیوں کو جوڑ کر اور جن مختلف کرداروں کو جمع کر کے افسانہ وتمثیل کو وجود دیتا ہے، ان میں جزاً جزاً تو ہر کا وجود سوسائٹی میں پایا جاتا ہے، لیکن وہ سب یکجا نہیں ہوتے۔ ان کو یکجا کرنا ادیب کے ذہن کا کام ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک واقعہ ۱۹۴۷ء کا ہو اور دوسرا جزئی واقعہ سنہ ۱۹۵۰ء کا، ایک مظاہرۂ جذبات کو ادیب نے کراچی سے لیا ہو اور ایک مکالمہ کو کلکتہ سے، ایک مسجد کا نقشہ لے پشاور سے اور اس کے لئے امام لے آئے بنگلور سے۔ وہ ایک کردار کہیں سے لے اور دوسرا کہیں سے، وہ شکل و صورت کسی کی لے، نام کسی اور کا لے اور حرکات وسکنات کسی اور کی اختیار کرے اور اس طرح ایک گلدستہ ایسا تیار کرے کہ ہر پھول بجائے خود تو واقعیت کے چمن سے توڑ کر لایا گیا ہو، لیکن اس پورے چمن میں چراغ لے کے ڈھونڈیئے تو بھی اس کا کوئی گلدستہ کہیں نہ مل سکے، اگرچہ ہزاروں گلدستے تیار کرنے کا سامان وہاں موجود ہے۔ اب اگر کوئی نادان مالی واقعیت کا مفہوم یہ سمجھے کہ باغ سے پھولوں کے کسی پودے کو گملے سمیت اٹھا کے لے آنا اور اسے "صاحب" کی میز پر رکھ دینا کمال فن ہے تو شاید ہی کوئی قدر شناس دنیا میں مل سکے، "فن" نام ہی واقعات میں تخیل کے مداخلت کرنے کا ہے، یہ مداخلت نہ ہو تو افسانہ کیسے وجود میں آئیں،

ہمارے ہاں واقعیت اسی طرح کی غلط صورت میں آ رہی ہے، لیکن وہ کسی سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کا نتیجہ نہیں، کیونکہ واقعیت سے متعلق کوئی عقیدہ و نظریہ کارفرما نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل اسباب یہ ہیں:-

(۱) لوگوں میں واقعات کا بیشتر حصہ جمع کرتے رہنے، اسے چھانٹنے پھٹکنے، اس کے مرکبات تیار کرنے [illegible]

ے اور واقعات کی نئی ترکیبیں پیدا کرنے کی پتہ ماری سے گریز پایا جاتا۔

(۲) تخیل اتنا سبک اور چابک دست نہیں ہے، کہ وہ واقعیت کو اس کی ٹھوس حالت سے فنی حالت کی طرف منتقل کرنے کے لئے حالات دکھائے،

(۳) پلاٹ کے تخیلی سانچے بنانے کی مہارت نہیں ہے۔ اس لئے بنے بنائے واقعاتی سانچوں سے کام لیا جا رہا ہے،

لیکن آگے چلنے سے پہلے ہمیں اپنی اس کمزوری کو دور کر لینا چاہیئے، کہ ہم ادھر ادھر سے کوئی واقعہ لے کر اسے نمک مرچ لگا کر رکھ دیں۔ بلکہ بعض اوقات تو اپنے ذاتی حالات کو یا اپنے کسی عزیز دوست یا کسی مخالف کی زندگی کے کسی واقعے کو افسانوں میں ... کی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں، اب یہ عادت چھوڑ کر ہمیں ادیبوں کی ذمہ داریوں کو محسوس کرنا چاہیئے،

اسلامی ادب وجود میں آتے ہی طنز کی طرف زیادہ جھک گیا ہے۔ اس کا اصل سبب تو وہی ہے کہ ایک دو ادیب جو اول اول اس راہ میں آئے ان میں طنز کا ذوق گہرا تھا، اور اس نے اپنا راستہ نکالا۔ لیکن اب سارے کے سارے لکھنے والوں کی توجہ اسی ایک ... منعطف ہو گئی ہے، یہ صورت مہلک ہے،

ہر ادیب کو اپنے شخصی ذوق اور رجحانات کا جائزہ لے کر اپنے لئے ایک خاص راستہ نکالنا چاہیئے۔ جیسے ہم شخصی ... ل میں مختلف طبائع رکھتے ہیں، مثلاً کوئی غصہ ور ہوتا ہے، کوئی نرم خو، کوئی سنجیدہ و متین ہوتا ہے، کوئی لطیفہ گو، کوئی ... تند خو ہوتا ہے، کوئی خلوتی، کوئی سخن طراز ہوتا ہے، کوئی کم سخن ——— اسی طرح شعر و افسانہ کے میدان میں ہر ... شخصیت کا اظہار مختلف اسالیب سے ہوتا ہے اور یہ اختلاف اسالیب اگر ختم ہو جائے تو وہ رنگا رنگی نہیں پیدا ہوتی ... زندگی کا ایک بہترین جوہر ہے، اور اس کے فنیات میں انفرادیت کا انداز پیدا کرتی ہے۔

بطور مثال میں کہونگا کہ مزاح کے پہلو سے ہمارے پاس ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب کے لکھے ہوئے "سیر و سفر ... ف بر طرف" کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے، کوئی مزاحیہ افسانہ، کوئی مزاحیہ ڈرامہ، اگر آپ دوسروں کے سامنے نمونہ ... چاہیں تو کہاں سے لائیں گے۔ آپ نے انسانی خوف و دہشت کے جذبات کو آج تک کبھی نمایاں نہیں کیا، آپ نے ... مد کے محرکات کو کام کرتے ہوئے نہیں دکھایا۔ آپ نے دنگے فساد کی نفسیات کو پیش نہیں کیا۔ آپ نے شجاعت اور تہور ... ابھار نہیں کئے ——— غرضیکہ سینکڑوں راہیں کھلی پڑی ہیں، اور آپ نے ان میں سے کسی پر قدم نہیں رکھا۔ یوں ... نہیں چلے گا۔

پھر آپ کے ہاں چند افسانے ——— جن میں سے بہت کم تعداد معیاری افسانوں کی ہے ——— ضرور ہیں لیکن ڈرامے کے میدان میں کتنی چیزیں ہیں کہ ان کو پیش کر کے ہم لوگوں کو یہ بتا سکیں کہ ڈرامے میں اسلامی ادب کا راستہ ادھر سے ادھر کو جاتا ہے۔

خدارا ایک ڈگر نہ بنایئے اور بھیڑ چال نہ چلئے۔

... تقابلی توجہ کمزوری، زبان، محاورے اور فن کی معلومات کی کمی ہے، صرف اتنا ہی نہیں کہ اس معاملے میں کوتاہی مطالعہ

کام کر رہی ہے، بلکہ ایک عام لاپرواہی کار فرما ہے، ان امور میں ہم مختار مطلق بن کر آنکھیں بند کئے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، چنانچہ ہماری نگارشات میں زبان اور فن کے لحاظ سے ایسی ایسی نادر مثالیں پائی جاتی ہیں کہ ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے کہ نہ معلوم کب ہمارا ـــــ بلکہ خود اسلامی ادب کا ـــــ مذاق اڑایا جانے لگے، اور ہمارے لئے شرمندگی سے منہ چھپا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو - اتنا بھی تو اہتمام ان معاملات میں نہیں ہے کہ اپنی لکھی ہوئی چیزوں کو کچھ دیر زیرِ غور رکھا جائے، انہیں دو چار مرتبہ پڑھا جائے، ان میں جو مقامات کھٹکیں، یا جہاں کچھ اشتباہ ہو، ان کے بارے بارے میں دوسروں سے مشورہ لیا جائے، لغت کی چھان بین کی جائے، اساتذہ کے ہاں تلاش کئے جائیں، اور اشاعت کے لئے کوئی چیز اس وقت دی جائے، جب شرحِ صدر حاصل ہو جائے،

انتہا یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والوں میں اوقاف کا استعمال جس لاپرواہی سے کیا جاتا ہے وہ بالعموم یہ غمازی کرتی ہے کہ زبان و محاورہ تو خیر بڑی چیز ہے، گرامر ہی کا فاقہ ہے!

آگے چلنے سے پہلے اس کمزوری کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے

سطورِ بالا کا منشا یہ نہیں کہ ہماری نگارشات صرف تاریک پہلو ہی رکھتی ہیں، اور ان تاریک پہلوؤں کو دیکھ دیکھ کر ہمیں بد دل ہو کر بیٹھ رہنا چاہیئے، بلکہ یہ باتیں آگے کے مرحلے میں قدم رکھنے سے پہلے اس مقصد کے تحت عرض کی جا رہی ہیں، کہ ایک طرف لکھنے والے زیادہ اچھی طرح تیار ہو کر اور سوچ سمجھ کر لکھنے کا اہتمام کریں اور دوسری طرف اب تنقید کی نگاہیں محاسبہ کرنے میں پوری فرض شناسی سے کام لیں -

یہاں تنقید کی ذمہ داری سنبھالنے والوں سے یہ گذارش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ :-

(۱) تنقید کے لئے آہستہ آہستہ کچھ اصول ذہنوں میں متعین کیجئے،

(۲) تنقید کو تعارف یا تنقیص سے ممیز رکھیے،

(۳) تنقید کے لئے " وزنوا بالقسطاس المستقیم" شرطِ اول ہے،

(۴) تنقید میں " ترقی پسندوں" کی سی زبان اور اسلوب سے بچ کر اپنا ایک خاص انداز پیدا کیجئے،

اعتذار

چراغِ راہ کو بروقت نکالنے کی کوشش " لبِ بام" پہنچ کے ناکام ہو گئی - کاتب نے چار تیار شدہ کاپیاں گم کر دیں، عجلت میں ان کی دوبارہ کتابت کرانے کے لئے دو تین کاتبوں سے کام لیا گیا' اس طرح کتابت کا معیار پہلے سے بھی پست تر ہو گیا - قارئین سے توقع ہے کہ وہ اس معذرت کو قبول فرمائیں گے -

(ادارہ)

اسلامی حکومت کی ماہیت

(وہ کیا نہیں ہے؟ وہ کیا ہے؟)

نعیم صدیقی

فہرست مباحث:

۔۔دستوری (Un-constitutional)	نہیں ________ دستوری	(Constitutional)	ہے
لادینی (Secular)	نہیں ________ دینی	(Theo-deomocratic)	ہے
قومی (...onal)	نہیں ________ اصولی	(Ideological)	ہے
مفاد پرست (Utilitarian)	نہیں ________ اخلاق پسند	(Moralist)	ہے
منقسم (dualistic)	نہیں ________ وحدانی	(Unitarian)	ہے
مطلق العنان (Unlimited)	نہیں ________ پابندِ حدود	(Limited)	ہے
اشرافی (autoratic)	نہیں ________ عوامی	(Papular)	ہے
آمری (dictatorial)	نہیں ________ شورائی	(Parlimantry)	ہے
وراثتی (heirarchical)	نہیں ________ انتخابی	(Electoral)	ہے
کثیر الحزبی (Multi-party)	نہیں ________ لاحزبی	(Non-party)	ہے
رسوم پرست (Ritualist)	نہیں ________ اجتہاد پسند	(Progressive)	ہے
تنگ ظرف (non-tollerant)	نہیں ________ عالی ظرف	(tollerant)	ہے
شہنشاہی (Imperialist)	نہیں ________ تبلیغی	Missionary	ہے
تبعی (dependant)	نہیں ________ مستقل	(Independent)	ہے

اسلامی حکومت کا نظام چونکہ آج دُنیا کے کسی گوشے میں کارفرما نہیں ہے، اور کئی صدیوں سے نہیں ہے، اسی وجہ سے بہت سے ذہن اس کی ماہیت و نوعیت کے متعلق صاف نہیں ہیں۔ پھر چونکہ دُنیا میں جو نظام مروّجہ ہیں ان کی مرعوبیت بھی اپنا اثر ڈالتی ہے، اسی وجہ سے جن ذہنوں میں اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں کچھ اُلجھنیں اور پریشاں خیالیاں موجود ہیں وہ ان کو صاف کرنا نہیں چاہتے، بلکہ دانستہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں تاکہ رائج الوقت نظاموں کی تقلید کے لئے اُنہیں وجہِ جواز نہیں تو وجہِ معذرت بنا سکیں۔ پھر ایک طبقہ چونکہ درمیان ایسا موجود ہے جو مغربی جمہوریت ہی پر ایمان رکھتا ہے اور اسلام کے پرتو سے اپنے ملک کو بچانا اپنا فرض قرار دئے ہوئے ہے لہٰذا وہ برابر اسلامی نظامِ حکومت کے متعلق اُلجھنیں اور غلط فہمیاں پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اس طبقے کے سرگروہ ہمارے وہ اکابرین ہیں جنہیں ان کے آقایانِ فرنگی حکمراں بنا کے رُخصت ہوئے ہیں پھر حکمرانوں کی اس ٹولی کے ساتھ اقتدار پرست اور اسلام سے منحرف لوگوں کی ایک خاصی تعداد ہے جو اسلام کے متعلق عوام میں انتشار پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی۔ یہ مہم پر اُس دن تیز کی گئی تھی جس دن پاکستان بنا تھا، اور اسلامی نظام قائم کرنے کے وعدوں کو پورا کرنے کا مطالبہ شروع ہوا تھا، لیکن قرار دادِ مقاصد منظور ہو جانے کے بعد یہ کئی گنا تیز تر ہو گئی ہے، کیونکہ اب "اسلامی نظام" کا خطرہ بالکل سر پر لٹک آیا ہے۔

ان حضرات میں سے کوئی تو یہ کہتا ہے کہ اسلامی دستور امریکہ کے دستور سے ملتا جلتا ہوگا، کوئی فرماتا ہے کہ اسلامی حکومت کا امیر المومنین ایک غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے، کوئی ارشاد کریگا کہ اسلامی حکومت سیکولر (لادین) ہوتی ہے اور پھر اُس کی تشریح کریگا کہ لادین کے معنی قومی حکومت کے ہیں، یعنی جس میں ہندو مسلم کی کوئی تمیز کسی معاملے میں نہ کی جائے اور مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہو، کوئی دلائل دے گا کہ کچھ پرانا اور کچھ نیا ملا جلا کر ہمیں اپنی مرضی کا دستور بنا لینا چاہئے۔ ——— وغیرہ!

بہرحال جن لوگوں کے ذہنوں میں غیر اسلامی عقائد و نظریات نے آشیانے بنا رکھے ہیں ان کو اسلامی نظام کے خطرے کی بو سونگھ کر مضطرب ہونا ہی چاہئے اور انہیں کوشش کرنی ہی چاہئے کہ مسلمان اسلام پر کبھی مطمئن اور یکسو نہ ہونے پائیں، بلکہ وہ جمع ہوں تو کسی کفر ہی پر جمع ہوں۔ سوال یہ ہے کہ ان حضرات کی کوششوں کے مقابلے میں اسلام پسند عناصر کا فرض کیا ہے؟ ——— ان کا فرض اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ دلائل کفر کے "سوادِ اعظم" پر نفرین بھیج کر بیٹھ رہیں، بلکہ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بار بار، پے در پے، نئے نئے انداز میں، مختلف پہلوؤں سے اسلامی نظام کی ماہیت کو اُجاگر کرنے کی مثبت کوشش جاری رکھیں۔ قلم سے بھی اور زبان سے بھی یہاں تک کہ عوام کو اسلام کے نظامِ سیاسی کا ایک واضح اور متعین تصور حاصل ہو جائے اور وہ اس پر اپنی نگاہیں جما دینے کے بعد کسی غولِ بیابانی کے بہکائے نہ بہک سکیں۔

یہ مثبت کام اس لئے بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو اسلامی نظامِ حکومت سے اگر اچھی طرح متعارف نہ کرا دیا گیا اور کل کلاں کو غلام احمد جیسے مجتہدِ زماں اور اُن کی اُمت نے دستور سازی میں نئے نئے گل کھلا کر پیش کئے اور ہمارے دستور ساز صاحبان نے کوئی کافرانہ "اسلامی دستور" قوم کے سروں پر لادنا چاہا تو اُن کا راستہ روکنا آسان ہوگا۔

اس مقصد کے پیشِ نظر اس مرتبہ یہ مضمون پیش کیا جا رہا ہے اور آئندہ بھی ہم اپنے اہلِ قلم کی جو نگارشات اس قسم کے موضوعات پر حاصل کر سکیں گے، پیش کرتے رہیں گے۔

موجودہ حالات میں "اسلامی حکومت" کے تخیل کو جس طرح مشتبہ بنا دیا گیا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ واضح کرنا ہی کافی نہیں کہ "اسلامی حکومت کیا ہے"۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ضروری یہ بتانا ہے کہ اسلامی حکومت کیا نہیں ہے۔ چنانچہ ان دونوں پہلوؤں سے اسلامی حکومت کی ماہیت پر چند اصولی باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ ان اصولی باتوں سے اگر دو ٹوک [illegible]

گیا ہے۔

مبحثِ اوّل:- غیر دستوری (Non Constitutional) نہیں!
دستوری (Constitutional) ہے!

جن لوگوں نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو اُن سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اسلام کے نظام کا مرتب جو خود کائنات کی اتنی بڑی سلطنت کا حاکم ہے کہ اُسکی وسعتوں کو انسانی علم محیط نہیں ہو سکتا، اگرچہ کوئی بالاتر اقتدار اس کے مقابلے میں ایسا موجود نہیں ہے جو اُس کو کسی دستور کا پابند بنا سکے، لیکن اُس نے خود اپنی آزاد مرضی کے ساتھ اپنی حکومتِ کائنات کے لئے بھی ایک دستور بنایا ہے۔ وہ اگرچہ مختارِ کُل ہے کہ اپنے بنائے ہوئے دستور کی پابندی کرے یا نہ کرے، لیکن عملاً وہ اپنے بنائے ہوئے اُصولوں کے تحت ہی اپنی مخلوق سے معاملہ کرتا ہے۔ اُس نے تخلیق کے لئے، حیات کے لئے، نشو و ارتقا کے لئے، موت طاری کرنے کے لئے، تغیرات بپا کرنے کے لئے، حوادث کے ظہور کے لئے، بناؤ اور بگاڑ کے لئے، رحم و کرم فرمانے کے لئے، قہر و غضب سے کام لینے کے لئے اور بحیثیت حاکمِ کائنات ہر قسم کے تصرف کرنے کے لئے مستقل قواعد و ضوابط بنا رکھے ہیں جنھیں قرآن نے "سُنّت اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔

سُنّت اللہ کیا ہے؟ ـــــــ یہ دراصل کائنات کی سلطنت کا دستور ہے جس کے تحت جمادات، نباتات، حیوانات اور خود ابنائے آدم کے لئے من حیث الافراد اور من حیث الاقوام باقاعدہ حقوق بھی مقرر ہیں اور فرائض بھی! اللہ تعالیٰ نہ ان مقررہ فرائض سے زائد ذمہ داریوں کا بار کسی پر ڈالتا ہے اور نہ مقررہ حقوق سے کم کسی پر نوازشات کرتا ہے۔

انسانی زندگی کے حادثات، تاریخ کا ارتقا، خیر و شر کے تصادموں کا ظہور، عذاب کا ورود، انعامات کی بارش، جذبۂ عمل کا نشو و نما، اجتماعی قوت کا ضعف و استقلال، حکومتوں کا قیام و سقوط، انقلابات کی توڑ پھوڑ، مذاہب و مسالک کا عروج و زوال، فلسفوں اور نظریوں کا غلبہ و ضعف ـــــ غرضیکہ جو جو کچھ حادثات ہمارے سامنے رونما ہوتے ہیں، ان سب کے لئے اٹل غیر نافذ العمل ہیں اور انہی ضوابط کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے جو معلومات اخذ ہوتی ہیں ان سے علومِ انسانی وجود پذیر ہوتے ہیں اگر کائنات پابندِ دستور و قانون نہ ہو تو لفظ تجربہ کے کچھ معنی ہی نہیں ہو سکتے۔

معاملہ اتنا ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے ابنائے آدم کے لئے آخرت میں جزا و سزا دینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کے نفاذ کے لئے بھی آئینی طریقہ پسند کیا ہے اور اپنے اوپر خود واجب ٹھہرایا ہے کہ وہ جسے سزا دے باقاعدہ قانونی کارروائی کے ذریعے جرم کو ثابت کر دینے کے بعد دے بلیقین اگر وہ بلا تحقیق اور بلا جرم ثابت کئے بھی سزا دیتا تو اس کی صفت عدل کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی بے گناہ کو کبھی سزا نہ دیتا لیکن وہ اتنا دستور پسند ہے کہ اُس نے ایک کھلی عدالت قائم کرنے، اعمال کا محاسبہ و وزن کرنے اور باقاعدہ شہادتوں کے ساتھ جرائم کو ثابت کرنے کا طریقہ اپنے لئے منتخب کیا ہے وہ اگر اپنی مخلوق پر سیفٹی ایکٹ لگا دیتا تو اُسے روکنے والا کوئی نہ تھا، لیکن اُس نے سیفٹی ایکٹ کے استعمال کے بجائے قانونی کارروائی کو صحیح قرار دیا ہے۔

ایسے دستوری حکمران سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو کائنات کے کسی گوشے میں اگر حکومتِ خود اختیاری (Self government) دے تو اُس کے لئے کوئی دستور نہ بنائے یہ بات عقل میں نہیں آسکتی۔ پھر وہ دین عجیب دین ہوگا جو مکمل دین ہونے کا دعویٰ کرے اور پھر اس کا حال یہ ہو کہ افراد کو تو چھوٹے چھوٹے معاملات کے لئے ضابطے بنا کے دے اور ان سے ان ضابطوں کی پابندی کا مطالبہ کرے، لیکن بہت سے افراد باہم مل کر جب حکومت کا ایک بڑا ادارہ قائم کریں اور اُس کے تحت

وہ بے شمار انسانی افراد سے بلکہ کئی انسانی اقوام سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے معاملات طے کرنے بیٹھیں تو ان معاملات کے لئے اُن کوئی ضابطہ فراہم کرکے دینے سے انکار کردے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک دین چھوٹے چھوٹے معاملات میں اس دلیل سے رہنمائی دیتا ہے کہ میری روشنی قبول نہ کرو گے تو بھٹک جاؤ گے تو آخر وہ بڑے معاملات میں کس دلیل سے لوگوں کو یہ آزادی دیتا ہے کہ یہاں میری روشنی کے بغیر بھی تم چل سکتے ہو اور ان معاملات میں اندھیرے میں بھی راہِ راست مل سکتی ہے۔ اگر بڑے بڑے معاملات میں انسان کسی مافوق ہدایت کا ضرورتمند نہیں تو چھوٹے معاملات میں اُسے کسی ضابطے کی پیروی پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کیجاسکتی۔ اگر حکومت چلانے میں آدمی کو خدا کی طرف سے واجب کردہ کسی دستور کی ضرورت نہیں ہے تو آخر ایک تجارتی فرم چلانے میں، ایک کارخانے کا نظم قائم کرنے میں، ایک دکان اور کھیت کو سنبھالنے میں اور ایک گھرانہ خاندان کی باگ ڈور تھامنے میں وہ خدائی دستور کا ضرورت مند کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ خدا آخر کیسا خدا ہوگا جو یہ ہدایات تو دے کہ طہارت کرو تو یوں کرو، پیشاب کرو تو یوں کرو، لین دین کرو تو یوں کرو ——— اور پھر یہ دھمکی بھی دے کہ اگر ایسا نہ کرو گے تو زندگی میں گمراہ ہوجاؤ گے۔ اور آخرت میں دوزخ میں جلو گے ——— لیکن تعلیم، عدالت، صلح، جنگ، خارجہ و داخلہ پالیسی کے بارے میں ایک قوم کی اجتماعی زندگی کے بارے میں ہدایت فراہم کردینے سے انکار کردے۔ یہ باتیں صریحاً خلافِ عقل ہیں۔

انسان اگر خدا کے دستور کا محتاج گھر اور دکان اور کارخانے میں ہے تو بالیقین وہ تھانے، کچہری، دفتر، اسمبلی اور دستور یہ میں بھی ہے اور وہاں اگر خدائی دستور کی غیر موجودگی سے گمراہی لازم آتی ہے تو یہاں خدائی دستور کے فقدان سے اس سے بڑے درجہ کی گمراہیاں لازم آتی ہیں۔ پس جو خدا زندگی کے چھوٹے چھوٹے امور کے لئے دستور دیتا ہے اور یہ لازم ٹھہرا ہے کہ اُسکی پابندی کرو، ورنہ دنیا و آخرت میں خسارہ اُٹھاؤ گے تو وہ خدا زندگی کے بڑے امور کے لئے اُس سے شدید تر فرضیت کے ساتھ دستور دینے والا ہوگا۔

جن لوگوں نے اپنے لئے کوئی ایسا اسلام تراش لیا ہے جس میں طہارت اور کھانے پینے کے ضابطوں کے آگے خلا ہی خلا ہے، اُن کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ یہ ناکمل اسلام جو زندگی کے قامت پر راست نہیں آتا اُسکو ساتھ لے کر چلنا عقل کو جواب دئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یا جائیگا تو سارا جائیگا یا پھر رہیگا تو پورا رہیگا۔

اس طولِ بیان کا خلاصۂ مدعا یہ ہے کہ جو لوگ اسلام پر یہ اتہام تراشتے ہیں کہ اس کے پاس حکومت کا سرے سے کوئی دستور نہیں ہے وہ یہ پروپگنڈہ اسلئے کرتے ہیں کہ اُن کے لئے حکومت کے غیر اسلامی نظام کو اختیار کرنے کے دروازے کھل سکیں کسی بھی دستورِ حکومت کے اندر دو جزء پائے جاتے ہیں۔ ایک بالکل بنیادی اصولیات، دوسرے ان کے تفصیلی تقاضوں کا اظہار۔ بالکل اسی طرح کتاب و سنت میں یہ بنیادی اُصول متعین کردئے گئے ہیں اور نبی صلعم کے دورِ سعادت میں اور آپ کے خلفائے راشدین کے زمانۂ بابرکت میں ان اُصولوں کے تفصیلی تقاضوں کا اظہار تمدنی حالات کے مطابق کیا گیا۔ دستور کے اُصول آج بھی وہی ہونگے، صرف اُن کے تفصیلی تقاضوں کے اظہار میں تمدنی حالات کے مطابق مختلف انداز اختیار کرنا پڑے گا دستور وہی رہیگا، البتہ اس کے خارجی ڈھانچے کا رنگ و روغن بدلے گا۔

کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور بندوں کی خلافت کے اساسی نظریات کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاست کا مقصدِ وجود، اُس کے حقوق اور اُس کے فرائض، امارت کا معیار، انتخاب اور اس کے دستوری حقوق، شورائیت

سمع و طاعت کے نظام، حدود اللہ کی اہمیت، عدلیہ کے اُصول، صلح و جنگ کے ضوابط، معاہدانہ تعلقات کے قواعد وغیرہ تمام فرد و ریاست کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں ان اُصولوں کی مزید وضاحت ہے اور خلافتِ راشدہ نے ان کے تحت عملی نظائر فراہم کئے ہیں۔

رسول اللہ سے پہلے بھی مختلف انبیاء نے حکومتیں چلائی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق ان کی دستوری بنیادیں استوار کی ہیں۔ قرآن میں ان کی طرف اشارات موجود ہیں جن سے اسلامی ریاست کے دستوری خد و خال کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن نبی کریم کی قائم کردہ گورنمنٹ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساتھ کے ساتھ جو دستوری ہدایات ملتی رہی ہیں وہ جوں کی توں محفوظ ہیں اور ان سے پورا خاکہ دستور سامنے آجاتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ نبی صلعم نے اگر ہر دوسرے کام کو ساری دنیا کے لئے "نمونے" کے طور پر بہترین پیرائے میں سرانجام دیا ہے تو پھر کیا آنحضور پر یہ بہتان نہ ہوگا کہ انھوں نے حکومتِ غیر دستوری یعنی اندھیر گردی کے اُصول پر چلائی۔ جس کے فیصلوں، پالیسی، اختیارات اور قانون سازی کا نہ سر اشتھا نہ پیر اور جس کے لئے کوئی اُصول و حدود نہ تھے۔

نبی صلعم کی حکومت کے کچھ اُصول تھے، ضابطے تھے، قوانین تھے، سرحدیں تھیں، حقوق و فرائض کا تعین تھا، فرد اور سوسائٹی کے تعلقات کی حدبندی تھی، حاکم اور محکوم کے باہمی معاملات کے لئے توازن تھا ——— اور وہ ہر پہلو سے آئینی و دستوری حکومت تھی۔!

آخر ایک حکومت برسوں چلی تو کوئی خطوط تو ہونگے کہ جن پر وہ چلتی رہی تھی۔ بس وہی خطوط ہیں جنکا نام دستور ہے۔

یہ درست کہ قرآن میں کوئی جداگانہ سورت ایسی نازل نہیں ہوئی جسکا نام دستورِ حکومت ہوتا اور اس میں دستور دفعہ وار تحریر کر دیا جاتا بلکہ دوسرے ضوابط کی طرح دستورِ حکومت کے تمام اُصول بھی قرآن میں نجماً نجماً مناسب موقعوں پر دعوتی خطاب اور تذکیری ہدایات کے ساتھ حل کر کے دعوتی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اُصول صحابہ اور جملہ مسلمین کے معلومات و معمولات میں اسی طرح شامل تھے جسطرح دوسرے ضوابط!

اور بعد میں علمائے اسلام نے اسلام کے دستوری مسائل پر جتنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سب کی بناء قرآن حکیم پر رکھی ہے۔ ابنِ خلدون، شہرستانی، ابنِ قتیبہ، امام ابن تیمیہ، امام مالک، ابنِ کثیر، ابنِ حزم، طبری اور دوسرے اہلِ قلم نے سیاسیات اور دستوریات پر جو تصانیف چھوڑی ہیں آخر اُن میں جو کچھ بھی استدلال کیا گیا ہے، اسلام کے مآخذ ہی سے کیا گیا ہے۔ اگر اسلام کے مآخذ میں دستوریات کا عنصر تھا ہی نہیں تو یہ ساری بحثیں پھوٹ کہاں سے پڑیں۔

ہماری رائے میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخِ انسانی میں دستوری مسائل پر پورے شعور کے ساتھ اگر بحث و فکر کا آغاز ہوا ہے تو پہلی مرتبہ اُمّتِ محمدیہ کے قرونِ اولیٰ ہی میں ہوا ہے۔ یہ بحثیں اگرچہ خلوص اور دیانت کے ساتھ تھوڑا عرصہ جاری رہیں اور بعد میں سیاسی جتھابندیوں نے ان کو "تحزب" اور "تعصب" سے آلودہ کر دیا، یہانتک کہ شیعیت، خارجیت، رافضیت وغیرہ کے نظریات سیاسی کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان فرقوں میں جو سیاسی بحثیں چل رہی تھیں وہ بالعموم دستوری مسائل سے تعلق رکھتی تھیں، مثلاً نصب امام واجب ہے یا نہیں؟ امارت کا عہدہ انتخابی ہے یا غیر انتخابی؟ سیادت کن کن شرائط سے مرکب ہے؟ افضل کو چھوڑ کر مفضول کو سیاسی امامت سونپی جا سکتی ہے یا نہیں؟ ——— وغیرہ!

یہ سارے اختلافات دستوریات سے متعلق تھے اور خود یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کو دستوریات سے کوئی واسطہ تھا کہ جس کے پیرو ان میں بحیثیت معترض ان کے گرد و پیش کی دُنیا ان مسائل کے بارے میں جاہل مطلق تھی اور جس میں دستوریاتی مسائل کا کوئی شعور سرے سے موجود نہیں تھا پھر یہ کی بات ہے کہ جہاں سرے سے دستورِ حکومت ہی موجود نہ ہو وہاں آخر دستوری شعور کدھر سے آگھسا تھا۔

اسلام کے پاس نہ صرف یہ کہ ایک دستورِ حکومت تھا بلکہ اسی کے اُصولوں پر چلنے والی حکومت کے لئے دُنیا بھر کا پہلا تحریری دستور وجود میں آیا جس میں اسلام کے اُصولوں کے تفصیلی تقاضوں کو نبی صلعم نے اس دور کے تمدن کے مطابق ملحوظ رکھا تھا۔

اس دستور نامے کو عربی محاورے کے مطابق "کتاب" کا نام دیا گیا تھا جسکا مفہوم فرمان یا حکمنامے وغیرہ کے الفاظ سے ادا کیا جاسکتا یعنی اس کے پیچھے تنفیذی قوت موجود تھی۔ اسکا متن سیرت ابن ہشام، سیرۃ ابن اسحاق، کتاب الاموال، البدایہ والنہایہ، سیرۃ ابن سید الناس وغیرہ کتب میں مذکور ہے اور اسکے اقتباسات دوسری مستند کتابوں میں بھی ملتے ہیں بھلا ہو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا کہ انھوں نے اسے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔

اس دستور نامے کی چند دفعات ملاحظہ ہوں جو بتائیں گی کہ نبی صلعم کی حکومت بے آئین حکومت نہ تھی۔

دفعہ ۱:۔ یہ ایک حکمنامہ ہے نبی اور اللہ کے رسُول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں سے ایمان اور اسلام لانیوالوں اور ان لوگوں کے مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اُن کے ہمراہ جنگ میں حصّہ لیں۔

یہ شہریت کے حقوق کی بنیاد ہے جو بیان کر دی گئی ہے۔

دفعہ ۲:۔ تمام دُنیا کے (لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علیحدہ سیاسی وحدت (اُمّت) ہوگی۔

یہ گویا ایک independent state کے وجود کا اعلان تھا۔

دفعہ ۱۳:۔ اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اُس شخص کے خلاف اُٹھیں گے جو انہیں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلائے اور ان کے سب ہاتھ ملکر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو (یہ گویا اسلامی حکومت کے اساسی مقصد "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے لئے ماحول کو تیار کرنے، پورے شہریوں پر ذمہ داری عاید کرنے اور حکومت کے اقدامات کے لئے ان کا تعاون حاصل کرنے کا فرمان تھا نیز اس دفعہ سے یہ بھی واضح ہے کہ اہل ایمان کی ذمہ داریاں خاص تھیں)

دفعہ ۱۹(ا) اور بے شبہ متقی ایمان والے سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

یہ ایک اصولی بات ریاست کیطرف سے اُسکے اصولوں کو مخلصانہ طور پر ماننے والوں کی خاص حیثیت کا اعلان تھا اس حیثیت میں ان اصولوں کو نہ ماننے والوں کو ان کے ساتھ مساوات کا مقام حاصل نہیں تھا یہی چیز ہے جسکے لئے ذمہ کا سے اشارہ اخذ ہوتا ہے

دفعہ ۲۳:۔ اور یہ کہ جب کبھی تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف ہو تو اُسے خدا اور محمد سے رجوع کیا جائیگا۔

یعنی واضح کر دیا گیا کہ اسلامی ریاست میں Final Authority اللہ اور اُسکے رسُول کو حاصل ہے اور سند خدا و رسُول ہی کا فیصلہ ہے

دفعہ ۳۶(ا) اور یہ کہ ان یہودیوں کے معاہد قبائل میں سے کوئی بھی محمد کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی کیلئے) نہیں نکلے گا۔

اس دفعہ کے ذریعے طے کر دیا گیا کہ جنگ و صلح کے آخری اختیارات محمد صلعم کو بحیثیت صدر ریاست [illegible]

دفعہ ۳۶(ب) اور کسی تاریخ یا ظلم کا بدلہ لینے میں (مذکورہ بالا قبائل کیطرف سے) کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائیگی

اس دفعہ کا مفہوم یہ تھا کہ ان کو سیاسی طور پر خود مختاری حاصل نہیں ہے اور وہ قانون کے راستے میں حائل ہونے یا اسکو ہاتھ میں لینے کے مجاز نہیں ہیں۔

دفعہ ۴۴:- اور یہ کہ اس دستور والوں میں جو کوئی قتل یا جھگڑا رونما ہو جس سے فساد کا ڈر ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمدؐ سے رجوع کیا جائیگا۔

یعنی عدالت مجاز صرف وہ ہوگی جو خدا اور رسولؐ کے تابع اور ان کے قوانین کو ان کے حسبِ ہدایت نافذ کرنے والی ہو۔

علیٰ ہذا القیاس اگر اس دستور کی جملہ دفعات پر غور کیا جائے تو ان میں سے بے شمار دستوری نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

نبی صلعم نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر جو آخری وصیتی خطبہ اُمت کے نام نشر کیا تھا، اسمیں اگرچہ زیادہ تر اخلاقی ہدایات تھیں، لیکن بعض ایسے امور بھی قطعیت کے ساتھ اعلان کئے گئے تھے جن کا تعلق دستورِ مملکت سے تھا۔ مثلاً فرمایا:-

(۱) ہر شخص کے تین بنیادی حقوق یعنی جان، مال، آبرو محفوظ اور قابلِ احترام ہیں۔ (یہ شہریت کے اساسی حقوق کی تصریح تھی جس پر عمل ہو رہا تھا)

(۲) زمانۂ جاہلیت کے سود کے تمام دعوے ساقط کئے جاتے ہیں صرف اصل واپس دلوائی جائیگی (یہ جاہلی دور کے حرام معاملات کے عدالت میں ناقابلِ تسلیم ہونے کا اعلان تھا)

(۳) امانتیں اور قرض (دورِ جاہلیت کے) واپس ادا کئے جائیں (اس اعلان کی رُو سے حکومت نے اپنے سے قبل کے جائز حقوق و واجبات کو قانوناً تسلیم کر لیا)

(۴) زمانۂ جاہلیت کے خون کے دعوے فراموش کر دئے جائیں اور اُن کے انتقام کا سوال ختم کر دیا جائے (یعنی حکومت نے اپنے سے قبل کے جرائم کو دریا برد ۔ قرار دے کر نیا دور شروع کیا)

(۵) قتل میں قصاص لیا جائیگا۔ (قرآن کے حکم کے مطابق یہ ایک اساسی فیصلہ تھا)

(۶) میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق آتے ہیں۔ شوہر کا حق یہ ہے کہ بیوی پاک دامن رہے اور ان لوگوں کو گھر میں داخل نہ ہونے دے جن کے لئے شوہر کی اجازت نہ ہو بیوی کا یہ حق ہے کہ شوہر اُسے اچھا کھلائے اور پہنائے۔ عورتیں ایک امانت ہیں، ان سے سلوک کرتے ہوئے خدا سے ڈرو اور اچھا برتاؤ کرو (اس اعلان کے ذریعے اسلامی نظامِ خاندان کے اصولیات متعین کر دئے گئے اور مرد و عورت کے تعلقات کی نوعیت واضح ہو گئی)

(۷) میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، جب تک تم ان کو تھامے رہوگے، بھٹکو گے نہیں۔ وہ قرآن اور سُنّت ہیں (اسلامی حکومت کے مأخذِ قانون متعین کرنے اور کتاب و سُنّت کو آخری سند اور معیارِ فیصلہ قرار دینے کے لئے یہ ہدایت دوہرائی گئی)

(۸) سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک ہی ہے، تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے خدا کے نزدیک تم سے مکرم ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو، ورنہ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں (اس وصیت نے "وحدتِ الٰہ" اور "وحدتِ انسانیت" کے اصولوں کو اسلامی معاشرہ کی اساس کے طور پر متعین کر دیا پھر اسمیں مساواتِ انسانی کا اعلان مضمر ہے۔ پھر اسمیں اسلامی معیارِ کرامت و فضیلت کا احساس دلا دیا گیا۔ اسلامی وصیت، وراثت، نسب، ولاء وغیرہ کے متعلق بھی دستوری اور قانونی تصریحات اس خطبہ میں موجود ہیں اور وہ عملاً پہلے سے اسلامی دستوریات کے ساتھ معمول بہا تھیں، انھیں کو تاکیداً واضح کیا گیا۔

بہرحال اگر کوئی شخص سنجیدگی سے اسلامی ریاست کے نظام اور اس کے دستوریات کا مطالعہ کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دنیا میں ایک نظامِ حکومت کو چلانے کیلئے جامع متعین اور معقول ترین دستور فراہم کرنیکا سہرا اسلام ہی کے سر ہے۔

اسلامی دستور کا وہ حصہ جو بنیادی اہمیت سے تعلق رکھتا ہے وہ تو تحریری ہے یعنی القرآن، احادیث کی کتابیں اسکی پوری پوری تفصیلات

محفوظ ہیں یعنی تفصیلی تعبیریں سوائے کتاب الٰہی بیشتر حصہ تحریری ہی ہے تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلامی دستور کے بعض پہلو غیر تحریری یعنی عملی روایات پر مشتمل تھے جنہیں دستوریاتِ اسلامی کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا ـــــ جبکہ آج بھی برطانیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کا دستور بیشتر روایتی اور غیر تحریری ہے لیکن عملی روایات کا احترام نقوشِ قرطاس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ہاں یہ بالکل بجا ہے کہ اسلامی دستور موجودہ دور کے طریقِ ترتیب کے مطابق غیر مرتب ہے یعنی عرب کی مملکت کے سامنے پورا مجموعہ کتاب و سنت تھا جس میں دستوریات اور قانونیات متفرق طور پر مذکور تھے اور انہیں کوئی خطِ فاصل موجود نہیں تھا نہ ایسا ہو سکا کہ دستور کی تمام تفصیلات دفعہ وار ایک الگ کتاب دستور میں مرتب کی جائیں، کیونکہ اس دور کا تقاضہ یہ تھا ہی نہیں لیکن آج اگر ہمیں دستور ملت بالکل جداگانہ شکل میں درکار ہے تو ماہرین دستوریاتِ اسلامی کا یہ کام ہے کہ وہ دلیسرچ کریں اور قرآن و حدیث اور آثار و نظائر اور ائمہ و صالحین کی علمی بحثوں کے مطالعہ سے دستوریات کو مستنبط کر کے آج کی زبان، آج کی اصطلاحات اور آج کے اندازِ ترتیب کو ملحوظ رکھ کر دستورنامۂ اسلام کی تدوین کرلیں۔

اسلامی حکومت بہرحال ہمیشہ دستوری تھی اور آج بھی دستوری ہی ہوگی!

خلاصہ: ــــ

۱۔ اسلام دستورِ حکومت رکھتا ہے اور اسلامی حکومت لازماً دستوری ہوتی ہے۔

۲۔ اسلامی دستور کے بنیادی اصول اٹل ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں البتہ اُن کے تفصیلی تقاضوں کے اظہار کیلئے نیا پیرایہ تمدنی حالات کے مطابق اختیار کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ اسلامی دستورِ حکومت کے پورے اصولیات اور اُنکی تفصیلات کے بعض اجزاء تحریری ہیں، لیکن تفصیلات کا ایک حصہ روایاتی بھی ہے۔

۴۔ اسلامی دستورِ حکومت کے اجزاء کتاب و سنت میں قانونی زبان کیساتھ دفعہ وار بیان نہیں ہوئے بلکہ انکو مستنبط کر کے دورِ حاضر کے اسلوبِ ترتیب کے مطابق باقاعدہ منضبط کرنا ماہرینِ دستوریاتِ اسلامی کا کام ہے۔

مبحث دوم:۔ لادینی (Secular) نہیں، دینی (Theo Democratic) ہے

لادینی حکومت وہ ہوتی ہے جو اپنے فیصلوں، استعمالِ اختیارات، پالیسی کی تشکیل وغیرہ میں دستوری طور پر اپنے اوپر نہ خدا کے اقتدارِ برتر کو موثر تسلیم کرے اور نہ عملاً خدا کی کتاب اور اسکی حدود کو اپنے اوپر عائد کرے، بخلاف اسکے دینی حکومت وہ ہوتی ہے جو اپنے فیصلوں، استعمالِ اختیارات اور پالیسی کی تشکیل وغیرہ میں دستوری طور پر خدا کے اقتدار کو تسلیم کرے اور عملاً اسکی نیابت کے منصب پر رہتے ہوئے خدا کی کتاب اور اسکی حدود کو اپنے اوپر نافذ کرے۔

حکومت کی ان دونوں نوعیتوں کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کی جاتی ہیں مثلاً اگر کوئی لادینی حکومت مذہب کے معاملات میں کچھ دلچسپی لینے لگے تو بعض لوگ اسکی اس چال سے خود دھوکا کھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ لادینی حکومت کے رویے مذہب کے متعلق تین قسم کے ہوتے ہیں

۱۔ مخالفِ مذہب ہونا ـــــ یعنی سیکولر ریاست کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو مذہب کو اپنی راہ میں حائل پاکر اسے پوری طرح کچلنے کی کوشش کرتی ہے جیسے روس اور ترکی میں ابتک صورتِ حال تھی۔

۲۔ بے نیازِ مذہب ہونا ـــــ یعنی سیکولر ریاست کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو مذہب کو براہِ راست تو نہیں کچلتی لیکن اُسے افراد کا نجی معاملہ قرار دیکر اور اپنے نظامِ حیات میں سے کوئی حصہ نہ دیکر اور اسکو دستوری حیثیت سے کوئی مقام نہ دیکر اسے کمزور کرنا چاہتی ہے۔ یہ قسم بھی دراصل بے حد خطرناک ہے براہِ راست اسکے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوتی اس لئے کوئی اشتعال پیدا ہوکر ردِ عمل تحریک کا موجب نہیں بنتا، اسکی مثال میں ہم اپنے ملک کی سابق انگریزی حکومت کو پیش کر سکتے ہیں۔

۳۔ حامیٔ مذہب ہونا ـــــ یعنی سیکولر ریاست کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جو مذہب کو دبانے کے بجائے اسکو ایک حد تک ترقی دیتی ہے [illegible] اپنی سیاست میں مداخلت کرنے

رہنے کیلئے اسکی خود مختاری ہے اس قسم کی ریاستیں بعض مذہبی تقسیم کے عہدے اور فنڈ قائم کرتی ہیں مدرسوں اور کالجوں میں دینیات کا ایک آدھ پیریڈ شامل کرتی ہیں۔ مذہبی تقاریب میں غالباً شرکت کا انتظام کرتی ہیں اور ملک میں سب مذہبی مذہبیات کی نشر کا انتظام کرتی ہیں۔ دینی عبادتگاہوں اوقات اور تعلیم گاہوں کو مالی گرانٹ دیتی ہیں۔ بس یہ مذہب دب کے رہتا ہے اور حکومت کو بالواسطہ طور پر اسکے اوپر کنٹرول قائم رکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اسکی مثال میں برطانیہ وغیرہ کے علاوہ خود پاکستان کی حکومت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ سیکولر ریاست کی پوزیشن بالکل ایسی ہی ہوتی ہے جیسے بے دین اور فاسق و فاجر جاگیردار مسجد کیلئے اپنی گرہ سے تنخواہ دیکر امام اور خطیب مقرر کردیتے اور تیلی کی مجالس منعقد کرا دیتے ہیں کہ مذہب کی طاقت انکی ممنون رہے اور اسکے فسق و فجور کو برا نہ کہا جائے۔

لیکن یہ تینوں قسم کی سیکولر حکومتیں بنیادی حقیقت کے لحاظ سے بالکل ایک ہوتی ہیں۔ ان میں حسب ذیل امور مشترک ہوتے ہیں:۔

۱۔ یہ مذہب و سیاست کی تفریق کے نظریے پر قائم ہوتی ہیں اور مذہب کو افراد کا پرائیویٹ معاملہ قرار دیتی ہیں۔

۲۔ یہ مذہب کے صرف ایک (اخلاقی) حصے کا عمل میں آنا گوارا کرنے پر تیار ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کے دوسرے بڑے (سیاسی) حصے کے عمل میں آنے کی سخت دشمن ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ مذہب کو چاہے کسی حیثیت سے الٰہی جیتے بھی دیں، اس کے اصول و حدود کو اپنے اوپر نافذ کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔

۴۔ ان میں سیاسی اقتدار "الٰہی" نہیں، انسانی تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے استعمال میں خدا کے احکام و حدود کا کوئی لحاظ کرنے کی دستوراً گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اب ہمارے آجکل کے بعض مفتی کہتے ہیں کہ اچھا اگر "لادینی" (Secular) کے لفظ سے چڑتے ہو تو ہم اس لفظ کو چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے بجائے "قومی" حکومت کا نام اختیار کئے لیتے ہیں لیکن سوال نام بدلنے کا نہیں، کیونکہ سؤر کا نام اگر ہرن بھی رکھ دیا جائے تو اس سے اس کا گوشت حلال نہیں ہو جائیگا۔ اگر سیکولر اسٹیٹ اپنی فطرت پر قائم رہے تو محض اُس کا نام بدل دینے سے حقیقت تو نہیں بدل جائیگی۔ بخلاف اس کے اگر ایک ریاست خدا کے اقتدار اور دین کے حدود و قیود کو اپنے لئے دستوراً واجب القبول تسلیم کرلے تو پھر چاہے آپ اُسے سیکولر ریاست کہہ کر جی خوش کرلیں وہ دینی ریاست بن جائیگی۔

دوسری طرف جب دینی ریاست کا نام لیا جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ دینی ریاست کا لفظ اگر تم سیکولر کے مقابلے میں بولتے ہو تو انگریزی میں اس کیلئے لفظ تھیوکریسی استعمال ہوتا ہے اور تھیوکریسی جانتے ہو کہ کتنی ناپاک چیز ہے ــــ ترجمہ! یعنی ان حضرات کے نزدیک یہ ناگزیر ہے کہ اگر آپ دینی حکومت کا نام لیں تو اس کا مفہوم متعین کرنے کے لئے پہلے اسے انگریزی میں ترجمہ کریں اور پھر وہاں سے تھیوکریسی کا لفظ اختیار کریں پھر اس لفظ کے معنی اسلام کے بجائے یورپین فلسفۂ سیاست کی ڈکشنری میں تلاش کریں۔ علاوہ بریں اس کی طرف سے یہ بھی آپ پر واجب ہے کہ لفظ سیکولرازم اور لفظ تھیوکریسی، ان دونوں اصطلاحوں میں سے ہی کسی ایک کو اختیار کریں اور اس کے معنی بھی وہی لیں تو یورپ نے مقرر کئے ہیں۔ اس مغالطہ انگیزی کے چکر سے ان حضرات کو نکالنے کیلئے یہاں دو باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ لفظ تھیوکریسی کے اصل لفظی (غیر اصطلاحی) معنی "الٰہی حکومت" کے ہیں یعنی ایسی حکومت جو خدا کے اقتدار کو مانے اور اس کے حدود و ضوابط کو عملاً قبول کرے۔ اگر اس لفظ کے یہ لفظی معنی پیش نظر رکھے جائیں پھر اختلاف ختم ہو جاتا ہے لیکن یہ حضرات اختلاف کو چونکہ ختم ہونے دینا نہیں چاہتے۔ اسلئے دوسری تصریح ضروری ہے۔

دوسری یہ کہ تھیوکریسی کا ایک اصطلاحی تصور یورپ نے پیدا کر دیا ہے جس کے معنی اس نظام حکومت کے ہیں جس میں ایک محدود مذہبی طبقہ حکمران ہوتا ہے اور وہ ظل اللہ قرار پاکر اپنے لفظ لفظ کو منجانب اللہ قرار دیتا ہے اور اپنی حکومت کو خدا کی حکومت کا نام دیتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام "الٰہی حکومت" کا یہ تصور سرے سے ہی نہیں رکھتا۔ یورپین تھیوکریسی کے خلاف اسلامی تھیوکریسی کے امتیازی پہلو یہ ہیں۔

۱۔ اس میں خلافت الٰہی بحیثیت مسلم کو حاصل ہوتی ہے اور تمام افراد خود اپنے اختیار سے اپنے میں سے بہترین آدمی کو منتخب کر کے امانتاً اسے یہ اختیار سونپتے ہیں

(معاہدہ) ـــــ یا دو شک ـــ سوچتے ہیں ـــ یہاں ایک طبقے کی حکومت کا کوئی تصور سرے سے موجود نہیں ہے۔

۲۔ اسلامی تھیوکریسی میں سند حکمران کی زبان نہیں بجز خدا اور رسول کے ارشادات ہوتے ہیں حکمران کی اطاعت کا التزام اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور رسول کے احکام بیان کرے۔

۳۔ اسلامی تھیوکریسی میں حکمران پر تنقید کرنے کا حق ہر شہری کو حاصل ہے۔

۴۔ اسلامی تھیوکریسی میں حکمران کو معزول کرنے کا اختیار بھی عوام کو حاصل ہے۔

۵۔ اسلامی تھیوکریسی میں حکمران مجلسِ شوریٰ کے مشوروں کے مطابق کام کرتا ہے۔

ـــ وغیرہ!

کوئی آدمی جس کے دل میں ذرہ برابر بھی عقل ہو وہ ان امتیازات کے ہوتے ہوئے اسلامی تھیوکریسی اور مغربی تھیوکریسی کو ایک قرار دے کر "دینی حکومت" کا نام لینے والوں کو مطعون نہیں کر سکتا کہ لوگو! دیکھنا یہ لوگ تھیوکریسی جیسی لغو حکومت قائم کرنے چلے ہیں۔

غلط لیکن ہمارے اندر ایسے معقول لوگ موجود ہیں جو اس طرح کی حرکات لاہور کے ایک بڑے چوراہے پر کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

ان حضرات کی مغالطہ انگیزی کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہم تھیوکریسی کی اصطلاح میں رد و بدل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر ہم نے "الٰہی جمہوری حکومت" (Theo-democracy) کی وہ نئی اصطلاح اختیار کی ہے جسے سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں استعمال کیا ہے یہ اصطلاح ایک "مذہبی طبقہ" کی حکومت کی خود ہی نفی کر دیتی ہے۔ بدنام اصطلاحات کو بدل دینا خود قرآن مجید نے اس موقع پر سکھایا تھا جبکہ منافقین دو مطلبی الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ آجکل کے منافقین سے نمٹنے کے لئے بھی یہ طریقِ کار ضروری ہے۔

اب فرمائیے کہ ـــــ تھیو ڈیموکریسی کے متعلق کیا ارشاد ہے؟

ان تصریحات کے بعد اگر کچھ بھی دیانت ان حضرات میں ہو تو یہ اپنی پھیلائی "غلط فہمیوں" پر معذرت طلب کریں۔ اور جس طرح تھیوکریسی کی مخالفت کرتے رہے ہیں اسی طرح تھیو ڈیموکریسی کی حمایت میں زورِ قلم صرف کریں۔ مگر ان کے آزاد رفقاء کی متاع ان دنوں یہی "غلط فہمی" ہے۔ اسکے سوا وہ اور کیا چیز بازار میں لا سکتے ہیں!

خیر اصطلاح یہ ہو یا کوئی اور ـــ بہر حال دینی حکومت سے ہماری مراد وہ حکومت ہے جو دین کے حدود و قیود کو اپنے نیچے دبا کے نہ رکھے بلکہ اپنے اوپر ان کو نافذ کرے، وہ دین کو یتیم بنا کر اسکی سرپرستی نہ فرمائے۔ بلکہ دین کو مالک الملک بنا کر اسکی خدمت انجام دے۔ اسی قسم کی حکومت کا نام اگر سیکولر رکھا جا سکتا ہو تو رکھ لیجئے! لیکن مطلب یہ ہے نہ کہ کچھ اور!

خلاصہ :-

(۱) لادینی حکومت وہ ہوتی ہے جو دستوری حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار کو تسلیم نہ کرے اور اسکی کتاب کے مقرر حدود و قیود کو لازماً اختیار نہ کرے۔

(۲) لادینی حکومت اگرچہ مخالفِ مذہب بھی ہوتی ہے، معاشی مذہب بھی اور بے نیازِ مذہب بھی۔ لیکن [illegible] ان تینوں کی اصل حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔

(۳) دینی حکومت وہ ہوتی ہے جو دستوری حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اسکے اقتدار کو تسلیم کرے اور اسکی کتاب کے مقرر حدود و قیود کی عملاً پابندی کرے۔

(۴) اسلامی حکومت سیکولر نہیں ہوتی لیکن اس معنی میں تھیوکریٹک بھی نہیں جن معنوں میں یہ لفظ یورپ میں [illegible] ہے بلکہ وہ [illegible] ہے

[illegible] سوم ـــ [قومی (National) نہیں! / اصولی (Ideological) ہے]

حکومتوں کی یہ ایک دوسری قسم ہے۔ بعض حکومتیں وہ ہوتی ہیں جو کسی خاص نسلی یا وطنی قومیت پر انحصار رکھتی ہیں۔ ایک خاص نسلی یا وطنی قوم کی عصبیت اسکی پشت پر ہوتی ہے اور اس قومیت کے دائرہ کے اندر پیدا ہونے والے لوگ اس کی تشکیل کرتے ہیں اور وہی درحقیقت اس کے فیوض و برکات سے متمتع ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لئے مستقل طور پر اس میں کوئی جگہ نہیں ہوتی اور ہوتی بھی ہے تو اس صورت میں جبکہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح ملیامیٹ کر کے حکومت کے فدوی بن کر ڈال دیں۔ اس حکومت کے تحت سارے استحقاق پیدائشی خوش قسمتی کے لئے ہوتے ہیں۔ پھر یہ حکومت دوسری قومیتوں کی نفرت کو اسی طرح اپنی فطرت کا جزو بناتی ہے جس طرح اپنی خاص نسلی یا وطنی قوم کے لئے تفاخر و استکبار کا جذبہ اس کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوتا ہے۔

اس حکومت کا قیام، اس کی صلح و جنگ اور اس کی داخلی سرگرمیاں یہ واحد مقصد رکھتی ہیں کہ جو قوم اسے چلا رہی ہے وہ زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر سکے وہ ہر طرف چھا جائے اور غالب ہو، وہ دوسروں کو پامال کر کے اپنا راستہ نکالے اس کا سبز پرچم جدھر بھی پھیل سکتا ہو پھیلے۔

اسلامی حکومت کی فطرت اس کے بالکل متضاد ہے۔

دوسری قسم اصولی حکومت کی ہوتی ہے اصولی حکومت اُسے کہتے ہیں جسے کوئی ایسی جماعت (پارٹی) قائم کرے جو کسی اصول کو کلمۂ جامعہ بنا کر مجتمع ہوئی ہو اس قسم کی حکومت کا مقصدِ وجود یہ ہوتا ہے کہ اس اصول کو فروغ حاصل ہو۔ ساری دنیا اس کی حقانیت کو سمجھے، اس پر ایمان لائے اور اس کو اپنے نظامِ زندگی کی اساس تسلیم کرے۔ اسکی تعلیم، اس کا پروپیگنڈا، اس کا ماحول، اس کا دفاع، اس کی داخلہ و خارجہ پالیسی اور اس کا قانون سارے کا سارا اسی اصول کے حفظ و بقا کے لئے ہوتا ہے۔

اصولی حکومت انسان اور انسان کے درمیان بھلا برا یا اپنے اور بیگانے کا فرق وطن، نسل، رنگ، زبان، صنف وغیرہ کے ذریعے نہیں کرتی بلکہ ان تمام اختلافات کو بے حقیقت قرار دے کر وہ پوری انسانیت کو ایک ہی قابلِ احترام قرار دیتی ہے۔ اگر "سیاست" کوئی تفریق تسلیم کرتی ہے تو صرف اپنے بنیادی اصولوں کو ماننے والوں اور ان کے نہ ماننے والوں کے درمیان تسلیم کرتی ہے۔

ایک اصولی حکومت کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے اصولوں کے ماننے والوں کو ان کے نہ ماننے والوں پر ترجیح دے اور اس اصول کے حفظ و بقا کے لئے جو ذمہ داریاں بھی اسے سونپتی ہوں وہ اصول کے مخالفین کو نہیں۔ بلکہ اس کے مومنین کو سونپے صرف اس ایک معاملہ میں وہ اپنے مومنین اور غیر مومنین میں مساوات تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے لیکن بقیہ تمام حقوقِ شہریت میں وہ ہر انسان کو یکساں قابلِ احترام قرار دیتی ہے۔

پس اسلامی حکومت عین اسی طرح کی ایک اصولی حکومت ہے اس کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ خدا کے حاکم، مالک، ادیب اور ہادی ہونے، انسانی زندگی کے لئے اس کے قانون ساز ہونے کے بنیادی اصول کو لے کے آگے بڑھے، پھر اس اصول کے حفظ و بقا، اس کی نشو و نما اس کی تبلیغ و تعلیم کے لئے وہ اپنے پورے ذرائع کو استعمال کرے۔ تعلیم سے لے کر دفاع تک اور داخلی معاملات سے لے خارجی معاملات تک وہ ہمہ تن اس بات پر متوجہ رہے کہ:-

(الف) کس طرح اس اصول کے ماننے والوں کا ایمان پختہ سے پختہ تر ہو سکتا ہے۔
(ب) کس طرح انکی پوری عملی زندگیاں اس کے سانچے میں ڈھل سکتی ہیں۔
(ج) کس طرح آئندہ نسلوں کو اسکی خدمت کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے۔
(د) کس طرح اسے دوسرے ممالک اور دوسری اقوام کے سامنے پیش کر کے ان کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔
(ہ) کس طرح اس اصول کے مخالفین کا سیاسی زور توڑا جا سکتا ہے۔
(و) کس طرح ماحول کو اس اصول کے مطابق رکھا جا سکتا ہے۔

چنانچہ اسلامی حکومت اس جماعت ([illegible]) کی پشت پناہی سے چلتی ہے جو اس کے بنیادی اصولوں کو کلمۂ جامعہ بنا کر استوار ہوئی ہو۔

اس بنا پر ان کے دروازے پورے نوع انسان کے لئے یکساں کھلے رکھے گئے ہیں۔ وہ ایک ان میں سے داخلہ صرف کسی خاص ملک، نسل اور قوم کے افراد کے لئے مخصوص ہو۔ ان دروازوں سے جس طرح اسلامی حکومت کے اصولوں کو ماننے والوں کا داخلہ جاری رہتا ہے بلکہ جو پہلے کے ماننے والے اس سے منحرف ہو جائیں اُن پر نظر رکھ ([illegible]) کا عمل کر کے انہیں دروازوں سے ان کو خارج بھی کیا جاتا رہتا ہے۔

اسلامی حکومت اپنے اصول کے فروغ کے لئے صرف ان لوگوں کے دل و دماغ، جذبات و افکار، علوم و فنون اور قابلیتوں اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے جو اس کے اصول کے قبول کرنے والے ہوں۔ لیکن جو لوگ اس کے اصول کو غلط سمجھتے ہوں اور اس کے خلاف کسی دوسرے اصول کے ماننے والے ہوں، وہ ایسی احمق نہیں ہے کہ ان سے اس چیز کی خدمت کا مطالبہ کرے جس کے وہ دشمن ہیں اور ان کو دشمن ہونے کا حق دیا جانا چاہیئے۔ وہ امن کو قائم کرنے کے لئے جھوٹ، شبہ، ایمان رکھنے والوں، عصمتوں کی حفاظت کے لئے بے حیائی کو پسند کرنے والوں، شراب نوشی کو روکنے کے لئے مئے خواروں کو ذمہ داریاں سونپنے کی حماقت اگر نہیں کر سکتی تو آخر کیسے وہ توحید کے فروغ کے لئے کسی بت پرست کی، اصولیت کی تبلیغ کے لئے کسی قوم پرست کی اور اخلاقیات کے نشو و نما کے لئے کسی افادہ پرست کی خدمات حاصل کر سکتی ہے؟ دنیا میں اگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نماز کی امامت، جمعہ کی خطابت اور کتاب اللہ کی تعلیم کے لئے کسی یہودی، نصرانی یا کسی سکھ کی خدمات حاصل کی گئی ہوں تو آخر اسلامی نظام حکومت کو چلانے کے لئے کسی ایسے شخص کی خدمات کیا معنی رکھتی ہیں جو اسلام کو حق جانتا ہی نہ ہو جبکہ اسے وہ ایک جھوٹا اور منفرد دین سمجھتا ہو۔

یہ اگر ممکن نہیں ہے کہ جمہوری ملک کسی "جرمن نازی" کو، کوئی سرمایہ دار ریاست کسی کیمونسٹ کو، کوئی کیمونسٹ ریاست کسی جاگیردار کو اپنی پالیسی، اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنے پروپیگنڈے، اپنے دفاع کی باگ ڈور سونپ سکے تو آخر اسلامی ریاست کو ایک تنگ نظر (Cosmopolitan) کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ دین اپنے اساسیات (Fundamentals) کے مخالفین سے درخواست کرے کہ آئیے اور ان اساسیات کے مطابق نظام حکومت چلائیے اگر اسلامی حکومت اس حماقت کے نہ کرنے کی وجہ سے تنگ نظر، جمود پسند، دقیانوسی، ملائی وغیرہ تعریفی الفاظ کی مستحق قرار پاتی ہے تو کچھ حرج نہیں، لیکن اسے احمق بہرحال نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ مجبور ہے کہ اپنے اصولوں کے مومنین پر ہی اپنی اہم ذمہ داریوں کا بار ڈالے وہ اپنے اصولوں کے مخالفین کو خوش کرنے کے لئے اور دنیا کے چند اکابر حکمرانوں سے سمجھوتہ کرنے کے لئے اپنی اصولیت کو کیسے قربان کر سکتی ہے اور اپنی جڑوں پر خود کیسے کلہاڑا رکھ سکتی ہے۔

ایک قومی حکومت قومیت کو تفریق کے اساس قرار دیتی ہے لیکن اصولی حکومت اصول کو تفریق کی اساس قرار دیتی ہے۔ وہ یہ دیکھتی ہے کہ آدمی پیدا کس گروہ میں ہوا۔ اور یہ دیکھتی ہے کہ آدمی کس اصول و مسلک پر کاربند ہے۔ قومی حکومت کی تفریق غیر عقلی ہے لیکن اصولی حکومت کی تفریق عقلی ہوتی ہے وہ دین کو چونکہ غیر وسیع قرار دیتی ہے اسلئے فخریہ اعلان کرتی ہے کہ شہریوں کے درمیان دین کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ قومیتوں کو غیر وسیع قرار دیتی ہے اسلئے یہ بصد افتخار یہ اعلان کرتی ہے کہ شہریوں کے درمیان نسل و قوم کی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کیا جائیگا۔

خلاصہ

(۱) قومی حکومت وہ ہوتی ہے جو:

ا۔ ایک قوم کے مفاد کے لئے قائم ہو۔

ب۔ اپنے قومی دائرے کے اندر پیدا ہونے والے لوگوں کو باہر کے لوگوں پر ترجیح دے۔

ج۔ اپنی قومیت پر مفاخرت اور دوسری قوموں کی نفرت کا جذبہ رکھتی ہو۔

د۔ اصول و مسلک کو کوئی اہمیت نہ دے۔

(۲) اصولی حکومت وہ ہوتی ہے جو:

ا۔ ایک اصول کے قیام، حفظ و بقا اور نشو و نما کے لئے قائم ہو۔

ب۔ اپنے اصول کو ماننے والی جماعت (پارٹی) کے بل پر ہے۔
ج۔ جو قومیت و نسلیت کو کوئی وقعت نہ دے،
د۔ جو اپنی ذمہ داریاں صرف اپنے اصولوں کے مومنین کے کندھوں پر ڈالے۔
س۔ جس کو چلانے والی جماعت کے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے ہوں۔

(۳) اسلامی حکومت قومی (National) حکومت نہیں ہے۔
(۴) اسلامی حکومت اصولی (Ideological) حکومت ہے

مبحث چہارم :— مفاد پرست (Utilitarian) نہیں
اخلاق پسند (Moralist) ہے

جس طرح افراد کی دو بڑی قسمیں اس لحاظ سے کیجا سکتی ہیں کہ ان میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جن کے طرزِ عمل کا معیار "مفاد" ہوتا ہے۔ اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کے کیش و مسلک کا معیار "اخلاقیات" ہوتے ہیں، اسی طرح اقوام اور جماعتوں اور حکومتوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک حکومتیں مادی مفاد پر نگاہ رکھنے والی ہوتی ہیں ——— اور ہر سیکولر حکومت ایسی ہی ہوتی ہے ——— دوسری وہ حکومتیں ہیں جو اخلاقی معیارات رکھتی ہوں، اور یہ صرف اسلام ہی کے زیر سایہ قائم ہوتی رہی ہیں۔ اوّل الذکر اپنے لئے کسی قسم کی اخلاقی اقدار کو مستقل نہیں مانتیں، بلکہ نفع و نقصان کے مواقع کو سامنے رکھ کر وہ وقتی طور پر فیصلہ کرتی ہیں کہ اسوقت کیا طرزِ عمل مناسب ہوگا۔ ان کے اخلاقیات وقتی اور متغیر ہوتے ہیں جیسا کہ میکیاولی کی فکر نے یورپ کو سکھایا ہے۔ لیکن موخر الذکر حکومتوں کے سامنے چند اخلاقی معیارات اور اخلاقی قدریں ایسی ہوتی ہیں جو ہر قسم کے حالات میں اٹل ہوتی ہیں اور وہ ان کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے مادی مفاد کی قربانیاں دیتی ہیں اور مالی نقصانات کا خیر مقدم کرتی ہیں۔

ان میں سے پہلی قسم کو ہم "مفاد پرست" کہتے ہیں اور دوسری قسم کو اخلاق پسند۔ یہ اخلاق پسند حکومتیں ہمیشہ وہ ہوتی ہیں جن کے پیشِ نظر پوری دستوری اہمیت کے ساتھ ایسا الٰہی ضابطۂ اخلاق ہوتا ہے اور وہ اس ضابطے کو اپنے سے برتر محسوس کرتی ہیں اور اس کے کسی شوشے کی تبدیلی کا اختیار حاصل نہیں کرتیں۔ اور دوسری قسم کی مفاد پرست کو الٰہی ضابطے کے وجود سے اور دستوری حیثیت سے اسکے قابلِ قبول ہونے سے سخت انکار ہوتا ہے۔ وہ خارج سے کسی ضابطے کے مسلط ہونے کو گوارا نہیں کرتیں۔ اور اخلاقیات کو اٹل نہیں مانتیں۔ ان کا اخلاق صرف فائدہ ہوتا ہے، اور کچھ نہیں۔

اسلامی حکومت مفاد پرست نہیں، بلکہ اخلاق پسند ہے اسکے ثبوت میں چند چیزوں کی طرف اشارہ کردینا کافی ہوگا۔

اسلام نے جنگ کے لئے بھی ایک اخلاقی ضابطہ بنایا ہے؛ مثلاً یہ کہ مخالف کی لاشوں سے توہین آمیز سلوک نہ کیا جائے، مفتوحہ علاقوں کے شہریوں میں لوٹ مار نہ مچائی جائے، غیر جنگی افراد پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے، عورتوں کی عصمتوں کی طرف بے باک نگاہ تک نہ اٹھائی جائے، قتل کا فعل بھی خوش اسلوبی سے کیا جائے، قیدیوں سے اچھا برتاؤ کیا جائے، مستأمن کی حفاظت کی جائے، اسلام کا اعلان کرنے والوں سے ہاتھ روک لیا جائے، صلح کی درخواست رد نہ کی جائے ——— وغیرہ؛ چنانچہ اسلامی حکومت نے ان اصولوں کو لفظ بہ لفظ عمل میں لاکر دکھا دیا۔

ظاہر بات ہے کہ مفاد پرست نظامِ حکومت اپنے سپاہیوں پر قابلِ نفرت دشمنوں سے سلوک کرنے میں اتنی قیود عائد کرنے

کی کوئی وجہ نہیں پاتا، وہ ان کو موقع دے گا کہ وہ گھناؤنے جذبات کو عمل میں لائیں، عفت و عصمت پر حملے کریں، خوف و ہراس پھیلائیں، لوٹ مار کریں، عورتوں کی عصمتوں سے کھیلیں، ——— اور موقع نہ دے گا تو کم سے کم چشم پوشی کرے گا۔ لیکن اسلام نے خوف خدا کے ذریعے اپنے سپاہیوں کو ان اصولوں کا شدت سے پابند بنایا یہاں تک کہ ان کے دشمنوں نے اگر اس قسم کی غیر اخلاقی حرکات کیں تو بھی ان کا انتقام غیر اخلاقی طریقوں سے نہیں لیا۔

حمص سے جب مسلمان فوج اپنا قبضہ اٹھانے پر مجبور ہوئی تو اس علاقے کے شہریوں سے جو حفاظتی ٹیکس وصول کیا گیا تھا سے واپس ادا کر دیا۔ سے پہلے وہ اندازہ نہیں ہوئی یہ صریحا ایک فائدہ سے ہاتھ دھونا تھا لیکن اخلاقی اصول کے لئے اُسے گوارا کیا گیا۔

اسلامی حکومت کی اخلاق پسندی کی ایک مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں ملتی ہے جبکہ سابق حکام کی پالیسی کے تحت غیر مسلموں کو اسلام لانے سے جبراً روک رکھا گیا تھا کہ خزانۂ سرکار کے ذریعہ ٹیکس کی آمدنی کم ہو جائیگی لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز نے شدت کے ساتھ اس پالیسی کی تردید کی اور فرمایا کہ نبی صلعم اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجے گئے تھے نہ کہ تحصیلدار بنا کر کہ لوگوں سے ٹیکس لے لے کر خزانے بھریں۔ لوگوں کو مسلمان ہونے دو اور اگر اسطرح خزانہ خالی ہوتا ہے تو ہو جائے۔ بنو اُمیہ کی سابق حکومت مفاد پرستی کے مسلک پر گامزن تھی لہٰذا اسکا منتہا یہ تھا کہ روپیہ کیسے زیادہ آتا ہے لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومت اخلاق پسند تھی لہٰذا اس نے مالیات کی قربانی دی اور لوگوں کے لئے ہدایت کے دروازے کھلوا دئے۔

اسی طرح قرونِ مابعد میں اسلامی حکومت کے خلاف بیرونی کفار نے ناجائز کارروائیاں کیں اور اپنے ملکوں میں مسلمانوں پر زیادتیاں بھی کیں، لیکن ان کا انتقام مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں سے کبھی نہیں لیا گیا۔ حالانکہ بظاہر جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے، بالواسطہ طور پر بیرونی ظالموں پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ طریقہ مفید ثابت ہو سکتا تھا، چنانچہ آج بھی دنیا کی مختلف قومیں ——— خود ہندوستان اور پاکستان کی دو قومیں ——— اسی طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن اسلامی حکومت اس طریقے کی کبھی روادار نہیں ہوئی کیونکہ اسکے اخلاقی اصول اسکی اجازت نہیں دیتے۔

ایک مفاد پرست حکومت کی تمام تر توجہ اپنے باشندگانِ ملک کے مادی و معاشی مفاد پر مرتکز رہتی ہے اور وہ اگر اخلاقی تعمیر کرتی بھی ہے تو صرف اس حد تک جس حد تک کہ مادی و معاشی مفاد خود اس کا متقاضی ہوتا ہے، لیکن اخلاق پسند حکومت مادی و معاشی مفاد پر جتنی توجہ دیتی ہے اس سے بڑھ چڑھ کر وہ باشندگانِ ملک کی اخلاقیات کی فکر کرتی ہے۔ بلکہ اسکا اصل مشن ہی یہ ہے کہ دنیا بھر میں وہ اخلاقی قدریں قائم ہو جائیں جن کو وہ لے کر اٹھی ہے، لہٰذا جن مادی و معاشی فوائد کے حصول کے لئے اخلاقیات کی قربانی دینی پڑتی ہو ان کو وہ اپنی اخلاق پسندی پر قربان کر کے آگے بڑھتی ہے۔

پھر ایک مفاد پرست حکومت کے پاس پھیلنے پھولنے کے لئے اور اپنے دائرے کے لئے صرف آلات و اسلحہ اور مالیات کی قوتیں ہی ہوتی ہیں جنکی حدود بالآخر بالکل بندھی تلی ہیں، اور اس قسم کی حکومتیں مخالفین کے صرف جسم فتح کر سکتی ہیں اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر سکتی ہیں۔ لیکن ان کے دلوں اور دماغوں کو فتح نہیں کر سکتیں اور ان کے ضمیروں پر قبضہ نہیں کر سکتیں۔ بخلاف اسکے اخلاقی اصولوں کی علمبردار حکومتوں کی قوت محض مالیات و اسلحہ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اسکی اخلاقی طاقت جسموں اور زمینوں کے ساتھ دلوں اور ضمیروں کو فتح کرتی چلی جاتی ہے اسطرح اسکی مادی قوتوں کی حدود بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ مادی حکومت جتنے ساز و سامان سے ایک علاقہ فتح کرتی ہے، اخلاقی حکومت اس سے بہت تھوڑے ساز و سامان کے ساتھ اُسے فتح کر لیتی ہے۔ چنانچہ تاریخ میں اس قسم کے تجربوں کی شہادتیں

اسلامی حکومت کی ماہیت

تلخیص -

خلاصہ :

(۱) مفاد پرست حکومت وہ ہوتی ہے جو :-

(ا) اس مقصد کے لئے قائم ہوتی ہے کہ باشندگانِ ملک کے مادی مفاد کی نگرانی ہو۔

(ب) نفع و نقصان کو اخلاق کا معیار قرار دیتی ہے -

(ج) اپنے پیشِ نظر کوئی ضابطہ اور اخلاق ایسا نہیں رکھتی جسے وہ محترم اور اٹل مانے -

(د) تمام تر مادی قوت پر دار و مدار رکھتی ہے -

(۲) اخلاق پسند حکومت وہ ہوتی ہے جو :-

(ا) مستقل اخلاقی معیارات اور اخلاقی قدروں کی پابند اور محافظ اور مبلغ ہو -

(ب) اپنے اخلاقی اصولوں کا مادی فوائد کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی -

(ج) اپنے باشندگان ملک کی تعمیرِ اخلاق کو اپنے بنیادی مقاصد میں شمار کرتی ہے - اور ان کے مادی مفاد سے زیادہ اہم قرار دیتی ہے -

(د) صرف مادی قوت ہی پر دار و مدار نہیں رکھتی بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اخلاقی قوت بھی فراہم کرتی ہے جسکی وجہ سے اسکی قوت کے اثرات وسیع تر ہو جاتے ہیں اور مخالفین کے لئے اس کا طرزِ عمل اخلاقی اپیل رکھتا ہے -

(۳) اسلامی حکومت مفاد پرست حکومت نہیں ہے -

(۴) اسلامی حکومت اخلاق پسند ہے -

(باقی آئندہ)

ہمارا پہلا ناول

(ایک منظر میں)

نعیم صدیقی

ایک تھا حامد!

فطرت اسے ادیب بنانے لائی تھی اور ماحول نے اسے دھکیل کر ایئر فورس میں بھرتی کرا دیا ۔ــــ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ایسے میں کیا ہونا چاہیئے تھا؟

بہرکیف ہونا جو تھا، وہی ہوا ــــ حامد کی داخلیت خارج سے ٹکرائی، آگ ابلی، لاوہ بہنے لگا، اس لاوے کے بلبلے اور جھاگ الفاظ بنے، الفاظ کو اسعد گیلانی نے ترتیب دی، ایک ناول وجود میں آگیا ــــ اور حامد اس میں تحلیل ہوگیا ۔ اب صرف اسعد گیلانی باقی ہے، جو ایک جہانِ نو کے لئے بیج ڈال رہا ہے، ــــ اس امید پر کہ ایک نہ ایک دن نیا نظام اُٹھے گا، نئی فوجی چھاونیاں اگیں گی، نئی ایرفورس اُٹھے گی، نئے کارخانے اگیں گے اور پھر حامد اور اس کے دوستوں کو ڈسچارج لینے کے لئے ایڑیاں نہ رگڑنی پڑیں گی۔

یہ اس مسافر کی داستان ہے جو "جاہلیت کی تنگ گھاٹیوں سے چلا اور چلتے چلتے اسلام کی حدود میں جا نکلا" ــــ انڈین ایرفورس میں بھرتی ہونے کے بعد ایسے تلخ تجربات کا سامنا کیا کہ وہ ڈسچارج لینے کے لئے بیتاب ہوگیا۔ لیکن جب اس نے ڈسچارج لیا تو انگریز بہادر کی ایرفورس سے نہیں، بلکہ پورے ماحول مسلط سے ۔ اسے ایرفورس کی بیرکوں نے، ڈسپلن سکھانے والی پریڈ نے، جانوروں کا سا سلوک کرنے والے افسروں نے، حقارت سے گالیاں دینے والے سپاہیوں نے متنبہ کیا کہ ماحول ایک بڑی طاقت ہے افراد اس کے سیلاب کے آگے حقیر تنکوں کی سی حیثیت رکھتے ہیں وہ سانچہ ہے جس میں فولادی چٹانوں کو بھی ڈھلنا پڑتا ہے ــــ اور وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے موم ہی کے بنے ہوئے انسان نہیں، لوہے کے انسان بھی اس میں ڈھل رہے تھے، دین و ایمان، ضمیر و احساس، افکار و مقاصد، عادات و خصائل، اخلاق و کردار پگھل پگھل کر باہر وہ ٹیڑھی منحوس شکل اختیار کر رہے تھے جس کے لئے سانچہ بنایا گیا تھا۔ پھر وہ دیکھ رہا تھا کہ اس سانچے کو جس نے توڑنے کی کوشش کی وہ آخر کار خود ہی ٹوٹ گیا، لیکن اس مسافر نے ــــ اس حامد کی خودداری نے اس شیطانی سانچے میں ڈھلنے سے انکار کر دیا۔ وہ اُکھڑ گیا اور اکڑا رہا ــــ یہاں تک کہ اس سانچے کے شکنجے سے اپنی جان بچا کر نکل بھاگا ــــ اور اب وہ بچے ہوئے اپنی داستان آپ کو سناتا ہے۔

اُس نے ماحول پر کچھ اچھے الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:-

"سوسائٹی اور ماحول ہمیں جس انداز میں پرورش کرتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ ہم اُس کے ویسے افراد ہو جائیں جیسے وہ چاہتے ہیں ــــ جیسے یہ نظام قاہر چاہتا ہے ــــ اور ہم ہو جاتے ہیں۔ نہ اس ماحول سے کوئی فرار ہے اور نہ اس نظام کے بندھنوں سے کہیں پناہ ہے۔ مقرر کردہ انداز سے ہٹ کر سوچنے کی سزا بھوک کی صورت میں دی جاتی ہے اور پھر پیٹ کہتا ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں، مجھ میں ہی سارے فلسفوں کا حل ہے۔"

اسلامی ادب کے نمائش کدے میں شعر و افسانہ کے ابتدائی نمونوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ اعلیٰ درجے کے نتائج فکر آراستہ ہیں، لیکن ابھی بعض گوشے

خالی رہے ہیں، مثلاً تمثیل کے گوشے میں سوائے دو چار چیزوں کے ہم کچھ نہیں پیش کر سکے، لیکن سب سے بدقسمت گوشہ ناول نگاری کا تھا —— جہاں ابھی کوئی ایک تخلیق بھی نمودار نہ ہوئی تھی لیکن اسعد گیلانی نے "جہنم کے دروازوں پر" نامی ناول پیش کر کے خلاء کو پُر کر دیا ہے۔

یہ ناول کیا ہے؟ یہ کس قدر و قیمت کا مستحق ہے! —— اس سوال کا جواب دینے میں وقت لگیگا۔ صیرفیانِ ادب اسے فن کے کانٹے پہ تولیں گے، تنقید کی کسوٹی پر پرکھیں گے، اور زبان و ادب کی کٹھالی میں گلائیں گے، تب کہیں یقین سے کہا جا سکے گا کہ وقت کے بازار میں اس کا نرخ کیا ہونا چاہیئے۔

یہاں جو کچھ اظہارِ رائے کیا جا رہا ہے وہ صرف مطالعہ کے اولین تاثرات پر مشتمل ہے۔ اسے حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا۔

میں سب سے پہلے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ناول پڑھ کر مصنف کے متعلق میرے ذہن میں کیا رائے پیدا ہوئی۔ یہ سوال ایسا ہے کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرنے والے سے ضرور پوچھا جانا چاہیئے، اور میں کسی کے پوچھنے سے پہلے جواب دیتا ہوں کہ اس ادیب کو جو جہانِ نو کے افسانچوں اور اپنے متعدد افسانوں میں ہمارے سامنے آ رہا ہے "جہنم کے دروازوں پر" کے ادیب کی پرواز نے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ میری رائے میں ہمارے بھائی اسعد کے ادبی مقام کو جس طرح اس کے ناول نے دریافت کیا ہے پہلے کی تحریریں نہ کر سکیں۔

ناول میں ادبیت کا زور بہت ہی نمایاں ہے، کہیں منظر نگاری کی صورت میں، کہیں خاکہ اڑانے کی صورت میں، کہیں طنز کی صورت میں، کہیں تشبیہ و استعارہ کی صورت میں، کہیں تخیل کی نزاکت کی صورت میں اور کہیں جذبات کے حسین و جمیل مظاہروں کی صورت میں! یہ ضرور محسوس ہوا ہے کہ ناول کے پہلے دو تہائی حصے کے بعد کے صفحات میں اسعد کی ادبیت اپنی راہ چھوڑ کر تصریف و تکرار کے چکر میں پڑ گئی ہے، جیسے ایک مسافر جو پہلے تازہ دم تھا تو وہ ایک قدم میں چار قدم آگے بڑھ جاتا تھا۔ لیکن چلتے چلتے جب تکان حرکت اعصاب میں سرایت کرنے لگی تو پھر پاؤں من من کے ہو جاتے ہیں اور جہاں اٹھاتا ہے وہیں رہ جاتے ہیں۔

اس کے باوجود شروع سے آخر تک کوئی صفحہ ایسا نہیں جو اہلِ ذوق کے لئے جمالیاتِ ادب کے کچھ نہ کچھ پُر تحریک نمونے آراستہ کئے ہوئے نہ ہو۔

بعض مقامات پر ذوقِ نگارش نے قلم کی باگیں اسعد کے ہاتھوں سے چھین لی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ادبیت کا زور ہے جو طولِ بیان پیدا کر رہا ہے، "حکایتِ لذیذ" "دراز تر گفتم" کی موجب بن رہی ہے۔ اس قسم کے مقامات غمازی کرتے ہیں کہ ناول نگار کے پاس اتنے بہت سے جذبات بند پڑے ہیں کہ جہاں تناسب کا پہرہ غافل ہوا وہ زندانِ ضبط کی دیواریں پھاند کے بھاگ نکلے۔ یہی نہیں کہ ان جذبات کو ناول کے پلاٹ نے مناسب موقعوں پر رخصتِ ظہور نہیں دی ہے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ ادیب اب تک جو کچھ لکھتا رہا ہے اس میں اپنے "داخل" کو "خروج" کرنے کے لئے راستے پیدا کر کے نہیں دے سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جا بجا حشر کے ڈراموں کی طرح کئی کئی ہم رنگ فقروں میں بات کہی گئی ہے۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر اگر ایک ہی چُست فقرے سے کام لیا جاتا ہے تو زور زیادہ ہوتا نہ کہ کم!

ہمارا ناول ایک اور پہلو سے جدید ناولوں کی صف کو چھوڑ کر پچھلے دور کے ناولوں کی صف میں چلا جاتا ہے —— اگرچہ وہ دوسرے پہلوؤں سے جدید ناولوں ہی کی صف میں آ شامل ہوتا ہے۔ شرر اسکول کے ناولوں میں ایک عنصر "وعظ" کا ہوا کرتا تھا۔ ناول نویس ناول کی رو پر چلتے چلتے یکایک رک جاتا اور کنارِ راہ کے کسی سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے پیچھے آنے والے کاروانِ قارئین کو روک کر اپنے گرد اکٹھا کر کے حلقہ بنا لیتا اور پھر اپنے دل کا غبار نکالنے تک انہیں بیٹھنے نہ دیتا۔ وہ انہیں مجبور کرتا تھا کہ آگے پھر ناول پڑھتے ہو تو میرا

ہمارا پہلا ناول

وعظ بھی تمہیں سننا پڑے گا۔

میں نے تمہاری تفریح کے لئے قصہ خوانی کا بازار نہیں کھولا ہے، مجھے تو کچھ اصول تم سے منوانے ہیں۔ قدریں تمہارے دل میں اتارنی ہیں۔ مجھے یہ حق دو تو میرے ناول میں تمہارا حق بھی ہے، ورنہ تم کون اور میں کون! یہاں مفت کا سودا نہیں بکتا، مول لینا پڑتا ہے، چنانچہ لوگ ناول کی شکر کھانے کے لئے اس میں لپٹی ہوئی کونین بھی اللہ کا نام لے کر نگل جاتے تھے (چاہے بعد میں حلق میں انگلی لے کے قے ہی کر دیں) اور پھر ناول نویس وعظ سے فارغ ہو کر ناول کے پلاٹ کی سڑک پر دوڑ پڑتا —— قارئین کا پورا کارواں ساتھ چاہیئے تھا۔

یہ پہلو ~~ریسے~~ بھی یہ کمزوری دکھائی ہے۔ وہ بھی شریک پیروؤں کی طرح اپنی تلقینات کو ناول میں اس طرح سمو نہیں سکا کہ ایک ہیجان محلول بن جائے بلکہ اسے بھی شکر خوروں کو کونین کھلانی پڑی ہے، وہ بھی قارئین پر زور دیتا ہے کہ جب تم شکر کیپ سولوں میں لپیٹ کر نہیں کھا~~سکتے~~ ~~تو~~ ~~میں~~ ~~کونین~~ کیوں کیپ سول میں لپیٹ کر کھلاؤں۔ اس کے چٹخارے لیتے ہو تو اس کا مزہ بھی چکھنا پڑے گا۔

~~اس کے~~ ~~نے~~ جہاں جہاں بھی ہیں، جنس غیر معلوم ہو رہے ہیں، جیسے کھیل کے میدان میں دارالمطالعہ!

جہاں مذکورہ بالا کمزوری ہے، وہاں بھی اللہ کا انداز پروپگنڈے کا نہیں ہے۔ ناول یقیناً تخلیقی ہے "نقارچیانہ"

چونکہ تمام تر دعوتی ہے اس وجہ سے ہم لوگ فوراً پروپگنڈے کی طرف لڑھک جاتے ہیں اور اس معاملے میں فن کی فقہ حد جواز میں ہمیں پابند رکھنا چاہتی ہے۔ ان کا لحاظ نہیں کرتے اور بے روک ٹوک دور تک چلے جاتے ہیں! ادب میں پروپگنڈا کرنا کسی دلیل سے حرام نہیں قرار دیا جا سکتا اور ایک تحریک کے ادیبوں کو تو بہرحال ایک اصول کی طرف لوگوں کو بلانا ہوتا ہے، لیکن ادبیات کے اپنے کچھ تقاضے ہیں اور ان کو نظر انداز کرکے بگٹٹ بڑھتے چلے جانا بالعموم یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ شعر کی شعریت، افسانے کی افسانویت اور تمثیل کی تمثیلیت ساری ختم ہو جاتی ہے، اور صرف پروپگنڈا باقی رہ جاتا ہے، جس میں کچھ دوام نہیں ہوتا۔ ہمارے ادیبوں اور شعرا کو اس معاملے میں جتنا جلد تنبہ ہو، اتنا ہی اچھا ہے،

اپنے ہاں کی نگارشات کے عام رنگ کے پیش نظر "جہنم کے دروازوں پر" کے بارے میں یہ اندیشہ تھا کہ یہ کہیں پروپگنڈے کا ناول نہ ہو —— اور ناول میں پروپگنڈے کا موقع بہت زیادہ نکالا جا سکتا ہے —— لیکن اسعد اس خطرے سے بچ کر نکل گیا ہے۔

سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ میں نے ناول کو پڑھنا شروع کیا تو پلاٹ کی اہمیت کی طرف توجہ ہوئی، لیکن اس سرے سے اُس سرے تک اسعد صاحب کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھرا اور پلاٹ کا محل وقوع کہیں نہیں ملا۔ وادیاں پھلانگیں، گڑھوں کا جائزہ لیا، جھاڑ جھنکار کو دیکھا، ایرفورس کی بیرکوں کی تلاشی لی۔ لیکن پلاٹ کا عنقا تخیل کے دامِ آفتاب گیر کے پھندوں میں نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہے کہ اسعد صاحب نے اپنے ناول کو "تاثراتی ناول" کہہ کر پیشگی معذرت کر دی ہے اور اب وہ شاید یہ ضرورت بھی محسوس کریں کہ "تاثراتی" کے معنی بھی ساتھ ہی لکھ دینے چاہئیں تھے، لیکن ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔

بات یہ ہے کہ جدید افسانے کو تو آپ کسی شخصیت کے صرف داخلی تاثرات کے سہارے سے تعمیر کر سکتے ہیں لیکن ناول کی تعمیر "اندرونِ خانہ" (IN DOOR) قسم کی نہیں ہوتی۔ ناول ہجوم واقعات کے بغیر کبھی ناول نہیں بن سکتا، چاہے اسے

ہمارا پہلا ناول

آپ چار ہزار صفحات پر کیوں نہ پھیلا دیں، ناول کی گاڑی چاہے داخلی تاثرات ہی کے مسافروں کو لے کے چلے اس کیلئے پلاٹ کی پٹڑی بچھانا ضروری ہوتا ہے، ورنہ وہ افسانے کی ادھی بس ہی رہے گی چاہے کتنی لمبی کیوں نہ بنا دیجئے!

"بے دانہ انگور" کی طرح ہمارا یہ بے پلاٹ کا ناول اسعد گیلانی سے جب جواب طلب کرتا ہے کہ حضرت لائیے میرا پلاٹ ——— کسی بازار سے خرید کر، کسی گھر سے مانگ تانگ کر ——— تو وہ معذرت کرتے ہیں کہ میرے عزیز ناول! میں نے تو حامد کی داستانِ سفر بیان کرنے کے لئے حقیقت نگاری کا قلم ہاتھ میں لیا تھا۔ اور جب حامد کی زندگی ہی میں کبھی پلاٹ نہ بنا ہو تو میں آخر اپنے پاس سے کیسے گھڑ لوں؟ ——— اس پر ناول جواب دیتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے حامد کے ہونے والے سوانح نگار کی ذمہ داری اٹھا کر اپنے کندھوں پر لے لی۔ حالانکہ یہ آپ کے فرائض میں داخل نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ناول کا یہ اعتراض سن کر اسعد صاحب سوچ میں پڑ جائیں کہ فی الواقع ایک ناول نگار کی حیثیت سے میرا کام اتنا ہی نہیں تھا کہ ایک حامد شخصیت کو لے لیتا اور اسکی سرگذشت کے گرد اپنی ساری ادبی تخلیقات کو پھیلا دیتا، بلکہ میری ذمہ داری تو یہ تھی کہ میں ایک حامد کو نہیں، بہت سے حامدوں کو لیتا۔ بلکہ پوری سوسائٹی کو لیتا اور ہر طرف سے طوفانِ حوادث کی لہروں کو جمع کرکے ایک پلاٹ بنا ڈالتا تو اچھا خاصا ناول بن جاتا۔ یہ ہوا غلط کہ ناول کو ایک شخصیت کے گرد گھما دیا۔ لیکن جو کچھ ہوا سو ہوا، اب تو گاڑی بے پٹڑی کے چلی اور بخیر اپنی منزل کو پہنچ چکی ——— خدا کا شکر ہے کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا، سب مسافر صحیح سلامت ہیں!

ناول اس کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ واقعات کا اتار چڑھاؤ بار بار قاری کے ذہن ...... کو تہ و بالا کرے، ورنہ طول واقعات تکان پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے ——— لیکن حامد کی ایرفورس کی چھاونیوں میں محدود زندگی واقعات کا اتار چڑھاؤ لائے کس بازار سے؟ ——— ناول نگار بچارا مجبور ہے کہ وہی کچھ بیان کرے جو اس کے سامنے ہے، وہ حامد کی زندگی میں خود اپنے پاس سے کوئی چیز کیسے ٹھونس سکتا ہے ——— اور حامد کی زندگی کی حدود سے باہر جانے کے بارے میں اس نے اپنے اوپر خود پابندی لگائی ہے۔

اسعد کے ناقدین اسے اسلام کے انقلابی داعی کی حیثیت میں جب سامنے رکھ کر ناول کا مطالعہ کریں گے تو وہ شاید یہ شکایت بھی کریں کہ معاشرہ کی بے شمار دکھتی رگوں پر طنز کا نشتر رکھنے کے مواقع جا بجا نکالے جا سکتے تھے، لیکن وہ صاف بچ گئے ہیں اور سوسائٹی میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان جو کشمکش ہو رہی ہے، زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کی جھلک دکھانے کی ذمہ داری سے ناول نگار کچھ کترا کے نکل گیا ہے ——— لیکن ایسی شکایت کے بجا ہونے کے باوجود ہمیں خوشی ہے کہ ناول نگار نے زندگی کے اہم مسائل پر اسلامی فکر کا پرتو ڈالا ہے اور غیر اسلامی فکر کی نشاندہی کی ہے۔

ان ناقدانہ قسم کی چند باتوں کے کہہ دینے سے ناول قدر و قیمت سے خالی نہیں ہو جاتا۔ اسے پڑھا جائے گا۔ اور آپ بھی اسے پڑھیئے، اس میں آپ کے لئے بہت کچھ ہے۔ وہ بہت کچھ کیا ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے سراغ راہ کی اشاعتِ آئندہ میں ناول کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

نیا اسلام

نعیم صدیقی

بہا تھا جو فاراں سے دنیا پہ نور — کیا اُس میں مُلّا نے پیدا فتور
وُہ دینِ کہن سوکھ کر رہ گیا — کہاں اُس کا باقی اثر رہ گیا
گئے گذرے کہنہ زمانوں کا دیں — فسانوں کا دیں، داستانوں کا دیں
نمازوں کا دیں، وہ اذانوں کا دیں — ختم پاراں قرآن خوانوں کا دیں
وہ دیں جس میں پابندیاں ہیں ہزار — ادھر نواہی کا اک خار زار
میاں! مت بلا کان یاں لٹ کھول — بڑی دیکھ بھال اور بڑے ناپ تول
فرائض، نوافل، سنن، واجبات — یہاں سے وہاں تک دو صد مشکلات
بڑا اہتمامِ حلال و حرام — نہیں اس گلستاں میں ممکن خرام
بچھے ہر طرف دام آیات کے — لگے کتنے پھندے روایات کے
وُہ پیچھے کو ہٹتا پلٹتا ہوا — وُہ ماضی کے اندر سمٹتا ہوا
اُسے آج کوئی کرے گر قبول — تو کہلائے دنیا میں وہ بوالفضول
کوئی آج اس پر اگر جم رہے — زمانہ نہ جانے کہ کیا کچھ کہے
مگر اس "دینِ مُلّا" پہ ٹھک جائیے — تو پھر خود ہی ناک اپنی کٹوائیے
اگر اس کو دُنیا میں لائیں گے ہم — کہاں اپنے چہرے چھپائیں گے ہم

زمانہ کہاں سے کہاں جا چکا — کئی منزلیں کارواں آ چکا
نیا دین اسلام درکار ہے — قیامت نئے دین [illegible]

نیا ہے بشر، ہو خدا بھی نیا — خدا بھی نیا، مصطفیٰ بھی نیا
فلک پر سے اُترے نیا جبرئیل — نئی الکتاب آئے بن کر دلیل
نئے ہوں حدودِ حلال و حرام — نئے مقتدی ہوں، نئے ہوں امام
نیا قبلۂ شوق، پائے وجود — بدل جائے سمتِ رکوع و سجود

ابھر آئے دینِ ترقی پسند — جو دے سُنّت کا ساتھ بے چون و چند
جو ہر کوچہ گردی پہ تیار ہو — جو گردش میں مانندِ پرکار ہو
ذرا آنچ دیں تو پگھل بھی سکے — جو ہر ایک سانچے میں فوراً ڈھل بھی سکے
جو ہر موڑ مڑنے میں ہشیار ہو — جو باطل سے جڑنے پہ تیار ہو
جو آگے نہیں، پیچھے چلتا رہے — دمادم جو شکلیں بدلتا رہے
جو اک خوش نما موم کی ناک ہو — مزاجِ صلابت سے جو پاک ہو
فنونِ لطیفہ کا ہو سرپرست — شرابوں ربابوں کی مستی میں مست
جو ہر بزمِ مے میں قدم جا دھرے — وہاں خوب جھومے، تلاوت کرے
چلے رقص گھر میں براہِ نیاز — کرے پیش فتوائے حکمِ جواز
وہ اسلامِ نو دور کی سوچ لے — نقابِ خواتین کی نوچ لے
حیا داریوں کا فسوں توڑ دے — [illegible]
جو غیرت کے احساس کو مار دے — [illegible]

جو عورت کو دے دیں مردانگی　　سکھائے اُسے گھر سے بیگانگی
جسے چِڑ نہ ہو رنگِ افرنگ سے　　نہ بِدکے کسی مغربی ڈھنگ سے
رفاقت دین ہو اس قدر تو فرود　　جھکے تاجِ برطانیہ کے حضور
بنے ملتِ مشترک سے بھی ربط　　رہے جس کو ذہنی غلامی کا خبط
ریاست ہو لادین جس کو قبول　　ہو تفریقِ دین و سیاست اصول
جو واشنگٹن کا ہو ذہنی غلام　　خرد بیں کو مانتا ہو امام
جو میکارتھر جی کے جھنڈے تلے　　بڑھے اور جہادِ مقدس لڑے
کہے پرورش ایسے فتویٰ فروش　　جو خود قرض ہوں آوارۂ قرآں بدوش
جو دے جاہلوں کو حقِ اجتہاد　　جو ایک ایک بدعت پہ کرتا ہو صاد
جو سرمائے کو دے خدائی کا حق　　جو محنت کو رکھتا ہو غرقِ قلق
جو حکّام کو رخصتِ عیش دے　　جو جمہور کو بس غم و طیش دے
جو قوت کے پاؤں پہ ماتھا دھرے　　مگر حق کی ذلّت کا ساماں کرے
جو غنڈوں کو سونپے قیادت کی باگ　　لگیں جس کے سائے میں خسّت کو بھاگ
شرافت کو مسجد میں رکھے اسیر　　جو تقویٰ کو ٹھہرائے بالکل حقیر
امانت خیانت کے ہاتھوں میں دے　　دیانت کی قیمت گراتا رہے
ہو جو "مردِ میداں" ہمہ تن گنہ　　بتائے اُسے حق کے "ظلِ اِلٰہ"
ہم چوروں کو سونپے عدالت کا تخت　　کہ انصاف کا ہو جگر لخت لخت
جسے کوئی مطلب ہو "کام" سے　　جو رکھے غرض نام ہی نام سے
جو ہو قدرداں جوشِ گفتار کا　　جو طالب ہو حسنِ کردار کا
جو نعرے تو سنے اور گم سم رہے　　عمل کے تقاضے نہ ہم سے کہے
چلیں سینٹی منٹ کے عجیب ڈھنگ　　پھلیں اُن سے عجب [illegible] و رنگ

تڑپتی ہو جب حرّیت دام میں　　بگڑنے زندگی چاہِ آلام میں
تو اسلام نو "مسکرا کر کہے　　کہ یہ امن کا راج قائم رہے!

بہرحال، اے دینِ مُلّا! سلام!
یہاں ہو رہا ہے نیا اہتمام

وہ دیکھو، نئے دین کی چونے نسیم　　بہی، جذب کر کے خرامِ نسیم
کلفٹن سے سوئے ہمالا چلی　　وہ نخرے دکھاتی چھنالا چلی
کرامت یہ جدّت کی اچھی رہی　　مبارک ہو! خوب اُلٹی گنگا بہی
مسلسل تقاریر کرتی ہوئی　　بہت اینٹھتی اور برستی ہوئی
وہ نعروں پہ نعرے لگاتی ہوئی　　بیانوں کے موتی لُٹاتی ہوئی
وہ "اسلام اسلام" کرتی ہوئی　　وہ ہر کفر کو عام کرتی ہوئی
تکلّم فروز اور ترنّم فشار　　"تبسّم فروش" اور تنعّم شعار
کہیں حُسن اُبھرا ہے بن کر حباب　　کہیں ہے بھنورِ عشق کا پیچ و تاب
ہیں رقصندہ جوشِ صد رنگِ ناز　　اُدھر بجتے ہیں آبشاروں کے ساز
کبھی نرم رو ہے کبھی گرم خیز　　کہیں سست پا ہے کہیں تیز تیز
کہیں تن گئی تو کہیں من گئی　　کہیں ٹھن گئی تو کہیں بن گئی
ہزاروں طرح کرتی ہے جوڑ توڑ　　کبھی اس سے مل اور کبھی اس کو چھوڑ
یہ آگ اور پانی کو کرتی ہے ایک　　خرد کو جنوں پر دیا ہے چھپک
ہے "نیک" اس کے پیچھے تو "بد" سامنے　　وہ حد اس کے پیچھے یہ حد سامنے
یہ ماضی کا ساحل چلی کاٹتی　　چٹانوں کے قلب و جگر چاٹتی
قیودِ شریعت کو چھوڑا! بڑھی　　حدودِ الٰہی کو توڑا! بڑھی
پُرانے کنارے بہا لے گئی　　قدامت کی قدریں اُڑا لے گئی

نئی رودگہ خود بناتی ہوئی — نقوشِ کہن کو مٹاتی ہوئی
اِدھر اک اشارہ کیا، بڑھ گئی — اُدھر ایک چرکا دیا، بڑھ گئی
ہمہ تن ہے یہ جذبۂ اجتہاد — یہ تاریخ سے لڑ رہی ہے جہاد
"اوامر" کو زیر و زبر کر گئی — "نواہی" کو جرأت سے سر کر گئی
حمیت کی میت اٹھا کر چلی — حیا کو ٹھکانے لگا کر چلی
روانی میں ہے جوئے فسق و فجور — جوانی پہ ہے اس کا شورِ نشور
یہ آغاز ہے اس پہ رونا ہے کیا! — ابھی دیکھ آگے کہ ہوتا ہے کیا
یہ ندی ہے، دریا اسے بننے دو — حوادث اسے اور کچھ جننے دو
تو پھر دیکھنا گل کھلاتی ہے کیا — یہ "فتنہ" "قیامت" اٹھاتی ہے کیا
تمہاری عباؤں قباؤں کی خیر — تقدس کی کہنہ رداؤں کی خیر

نمازوں کا کیا حال ہو، کیا نہ ہو! — زمانے کی کیا چال ہو، کیا نہ ہو
"اذانوں" کی یہ گونج کب تک ہے — کہاں تک [illegible] کے پیچھے
نہ معلوم "عصمت" پہ بیتے گی کیا — مرے گی یہ کیا اور جیئے گی کیا!
تقدس کے گھر میں بجیں گے رباب — شرافت کے گھر میں بہے گی شراب
حیا بے حیائی کو پالے گی خود — بھلائی برائی کو پالے گی خود
لبِ جُو پہ تم بزم آرا رہو! — خموشی سے محوِ تماشا رہو!
کوئی دن کی ہے بات، وقت آئے گا — کہ پانی سروں سے گزر جائے گا

سرِ چشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ فیل

اسلامی معاشیات نمبر

اسلامی معاشیات نمبر کی ہماری بھر کم اسکیم تو ہم پیش کر چکے ہیں ۔۔۔ اور ابھی تک اسے عمل میں لانے کا عزم قائم ہے ۔۔۔ لیکن اس اسکیم کی اشاعت کا ردِ عمل بعض پہلوؤں سے کما حقہٗ نمودار نہیں ہوا۔ خیال تھا کہ اس سلسلے میں اپنے حلقوں سے تعاون کی پیش کش ہی نہ آئے گی۔ بلکہ مفید مشورے کثرت سے موصول ہوں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ صرف دو چار رفقاء نے ذرا سی دلچسپی لی ہے اور محض ایک رفیق نے سرگرمی سے تعاون شروع کر دیا ہے۔ ان حالات میں محسوس ہوتا ہے کہ کہیں یہ اسکیم اپنے وقت سے چند سال پہلے تو پیش نہیں کر دی گئی۔ اسی احساس کے پیشِ نظر اہل قلم حضرات سے مضامین کے بارے میں ابھی تک ضروری مراسلت نہیں کی گئی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر طرف سے معذرتیں موصول ہونے لگیں۔ اور آخرکار خود ہمیں قارئین چراغِ راہ کے سامنے ایک آخری معذرت پیش کر دینی پڑے۔ ناقص نمبر نکالنے پر ہم تیار نہیں ہیں۔ اور اسے جامع بنانے کے لئے تنہا ہماری کوششیں کافی نہیں ہو سکتیں۔

تاہم ابھی امیدیں قائم ہیں۔ اور ان شاء اللہ یہ نمبر نکلے گا۔

چند مزید عنوانات جو بعد میں سامنے آئے ہیں۔ یہ ہیں :۔۔۔

(۱) معاشیات اور اسلامی نظامِ تعلیم۔

(۲) فنِ حسابیات (ACCOUNTS) اور معاشیات۔

(۳) معاشیات میں اعداد و شمار کا استعمال۔

(۴) نظامِ سرمایہ داری اور اس کا نشو و ارتقا۔

(۵) روس کا نظامِ معیشت۔

(۶) پاکستان کی سہ سالہ معاشی تاریخ ۔۔۔ (۱) تعاریر اور کاغذی اسکیموں کے لحاظ سے (۲) عمل و واقعہ کے لحاظ سے)

(۷) پاکستان کے لئے تعمیرِ معیشت کا ایک جامع منصوبہ۔

(۸) حضرت عمر بن عبدالعزیز کی معاشی اصلاحات۔

علاوہ بریں ایک مضمون اس نمبر کے لکھنے والوں کے تعارف پر مشتمل ہوگا۔

یہ تجویز بھی اہم سمجھی گئی ہے کہ پوری دنیا کا ایک نقشہ اور پاکستان کا ایک نقشہ معاشی کوائف کو واضح کرنے کے لئے اس نمبر میں شامل کیا جائے۔

پھر زیرِ غور یہ بھی ہے کہ جائز آرٹ (فوٹو۔ ڈرائنگ۔ خطاطی) کے دو چار ایسے نمونے بھی شریکِ اشاعت ہوں جن کا تعلق "معاشیات" کے موضوع ہی سے ہو اور جن میں کچھ نیا پن پایا جائے۔ ایسے چند نمونوں کے لئے ابتدائی تخیل متعین ہو چکا ہے۔ بس اس مسئلے کو اب مصارف کے نقطۂ نظر سے سوچا جا رہا ہے۔

معاشیات نمبر سے چراغِ راہ کا سرورق بھی بدل جائے گا۔ نئے سرورق کی ڈیزائننگ کرائی جا رہی ہے۔

اب جو حضرات اس نمبر کا وجود میں آنا اور معیاریت کے ساتھ وجود میں آنا ضروری سمجھتے ہوں ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کے پروگرام میں ہر پہلو سے تعاون کی پیشکش کریں۔ ورنہ تغافل کا اگر یہی عالم رہا تو آئندہ ماہ کے چراغِ راہ میں ساری تجویز کو منسوخ کر دینے کا اعلان

مجھے میرے "بڑوں" سے بچاؤ

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

نعیم صدیقی

یہ بچے کے احساسات ہیں جو اس کے اندر بڑوں کے متعلق پیدا ہوتے ہیں
لیکن ان کے اظہار کے لئے چونکہ بچے کی زبان پورا ذخیرہ الفاظ نہیں رکھتی،
اس لئے بڑوں کی زبان مستعار لی گئی ہے۔

امی کہتی ہیں دھوپ میں پھرو گے تو بخار ہو جائے گا ——— حالانکہ پرسوں جب گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے، اور مجھے موقع مل گیا تھا تو میں کلو اور سوسن دو تین گھنٹے کڑکتی دوپہر میں کھیتوں میں گھومتے پھرتے رہے تھے، لیکن مجھے کوئی بخار نہیں ہوا۔ کلو کو بھی نہیں ہوا، سوسن کو بھی نہیں ہوا ——— پھر خدا جانے امی اس طرح کی باتیں کیوں کہتی ہیں، مجھے تو منع کرتی ہیں کہ جھوٹ نہ بولا کرو، غلط باتیں نہ کیا کرو لیکن خود ایسی ایسی باتیں کہہ دیتی ہیں جن کا سر ہوتا ہے نہ پیر!

یہ ہمارے مہمان جو آئے تھے۔ یہ بھی تو عجیب حرکتیں کرتے تھے، جب تک وہ گھر میں رہے، میرا جی ہی نہیں لگتا تھا۔ یہ لوگ مجھے زبردستی پکڑ لیتے تھے، گود میں بٹھا لیتے تھے، پھر کوئی پوچھتا کہ پڑھتے کیا ہو، کوئی کہتا سبق سناؤ، کسی کا سوال تھا کہ نام بتاؤ، کبھی یہ معلوم کیا جا رہا تھا کہ منے میاں سے تم کو کتنی محبت ہے؟ کتنے فضول سوالات تھے، ان کی کیا ضرورت تھی! ان لوگوں نے مجھے مذاق کا ہدف بنا رکھا تھا، جیسے میں کوئی کھلونا ہوں، اور میری کوئی عزت نفس نہیں ہے۔

اپنی باتیں تو یہ خوب خوب کرتے تھے، خالہ بھی، خالو ابا بھی، امجد آکا بھی، اور سب کے سب، ابا اور اماں بھی، لیکن جب میں نے اپنی کوئی بات چھیڑی تو فوراً مجھے خاموش کرا دیا گیا کہ چپ رہو، بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔ اچھا مان لیا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہم بچے اپنی جگہ کھیل رہے ہوتے ہیں تو ابا میاں کیوں آ کر ہماری باتوں میں دخل دیتے ہیں۔ یا تو قاعدہ یہ ہو کہ بچوں کی دنیا الگ، بڑوں کی دنیا الگ، یا پھر یہ ہو کہ بڑے بچوں کی سنیں اور بچے بڑوں کی سنیں، لیکن یہاں عجیب اندھیر گردی ہے۔ وہ باتیں کریں تو ہم چپ رہیں اور ہم باتیں کریں تو ہمیں ڈانٹ دیا جائے کہ دخل نہ دو۔

اتنا ہی نہیں، بے انصافی کی حد ہے کہ ابا خط وط لکھ رہے ہوں، اخبار پڑھ رہے ہوں تو ہمیں حکم ہے کہ گھر میں "چوں" بھی نہ کریں کیونکہ ابا کے کام میں ہرج ہوتا ہے، لیکن ہم کتنا ہی ضروری کھیل کیوں نہ کھیل رہے ہوں، بلکہ اسکول کا کام بھی کیوں نہ کر رہے ہوں، ہمیں بلا تامل پکارا جائے گا کہ ممو، ذرا دروازے پر جانا کوئی بلا رہا ہے ——— پھر اگر فوراً کام چھوڑ کے لپک نہ جائیں تو خطرہ ہوتا ہے کہ یا تو اماں کی گھرکیاں ہوں گی یا ابا کی لاٹھی حرکت میں آ جائے گی ——— یہ کم بخت، لاٹھی دیکھنے میں جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی اپنے اوصاف کے لحاظ سے گھناؤنی ہے! آخر یہ کیا انصاف ہے!

اور سنئے! ابا کی کتابوں میں بڑی بڑی مزے کی تصویریں ہیں، عجب عجب نقشے ہیں! اور جی یہ چاہتا ہے کہ ان پر اپنا قبضہ ہو، ہمیں کتابیں "کوچا ہیں دیکھیں بھالیں، نقشے اتاریں، تصویریں کاٹ کر نکال لیں، لیکن اس کی اجازت کسے ہے۔ چلئے مان لیا کہ ابا کی کتابوں سے ہمیں کوئی "واسطہ نہیں ہونا چاہئے، وہ بڑی قیمتی ہیں اور چھوٹوں کے کام کی نہیں ——— اگرچہ یہ بات غلط ہے کہ وہ ہمارے کام کی نہیں ہیں۔ سنئے"

[illegible]

اسی طرح یہ بھی مان لیا کہ امی کی سلائی کی مشین، قیمہ کرنے کی مشین اور سوئیوں کی مشین پر بھی ہمارا کوئی حق نہیں اور یہ چیزیں بھی ہمارے کام کی نہیں، اور یہ بھی تسلیم کر آپا جان کی گڑیاں، کھلونے، کتابیں جیومیٹری بکس، ڈرائنگ کا سامان، یہ ساری الا بلا بھی ہمارے حدود اختیار سے بالاتر ہے، لیکن جو کچھ ہمارا ہے، اس پر کسی کی دراز دستی کے کیا معنی؟ ـــــ مثلاً دیکھئے برابر کئی ہفتوں سے کوڑے کے ڈھیر چھان چھان کر، ابا کی ردی کی ٹوکری کی تلاشی لے لے کر کچھ کاغذ ہم نے جمع کئے تھے۔ یہ کاغذ ہمیں بہت پسند تھے اور ان کا عجائب گھر ہم نے سجا رکھا تھا، لیکن ایک دن امی کی توجہ نہ جانے کیسے ان کی طرف پھر گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ شور مچ گیا کہ گھر میں کوڑا بھر رکھا ہے، تمام فرش خراب کر دیا ہے، یہ ہو گیا وہ ہو گیا اور پھر یہ سارا عجائب گھر چولہے میں تھا ـــــ اور ہم بسورر ہے تھے، لیکن بسورنے سے کیا حاصل! اسی میں کئی ٹکٹیں تھیں، دو تین تصویریں خود ہم نے بنائی تھیں، ایک طوطے کی، دوسری اونٹ کی، نہ یہ رہی، نہ وہ رہی! اسی عجائب گھر میں کاغذ کی دو کشتیاں بھی تھیں، ایک خط ہم نے لکھ رکھا تھا، تین لطیفے نقل کئے ہوئے تھے ـــــ کچھ بھی نہیں بچا!

ابھی پرسوں ہی کا تو ذکر ہے کہ میں نے باہر گھاس میں دیکھا کہ ایک ٹڈا ہے جس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور بیچارا حرکت نہیں کر سکتا میں اسے گھر اٹھا لایا، کپڑے کی ایک دھجی بچھا کر صحن کے ایک کونے میں اسے بستر پر ڈالا، کیونکہ جو کوئی بھی بیمار ہوتا ہے اسے بستر پر ڈالا جاتا ہے، پھر اسکے لئے تھوڑا سا دودھ لیا۔ ڈبل روٹی لی، شکر لی، اور دوات کے ڈھکن میں ڈال کر اس کے آگے یہ سب رکھا کہ وہ کچھ تو کھائے، مگر وہ کچھ کھاتا ہی نہیں تھا۔ شاید بے ہوش ہو گیا ہو۔ میں اسکی تیمارداری میں شام تک لگا رہا، حتیٰ کہ کھانے کا وقت ہو گیا یہ ابا اماں جو کہتے ہیں کہ مظلوم اور دکھی پر رحم کرنے سے ثواب ہوتا ہے اور اللہ میاں خوش ہوتے ہیں، انہی کے بتانے سے میں ادھر لگا تھا۔ لیکن اب یہی مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ کھانے میں دیر ہو رہی ہے، کن فضولیات میں لگے ہو ـــــ لیجئے ایک ثواب کا کام ان کی نگاہ میں فضولیات ٹھہرا۔ خود ہی وہ کہتے ہیں، خود ہی یہ فرماتے ہیں،

مگر میرا دل دکھی تھا، میں اس کی ٹانگ کو دیکھتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا کہ خوب روؤں، مجھے اس ٹڈے سے ایسی محبت ہو رہی تھی کہ اگر اس سے کچھ ڈر سا نہ ہوتا تو میں اسے اٹھا کر چوم لیتا۔ لیکن اماں نے تو حد کر دی وہ اٹھیں اور قریب آکر جھک کے اس ٹڈے کو دیکھا تو آگ بگولہ ہو گئیں کہ یا بی، کن کاموں میں وقت ضائع کرتا ہے اور اسے چمٹے سے اٹھا کے دیوار کے باہر پھینک دیا ـــــ مجھے گھسیٹتے گھسیٹتے دسترخوان پر لے آئیں۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ نیکی کی باتیں بتاتے ہیں اور پھر وہی باتیں کرنے نہیں دیتے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا تھا اس پر ابا اماں دونوں بہت خوش ہوں گے اور اٹھا کر مجھے چمکاریں گے اور پھر کہیں گے کہ ہمارا منّو کتنا اچھا ہے، کتنا پیارا بچہ ہے، لیکن انہوں نے تو حد کر دی۔

ادھر ماسٹر صاحب بھی عجیب قسم کے آدمی ہیں۔ ایک مہینہ ہوا ہمیں سبق پڑھاتے ہوئے بتانے لگے کہ چھوٹوں سے پیار کرنا چاہئے ان کی مدد کرنی چاہئے۔ اور ان کو کبھی مارنا نہیں چاہئے ـــــ اور ہمیں نصیحت کی کہ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کبھی سختی نہ کیا کرو۔ ہم اس سبق پر بہت خوش ہوئے کہ اب تو ماسٹر صاحب کا مزاج بدل رہا ہے۔ مگر وہی سبق جب شام کو ہم سنانے لگے تو میں ایک لفظ پر اٹکا، ابھی غور کر ہی رہا تھا کہ قمچی پڑ گئی۔ قمچی پڑنے سے جو درد ہوا وہ تو ہونا ہی تھا۔ لیکن اصل دکھ اس بات کا تھا کہ ماسٹر صاحب کے متعلق نئے اندازے کا جو محل استادہ ہم نے اپنے دل میں کھڑا کر لیا تھا وہ اس طرح گر گیا جیسے پچھلی برسات میں ہمارا باورچی خانہ گرا تھا کہ کسی طرف کی کوئی دیوار سلامت نہ رہی تھی۔ اگر میں چھوٹا بچہ نہ ہوتا تو ماسٹر جی سے پوچھتا کہ میرا قصور کیا؟ ایک لفظ ہی کا تو لفظ مجھے یاد ہوتا تو میرا فرض تھا کہ بیان کر دیتا، نہ کرتا تو مجرم تھا، لیکن وہ مجھے یاد ہو ہی نہیں سکا۔ تو میرا

اختیار اس میں کیا تھا۔

ماسٹر صاحب عام طور پر ہمارے دل میں پیدا ہونے والے اس سوال کا جواب خود بخود ہی دیتے رہتے ہیں اور وہ یہ ہوتا ہے کہ جب میں سبق پڑھاتا ہوں تو تمہارا خیال کہیں کا کہیں گھومتا رہتا ہے۔ ہماری بلا جانے کہ یہ خیال کیا بلا ہوتی ہے، یہ کس طرح گھومتی ہے، کہاں کہاں چرتی ہے، البتہ اتنا جانتے ہیں کہ جب ماسٹر پڑھاتے ہیں تو ان کی آواز، ان کی صورت اور ان کا طرزِ عمل ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنا آفت معلوم ہوتا ہے اور ہم اس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ہماری غلطی ہو، لیکن ہم کریں کیا؟ کیوں نہ ماسٹر صاحب بدل جائیں۔ وہ ہمیں کہانیاں سنائیں، ہمیں ہنسائیں، تصویریں دکھائیں، کھیل کھلائیں۔ سیر کرائیں، صلح سلامتی سے پڑھائیں، تو ان سے ہمارے تعلقات اچھے ہو جائیں۔ اور ہم دھیان دینے لگیں۔ بس ان کو ضد ہے کہ وہ رعب گانٹھتے رہیں گے، تھپیاں مارتے رہیں گے، جو چیز ہمیں پسند ہوگی وہ نہ کریں گے۔ ہمارا کوئی لحاظ نہ رکھیں گے۔ اب اگر خیال کہیں چرتا پھرتا پھرے تو قصور کس کا ہے؟

خیر مان لیا کہ قصور ہمارا ہی ہوتا ہے اور ہمیں سزا ملنی چاہئے۔ لیکن کیا ماسٹر صاحب کا کبھی کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا ہے تو ان کو سزا دینے والا کون ہے اور سزا دینے کی صورت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم بچے کچھ نہیں کر سکتے، وہ غلطی کرتے ہیں اور بات ٹال جاتے ہیں۔ مثلاً وہ بیٹھے ہوئے تھے میری دوات ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی، اب اس پر سزا کا تو کیا سوال، مجھ سے آپ نے معافی [illegible] نہیں مانگی، حالانکہ خود ہمارے [illegible] کسی دوسرے کا نقصان کر بیٹھو تو فوراً معافی مانگو——— بلکہ الٹا مجھے ڈانٹ کر حکم دیا کہ اٹھالے جا [illegible] دوات گر کر کوڑے کے ٹین میں ڈال دو۔ لیکن اس سے دس روز پہلے میرے ہاتھوں حبیب سلیم کی دوات ٹوٹ گئی تھی [illegible] جو تھپیاں ماسٹر صاحب کے ہاتھ سے کھائی تھیں ابھی ایک بھی نہیں بھولی

ان تھپیوں کا [illegible] سب [illegible] مثال ہے۔ ایک دن افسر نے نہ جانے کیا کہہ دیا کہ ہم سب ہنس پڑے، آخر ہنسی تو آتی ہی ہے، پھر ہمیں [illegible] خرچ کے ڈانٹ [illegible] گئی۔ لیکن ماسٹر صاحب کا جس دن جی چاہتا ہے ہنس دیتے ہیں اور ان کی خبر لینے والا کوئی نہیں۔ یہ ہنس دینا کس وجہ سے جرم ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہنسی تو ہنسنے آتی ہے، اسے سوچ سمجھ کر آتی ہے، زور کر کے آتی ہے اور آکے رکتی ہے پھر رکتا نہیں [illegible] صورت [illegible] رکھنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے۔ ابا کے پاس ایک رسالہ "ہمدردِ صحت" آتا ہے، اس میں میں نے خود پڑھا تھا کہ ہنسنے [illegible] سے صحت ترقی کرتی ہے، مگر ماسٹر صاحب کو ہنسنے سے بیر ہے، ان کو تو جتنی دھوبیئے کی شکل پسند آتی ہے اور [illegible] ہیں کیونکہ اس [illegible] کی صورت ہی اللہ میاں نے ایسی بنائی ہے کہ دیکھو تو ترس آئے اور وہ اگر کبھی ہنستا ہے تو اسے ڈھنگ نہیں آتا کہ کیسے ہنسے۔ جب تک وہ جوڑ توڑ کر کے مسکرانے کی سی صورت بناتا ہے، وہ بات ہی گئی گذری ہو جاتی ہے جس پر دوسرے ہنسے تھے۔

سوچ سوچ کر حیران ہوتا ہوں کہ اللہ میاں نے ان بڑوں کو کیا بنایا ہے۔ ماسٹر صاحب ہوں یا ابا یا ماں، ان کا نقشہ اس وقت بڑا خوفناک ہوتا ہے، جب ان کو غصہ آتا ہے۔ ان کی شکلیں عجیب و غریب قسم کی ہو جاتی ہیں، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، آنکھیں باہر نکلی پڑتی ہیں اور جو لفظ منہ سے نکالتے ہیں وہ غلط ہوتے ہیں۔ پھر ایسی ایسی باتیں کہنے لگتے ہیں کہ جیسے نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے۔ ایسے میں ان کا سارا بڑاپن غائب ہو جاتا ہے، وہ مجھے ہیبت ناک بن جاتے ہیں——— اور میں ہکا بکا ان کو دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ مجھے پھر ان کی [illegible] تھیں [illegible] پڑ جائے اور ہر بیٹا جانے۔ اس وقت مجھے معلوم ہو کہ یہ غصے کا دورہ تھا۔

مجھے میرے بڑوں سے بچاؤ

امی پر تو مجھے اس بات پر سخت افسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت منے کو گود میں لئے رہتی ہیں، باتیں بھی اسی سے کرتی ہیں، سلاتی بھی ساتھ اسی کو ہیں ——— ابا جب بازار جاتے ہیں تو منے ہی کے لئے طرح طرح کی چیزیں منگاتی رہتی ہیں، کپڑے، دودھ کی بوتل، چسنیاں، رومال، پوڈر، جھنجھنے، اور جانے کیا کیا، مگر میرا نمبر تو سب سے پیچھے ہے، بلکہ جیسے میں اب ان کا کچھ رہا ہی نہیں، پاس جاؤں تو ہٹا دیتی ہیں۔ پیار نہیں کرتیں، چمکارتی نہیں، باتیں نہیں سنتیں، کہانیاں نہیں سناتیں۔ معلوم نہیں انہیں اب ہو کیا گیا ہے، پہلے تو ایسی نہ تھیں اس منے نے آکر ان کو کیا سے کیا بنا دیا۔ اب میں بھی جب موقع لگے اس کی خبر لوں گا۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اسے اٹھانا نہیں چاہتا میرا دل چاہتا ہے کہ اسے گھر سے باہر پھینک دوں۔

منے کو کبھی اٹھانا چاہوں تو روک دیا جاتا ہے ——— کہ ہیں ہیں دیکھنا گر پڑے گا، رونے لگیگا، یہ ہوگا وہ ہوگا، گویا میں نالائق آدمی ہوں۔ ایک منے ہی کا معاملہ نہیں، کبھی اگر سالن کی رکابی اٹھاکر مردانے میں لے جاتا ہوں، ابا کو چائے دان لے جاکے دینا چاہوں، شکر کا مرتبان خود کھولنا چاہوں، تو ہر کام سے مجھے روک دیا جاتا ہے۔ مجھے گھر کے سارے ہی لوگوں نے نہایت بے وقوف، کمزور، اور بے کار آدمی بنا رکھا ہے، میں گویا کسی کام کا نہیں۔

بے اعتباری ہی تک بات رہتی تو بھی صبر کر لیتا، وہاں تو دل دہلاتے رہنے کی ایک مہم جاری ہے۔ اگر میں اپنے باغیچے کے کسی درخت پر چڑھتا ہوں تو شور مچ جاتا ہے کہ گر پڑوگے، اگر میں چھلانگیں لگاؤں تو مجھے ہولا دیتے ہیں کہ ٹانگ ٹوٹ جائے گی، اگر میں سڑک پر چلوں تو ڈراتے ہیں کہ کسی گاڑی کے نیچے آ جاؤ گے، اگر میں اکیلا نکلوں یہ دھمکی کہ راستہ بھول جاؤ گے یا محلے کے لڑکے ماریں گے، پڑوسیوں کا کتا کاٹ کھائے گا ——— یعنی مدعا یہ کہ میں بس پتھر ہو کر پڑا رہوں، ورنہ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے میں دیکھتا ہوں کہ میرے پڑوس کے بچے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور انہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آتا، لیکن ابا اماں ہیں کہ مجھے گندی گندی کہانیاں سناتے رہتے ہیں کہ فلاں محلے میں بچہ ڈوب مرا یا اخبار میں لکھا ہے کہ ایک بچہ آج موٹر سائیکل کی چپیٹ میں آگیا اور ہسپتال میں زیر علاج ہے، کبھی بتائیں گے کہ تمہاری خالہ کا ایک بھائی جوا کرتا تھا اسے کوئی اٹھالے گیا ——— یہ باتیں سن سن کر مجھے کتنے ہی ڈراونے خواب دکھائی دیتے ہیں اور میں بہت پریشان ہوتا ہوں۔

بس دھمکیاں، ہدایات، نصیحتیں، ڈراوے، پابندیاں چاروں طرف سے اسی طرح کھنچے ہوئے ہیں کہ کان تک ہلانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ مجھ سے جو کوئی بھی عمر میں بڑا ہے وہ اپنا قانون برابر چلاتا رہتا ہے اور حکم حضور سے مجال سرتابی نہیں ہوتی۔ کپڑے کیوں میلے کر دئے، چھری ہاتھ میں نہ لو، کوڑا پھیلا رہے ہو، مشین کو چھیڑ دیا، سائیکل گر پڑے گی۔ منہ نہیں دھویا، بال بکھر رہے ہیں۔ نوالہ چبا کر کھاؤ، چھوٹے لقمے لو، بسم اللہ پڑھی ہی نہیں، کھانے میں زیادہ باتیں نہیں کرتے وغیرہ فقرے صبح سے شام تک بیسیوں مرتبہ سننے میں آتے ہیں اور یہی سنتے سنتے دن رات گزرتے ہیں۔ میرے گرد ایک پنجرہ سا بنا ہوا ہے اور میں اس میں پھڑپھڑاتا رہتا ہوں۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں،

مجھے یہ سب کچھ منظور ہے، مگر پہلے مجھے قائل معقول تو کیا جائے۔ ہر بات اس طرح کہی جاتی ہے کہ نہ دلیل نہ اپیل۔ ماسٹر صاحب کی عادت ہے کہ میں ان کی پسند کے خلاف کوئی حرکت کر بیٹھوں تو فوراً کہیں گے: "عمو! بری بات ہے"! ——— صاحب آخر کیا بری بات ہے۔ مجھے بھی تو پتہ چلے۔ لیکن کچھ سمجھائیں گے نہیں، بلکہ ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے زور سے کہہ دیں گے "بری بات ہے"۔ مجھے اگر پتہ چل جائے کہ یہ واقعی بری بات ہے تو میں آخر برا تھوڑی ہوں، میں کیوں برائی کرنے لگا، لیکن یہ تو ضروری ہے کہ برائی کا اتا پتا تو دیا

مجھے میرے بڑوں سے بچاؤ

جائے اور زبردستی یہ منوایا جائے کہ بری بات ہے ۔ یہی حال امی کا ہے ۔ اگر جی اپنی مٹھائی کھانے کے بعد کبھی مجھ سے میرے اپنے حصے کی مٹھائی میں سے کچھ مانگتی ہے اور میں انکار کر دیتا ہوں تو وہ فرماتی ہیں کہ "محمود دیکھو ! ایسے گناہ ہوتا ہے" ——— مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ گناہ کیسے ہو گیا ۔ وہ اگر دستِ پناہ ہاتھ سے رکھ کر اور مجھ اپنی اس پسندی کا پورا پورا یقین دلا کر پھر یہ بات سمجھا دیں کہ یوں گناہ ہوتا ہے تو میں کبھی گناہ نہیں کرنا چاہتا ۔ لیکن وہ نہیں سمجھاتیں، ان کو فرصت نہیں ملتی ! ——— اب میں کیا کروں ۔

یہ ان بڑوں کو پتہ نہیں اتنی ضروری باتوں کے لئے کیوں نہیں فرصت ملتی ۔ مجھے ہزاروں باتیں کہنی ہیں، ہزاروں سوال پوچھنے کے ہیں ۔ لیکن جب موقع نکال کے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، ٹال دیا جاتا ہے ۔ کتنی ہی مرتبہ ابا سے دریافت کر چکا ہوں کہ خدا کیا ہے ؟ وہ ہنس دیتے ہیں اور بس ۔ دو ایک مرتبہ امی سے پوچھا کہ اللہ میاں کے لئے روٹی کون پکاتا ہے ۔ تو وہ توبہ توبہ کرنے لگتی ہیں اور کہتی ہیں کہ کیا کبھی اللہ میاں بھی روٹی کھایا کرتے ہیں ——— لیکن اگر وہ نہیں کھاتے تو بھوک کا کیا کرتے ہوں گے ؟ اب ان باتوں کا کوئی جواب مجھے نہیں ملتا ۔ پھر ایک سوال جو حل نہیں ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ننھے میاں کہاں سے آ گئے اور کیسے آ گئے ، مگر اس سوال کو ایک مرتبہ پوچھا تو وہ گت بنی کہ آگے کے لئے توبہ کی ۔ ابھی اگلے ہی روز ماسٹر جی سے دریافت کیا کہ ماسٹر جی ! یہ کیا بات ہے کہ جو لوگ اللہ کے حکموں پر چلتے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں اور جو نہیں چلتے ان کو بھی آپ مسلمان کہتے ہیں، پھر فرق کیا ہوا ! ——— اس پر فرمانے لگے کہ مسلمان کلمہ پڑھتے ہیں، اس لئے وہ مسلمان ہوتے ہیں ۔ مگر مجھے تو خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کلمہ پڑھنے سے کیا ہوتا ہے ۔ کلمہ تو ہمارے عیسائی انجینئر صاحب کی بیوی بھی کئی دن پڑھتی سنی ہیں ۔ لیکن اماں بتاتی ہیں کہ وہ مسلمان نہیں ۔ پھر آج یہ جی چاہ رہا ہے کہ کسی بڑے آدمی سے معلوم کروں کہ ہمارا مالی نماز پڑھتا ہے اور برے کام نہیں کرتا ۔ لیکن وہ پھٹے حالوں رہتا ہے اور اسلم کے ابا جو بڑے نواب ہیں، شراب پیتے ہیں، نوکروں کو مارتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں لیکن اللہ میاں نے ان کو ایسی اچھی کوٹھی دے رکھی ہے، اور اتنے اچھے اچھے کپڑے اور کھانے انہیں ملتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے ۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے مگر میں پوچھوں بھی تو بتائے گا کون ؟ کس کے پاس وقت ہے ! کون مجھ چھوٹے سے بچے کے لئے وقت نکال سکتا ہے !

عقل حیران ہے کہ ان بڑوں کو کیا کیا جائے
کوئی مجھے ان میرے بڑوں سے بچائے

آسمانی ادب

(آیاتِ الٰہی کے ادبی جمال کا انعکاس)

(المعارج)

دیر ہے، اندھیر نہیں!

ایک دریافت کنندہ نے ٹوٹ پڑنے والے عذاب کے متعلق استفسار کیا!

وُہ عذاب کہ جس کے مقابلے میں کفّار کے پاس کوئی مدافعت کرنے والا نہیں ہے۔

وُہ! ۔۔ اُس اللہ کی طرف سے وارد ہونے والا ۔۔ جو (تدریجِ زمانی کے) بلند اُٹھتے ہوئے زینوں کا مالک ہے!

(ان زینوں کے ذریعے) فرشتے اور "الرّوح" (اپنے نوشتوں کو ساتھ لئے ہوئے) اُس کی (بارگاہ کی) طرف (احکام حاصل کرنے کے لئے) برابر اوپر بڑھتے چلے جاتے ہیں ۔۔ پورا ایک روز ۔۔ (لیکن ایسا ایک روز) کہ جس کی طوالت پچاس ہزار برس کے برابر ہے۔

(یوں ہے اللہ تعالیٰ کے قانونِ تدریج و امہال کا تقاضا!)

پس تم صبر سے کام لو ۔۔ صبرِ جمیل سے:

یہ لوگ عذاب کو بہت دُور سمجھتے ہیں لیکن ہم اسے بالکل قریب پاتے ہیں:

وہ دن جب کہ:۔

آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔

اور پہاڑ رنگ دار اُون کی طرح ہو جائیں گے،

اور رفیق رفیق کو نہ پوچھے گا (حالانکہ) ۔۔ ان لوگوں کو (ان کے رفیق) سب دکھائی دیں گے۔

اُس دن کے عذاب سے بچ نکلنے کے لئے مجرم کوشش کرے گا کہ کسی طرح فدیے میں اپنے بیٹوں، ساتھیوں، بھائیوں اور اپنے کنبے کو جس کے درمیان وہ رہتا تھا اور جو کوئی بھی زمین میں ہے سبھی کو پیش کر دے ۔۔ اور پھر چھوٹ نکلے!

[illegible] آگ ہے کھال اُدھیڑ لینے والی! ۔۔ وہ تو دعوت دیتی ہے اس شخص کو جس نے [illegible]

کی طرف) پیٹھ کی اور اپنے قدموں لوٹ گیا۔ اور پھر جاکر (دنیا کا سامانِ عیش و عشرت) سمیٹا اور پھر اسے (خوب) سینت کر رکھا:

حق یہ ہے کہ انسان پیدا ہی ہوا ہے تھڑدلا! جہاں اسے (راہِ راست پر چلنے میں) ذرا سی تکلیف محسوس ہوئی (گھبراکر) بُرا بھلا کہنے لگا اور اگر کوئی بھلائی پالی تو (اس سے دوسروں کو حصہ دینے میں) بخیل بن گیا ـــــ (ہاں مگر) مستثنیٰ صرف وہ اہلِ صلوٰۃ ہیں جو:-

اپنی نمازوں پر ہمیشہ کے لئے قائم ہیں۔

اور وہ جن کے مال و دولت میں محتاجوں اور بھکاریوں کے لئے ایک مقررہ حصہ ہے۔

اور وہ جو روزِ انصاف (کے آنے) پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔

اور وُہ جو اپنے آقا کے عذاب کا خوف رکھتے ہیں ـــ بلاشبہ ان کے آقا کا عذاب بے پناہ ہے ـــ

اور وُہ جو اپنی عصمتوں کے نگہبان ہیں ـ الّا یہ کہ (اس معاملے میں) وہ اپنی بیویوں یا اپنی مملوکہ عورتوں سے بے تکلف ہوں تو اس صورت میں ان پر کوئی الزام نہیں۔ پھر جو کوئی (ان جائز راستوں کے کھول دیئے جانے کے بعد) اس سے زائد کچھ چاہے تو پھر ایسے لوگ حدوں کو توڑنے والے ہیں ـــ

اور وُہ جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کو نباہتے ہیں۔

اور وُہ جو اپنی شہادتوں پر جمے رہتے ہیں۔

اور وہ جو اپنی نمازوں پر نگرانی کرتے ہیں۔

وہی ہیں جو (عالمِ آخرت کے) چمنستانوں میں عزت و اکرام سے نوازے جائیں گے۔

تو پھر آخر ان اہلِ کفر کو ہو کیا گیا ہے کہ یہ دائیں سے اور بائیں سے تمہاری طرف جھرمٹ کر کے دوڑے آتے ہیں! کیا (تمہارا خیال ہے کہ) ان میں سے ہر فرد اس کا حریص ہے کہ اسے چمن زارِ نعمت میں داخل کیا جائے؟ ـــ (نہیں) ـــ سمجھ لو ہم نے انہیں جس چیز سے پیدا کیا ہے۔ جسے جانتے ہیں۔!

ہاں تو نہیں: (بلکہ) میں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ہم اس پر پوری طرح قادر ہیں کہ (ان کی جگہ) ان سے بہتر لوگوں کو بدل کے لے آئیں ـــ اور ہم ان سے مغلوب ہونے والے نہیں ہیں!

پس تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو یہ بحثوں میں پڑے رہیں اور تفریحات میں گُم رہیں ـــ تا آنکہ ان کی مڈبھیڑ اس یوم سے ہو جائے جس کا ان سے وعدہ ہے ـــ وہ دن جبکہ یہ قبروں سے نکل کے لپکیں گے جیسے یہ (آج کسی) نہ (کسی) [illegible] جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر [illegible]

تنقید اور نقّاد کی ذمّہ داریاں

عاصی ضیائی۔ رامپوری

ہفتہ وار "جہانِ نو" کی کسی قریبی اشاعت کا اداریہ شائع شدہ نظر سے گزرا۔ جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز اور ایک حد قابلِ افسوس حقیقت کی ترجمانی کر رہا تھا۔ اس میں جناب مدیر نے بتایا ہے کہ کس طرح "جہانِ نو" کے افسانہ نمبر میں بہترین افسانہ متعین کرنے ...ت آرا ہوا۔ اور محض اسی اختلاف کی بنا پر ایک عرصہ تک موعودہ انعام نہیں دیا جا سکا۔ اگر معاملہ صرف دو تین افسانوں میں سے صرف ایک ...ترین قرار دیئے جانے کا ہوتا تو صاحبانِ نظر کا اس مسئلے پر اختلافِ رائے کوئی نئی بات نہ ہوتی۔ یہ ہمیشہ ہر ملک، ہر زبان کے لٹریچر میں ...یا ہے۔ لیکن تحریکِ اسلامی سے وابستہ ادیبوں کے لئے یہ بات باعثِ افسوس و ندامت ہونی چاہیئے کہ جہانِ نو کے افسانہ نمبر کا تقریباً ہر ...مختلف "ادبی حلقوں" کی طرف سے بہترین قرار دیا گیا۔ کسی کی نظر میں ایک افسانہ بہترین تھا تو کسی کے خیال میں دوسرا۔ غرض جہاں تک ...یا معلوم ہوتا ہے، مدیر جہانِ نو کے مذکورہ بالا شذرہ کی اطلاع کے مطابق مولہ افسانوں میں سے کم از کم تیرہ بہترین قرار دئے گئے ہیں!

...لوگوں نے ممکن ہے اس اطلاع کو سرسری نظر سے دیکھا ہو لیکن میرے لئے اس میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ اس سے ہمارے بہت سے ...بہم پرخاش ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم میں نہ صرف اہلِ نظر اور اہلِ بصیرت کا کال ہے۔ بلکہ یہ بھی کھل جاتا ہے ...ن انتقاد کے قدیم و جدید اصولوں سے نہ واقف ہیں نہ ہونا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہماری ذہنیت، ہمارے ایک ...ٹ پھاہ بن لانے کے باوجود ابھی تک اسی طرح منتشر اور پراگندہ ہے۔ جس طرح ہمارے زمانۂ غلامی میں تھی۔ آج بھی ہمارا کوئی ...پختہ اور مستقل نہیں ہے۔ آج بھی ہم اپنے وطن کے عامۂ مسلمین کی طرح ذہنی طور پر بے ربطیٔ افکار اور پریشانیٔ خاطر میں مبتلا ہیں ...جب ادب میں ہماری رائیں اس قدر متنوع ہو سکتی ہیں تو ملک و ملت کی اجتماعی بہبود کے مسئلہ پر بھی کسی ایسے ہی نازک موقع پر ہمارا اختلاف ...ے معرضِ بحث ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ایک مائل بہ ترقی قوم کے لئے افکار کی ہم آہنگی بہت ضروری ہے۔ جمہور ملت اسلامیہ کے لئے، جو سب ...سے زیادہ ترقی پسند اور ترقی پذیر جماعت ہونی چاہئے۔ اور اگر ہم ملت کے ایک ... اور مخلص ترین عنصر (تحریکِ اسلامی) میں بھی ...وخیال کی شیرازہ بندی ابھی تک نہ ہو سکی تو آئندہ کے لئے کم از کم مجھے، ... کے علم بردار ... بہت کم کسی اجتماعی اور ... توقع ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ "جہانِ نو" کے ... تنالث' کا آخری فیصلہ نہ صرف میری تمنا کے عین مطابق ہوا ...یحی معیارِ تنقید پر پرکھا جائے۔ تو جہانِ نو کے اس شمارے میں ... افسانہ "رگو نجے طوفان" اس قابل ٹھہرتا ہے۔ کہ اسعد گیلانی کے ...نف "ایک عورت" کے بعد پورے مجموعے کا بہترین افسانہ کہا جائے۔ لیکن تعجب میں اپنے ساتھی ادیبوں ——— بلکہ نقادوں ——— ...ذوق مذاق" کا تصور کرتا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا کہ اس انتخاب کی وجہ کوئی حقیقی ذوقِ سلیم اور سنجیدہ اصولِ تنقید تھی۔ بلکہ میں سمجھتا ...کہ اداره جہانِ نو کے بنائے ہوئے اس ... کا یہ فیصلہ محض ... رجحان بالغیب ہے۔ جو اتفاق سے درست نکل آیا۔ لیکن آپ خود سمجھ سکتے ...یہ اٹکل کے تیر ہمیشہ کام نہ آ سکیں گے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ہم میں سے جو لوگ ادبیت کا تھوڑا ذوق رکھتے ہیں، وہ مسلم اور متداول اصول

کا بالاستیعاب مطالعہ کرکے اپنے ذوق کی تربیت کریں تب وہ اپنے کچھ آزاد فیصلے دینے کا اہل تصور کر سکتے ہیں۔ اور جن میں یہ صلاحیت مفقود ہے وہ براہ کرم اس بھاری پتھر کو چوم کر ہی چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔ ورنہ ہماری ادبی تحریک جس منزل میں آ چکی ہے۔ اسی میں جو خدشہ درپیش ہے وہ نمایاں ہوگا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہماری تمام رجائیت سے بھری پیش گوئیوں کے باوجود اسی حشر کو پہنچے جس کو ترقی پسند تحریک پہنچ چکی ہے۔

ایک زندہ ادب کی سب سے بڑی ضمانت اس کے تنقیدی حصے کا جاندار اور پختہ ہونا ہے۔ اور تنقیدی حصہ اسی وقت جاندار اور پُروزن ہو سکتا ہے۔ جب نقادوں کا ادبی ذوق ستھرا اور نفیس ہو۔ ہمارے قدیم ادب میں مسلسل انحطاط کا سبب یقیناً معاشرے کے اخلاقی زوال کے بعد صحیح تنقیدی معیار کا نہ ہونا ہی تھا۔ تقلید پرستی نے تنقید کے دائرے کو اسی طرح بے لچک اور محدود رکھا۔ جس طرح اخلاف نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا تھا۔ ان کے لئے کسی غزل میں زبان کی فصاحت، رعایت لفظی کا چٹخارا، تخیل کی بلند پروازی، مضمون کی جدّت ۔۔۔ یہی اور ایسی ہی دو تین چیزیں اس غزل کو معیاری اور غزل گو کو چوٹی کا "استاد" قرار دینے کے لئے کافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ وغیرہ حقیقی شاعروں کے بعد ان اصولِ نقد پر پورے اترنے والے بڑے "استاد" اردو شاعری میں ملتے ہیں جنہیں سچی اور فطری شاعری سے بہت کم سروکار ہے ۔۔۔ اور اب تحریکِ اسلامی کے ادیبوں اور نقادوں کے معیارِ جمال و ادبیت کو دیکھتے ہوئے شاید میں یہ اندیشہ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے ادیب، ادیب کے بجائے محض واعظ ہو کر رہ جائیں گے۔ کیونکہ ان کے پرکھنے والوں کی کوئی نہ کوئی کسوٹی ان کے "ادب پاروں" کو معیاری قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہے گی۔ اور وہ اپنے ادبی ارتقا کا لحاظ نہ کرکے اپنے فن پر اسی طرح قانع رہیں گے۔ جس طرح اب تک رہا کئے ہیں۔

پس اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا "صالح" "تعمیری ادب" "دنیا کے عجائباتِ ادب" میں "دیوارِ چین" کے بجائے "دیوارِ قہقہہ" بن کر رہ جائے بلکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم ہی وہ لوگ بھی ہوں جو دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب کی باگیں بھی باطل کے ہاتھوں سے چھینیں تو کم از کم ہمیں اپنا تنقیدی معیار اتنا بلند تو ضرور کرنا ہوگا۔ جتنا آج تک باطل پرست ادیبوں کا رہا ہے۔ احساس فن کے تمام ارتقائی مراحل کو ذہن میں رکھنا ہوگا جن کو اس نے دو ڈھائی ہزار سال کی مدت میں طے کیا ہے۔ اس کے لئے جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں۔ ہمارے نقادوں کے لئے مذاقِ تنقید کے ساتھ ساتھ مطالعہ فن تنقید بھی لازمی ہے۔ لیکن آج کی صحبت میں میں کسی قدر تفصیل سے نقاد کے فرائض پر بحث کرنی چاہتا ہوں۔ یہ موضوع عموماً تشنہ رہتا ہے۔ کیونکہ بیشتر لکھنے والے "تنقید نگار" کی جگہ "تنقید کی تعریف" و حدود پر بحث کرنے لگتے ہیں۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں خود ادب کی تعریف و حدود کے ہیں۔ اور اس طرح نقاد کا موقف یا تو تنقید اور ادب کی بحثوں میں الجھ کر گم ہو جاتا ہے۔ یا اگر کوئی اہل قلم اس پر براہ راست کچھ لکھتا بھی ہے۔ تو فلسفیانہ مسئلے کی طرح اس پر معروضی (objective) نقطۂ نظر سے بحث کرکے خود بھی غلط نظریہ قائم کرتا ہے اور پڑھنے والے کے لئے نقاد کا موقف غلط اور لایعنی سا قیاس بنا دیتا ہے۔

تنقید کی تعریف یہ تو ظاہر ہے کہ تنقید کا مقصد فن کا جائزہ لینا ہے۔ لہٰذا فن کی جو تعریف کی جائے گی۔ وہی تعریف تنقید کی بھی قرار پائے گی۔ اور چونکہ فن کی جامع و مانع تعریف آج تک نہ ہو سکی۔ اس لئے تنقید کی تعریف بھی نہیں ہو سکتی لیکن یوں دیکھا جائے تو تنقید بھی ویسا ہی ایک فن (یا علم) ہے جیسا انسانی تاریخ۔ تاریخ کا کام ہے۔ انسان کے گزشتہ کارناموں کی حفاظت کرنا۔ ان کا جائزہ لینا بعض اخلاقی اصولوں کی روشنی میں ان کے حسن و قبح کا حکم لگانا اور پچھلے تجربوں کے پیش نظر آئندہ انسانی لائحہ عمل کے لئے صحیح صحیح نشان راہ مہیا کرنا۔ اس سے زیادہ تاریخ کے بس میں نہیں۔ اس معنی کی رو سے تو تنقید کی جاتی ہے اسی طرح تنقید بھی ادبیاتِ گزشتہ کا مکاشفہ ان کے حسن و قبح کا تجزیہ اور آئندہ کے لئے ادبی اصولوں کی کسی قدر تعیین کا کام ہے۔ اور جس طرح تاریخ کا تجربہ علم کسی نئے انسانی معاشرہ کا بنیادی ڈھانچہ دے سکتا ہے یا بنیادی اصول پیش کر سکنے کا اہل ہے اسی طرح تنقید کے عام اصولوں سے بھی یہ توقع ہے کہ فن میں نئے تجربات کا امکان پیدا

جمالیات کے نئے اصول و معیار ایجاد کرے۔ یہ کام فن کار کا ہے۔ وہی ہمیشہ فن میں نئے تجربات کرتا آیا ہے۔ اور اسی کے فن پاروں کو انسانوں نے جمالیاتی معیاروں کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ انہی تجربات کو سلیقہ اور ترتیب سے جائزہ لے کر مدوّن کرنا اور انسانوں میں ان کی مقبولیت کے اسباب پر غور کر کے جمالیاتی معیاروں کا استنباط تنقید کا کام ہے۔

نقاد کا مقام

اس طرح جو لوگ تنقید کو ایک خاص سائنسی علم یا جج کا فیصلہ سمجھتے ہیں، وہ اس موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہ موضوع اتنا معروضی نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے یا متوقع ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نقاد کا کام ہی جذباتِ انسانی کا ادب سے تعلق متعین کرنا ہے تو نقاد کے عمل کو معروضی کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک جج سے یہ توقع تقریباً پوری طرح درست ہے۔ کہ مقدمے کا فیصلہ اپنے جذبات کو بالائے طاق رکھ کر مسل اور مروجہ قانون کی روشنی میں کرے۔ ایک ممتحن مکلف ہے کہ امیدواروں کے پرچے نصابِ مقررہ کے ضابطوں کے تحت جانچتے وقت دل کے بجائے دماغ سے کام لے۔ لیکن ایک نقاد کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرنے میں اپنے جذبات شامل نہ کرے۔ یوں تو جج اور ممتحن سے بھی سو فی صدی معروضیت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور ان کی راہِ عمل میں بھی ایسے گوشے بہرحال چھوٹ جاتے ہیں جن کو موضوعی ([illegible]) نقطۂ نظر ہی سے سمجھا جا سکتا ہے مگر بہرحال ان کا ضمیر اتنا بلند اور پاکیزہ تصور ہوتا ہے کہ گویا جہاں تک ان کا بس چلے گا یہ اپنے جذبات کو کم سے کم دخل دیں گے۔ ان کے برخلاف نقاد کا موقف ان سے کہیں زیادہ نازک اور ــــ انفرادی نہیں، مجرد اقداری نقطۂ نظر سے ــــ کہیں زیادہ اہم ہے۔ ان دونوں کے پاس بطورِ مثال یا کسوٹی ایک واضح چیز ہوتی ہے۔ جج اپنے فیصلے کو مجموعۂ قوانین پر عرض کر کے دیکھتا ہے۔ اور ممتحن اپنی جانچ کو نصاب کی کتابوں پر۔ لیکن نقاد کے لئے ایسا کوئی واضح معروض علیہ نہیں۔ وہ جس وقت ایک شاعر کی نظم پر کوئی حکم لگائے گا تو اس کی رائے کا بیشتر حصہ موضوعی ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود اس کا ذہن شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے ماحول کے تمام یا بیشتر تنقیدی معیاروں کو، جو اس کی سوسائٹی میں مروج ہوں قبول کر چکا ہو۔ اور انہی کی عینک (Pattern) سے گزر کر اس کی رائے قائم ہو سکی ہو، لیکن بہرحال اس کا یہ اظہار رائے قطعی ذاتی ذوق سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس لئے اس کی کوئی حد اور تحدید نہیں ہو سکتی۔

یہیں آ کر میرے خیال میں ہر ناظر بخوبی سمجھ سکے گا کہ نقاد کی تنقید خواہ شعوری طور پر اس کی اپنی رائے ہو۔ لیکن لاشعوری طور پر وہ دراصل اپنے معاشرے کے ذوق کی ترجمانی کر رہا ہوتا ہے۔ اور وہ جتنا زیادہ اپنے معاشرے میں جذب ہو چکا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے ذوق کی بہتر ترجمانی کر سکتا ہے۔ اس طرح گویا ایک ممتحن کا امیدوار کو نمبر دینا ایک محدود تعلیمی ادارے یا بورڈ کی نمائندگی ہے؛ ایک جج کا فیصلہ ایک حکومت کے قوانین کی نمائندگی ہے۔ لیکن ایک نقاد کا ایک ادیب کے کلام پر اظہار رائے پوری قوم کی جمالیاتی حِس کا مظاہرہ ہے۔ اور اپنی وسعت اور غیر یقینیت کی وجہ سے پہلی دونوں مثالوں کی نسبت اہم تر اور خوب تر ہے۔ اور اس میں سب سے عجیب امر یہ ہے۔ کہ دونوں مثالوں میں معیار معروضی ہیں۔ لیکن نقاد کے معیار موضوعی ہوتے ہوئے بھی زیادہ مکمل اور حقیقی ہیں۔

لیکن نقاد کا کام صرف اپنے معاشرے کی ترجمانی کرنا ہی نہیں۔ ایک عظیم نقاد معاشرے کے لئے اس کے ذوقِ جمال کے ارتقاء کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔ اور اسی کو ہر وقت پہلے سے زیادہ سنوارنے میں گزارتا ہے۔ وہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ ایک شاعر کے کلام میں کیا ہے اور کیا نہیں؛ بلکہ یہ بھی کہ کیا ہونا چاہئے تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کیا ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ وہ مقام ہے جہاں ایک زوال پذیر قوم کے نقاد بار نہیں پا سکتے۔ یہ لوگ خود اپنی قوم کے ساتھ مسلسل پستی اور جمود کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ تو بھلا اس کے لئے روشنی لے کر اس کے آگے آگے کیوں کر چل سکیں گے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نقاد کے بھی آگے چلنے والے (ادیب) اس قوم میں کوئی انقلابی اور ٹھوس تعمیری کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے، تو پھر نقاد جس کا کام ہی ادیب کے بعد شروع ہوتا ہے، کیونکر قوم کی تقدیر میں تبدیلی کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر ایسی پراگندہ ملت، جیسی آج کل ہماری ہے، اگر اپنا مذاقِ جمال کھو چکی ہے

تجربے بھی اگر اس میں اچھے اہلِ نظر نقاد نہیں پیدا ہوتے لیکن ان لوگوں پر مجھے یقیناً تعجب ہے جو اپنے عقائدِ دینی و اعمالِ شرعی کے اعتبار سے ایک دینی مسلک ہو چکے ہیں لیکن بہ وجہ دوسرے سے اتحاد کے باوجود ذوقِ جمال میں اپنی قوت کے انتشار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ میں اس بات کا بہت قائل ہوں کہ ہر شخص کا ذوق جداگانہ ہوتا۔ اگر یہ بات ہوتی تو انسان کے لئے اجتماعی زندگی گزارنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر کارخانہ اپنی مصنوعات بھی وضع قطع کی لاکھوں کی تعداد میں مواد پیدا کرتا ہے۔ اور وہ خریداروں میں مقبول ہوتی ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ذوق بھی بنیں اجتماعی ہوتا ہے۔ اور انفرادی اختلافات نہایت جزوی اور ناقابلِ لحاظ ہوتے ہیں۔ ورنہ مشینی انقلاب دنیا میں بالکل فیل ہو جاتا اور صرف کاری گر رہ جاتے۔ جو ہر گھر کے ذوق کی جدا جدا موزونی کرتے۔ دراصل ذوقِ جمال ابھی میرے خیال میں بالکل اسی طرح اجتماعی ہے جس طرح ذوقِ اخلاق ایک معاشرہ جس طرح اپنا اخلاقی مزاج رکھتا ہے۔ اسی طرح جمالیاتی شعور بھی۔ بلکہ استاذ محترم ضیا احمد صاحب صدیقی کے خیال میں اخلاقیات اور جمالیات میں براہِ راست ربط ہے۔ یہاں تک کہ بقول ان کے کوئی نامعقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا۔

پس ہماری تحریک کے ادیبوں اور نقادوں کو یہ بات خاص طور پر ملحوظ رہے۔ جس طرح وہ ایک بگڑی ہوئی سوسائٹی کو عملاً منظم و متحد ہو کر متحدہ نظامِ فکر و عمل کی دعوت دینا چاہتے اور دے رہے ہیں۔ اسی طرح ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ متحدہ شعورِ جمال کا بھی مظاہرہ کریں اس طرح نہ صرف اپنے لکھنے والوں کی صحیح تربیت کریں۔ بلکہ عام پڑھنے والوں کے ذہنوں میں بھی نئے اور مستقل جمالیاتی معیار تعمیر کریں۔ اور یہ وقت ہو سکتا ہے کہ ہمارا ہر ناقد پوری محنت سے مختلف قوموں اور دائروں کے جمالیاتی پیمانوں کا مطالعہ کر کے ان میں سے ہر اس عنصر کو خارج کرے۔ جس میں جاہلیت کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ اور پھر اندازہ لگائے کہ خدا اور رسول کے دیئے ہوئے نظام سے یہ جمالیاتی نظام میل کھاتا ہے۔ نیز اس نظامِ حیات کے مطالعے سے خود بخود جمالیات کا جو تصور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے تقاضے جمالیاتی معیار کہاں تک پیدا کرتے ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سخت محنت طلب اور صبر آزما کام ہے۔ مگر آپ غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حیات کے کسی شعبے میں اس سے کم محنت کوئی کام منتظر نہیں۔ سیاسیات، معاشیات، نفسیات، حیاتیات، الٰہیات وغیرہ کوئی موضوع اسلام ایسا نہیں جو ہمیں اپنے زمین و آسمان بدلنے کی دعوت نہ دے رہا ہو۔ لیکن اگر جوئے شیر کا تصور ہی کسی کو کھل رہا ہو تو وہ ذرا کے تو کیسے۔ بقولے فرہاد نے دست چلایا ہے!

ختمِ کلام

یہاں پہنچ کر واضح ہو گیا ہوگا کہ تنقید کے فرائض دو گونہ ہیں۔ تجزیہ اور تبصرہ۔ تجزیہ میں وہ تمام عمل داخل ہے۔ جو نقاد ایک ادیب کے ادب پارے میں سے اصول جمالیات کے استقرار اور استخراج کی غرض کرتا ہے۔ اس میں اس کی وہ طاقت ہے۔ جو وہ ادیب کے معاشی پس منظر، ماحول، ارتقاء اور نشو و نما وغیرہ پر ڈالتا ہے۔ تبصرہ گویا تجزیہ کا نتیجہ ہے۔ اور یہی حصہ نقاد کی قوتوں اور صلاحیتوں کا امتحان ہے۔ اس میں وہ ادیب کے کلام پر اپنی منفرد نظر، اور بعض استنباط کردہ اصولوں کی روشنی میں محاکمہ کرتا۔ اس کے ادب اور عصر کا اندازہ لگاتا۔ عوام پر اس کے اثر کی کیفیت اور نتائج پر نظر اور بالآخر خود اسی ادیب کے دوسرے فن پاروں سے موازنہ کر کے اس کے ادبی ارتقا کو ناپتا، اور دوسرے ادیبوں سے مقابلہ کر کے دنیائے ادب میں اس کا صحیح درجہ متعین کرتا ہے۔ یہ تمام کٹھن گھاٹیاں بڑی دشوار گذار ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ان کی پگڈنڈیاں بہت پیچیدہ اور غیر معین اور ان پر نشان اور روشنیاں بہت مبہم ہیں۔ معترض کو اس کا جواب یہی ہے کہ جو اس راہ سے مطمئن ہو کر گزرے وہ بھی ہر جگہ نہیں۔ اور یہ خلاف مسلم کچھ ایسی مجبوری ہے۔ جس کا احساس شعور زیادہ پختہ اور

باقی صفحہ ___ پر

سکتا ہو۔

ہمیں کیا اسلام پسند ادیبوں کے لئے یہ مشورہ مخلصانہ نہیں کہ اگر وہ اپنے ذوقِ جمال کی تربیت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے نصب العین عشق اور احساسِ فرض کو اپنے ذہن و عمل میں تازہ تر کر لینا چاہیئے؟ مقصد کا عشق اور فرض کا احساس نئی قدریں خود تیار کر دیتا ہے جس وقت ہم لوگ اپنے ذہن و عمل کے اعتبار سے مکمل آزاد (بالفاظِ دیگر خدا اور رسول کے مکمل غلام) بن جائیں گے تو ہمارا ذوقِ جمال بھی دوسرے ضابطوں کی طرح دنیا کے لئے وجہِ تقلید اور اصل معیاری ہوگا۔ بقول اقبال ع

جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا۔

اس وقت تو ہمیں اپنے اندر ایسے نقادوں کی ضرورت ہے جو علم کامل نہ سہی، عزمِ راسخ اور جوشِ صادق رکھتے ہوں اور بے سر و سامانی کے باوجود محض توکل بخدا یہ دعوے کر سکیں کہ

بہ وادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است ؛ بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است (غالب)

"نیا فکر" [illegible]

آپ اور ہم سب اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ سرمایہ داری کی لعنت اور اشتراکیت کی لادینیت کا مسکت جواب صرف وہ فقط اسلام ہے۔ لیکن دنیا آج عملی جواب چاہتی ہے۔ وہ خالی دعووں سے متاثر نہیں ہوتی۔ اس لئے ہم دورِ حاضر میں بھی بہترین معاشرہ عملی طور پر پیدا کر کے دکھائیں تو دنیا ہمارے ——— اسلام ——— کی قائل ہوگی۔

قرآنی حکومت کے مطابق معاشرہ پیدا کرنے کے لئے ہمارے سامنے صرف وہ دور ہے جو سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلعم نے پیدا کیا۔ اس دور کے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کا مطالعہ کرنا ضروری ہے:۔

(۱) اس دور کا نظامِ فکر (ideology) (۲) قرآن حکیم کے نظامِ معاشیات و اقتصادیات کا مطالعہ عملی شکل میں یعنی اس سوسائٹی کا براہِ راست مطالعہ جو قرآن حکیم نے پیدا کی (۳) قرآن حکیم کے سیاسی مقاصد کا واضح تعین (۴) قرآن حکیم کی اجتماعیت کا مطالعہ اور فرد، اور قوم اور بین الاقوامیت کے حدود کا تعین۔

اس کے بعد قرآنی حکمت کی روشنی میں اپنے موجودہ دور کے مسائل حل کرنے کی ضرورت ہے:۔

(۱) اس مشینی دور میں قرآن کی حکمت کا استعمال (۲) سرمایہ داری اور مادیت کا مطالعہ (۳) فلسفہ کائنات اور انسانی زندگی (۴) انقلاب (۵) قومیت اور بین الاقوامیت (۶) پارٹی پالیٹکس اور جمہوریت (۷) محنت کش طبقے کے حقوق (۸) مسلمان نوجوان کی خودی کا قیام وغیرہ۔

ہمیں یقین ہے کہ امام ولی اللہ دہلوی کا فلسفہ جس کی بنیاد خیر القرون کے مطالعہ پر رکھی گئی ہے عصرِ حاضر کے تمام مسائل کے حل میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے اس فلسفے کے مطالعہ میں اپنی پوری عمر صرف کی، اس کے خصوصی مطالعہ اور تحقیق کیلئے محمد قاسم ولی اللہ سوسائٹی کے ماتحت بیت الحکمت اور [illegible] اکیڈیمی قائم کی ہے۔ اب اس فلسفے کی اشاعت کے لئے سوسائٹی مذکور کے ماتحت ایک [illegible] "نیا فکر" کی صورت میں [illegible] ہے۔ انشاء اللہ کرم ہماری حوصلہ افزائی فرمائیے اور ہمارے کام پر نگاہ رکھئے۔

قند و نمک

جھوٹ سچ!

آپ کہتے ہیں کہ ہمارے مقدس مگے میں اللہ میاں نے نہ معلوم کیا آمرِ خاص فرمایا ہے کہ اس میں سے جھوٹ راستہ نہیں نکال سکتا، بلکہ اگر بند کر کے آنا چاہتا ہے تو بالکل چپس کے رہ جاتا ہے۔ آخر ایک اسلامی ریاست کے "امام" کو اہلِ سنت کے نزدیک "متقی" اور شیعی نظریہ کے مطابق "معصوم" ہونا چاہئیے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ یہاں تقویٰ اور عصمت کے مقام پر فائز ہونے کا موقع نکالا ہی نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ پیدا ہوئے تھے نوابی کی گود میں، تربیت پائی میکالے کے نظامِ تعلیم کے سایہ میں، قوتیں بیچ دیں جاہ و منصب کی خاطر ہیں اور دل نثار کیا تو جتنا افرنگ کے قدموں پر۔ اسی رعنائی میں پاکستان بن گیا اور پھر تقدیر کا ایک دوسرا ریلا آیا تو وہ قرار دادِ مقاصد کا جھنڈا اٹھا کر گیا۔ اب سرِ آئینی اسلامی ریاست کی امامت بھو ہی حال کر۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن!
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے!

لیکن اللہ میاں نے کہا کہ ہمارا امیر المومنین جو تاریخِ ملتِ اسلامیہ میں کئی سو سال کی گردشوں کے بعد پہلی مرتبہ نمودار ہوا ہے، کیا یاد کریگا کہ ہم بھی غدار رکھتے تھے" لا تقویٰ کی عصمت کا مقام اس پر زبردستی منڈھ دو۔ چنانچہ اس عنایتِ غیبی کا ایک پہلو یہ ہے کہ گلے کو جھوٹ عبور کر نہیں سکتا۔ غالباً دوسرے پہلوؤں پر بعد میں روشنی ڈالی جائیگی۔ ایک دن آپ سنیں گے کہ ہمارے تقدس مآب فرما رہے ہوں گے کہ میرے سامنے جب لڑکیاں نیم عریاں شان کے ساتھ آتی ہیں یا کسی سینما بازار میں گذر پڑتا ہے، یا زنانہ ہنیشل گارڈ کے کسی دستے سے سلامی لینے کا موقع پیش آتا ہے تو میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہتی ہے۔ یہ اسلئے کہ شریعتِ اسلامیہ نے نامحرم خواتین سے دامنِ نگاہ کو بچانے کا حکم دیا ہے۔ پھر آپ یہ بھی سنیں گے کہ چونکہ نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ میں آلاتِ موسیقی توڑنے پر مامور کیا گیا ہوں، اس وجہ سے جب کبھی چنگ و رباب کا طوفانِ نوا میرے کانوں کے پردوں سے ٹکراتا ہے تو پرمیننٹ بہراپن" مسئلہ ہو جاتا ہے۔ پھر آپ یہ بھی سنیں گے کہ چونکہ اسلام میں اسراف حرام ہے اور حکام (خصوصاً صدرِ حکومت) کے لئے گراں بہا رقوم مسلمانوں کے خزانے سے وصول کرنا منع ہے۔ اسلئے جب اسراف کا ارادہ کرتا ہوں تو ہاتھ پر فالج گر جاتا ہے۔ ایک امیر المومنین میں اتنی کرامات تو ہونی چاہئیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ عطیہ وہبی نہیں، بلکہ تمام تر اکتسابی ہے۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں "گلے کے آپریشن" کا واقعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کی معلومات یہ ہیں کہ امریکہ و کینیڈا میں بعض ڈاکٹر گلے کا ایسا روحانی آپریشن کرتے ہیں کہ پھر جھوٹ کی گاڑی اس میں سے کبھی نہیں گذر سکتی چنانچہ ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ لیکن یہ محض خیال آرائیاں ہیں۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ فرض کیجئے کہ آپریشن کئے ہوئے گلے میں سے ٹھوس قسم کے جھوٹ نہ نکل سکیں لیکن اگر جھوٹ رقیق (اس لفظ کا ایک املا ورکیک بھی ہے) اور سیال ہو تو آپریشن کیا کر سکتا ہے؟ پس یہ غلط ہے۔

آپریشن اس کے بالکل برعکس دوسرے مقصد کے لئے ہو سکتا ہے۔ یعنی کوئی امیر متقی اور امام موصوم یہ محسوس کرے کہ موجودہ دور جھوٹ کا دور ہے اور دنیا کی بڑی بڑی دوررغ باف اور فریب کار قوموں سے سابقہ پڑتا ہے، اس حال میں اگر اسلامی حکومت کا امیر المومنین کفار کے ساتھ مصافحۃً یا بالاہ پر ہو کے گذرنے کا جہاد کرتے ہوئے برابر کی چوٹ نہ لگا سکے تو اسلام کی ناک پر جائیگی، لہٰذا وہ دیار کفار و روغ کے جرّاحوں سے اپنے گلے کو تقویٰ اور معصومیت کے ان "آلائشی" غدودوں سے پاک کرلنے پر مجبور ہوگا جو بڑے بڑے ٹھوس جھوٹوں کا راستہ خواہ مخواہ روک رہے ہیں۔ اس حقیقت کی سچائی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ آپریشن کے بعد گلے کی پہلی آزمائش جنگ کو دیا ہوا ایک بیان دے کر کی گئی جس کا مفاد یہ تھا کہ پاکستان کے شہیدہ شرکت کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ یہ بات اس وجہ سے بھی دل کو لگتی ہے کہ امیر المومنین دینی ملقے سے بہت بیزار ہیں اور

ہمیشہ سچ بولو" کا اصول تو اسی دینِ ملّا کا ایک جزو ہے۔ آخر امامِ وقت کوئی ملّا تو نہیں

سچ کی ایک قسم بہت ہی عجیب وغریب ہوتی ہے جس کی نشاندہی پہلی مرتبہ قرآن حکیم نے کی ہے۔ یعنی ایک بات سچی ہوتی ہے لیکن اُسے کہنے والا جھوٹا ہوتا ہے۔ جو جھوٹے ہوں وہ سچ بول کر بھی جھوٹے ہی رہتے ہیں۔ جیسے کہ آنکھ کان اور زبان رکھنے کے باوجود قرآن کی زبان میں لوگ اندھے بہرے اور گونگے ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اذا جاءک المنافقون قالوا نشھد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون ۔ نبی صلعم سے خطاب یہ ہے کہ جب دورنگے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں نہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور یہ بات تو اللہ کے علم میں ہے ہی کہ آپ اسکے رسول ہیں۔ لیکن اللہ ساتھ کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ دورنگے لوگ جھوٹے ہیں۔ دیکھا! رسول کو رسول بھی تسلیم کیا اور پھر جھوٹے کے جھوٹے ہی رہے تیل بھی کیا اور دُکھا بھی کھایا۔

جو میرا کلام یہ ہے کہ کسی کا یہ تسلیم کرنا کہ رسول رسول ہے" یہ بات تو سچ ہے، لیکن جب یہ بات دل سے تسلیم نہ ہو اور زبان سے دعوےٰ دینے کے لئے لفاظی کی جارہی ہو تو سچ بولنے کے بعد بھی جھوٹا جھوٹا ہی رہتا ہے۔ زبان نے تو خوشنما باتیں کردیں اور غلط فہمیوں کی تردید کے لئے چکنی چپڑی اگل دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساری عملی زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہاں جھوٹ کی کھیتیاں چاروں طرف لہلہا رہی ہیں۔ ان میں ایک کیاری اگر سچاوٹ کے لئے سچائی کے گُل ولالہ کی بھی بو دی تو اس سے حقیقت میں کیا فرق آسکتا ہے۔

اس مثال کو اگر وہ لوگ سامنے رکھ لیں جو کہتے پھرتے ہیں کہ :-

"اسلام موجودہ دنیا کی ساری مشکلات کا بہترین حل پیش کرتا ہے"

"اسلامی نظام سب سے متوازن نظام ہے"

—— وغیرہ

تو ان کو کافی غذائے فکر مل سکتی ہے۔ زبان پہ "اسلام" ہو اور عملی زندگی اسکے خلاف ہو تو زبان کی بات تو سچی ہوگی لیکن کہنے والا جھوٹا ہوگا — چاہے وہ مریخ جاکر یوں نہ گلے کا آپریشن کرائے۔

بقیہ از صفحہ ۴۸

اور برپا شدہ نظام کو کسی کتاب کی ناوک اندازی سے تہ و بالا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فقرہ بہت بچگانہ سا معلوم ہوتا ہے۔
یہ کتاب ۵ روپیہ میں مکتبہ نشاۃ ثانیہ، معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن اور دفتر حیات نو حیدرآباد دکن سے حاصل کی جاسکتی ہے

اسیرانِ عشق

ابوالبیان

مومن ہے سوز و سازِ محبت سے بہرہ مند — اُس کا ضمیر زندہ ہے اور حوصلے بُلند
تاریخ اپنے آپ کو دُھرا رہی ہے پھر — عصرِ رواں لگاتا ہے اُلٹی سی اک زقند
ہم دوش ہے نصیب اسیرانِ عشق کے — دنیا میں سرفراز تو عقبیٰ میں سر بلند
اللہ کو جو عزیز ہیں بھی وہی عزیز — اپنی ہے جو پسند اُسے بھی وہی پسند
معروفِ التجا ہے کوئی چشمِ اشکبار — محو دعائے شوق کوئی قلبِ دردمند
بے بس ہوا ہے کیدِ زلیخائے اقتدار — نکلا مقامِ عفتِ یوسف بسا بلند
اُن کے سروں پہ سایہ ہے پروردگار کا — پہنچے گی اہلِ حق کو نہ ہرگز کبھی گزند
کہتے ہیں "یعقوب ایکٹ" جسے قائدینِ قوم — تہذیبِ کفر کا ہے وہ فرزندِ ارجمند
اک اور تازیانہ کی حاجت ہے پھر اُسے — ہے سُست گام گردشِ ایام کا سمند
اربابِ تخت و تاج کا اقدامِ جور و ظلم — اہلِ نظر کے واسطے سامانِ زہر خند
خواہی کہ نزدِ رحمتِ حق سرخرو شوی — اے دل بسوزِ خویش را چوں دانہ سپند

جذبۂ بے اختیار

ن۔ حشمی

آجتک انسان کے دل کو قرار آیا نہیں — اس جہانِ رنگ و بو پر اعتبار آیا نہیں
ہاسئے یہ انسانیت کے باغ پر دورِ خزاں — مدتیں گذریں مگر رنگِ بہار آیا نہیں
یاد ہیں ابتک رہِ حق میں کسی کے نقشِ پا — پھر کبھی اس سمت وہ جانِ بہار آیا نہیں
ابتری سی ابتری ہے بے حسی سی بے حسی! — انجمن میں کیا کوئی مسلم شعار آیا نہیں؟
آپ کے باعث اگر دلچسپیاں کچھ ہوں تو ہوں — ورنہ ہنگامہ جہاں کا سازگار آیا نہیں

کوششِ فکر و عمل بے کار ہے حشمی! اگر
دل کے اندر جذبۂ بے اختیار آیا نہیں

ہر چیز میں انقلاب کرنا ہوگا — ہر فعل پہ احتساب کرنا ہوگا
کتنے ہی خدا تھے جنہیں پوجا ہم نے — اب ایک کا انتخاب کرنا ہوگا

گلگشت

تعارف کتب و جرائد

(ادارہ)

ڈاکٹر عارف بٹالوی کی لکھی ہوئی کتاب "اقبال اور قرآن" کتاب لمیٹڈ، کراچی نے شائع کی ہے۔ کتاب کا مقصد و مدعا یا تو یہ ہے کہ یہ دکھایا جائے کہ اقبال نے قرآن کی ترجمانی کی ہے، اور یا یہ ہے کہ قرآن کی دعوت کی توضیح اقبال کے کلام سے کی جائے۔ موضوع کے تقاضے علمی اور تحقیقی قسم کے ہیں، لیکن کتاب شاعرانہ جذباتیت کی مظہر ہے۔ علاوہ بریں پوری کتاب اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اقبال تنقید سے بالاتر ہیں، یا وہ اسلام کے معیار پر اتنا پورا اترتا ہے کہ کہیں مقامِ گرفت نہیں مل سکتا۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر عارف کا رجحان جس طرح کہ اس کتاب میں نمایاں ہے، اسلام پسندانہ ہے۔ کمزوری اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ ذہن پوری طرح صاف نہیں؛ اس میں الجھنیں اور تضادات چلے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰ پر فرماتے ہیں کہ "وہ پوری قوم مسلمانوں کی قوم رہی، نہ اس کے افراد انگریز بن سکے" پھر صفحہ ۱۳ پر فرمایا کہ "ہماری ملتِ اسلامیہ اس وقت تک کبھی صالح نہیں ہو سکتی جب تک اس کا امیر صالح نہ ہو" صفحہ ۱۶ پر یہ جملہ حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ "عوام کے بدلے ہوئے احساسات اور ذہنی تغیر کو دیکھ کر ایک مبہم سی امید کی جھلک دکھائی دیتی ہے ——— حکومتِ پاکستان نے دستورِ نو کے ساز چھیڑ کر عوام کی توجہ کو ہمہ گیر تو کر لیا لیکن ان کی روحانی تشنگی کے سامان فراہم کرنے میں اب تک کامیاب نہیں ہوئی"۔ صفحہ ۱۸ پر بتایا ہے کہ "دین اس اقتدار کا نام ہے جس میں حکومت صرف خدا کی اختیار کی جائے ——— یعنی خدا کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے"۔ یہ تمام جملے اچھے احساسات کو سامنے لاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف کئی باتیں قابلِ گرفت بھی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۵۱ پر آیتِ استخلاف کا ترجمہ کرنے میں بہت ہی بے جا تصرفات کئے گئے ہیں۔ "وعملوا الصلحت" کا ترجمہ "اور وراثتِ ارضی کی صلاحیت پیدا کرنے والے اعمال کئے" کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ یہاں "مشرقی" طرزِ تفسیر نمایاں ہے۔ "کما استخلف الذین من قبلهم" کے ترجمے کے لئے "جس طرح ہم نے ان سے پہلوں کو قوت و شوکت عطا فرمائی تھی" کا فقرہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح صفحہ ۷۴ پر آیت "وما الحیوۃ الدنیا الا لعب ولھو" کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے "یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے" اور پھر اقبال نے اپنے بچپن پر جو اشعار لکھے ہیں۔ ان کو درج کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ نہ وہ ترجمہ صحیح ہے اور نہ اقبال کے اشعار کو اس آیت پر منطبق کرنا درست۔ اسی نسخے پر دوبارہ اس آیت کا ترجمہ ایک اور غلط صورت میں درج ہے۔

صفحہ ۸۵ پر فرمایا ہے کہ "بندے کے خدا ہو جانے" پر ایک زمانے میں وارورسن کے ہنگامے بپا ہو جایا کرتے تھے، کیونکہ ہمارے علماء نے یا تو قرآن کریم کو سمجھا نہ تھا، اور اگر سمجھا تھا تو عوام کو اس لئے نہ سمجھایا کہ مبادا علوم اس کے ہاتھ سے نکل جائیں"۔ اور پھر یہ نکتہ "علیحدہ واضح کیا ہے کہ "جو سوسائٹی ان قوانینِ خداوندی کی علمبردار ہو گی وہ ایک طرح خدا بن جائیگی" جیسا کہ خود اس نے فرمایا ہے کہ "تخلقوا باخلاق اللہ"۔

نگفت

صفحہ ۱۲۳ پر حضرت یوسف ؑ کی داستان بیان کرتے ہوئے جب بادشاہ کے خواب کی تعبیر کا ذکر آتا ہے اور یوسف علیہ السلام قید سے طلبی ہونے پر "فرمایا ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن" کا جواب دیتے ہیں تو اس موقع پر اقبال کے وہ اشعار درج کر دئے گئے ہیں جو "افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں" کے مصرعے سے شروع ہوتے ہیں۔ صاف بات ہے کہ یہ نہ تفسیرِ قرآن ہے' نہ تشریح کلامِ اقبال!

صفحہ ۲۰ و صفحہ ۲۱ پر نظریۂ ارتقا اور قرآن کی نہایت بھونڈی تطبیق کی گئی ہے۔ صفحہ ۸۱ پر کفار کے حاکم اور مسلمانوں کے محکوم ہونے کی توجیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب بتاتے ہیں کہ "ہماری ملتِ اسلامیہ نے تم فرداسے بے نیاز ہو کر مستقبل کے لئے کچھ نہیں سوچا۔ اس مستقبل کا نام آخرت ہے۔ اس سے آخرت کے معاملے خدا پر چھوڑ دئے ہیں' اور انگریز قوم نے فکرِ مستقبل کو زیرِ بحث رکھا۔ اس لئے اسے دُنیا و آخرت دونوں پر قابو ہے۔ یہ کلمات کتنی بڑی پریشان خیالی کا ثبوت دیتے ہیں۔

مؤلف آج سے دس سال پہلے کے ایک فیشن میں بُری طرح مبتلا ہیں' یعنی ہر جرم کا مجرم "مولوی" —— الا بلا بگردنِ مُلّا! جیسے کہ صفحہ ۸۱ پر فرمایا کہ "ملوکیت میں دین محض مولوی طبقہ کے سپرد رہا اور سیاست جس کا دوسرا نام سلطنت ہے' سلطان کے ذمہ رہی۔ مولویوں نے عوام کو تحقیق سے باز رکھا اور کہا کہ ہر چیز کو بغیر تحقیق کے مان لینے کا نام مذہب ہے" لیکن "سلطان" نے کیا کیا؟ اس کا کوئی ذکر مؤلف نہیں فرماتے بلکہ اسے ساری چھوٹ ہے! صفحہ ۲۲۶ پر "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے مولوی کو پھر مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے کہ "مولویوں نے (یہ شعر سن کر) کہا کہ یہ غلط ہے' بلکہ زوال کا سبب یہ ہے کہ ہم بے سرمایہ ہیں' پوری کی پوری قوم افلاس کے جال میں پھنسی ہے" یہ محاورہ بھی عجیب ہے۔ چراغ راہ مولوی نے شاید کبھی یہ کہا ہو لیکن آج تو وہ اس کے برعکس دوسری بات کہہ رہا ہے اور مولوی کے موقف پر بالوا مسٹر لوگ کھڑے ہیں جو کہتے ہیں کہ ابھی اسلامی نظام کا کیا ذکر! ابھی تو پاکستان غریب ہے' اسے خطرات درپیش ہیں' وغیرہ! لیکن ڈاکٹر صاحب غریب مولوی کے خلاف برابر یہ فیشنی ایکسپرشن استعمال کئے چلے جا رہے ہیں۔

مصنف کی نیت نیک اور جذبات اچھے ہیں' لیکن شعور کمزور اور اسلوبِ بحث غیر علمی ہے۔ کتاب مجلد ہے' رنگین گرد پوش سے آراستہ ہے اور ۵ روپے فی جلد کے حساب سے بک رہی ہے۔

عبدالکریم عابد کی کتاب "مارکس اور اس کے معتقدات" مکتبۂ فکر نو حیدرآباد دکن نے شائع کی ہے۔ یہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) مارکس کا نفسیاتی تجزیہ (۲) کمیونزم کا تاریخی تجزیہ (۳) کمیونزم کا علمی تجزیہ۔

کتاب میں جان ہے' پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ سامانِ اضافۂ معلومات ہے۔ دوسرے عنوانات پر جو کچھ معلومات یکجا دی گئی ہیں' وہ کسی نہ کسی شکل میں دوسری کتابوں میں بھی ملتی ہیں' لیکن مارکس کا نفسیاتی تجزیہ ایک نئی بحث ہے۔ یہ بحث بتاتی ہے کہ مارکس کی نفسیات میں ایسے خصائل موجود تھے جن سے طبعی طور پر ویسا ہی طرزِ فکر برآمد ہو سکتا تھا جیسا کہ مارکس کے ہاں ملتا ہے۔ اس بحث سے بالواسطہ یہاں اس نظریہ کی اہمیت بھی سامنے آجاتی ہے کہ انسانی نفسیات اس کے سیاسی و معاشی افکار پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہیں اور انسانی تمدن کی جڑیں معاشی مسئلوں سے آگے گذر کر نفسیاتِ انسانی میں واقع ہوتی ہیں۔

اس کتاب کے دیباچہ میں یہ کہا گیا ہے کہ اب "مارکس کے کارواں کو رکنا ہی پڑے گا" حالانکہ دنیا کی کسی چلتی ہوئی تحریک

مکتبہ چراغِ راہ

...ستان کی پہلی اسلامی تحریک	مولانا مسعود عالم ندوی	2/8
...شتراکیت اور اسلام	از مولانا مسعود عالم ندوی	2/8
...محمد بن عبدالوہاب	از مولانا مسعود عالم ندوی	2/12
...اب عرب میں	از مولانا مسعود عالم ندوی	4/8
...ی ملکیت	از نعیم صدیقی	0/12
...مطالعۂ قرآن	از مولانا امین احسن اصلاحی	6/0
...سلمان اسلام کی کسوٹی پر	از نذیر الحق میرٹھی	7/8
...ے لیڈر (انگریزی)	از چودھری محمد اکبر	4/8
...لام احمد شہید	از ڈاکٹر اقبال قریشی	3/8
...تیب حضرت امام غزالی	مترجمہ عبدالوہاب ظہوری کا	3/8
...ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی	از مولانا مناظر احسن گیلانی	8/12
...فۂ عجم	از علامہ اقبال	3/2
...نبوی میں نظام حکمرانی	از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب	4/8
...ن بین الممالک	از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب	3/8
...منشور متحدہ اقوام و		
...سیاسی دستاویز	مترجم احمد عبداللہ المسدوسی	7/0
...حضرت ابوذر غفاری	مناظر احسن گیلانی	3/4
...کے دسترخوان پر	اسعد گیلانی	3/8
...سلام کا نظام عدالت و سیاست	یعقوب الرحمن عثمانی	2/12
...افکار آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد	3/8
...ارشادات رسول	عبدالرحیم اشرف	7/4
...بیدار الٰہی	امام ابن رجب حنبلی	7/0

بچوں کے لئے

ابتدائی تعلیم کا سٹ جس میں قاعدہ، پہلی کتاب، دوسری کتاب اور تیسری کتاب شامل ہے۔ چوتھی بار شائع ہوتا ہے۔ قیمت ۱/۱۲

عبادت	قیمت ۱۲ر	نماز	قیمت ۸ر
انسان کی کہانی	- ۱۲ر	آپ کیا کریں	- ۱۳ر
ماضی کا ہیرو	- ۵ر	سندھاری کی بیل	- ۴ر
[illegible]	- ۵ر	غار والے	- ۵ر
گاؤں والے	- ۵ر	سینچر والے	- ۵ر
حضرت عائشہ صدیقہؓ	- ۱۴ر	حضرت سیدہ فاطمہؓ	- ۷ر
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	- ۷ر		

سیرت آنحضرت صلعم	غلام محمد بی۔اے	قیمت ۱۲ آنے
حضرت ابوبکر صدیقؓ	الطاف شوکت بی اے	- ۶ر
حضرت عمر فاروقؓ	الطاف شوکت بی۔اے	- ۸ر
حضرت عثمان غنیؓ	اعجاز الحق قدوسی	- ۱۰ر
حضرت علی کرم اللہ وجہہ	اعجاز الحق قدوسی	- ۱۰ر
حضرت امام حسن علیہ السلام	عبدالصمد ہاشمی مولوی فاضل	- ۷ر
حضرت بلالؓ	شاہین فاروقی بی اے	- ۷ر
حضرت امام حسین علیہ السلام	عبدالصمد ہاشمی مولوی فاضل	- ۷ر
حضرت خالد بن ولیدؓ	شاہین فاروقی بی۔اے	- ۸ر
حضرت محمد بن قاسم	شاہین فاروقی بی اے	- ۷ر
حضرت امام ابوحنیفہؓ	شاہین فاروقی بی اے	- ۸ر

ملنے کا پتہ:- **مکتبہ چراغِ راہ**

۹۔ لٹیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

ہماری اردو عزیز مطبوعات

اسلامیات

تاریخ اسلام طبری	علامہ عبداللہ العمادی	8/12
اسلامی معاشیات	علامہ مناظر احسن گیلانی	7/12
اسلامی تہذیب کیا ہے؟	غلام دستگیر رشید ایم۔ اے	3/0
قصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریا بادی	7/12
حضرت ابوذر غفاریؓ	علامہ مناظر احسن گیلانی	3/4
الدین القیم	۔ ۔ ۔	2/12
مکالمات ابوالکلام	مرتبہ عقیل احمد جعفری	3/12
خطبات احمد کا مکاتب	ماہر القادری	0/9
افادات محمد علی	رئیس احمد جعفری	3/12
نگارشات محمد علی	۔ ۔	3/12
مطالبات محمد علی	۔ ۔	2/8

اقبالیات

تصریح اقبال	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	5/12
اقبال کا تصور زمان و مکاں	ڈاکٹر رضی الدین	0/12
آثار اقبال	مرتبہ غلام دستگیر رشید ایم اے	3/12
مقام اقبال	سید اشفاق حسین ایم اے	4/8

سیاسیات

عہد جدید ہندستان	مترجمہ علامہ عبدالقدوس ہاشمی	4/8
جناح کی تقریریں	مترجمہ شان صدیقی	4/0
سیاست جاپان	عبدالقادر ایم۔ اے	7/10
[illegible]	محمد مسیح ہاشمی ایم۔ اے	7/12
[illegible]	مترجمہ سید صدیقی	4/6
[illegible]	عبدالقادر ایم اے	7/0

تاریخ۔ تدریس۔ ادب۔ تنقید۔ فلسفہ

مختصر تاریخ ادب	سید اعجاز حسین ایم اے	5/4/-
تعلیمی طریقے	سید عبدالحکیم ایم۔ اے	4/0
ان پڑھ ہندستان	ملا فخرالحسن ایم۔ اے	3/4
سہیل کی سرگزشت	رشید احمد صدیقی ایم۔ اے	3/12
روایت اور بغاوت	سید احتشام حسین ایم۔ اے	3/0
تنقیدی جائزے	۔ ۔ ۔	3/12
تنقیدی حاشیے	مجنوں گورکھپوری ایم اے	3/12
ترقی پسند ادب	عزیز احمد بی اے	2/14
داستانِ اردو	نصیر حسین خاں خیال	7/12
فنِ افسانہ نگاری	وقار عظیم ایم۔ اے	3/0
تاریخ سادات امروہہ	جمیل احمد نقوی	0/0
اردو غزل	از ڈاکٹر	5/0

نفسیات

تعمیر حیات	ترجمہ فیروز شاہ	4/0
شخصیت و کردار	فیروز محمد اختر	2/8
بچوں کی نفسیات	۔ ۔	7/12
نفسیات زندگی	۔ ۔	7/12
[illegible]	منظور بخاری بی۔ اے	7/0

ہرایک دوائی پورے کورس پر دو آنے فی روپیہ رعایت

خداوند قدوس نے پچھلے چند ماہ میں ہمیں مسرت کے کئی مواقع فراہم کئے۔ اسی خوشی میں ہم یہ حقیر پیشکش کرتے ہیں کہ اپنے تمام مرکبات پر ماہ ستمبر تک کے آرڈروں پر ۲ آنے فی روپیہ رعایت کر دیگے

لبوب کبیر خاص الخاص
جملہ جنسی اور جسمانی کمزوریوں
کا مداوا
قیمت ۳۰ یوم
اٹھارہ روپے

راحت
کثرت احتلام کا
مجرب نسخہ
۳۰ یوم
چار روپے

نجات
جریان کا
بہترین علاج
۳۰ یوم
پانچ روپے

خمیرہ گاؤزبان عنبری باضافہ جواہرات
دل ۔ دماغ حافظہ اور اعصاب کی تقویت
کا بہترین مرکب
قیمت ۳۰ ۔ یوم
۱۴ روپے آٹھ آنے

دوا المسک معتدل باضافہ جواہرات
نئے خون کی پیدائش اور تقویت دل کے لئے اصل نسخہ میں
• عنبر • کستوری
اور جواہرات کا اضافہ
اصل قیمت ۳۰ ۔ یوم ، چودہ روپے آٹھ آنے

دماغ انسٹرز
حافظہ و نظر کی کمزوری ، قوت وسوچ و بچار کی
کمی ۔ نسیان ۔ عام دماغی کمزوری ۔ سر چکرانا ۔
عوارض کا کامیاب تحفہ ۔
۳۰ یوم بیس روپے

فہرست ادویہ مفت طلب فرمائیں ۔

مفرح یاقوتی معتدل
فرحت ۔ سرور ، تقویت قلب و دماغ کے لئے بیش قیمت تحفہ
۳۰ ۔ یوم پچیس روپے

رُوح نشاط
لبوب کبیر خاص الخاص کو گولیوں کی شکل میں تیار کردہ قیمتی نسخہ
۳۰ ۔ یوم اٹھارہ روپے

ناظم اشرف میڈیکل ہال رجسٹرڈ ۔ ہیڈ آفس لائلپور

Only Title Printed at the Shan Electric Press, Arambaugh Road, Karachi.

چراغِ راہ

(کراچی)

اگست ۱۹۵۰ء

مرتب
نعیم صدیقی

مکتبۂ چراغِ راہ
لوٹا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی ۱

۱/۸

ماهنامه

چراغِ راہ

جلد۳۔ عدد۸۔ ۹ لوٹیا بلڈنگ ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی نمبرا۔ ماہ اگست ۱۹۵۰ء

چندہ سالانہ:—— پانچ روپے فی پرچہ —— ۸ آنے

چودھری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس ... سے چھپوا کر ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کی۔

سوچ بچار

تحریکِ اسلامی کے خلاف نئی مہم

پریس کی منظرگاہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریکِ اسلامی کو مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور ان کے رفقاکی رہائی سے قدم آگے بڑھانے کا جو موقع مل رہا ہے، اس کے پیشِ نظر نظامِ اسلامی کے مخالفین کیطرف سے ایک نئی مہم شروع کی گئی ہے۔ یہاں اسی مہم کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا اور کوئی نظام ایسا نہیں جسے لے کے آپ اُٹھیں اور آپ کو مزاحمت کرنے والے محاذ پر مختلف اور متضاد قسم کی طاقتیں متحد نظر آئیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دنیا کی ہر تحریک اور خود ساختہ مقاصد کے لئے بنائی ہوئی ہر جماعت دوسری تحریکوں اور جماعتوں سے کسی نہ کسی نقطے پر اتحاد (Compromise) کر سکتی ہے لیکن اسلام چونکہ اللہ کا دین ہے، لہذا جو لوگ اسے اللہ کے دین کی حیثیت سے اپنے لئے واجب التعمیل مان کر چلتے ہیں وہ اپنے آپ کو سودا بازی کا مختار نہیں پاتے۔ چنانچہ اسلام کی ٹھوس اصولیت ہی کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ نظامِ اسلامی کی علمبرداری کر رہے ہیں ان کی مخالفت کے پروگرام میں برسرِ اقتدار طبقہ، کمیونسٹ، سوشلسٹ، سیاست اغراض کے عادی، نظامِ مغرب کے مومنین، قادیانی، آفاقی، منکرینِ حدیث، جاہ پرست علماء، عوام کے ضمیروں سے کھیلنے والے پیر اور بے پردگی کی علمبردار خواتین سب کے سب متحد و متفق ہیں۔ ان مختلف عناصر میں سے جس جس کے ہاتھ میں پریس کی جتنی جتنی طاقت ہے، وہ تمام کی تمام تحریکِ اسلامی کو کمزور کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔

مخالفت کی مہم کی جو نئی لہر اٹھی ہے، اس کا بغور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک خاص اسکیم ہے جو زیرِ عمل آ رہی ہے اس اسکیم کا مدعا یہ ہے کہ اسلام کا نام لینے والوں کے متعلق ملک کے عوام کو ایک ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا جائے، یہاں تک کہ نظامِ اسلامی اور اس کی دعوت ان کے لئے مشتبہ ہو جائے، وہ سیدھی سادی بات کو سمجھ نہ سکیں اور ان کو شکوک میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ ملک کے ذہین طبقہ (intellegentia) کو اس دعوت کی علمبردار طاقت سے مایوس اور بدگمان کر دیا جائے۔ اس مقصدِ عظیم کے لئے جو پروگرام تقسیمِ کار کے اسلوب کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے اس کی تفصیل عرض کی جا رہی ہے۔

ایک صاحب جریدہ نے کچھ عرصہ سے اپنے ذمہ یہ فرض لے رکھا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے بارے میں مسلسل یہ نشر کیے جاتے ہیں کہ جماعت اچھے لوگوں کی ہے، خوب منظم ہے، بڑا لٹریچر اس کے ساتھ ہے، مگر پروگرام کوئی نہیں۔ اب یہ صاحب اس چیز کو برابر دوہرا رہے ہیں اور انہوں نے کبھی پیچھے پلٹ کے نہیں دیکھا کہ جماعت کدھر سے چل کر کس راستے سے ہوتی ہوتی کہاں جا رہی ہے۔ ان کو اقبال کے ایک ایک شعر میں پروگرام ملتا ہے، مولانا آزاد کے ایک ایک فقرے میں سے یہ پروگرام ڈھونڈ کے نکال لاتے ہیں، لیکن ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے جماعت اسلامی ہی کے لٹریچر میں ان کو پروگرام نظر نہیں آتا۔ اس کی تقریروں سے انہیں کسی پروگرام کی جھلک نہیں ملتی، اس کی شوریٰ کی قرار دادوں سے یہ کوئی پروگرام اخذ نہیں کر سکتے، اس کی عملی سرگرمیوں سے پروگرام کے وجود کا ثبوت

نہیں ملتا۔

ان صاحب کی نگاہ میں مسلم لیگ کے پاس پروگرام موجود ہے، عوامی لیگ پروگرام رکھتی ہے لیکن اگر نہیں تو صرف جماعت اسلامی کے پاس کوئی پروگرام نہیں۔

ان بزرگ کی یہ ساری کوشش جماعت کے بارے میں عوام الناس کو ایک التباس میں مبتلا کرنے کی ہے۔

ایک دوسرے بزرگ ہیں جو اپنے روزنامے کے کالموں میں متعدد مرتبہ جماعت اسلامی کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرما چکے ہیں کہ یہ لوگ مخلص ضرور ہیں، مگر عقل کے کورے ہیں، زندگی کے مسائل کو نہیں جانتے، تاریخ پر ان کی نگہ نہیں ہے، بین الاقوامی ماحول کا کوئی تصور انہیں حاصل نہیں ہے، عوامی تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ یہ وہی بات ہے کہ خدا کے ایک نبی پر چھدا رکھنے والوں نے کہا تھا کہ آپ تو سفاہت کا شکار ہیں اور خاتم المرسلینؐ پر الزام لگایا تھا کہ "انک لمجنون"!

ان صاحب کا وطیرہ بھی یہی ہے کہ مڑ مڑ کے اپنے اس نظریئے کو دوہراتے چلے جاتے ہیں اور کسی کی سُن کر نہیں دیتے۔ ہمالہ کی اونچائیوں پر کھڑے ہو کر ہمیشہ بھاری بھرکم خیالات نشر فرماتے ہیں، جیسے انسانی تاریخ، فلسفے اور سیاست کے تمام اجزا سمٹ کر ان کے قدموں میں آ گئے ہیں، اور باقی دنیا جاہلوں اور اَن پڑھوں سے بھری پڑی ہے۔

کچھ بزرگ ایسے ہیں جنہیں اور کوئی عذر نہیں ملتا تو پیری مریدی کا الزام چپک دیتے ہیں۔ ان حضرات کی بحثوں کی تان اس پر ٹوٹے گی کہ جماعت اسلامی پیری مریدی کے اصول پر قائم ہے۔ جماعت اپنے ریزولیوشن میں نظام کی نوعیت کو واضح کرتی ہے، پمفلٹوں میں وہ اپنے داخلی نظم کے متعلق تصریحات بیان کرتی ہے، تقاریر میں وہ غلط فہمیوں کی تردید کرتی ہے اور پھر عملاً ان حضرات کے سامنے وہ اپنے لئے امیر اور ارکانِ شوریٰ کا انتخاب ارکان کی آراء سے کرتی ہے، لیکن یہ سب کچھ "پیری مریدی" کی تردید کے لئے ناکافی ہے۔ وہاں مرغ کی ایک ٹانگ اٹل ہے۔

پھر ایک ہتھیار ملائیت اور قدامت پرستی (Orthodoxy) کے طعنے دینے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ کچھ ایسی پرانی باتوں کے احیاء پر بضد ہیں جن کے لئے موجودہ دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ پھر تحریک اسلامی کا مقصد تھیوکریسی (Theocracy) کا قیام بتایا جاتا ہے ——— حالانکہ جماعت کے لٹریچر میں تھیوکریسی کے اس تصور کی پوری تردید موجود ہے جو یورپ سے درآمد ہوا ہے۔ علاوہ بریں نظریۂ سیاسی، دو دستوری خاکے اور اسلام کا نظام حیات نامی کتابوں میں سیکولر نظام ریاست اور تھیوکریٹک نظام ریاست دونوں کے مقابلے میں اسلام کا تیسرا انتظام پیش کیا گیا ہے، اور ان کتابوں کے ہوتے ہوئے یہ الزام لگانا انتہائی ڈھٹائی ہے کہ جماعت اسلامی تھیوکریسی (یعنی ایک مذہبی طبقے کی اجارہ داری) قائم کرنے اٹھی ہے۔

تھیوکریسی میں رائے عام کا کوئی مقام نہیں، لیکن جماعت جس نظام کی علمبردار ہے اس کا دارومدار ہی رائے عام کی صلاح و فلاح پر ہے۔ تھیوکریسی میں "انتخاب" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن جماعت اسلامی ریاست کے نظم کے لئے انتخابات کے اصول کو لازم سمجھتی ہے۔ تھیوکریسی میں حکمران طاقت تنقید سے بالاتر ہوتی ہے، لیکن جماعت اسلامی خدا اور رسول کے سوا کسی کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتی بلکہ اس کی نگاہ میں شہریوں کا یہ عین اسلامی فرض ہے کہ وہ حکمرانوں پر پوری آزادی سے تنقید کریں۔

تھیوکریسی میں ارباب حکومت کی معزولی کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن جماعت اسلامی کسی صاحب اقتدار اور کسی عہدے دار کے نااہل ثابت ہونے پر پبلک کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ وہ اس سے معزولی کا مطالبہ کرے اور یہ مطالبہ اگر دستوری لحاظ سے درست ہو تو ضروری ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔

مگر یہاں وہی رٹ جاری ہے کہ ملائیت اور تھیوکریسی کا خطرہ ہے۔

جماعت جدید دور کے مسائل کو اجتہادی زاویۂ نگاہ سے حل کرنے کے اصول بتاتی ہے اور پھر اس کے لٹریچر میں تعلیم، قانون، معاشیات اور دوسرے مسائل کے بارے میں تفصیلی طور پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی اصولوں کے تحت زندگی کے مختلف شعبے آج کل کی ضروریات کے لحاظ سے کیسے منظم کئے جا سکتے ہیں لیکن ان ساری وضاحتوں کے علی الرغم پھر یہ الزام اپنی جگہ قائم ہے کہ یہ لوگ قدامت پرست اور محدود نظر اور جامد الفکر ہیں۔

اس کوشش کا مقصد صرف یہ ہے کہ جماعت کے متعلق ایک تذبذب اور انتشار پھیلا دیا جائے۔

Section break

ایک طرز عمل یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جماعت کی طرف سے جو صاف سے صاف اور واضح سے واضح بات بھی پیش کی جائے اس پر یہ کہ دیا جائے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر آپ جتنی جتنی تصریح کرتے جائیں گے اتنا ہی اتنا زور دے کر الزام لگایا جائے گا کہ ابہام کی گرہیں کھلنے کے بجائے اور الجھ گئی ہیں۔ چنانچہ جماعت کی انتخابی پالیسی کے سامنے آنے پر کہا گیا کہ صاحب! یہ "صالح نمائندہ" کیا ہوتا ہے؟ ------ ہماری سمجھ میں تو اس اصطلاح کا مفہوم نہیں بیٹھتا۔

اس واضح حقیقت کو کئی بار واضح کیا گیا لیکن ہر بار ردِ عمل یہی رہا کہ لفظ صالح کے معنی ہماری دسترس سے بالاتر ہیں۔ آخر صالح کی تعریف کیا ہوگی؟ اس کا معیار کیا ہوگا؟ کون نامزد کرے گا کہ فلاں صالح ہے اور فلاں صالح نہیں ہے؟ بہت سے صالحیت کے دعوے داروں میں سے کس کو سچا مانا جائے گا اور کس کو جھوٹا؟ ------ ان سوالات کے جوابات تحریروں اور تقریروں میں بیسیوں دفعہ دئے جا چکے، دو دو دو گفتگوئیں کی گئیں۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کہ "صالح نمائندہ" کا مفہوم متعین نہیں ہو سکا۔

اس کوشش کا بھی اصل مدعا صرف یہ ہے کہ پبلک کو الجھا دیا جائے اور بار بار "لا ادری" کہ کر ذہنی انتشار پھیلا دیا جائے۔

Section break

ایک گروہ نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ادھر سے جس معاملے میں کوئی حقیقت واضح کی جائے اسے ایسے طریق سے پبلک کے سامنے رکھا جائے کہ زیادہ سے زیادہ جتنی غلط فہمی پیدا ہو سکے ہو جائے۔

جماعت نے جاگیروں کے خاتمے کے لئے جو طریق کار پیش کیا ہے اس پر اسی "فن لطیف" کو استعمال کیا گیا ہے۔ ادھر سے کہا یہ گیا تھا کہ [illegible] سلب کی جائیں لیکن یقیناً ... کر کے خدا کے دین کے مطابق سلب کی جائیں اور جن کا سلب کرنا شرعاً حق قرار پاتا ہو ان کو بغیر معاوضہ کے ... کیا جائے۔ مدعا یہ تھا کہ شریعت کے اصول پر چھان کر نے کے بعد ان کے ساتھ باقاعدہ ذبح کیجئے۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ اسلام کے چھاج میں پھٹکنے سے شاید ہی کوئی ... بچ سکے گی۔ لیکن ادھر سے ڈونڈی پیٹ دی گئی کہ جماعت اسلامی نے جاگیرداری کی حمایت کا فیصلہ کر دیا۔
مدعا صرف یہ ہے کہ [illegible] بدظن ہو جائیں۔

Section break

[illegible]

نگاہی کالموں میں پھبتی اور پھکڑ بازی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتا ہے اور یا پھر کھلم کھلا گالم گلوچ سے کام لیتا ہے۔ اس آرٹ کے ماہرین نے پہلے ۱۹۴۸ء میں ———— اور پھر اب گذشتہ ایک مہینے میں صحافت کے روئے زیبا پر جیسے جیسے غازے لیپے ہیں وہ تاریخ مستقبل میں یادگار رہیں گے۔

یہ فن کار اس کے سوا کوئی مقصد نہیں رکھتے کہ پگڑی اچھال کر اس احترام کو ختم کر دیں جو تحریک اسلامی کے چند بہترین کارکنوں کو ان کی سنجیدگی اور ان کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے عوام کی نگاہ میں حاصل ہے۔

ان مخالفانہ سرگرمیوں کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اس ملک میں اسلام کا نظام عملاً قائم دیکھنا چاہتے ہیں اور جن کا جینا مرنا اسی ایک مقصد کے لئے ہے، ان کو اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے ہوئے ایک ایک انچہ زمین بزور بازو لڑ مر کر حاصل کرنی پڑیگی۔ چپے چپے پر معرکے ان کے منتظر ہیں اور قدم قدم پر سنجیدہ آزمائشیاں ناگزیر ہیں۔ آپ یہاں جو کچھ پائیں گے اس کے لئے پوری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

خدا آپ کو اس کی توفیق دے!

قند و نمک

وزیرِ اعظم کی واپسی

وزیرِ اعظم کا سفر اور پھر واپسی شہزادہ بہرام کی کہانی کی طرح اپنے اندر بڑی اعجوبگیاں رکھتی ہے —— لیکن سیاسیات میں یہ اعجوبگیاں موجبِ ہلاکت ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس سفر سے ہمارے محترم وزیرِ اعظم کیا کما کے لوٹے ہیں؟ ایک چیز جو ہمیں بتائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم امریکہ اور کینیڈا کے سامنے پاکستان کا تعارف کرا کے اور اس کا وجود محسوس کرا کے آئے ہیں! لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ امریکہ اور کینیڈا میں حاضر ہو کر یہ رپورٹ پیش کرنا کہ عالی جاہ! ہم کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔ اور ہم ایسے ہیں اور ویسے ہیں —— یہ دراصل کوئی قابلِ فخر بات نہیں، بلکہ اُلٹا اس سے آپ کا یہ احساس ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ و کینیڈا کی بارگاہ وہ بارگاہ ہے جہاں حاضری دے کر دنیا کی چھوٹی قومیں اپنے موجود ہونے کو تسلیم کرایا کرتی ہیں۔

پھر پاکستان کا جو تعارف آپ نے کرایا ہے، وہ اس حیثیت سے نہیں کرایا کہ یہ نئی مملکت نئے اصولوں پر قائم ہو رہی ہے اور اس نے امریکہ و روس دونوں کی تقلید سے ہٹ کر اپنے لئے نئی اسلامی شاہ راہ کو پسند کیا ہے، بلکہ آپ نے پاکستان کا تعارف کراتے ہوئے یہ تصریحات فرمائی ہیں: ——

- ا - پاکستان اور امریکہ کے کلچر میں یکسانیت کے وجوہ پائے جاتے ہیں۔
- ب - پاکستان کی ترقی کے لئے ہم امریکہ سے ترقی کے گُر سیکھنا چاہتے ہیں۔
- ج - ہمارے ہاں عین وہی جمہوریت قائم ہو رہی ہے جو امریکہ میں ہے۔
- د - ہم اپنی عورتوں کو اسی راستے پر لے جا رہے ہیں جس پر امریکہ کی عورتیں چل رہی ہیں۔
- ر - ہم مسلمان اور غیر مسلم میں کسی طرح کے امتیاز کے روادار نہیں ہیں۔
- س - ہم ملّا ازم (یعنی دینی نظامِ حکومت) کے خلاف ہیں۔
- ص - ہم امریکی سرمائے کے ضرورتمند ہیں۔
- ط - دنیا کے امن کے لئے ہم یو، این، او کے ساتھ پوری وفاداری رکھتے ہیں۔
- ع - ہم امریکہ کے ساتھ جنگ کوریا میں تعاون کریں گے۔

اس تعارف کے نتیجے میں امریکہ کے صدر، اس کے لیڈروں، اس کے پریس اور اس کے عوام کی طرف سے جو ردِ عمل ظاہر ہوا ہے وہ بالکل قدرتی ہے۔ آپ کا خیر مقدم، آپ کی دعوتیں، آپ پر پریس کے مدحیہ نوٹ، یہ سب اپنی جگہ بالکل صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ کیا امریکہ نے یہی کچھ مارشل چیانگ کائی شک اور میڈیم چیانگ کے ساتھ نہ کیا تھا؟ اور کیا یہی کچھ وہ نہرو کے لئے نہیں کرتا؟! اور کیا یہی کچھ اس نے شاہِ ایران کے لئے نہیں کیا تھا؟ —— پھر آپ کی تمام کوششوں کا حاصل آخر کیا ہے؟ یہ کہ پاکستان کو امریکہ کے لوگ ایک چین، ایک انڈیا یا ایک ایران سمجھ لیں؟

اس سے حاصل کیا ہوا؟

ہاں اگر آپ اپنی اسلامی ریاست کی مخصوص حیثیت کو واضح کرتے، اپنی کسی جدید پالیسی کا اعلان کرتے، امریکہ پر تنقید کرتے، اس کے غلط اصولوں سے انحراف کرکے چلنے کا اعلان کرتے، تو پھر دنیا دیکھتی کہ پاکستان کو دنیا کے نقشے پر کس طرح نمایاں جگہ ملتی ہے اور امریکی پریس آپ کو دنیا کا ایک بڑا بین الاقوامی سیاست دان کیسے قرار دیتا ہے؟

اس صورت میں پاکستان کے تاریک پہلو دکھائے جاتے، آپ کو تنگ نظر قرار دیا جاتا، آپ کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جاتیں ——— لیکن درحقیقت آپ پاکستان کی سب سے بڑی خدمت سرانجام دیتے اور قراردادِ مقاصد کا پورا پورا حق ادا کرتے۔

لیکن اب جبکہ آپ "مرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو" کا اعلان کرکے اس بُتِ کافر کو راضی کرکے لوٹے ہیں تو قوم کے دل میں آپ کے لئے ذرہ بھر جذبہ احترام پیدا نہیں ہوا، بلکہ آپ کے احترام میں نمایاں کمی واقع ہے۔ ہمیں آپ کے اس کے دورہ کے متعلق کسی ایک ذہین یا عامی فرد سے کلمات تعریف سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ جو کچھ آپ کے استقبال کا اہتمام کیا گیا ہے، یقین جانئے محض ایک دھوکا ہے۔ یہ سرکاری ملازمین اور لیگی حلقوں کا ایک ڈرامہ ہے جو آپ کو دکھایا گیا ہے اور اس ڈرامہ میں بھی چوہدری خلیق الزماں جیسے بدنام روزگار آدمی سے بہتر کوئی آدمی مہیا نہیں ہوسکا جو آپ کے لئے قصیدۂ مدحیہ پڑھتا۔ اس قصیدہ مدحیہ نے آپکے احترام کو اور کم کیا ہے، بڑھایا نہیں!

کاش کہ آپ امریکہ کی سرزمین پر ایک داعی اسلام کی حقیقت سے قدم رکھتے اور وہاں ایک اسلامی ریاست کے وزیر اعظم کی شان سے اسلام کے اصولوں کی دعوت اپنے قول اور عمل سے پیش کرتے۔ پھر آپ کی واپسی پر قوم کی مسرتوں کا ٹھکانا نہ ہوتا، اور چاہے امریکہ میں آپ کو کچھ بھی مقبولیت حاصل ہوتی، لیکن کی قوم آپ کے لئے اپنی آنکھیں فرش راہ کرتی۔

جنگ کوریا اور پاکستان

حدیث میں نبی صلعم نے ان لوگوں کی بدنصیبی کا تذکرہ کیا ہے جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے اپنی عاقبت خراب کر لیتے ہیں یہی حال بڑے پیمانے پر ان قوموں اور حکومتوں کا ہے جو دوسری قوموں کے امپریلزم اور ان کے مفادات کے لئے اپنے آپ کو قربانی کا بکرا بنانے پر تیار ہو جاتی ہیں۔

کوریا کی جنگ کون نہیں جانتا کہ روس اور امریکہ کی جوع الارض کا ایک تصادم ہے اور اس میں جیت ایک کی ہو یا دوسرے کی، دنیا کی چھوٹی قوموں کے لیئے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں جو گھوڑے اور بیل پائے جاتے ہیں، ان کا مصرف اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں کہ وہ دوسروں کے اقتدار کے رتھوں اور ہَلوں میں جُتیں اور انہیں کرۂ ارضی پر کھینچتے پھریں ——— کبھی امن کی مجلسوں سے میدان جنگ کی طرف اور کبھی میدان جنگ سے امن کی مجلسوں کی طرف! اس وقت یورپ، مشرقی وسطیٰ اور ایشیا کی چھوٹی قومیں تمام کی تمام اسی ادائے فرض میں مصروف ہیں۔

یوں تو ہمیں عالم انسانی کے کسی بھی حصے کو اس منصب ذلت و مجبوری پر دیکھ کر شدید رنج ہوتا ہے اور خصوصیت سے مسلم ممالک کا اس مسلک پر چلنا ان کے بنیادی فکر کی نفی کرتا نظر آتا ہے، لیکن ہم دوسروں کا رونا رونے کے قابل ہی نہیں چھوڑے گئے کیونکہ ہم ——— ملتِ پاکستان ——— کو بھی ہمارے وزیر اعظم نے امریکہ کے رتھ میں جوت دیا ہے۔ موصوف نے اس کارِ خیر کے انجام دینے میں استخارہ کی کوئی حاجت محسوس نہیں کی، اور بغیر اس کے کہ آپ اپنے ملک کے رجحانات کا جائزہ لیتے،

قوم کے مافی الضمیر کو سمجھتے، کیبنٹ سے مشورہ لیتے، اور پارلیمنٹ سے استصواب کرتے، آپ نے ایک امرِ مطلق کی حیثیت میں اپنی قوم کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ صادر فرما دیا ہے، جس سے کوئی سنجیدہ فردِ مملکت متفق نہیں ہے۔

استدلال یہ ہے کہ ہم امنِ عالم کے پاسبان ہیں، لہٰذا ہمارے لئے لازم ہو گیا ہے کہ ہم یو۔ این۔ او کے فیصلے کے پلڑے میں اپنا وزن ڈال دیں ——— اور یہ سارا استدلال نہایت درجہ غلط ہے۔

اولاً یہ جان لینا چاہئے کہ خدا سے آزاد حکومتوں اور قوموں کی لڑائیاں "جنگ برائے امن" کے اصول پر نہیں ہوتیں، اگرچہ دعویٰ یہی کیا جاتا ہے، بلکہ درحقیقت یہ "جنگ برائے مفاد" کے اصول پر ہوتی ہیں۔ ان جنگوں کے بطن سے امن کی نسل نہیں چلا کرتی، بلکہ ہر جنگ اپنے سے خطرناک تر جنگ کے لئے انڈے دے کے ختم ہوتی ہے۔ پس مفاد پرست اقوام کی ان لڑائیوں میں شرکت کرنا درحقیقت مستقبل کی تاریخِ جنگ کی تعمیر میں حصہ دار بننا ہے۔

کوریا کی جنگ اپنی فطرت کے لحاظ سے یکسر "فساد فی الارض" ہے۔ اس میں کوئی اِدھر سے شریک ہو یا اُدھر سے، شر ہی کی خدمت ہوگی، خیر کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ثانیاً یہ واضح رہے کہ یو۔ این۔ او بھی درحقیقت دو مفاد پرست دھڑوں کا ایک اکھاڑا ہے جو اتفاق سے اس وقت امریکی دھڑے کے قبضے کے نیچے ہے۔ یہ دھڑا بندیاں اپنی اغراض کے لئے ہیں، نہ کہ انسانی امن کے لئے، ورنہ اگر اس ادارے کو امن ہی عزیز ہوتا تو یہ فلسطین کا مسئلہ حل کرنے میں وہ بددیانتیاں نہ کرتی جن سے مسلسل فتنے پھوٹ رہے ہیں، یا افریقہ میں نسلی امتیاز کے فتنے کا سر کچلنے میں عجلت دکھاتی، یا کشمیر کا مسئلہ مخلصانہ طریق سے نپٹا کے اپنا بااصول ہونا ثابت کر چکی ہوتی۔ کوریا کے معاملے میں جو رفتارِ کار اس نے اختیار کی ہے کیوں نہ یہی رفتار دوسرے مواقع پر اختیار کی گئی؟ پس یو۔ این۔ او کے فیصلے وحی نہیں ہیں کہ ان میں راستی و عدل کے تقاضوں کو کاٹنے کے قول بحال رکھا جاتا ہو، اور جو ان سے انحراف کرے، فقد کفر!

ثالثاً، ہم جو کچھ ہیں، ہمیں اپنے آپ کو اتنا ہی کچھ سمجھنا چاہئے۔ ابھی ہمارا مقام صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو سنبھال کر ترقی کے راستے پر لے چلیں، ابھی ہم دنیا کے امن کے محافظ بننے کے لئے تیار نہیں ہو چکے ہیں۔ دنیا کے امن کے محافظوں کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں نہیں رہ سکتی۔

کوریا کی جنگ میں پاکستان کے تعاون کا اعلان کرتے ہوئے وزیر اعظم کو کچھ تو خیال کرنا چاہئے تھا کہ وہ اس قراردادِ مقاصد کے خود محرک اور مفسر تھے جس نے پاکستان کو حدود اللہ کا پابند بنا دیا ہے۔ اس قراردادِ مقاصد کے بعد پاکستان کے لئے جنگ کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ——— ایک جہاد "فی سبیل اللہ" دوسرے "جہاد فی سبیل الطاغوت"! اب وزیر اعظم فرمائیں کہ کوریا میں جہاد فی سبیل اللہ ہو رہا ہے یا فی سبیل الطاغوت؟

اگر یہ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے تو اس میں سب کچھ جھونک دینا عین عبادت ہے اور اگر یہ "فی سبیل الطاغوت" ہے تو اس میں کوئی حصہ داری بھی تمام تر معصیت ہے۔ اگر وزیر اعظم صاحب اس کے جہاد فی سبیل اللہ ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں تو پھر قربان جانا چاہئے اُن پر۔ آخر بڑے دین جیسے مدعیٔ وقت کے جھنڈے تلے، فرنگی اخلاق کے ساتھ شہنشاہی مقاصد کے لئے جو جنگ لڑی جا رہی ہو اس میں ایک اسلامی سلطنت نے حصہ نہ لیا تو آخر جہاد کا کونسا موقع آئے گا۔ فیصلہ اگر یہی ہو تو قوم کو چاہیے کہ چندہ جمع کرے، اور رضا کار بھیجنے کا انتظام کرے ——— جو فتح پائے وہ غازی، جو مر جائے وہ شہید!

کوریا کی جنگ تیسری جنگِ عظیم کو جنم دینے والی ماں ثابت ہو سکتی ہے اور اس جنگ میں عملی یا مالی یا اخلاقی امداد دینے کے بعد ہم

انسانیت کی ان ساری غارتوں ویرانیوں میں حصہ دار ہوں گے جو مستقبل میں پیش آنے والی ہیں۔ پس وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں بصد ادب یہ گذارش ہے کہ محض سیاسی نقطہ ہائے نگاہ کو چھوڑ کر وہ مسلمان ہونے اور ایک اسلامی حکومت کے وزیر اعظم ہونے کی حیثیت سے غور کریں کہ کوریا کی جنگ کے متعلق ان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

اس قسم کے موقعوں پر جو غلطیاں کی جا رہی ہیں وہ اس آئیڈیالوجی کا خون کئے دے رہی ہیں جس پر ہم اپنی ریاست کی بنیادیں استوار کرنے والے ہیں۔

تجاہل عارفانہ

کوریا کی جنگ کے سلسلے میں کوئٹہ میں وزیر اعظم سے سوال کیا گیا کہ ملک کی رائے عام کے مطالعہ کے بعد کیا وہ اپنے اعلان پر نظر ثانی فرمائیں گے؟ —— اس پر وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ رائے عام کی طرف سے اس فیصلے کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا گیا لہٰذا نظر ثانی کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

امر واقعہ کو جھٹلانے کی یہ جسارت اخلاقی حیثیت سے انتہائی افسوسناک ہے۔ سیاسی حیثیت سے یہ فرسودہ انگریزی پالیسی کی تقلید ہے کہ برطانوی حکومت ملکی مطالبات اور احتجاج سے بے نیازی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی اور ملک کو اگر کسی روش سے اختلاف ہوتا تھا تو اس اختلاف کے موجود ہونے کو تسلیم نہیں کیا کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رائے عام نے اپنے اظہار کے لئے آہستہ آہستہ ہنگامہ آرائی کے طریقے اختیار کئے۔ کیا اب ہمارے وزیر اعظم اور ان کے رفقا بھی یہی چاہتے ہیں کہ رائے عام کو وہ انگریزوں کی طرح نظر انداز کیا کریں اور پھر رائے عام ان پر اپنے اختلافات کو واضح کرنے کے لئے ہنگامہ آرائی کیا کرے؟ کیا رائے عام کا اختلاف آپ حضرات کو صرف اس صورت میں محسوس ہو سکتا ہے کہ جلوس نکلیں، ان میں اشتعال انگیز نعرے لگیں، جوتے اچھالے جائیں، جنازے نکالے جائیں اور کالی جھنڈیاں دکھائی جائیں؟ —— نہیں عوام کو اس پر مجبور نہ کیجئے، یہ نہ آپ کے لئے اچھا ہوگا، نہ قوم کے لئے اور نہ خود اسلام کے لئے!

جنگ کوریا میں حصہ لینے کا جو اعلان آپ نے کیا ہے اس کے خلاف قریب قریب پورے پریس نے صدائے احتجاج بلند کی ہے، اس کے خلاف ہر عامی تک نفرت کے جذبات لئے پھرتا ہے۔ کوئی دل نہیں جسے آپ نے اس فیصلے کے ذریعے جیتا ہو —— بجز چوہدری خلیق الزماں صاحب کے جنہوں نے اپنے خوشامدانہ سپاسنامۂ خیر مقدم میں آپ کے فیصلے پر اظہار مسرت کیا ہے۔

اگر آپ کے ذرائع معلومات میں کوئی کمزوری ہے تو اسے درست فرمائیے، ورنہ یقین جانئے کہ رائے عام کو نظر انداز کر کے جو فیصلہ آپ نے دیا ہے اس نے آپ کی مقبولیت کو بہت بڑا دھکا لگایا ہے، اور آئندہ فضا کا رنگ اور بھی زیادہ بدلتا چلا جائے گا۔

انڈو پاکستان جائنٹ ڈیفنس

چراغ راہ کے سابق افتتاحیئے میں ہم نے انڈیا اور پاکستان کے دفاع کے مشترک ہو جانے کے امکانات پر جو اشارہ کیا تھا، جنرل سلِم کے بیان نے اس پر مہر تصدیق کر دی ہے۔

بین الاقوامی سیاسیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو صاف محسوس ہو رہا ہے کہ موجودہ حالات میں امریکی بلاک کی طرف سے انڈیا اور پاکستان کے ڈیفنس کو ایک کرنے کی کوشش لازماً ہونی ہی ہے اور دوسری ان دونوں مملکتوں کی قیادتوں کا لحاظ

کرتے ہوئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ ایسی کوشش کی کامیابی کے امکانات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ یہ کوشش "عالم بالا" کی طرف سے چند ماہ قبل سے شروع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پہلی مرتبہ اس کا باقاعدہ ذکر کولمبو کانفرنس میں ہوا ہو۔

تاہم جب بھارت اور پاکستان کے درمیان تجارتی تعلقات کا نیا معاہدہ اچانک طور پر عمل میں آیا اور اس کے لئے آناً فاناً فضا سازگار ہوگئی تو جائنٹ ڈیفنس کی اسکیم کے امکانات سامنے آگئے۔ ان امکانات کو پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر نے اور زیادہ ابھار دیا اور اب جنرل سلم نے کراچی میں آکر بڑی جرأت کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے دفاع کو مشترک کرنے کی تجویز پیش کر دی ہے۔

غور طلب حقیقت یہ ہے کہ جنرل سلم کون ہوتا ہے جو ایک آزاد مملکت کے دارالحکومت میں آکر معاً ایک ایسی تجویز پیش کر دے جس کے لئے ملک کی رائے عام میں کوئی رجحان موجود نہ ہو، اور جس کو ملک کے ذمہ دار لوگ گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں؟ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ ہمارے اکابر سے اس معاملے میں پہلے کہا سنا جا چکا ہوگا۔ لیکن انکی طرف سے یہ مشکل تھا کہ قوم کو اس مسئلے میں براہِ راست کوئی خطاب کیا جاتا۔ یہ پہلا پہل کسی نہ کسی جنرل سلم کے ذریعے ہونا چاہئے تھا۔ اب اس موضوع کو میدان میں ڈال دیا گیا ہے اور اس پر بحث و تمحیص کے دروازے کھول دئیے گئے ہیں تاکہ قوم اس موضوع پر کچھ سننے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اس حکمتِ عملی کے تحت جب ذہنی فضا مناسب شکل اختیار کرلے گی تو جو بلی تھیلے کے اندر ہے: وہ پھدک کے باہر آجائے گی۔

پیشتر اس کے کہ بلی تھیلے سے باہر آئے، قوم کو سمجھ لینا چاہئے کہ جائنٹ ڈیفنس کی تجویز کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اختیار کرنے کے نتائج کیا ہوں گے؟

انڈیا اور پاکستان کے ڈیفنس کو ایک کرنے کی تجویز نہ پاکستان کے ضمیر سے ابھری ہے، نہ انڈیا کے ذہن کی کسی داخلی تحریک کا نتیجہ ہے۔ یہ تجویز امریکہ میں پیدا ہوئی، برطانیہ میں پروان چڑھی اور کامن ویلتھ کی خفیہ کانفرنسوں میں متعارف کرائی گئی، اور اب جنرل سلم کے ذریعے پاکستان اور ہندوستان کو برآمد کی جا رہی ہے۔ امریکہ و برطانیہ جانتے ہیں کہ تیسری جنگ روس اور ان کے درمیان بالکل معلق ہے اور اب کوریا کی جنگ کے چھڑ جانے کی وجہ سے وہ اور قریب ہوگئی ہے۔ لہٰذا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب پاکستان اور انڈیا کے درمیان جتنی وحدت ہوگی اتنا ہی زیادہ اچھی طرح ان دونوں کی مجموعی طاقت کو استعمال کیا جاسکے گا۔ پس وہ دونوں کو گھیر گھار کر اور چاروں طرف سے ہانک کر ——— بملاطفت بھی اور بہ تہدید بھی ——— مشترک دفاع کی منزل تک لانا چاہتے ہیں کہ بیل کی یہ جوڑی ایک ہی جوئے کے نیچے جُت ہو جائے تو گاڑی خوب چلے گی۔

دوستانہ تعلقات تو اور چیز ہیں اور ان کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن یہ مشترک دفاع کی اسکیم پاکستان کی سیاسی و معاشی آزادی کو کالعدم کرنے والی اور اسلامی نظام کے قیام کے امکانات پر پوری طرح پانی پھیر دینے والی ہے۔

مشترک دفاع میں جب آپ کی فوجی طاقت ایک کمان میں دے دی جائے تو اس کمان میں سو فیصدی مختار آپ نہیں ہوں گے بلکہ آپ کو اپنی فوج کے استعمال کرنے کے لئے بھی انڈیا کی رضامندی حاصل کرنی ہوگی۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ مشترک ہائی کمان میں دونوں کی طاقت برابر برابر رہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ امکان اس امر کا ہے کہ انڈیا فوقیت حاصل کرلے گا، کیونکہ فوجوں کی تعداد، اسلحہ کی مقدار، فوجی بجٹ میں حصہ داری، قطعہ ارضی (territory) کی وسعت، مالی، معاشی فوقیت، مغربی ڈپلومیسی میں خصوصی مہارت وغیرہ کے لحاظ سے انڈیا پاکستان کو کبھی اپنے برابر نہ ہونے دے گا۔

پھر بہت زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ مشترک دفاعی قوت کسی غیر ملکی کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں ہو ——— اور یہی صورت امریکہ و برطانیہ کے لئے بہترین ہے۔ اس کے امکانات بھی واضح ہیں کہ انڈیا کسی پاکستانی کے ہاتھ میں پوری فوجی قوت کو دینا پسند

کریگا اور پاکستان کسی انڈین پر اعتماد کرنے پر تیار نہ ہوگا' بدیں وجہ دو بلیوں کو انصاف کے لئے ایک بندر کی ضرورت ہوگی اور بندر اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار بیٹھا ہے۔ اب فرمایئے کہ اس صورت میں پاکستان کی آزادی کے معنی کیا رہ جاتے ہیں؟

علاوہ بریں دونوں ملکوں کے دفاع کے ایک ہونے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ دونوں کی خارجہ پالیسی بالکل ایک ہو۔ فوج چونکہ خارجی خطرات ہی کے سدباب کیلئے ہوتی ہے لہذا دفاع کے مسئلے کے ساتھ خارجہ پالیسی کا دامن بالکل بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح جس ملک سے انڈیا صلح کرے گا اس سے پاکستان کی جنگ نہیں ہوسکتی۔ جس سے انڈیا کی جنگ ہوگی اس سے پاکستان کو صلح کا اختیار نہیں ہوگا' جس جنگ میں شریک ہونگے دونوں ہونگے اور جس سے بائیکاٹ کریں دونوں کریں گے۔ کسی سے دوستانہ تعلقات ہوں گے تو دونوں کے ہوں گے اور نہ ہوں گے تو دونوں کے نہ ہوں گے۔ پھر دفاع کے ایک ہونے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ذرائع رسل و رسائل پر مشترکہ کنٹرول ہو سڑکیں' پل' ریلیں' سمندر' ہوائی جہاز' ڈاک' تار' ٹیلیفون وغیرہ کا انتظام دونوں کو ایک کرنا ہوگا۔

پھر دفاع کے مشترک ہونے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ دونوں ملکوں کے بجٹ سسٹم اور مالیات میں کامل وحدت نہ سہی۔ ہم آہنگی موجود ہو اور وہ دفاع' رسل و رسائل اور دوسری مدات کے لئے جو رقوم مخصوص کریں۔ وہ اُس پالیسی کے مطابق ہوں جو مشترک دفاع کے لئے طے کی جائے۔

پھر مشترک دفاع کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان علیحدگی اور جداگانگی اور غیریت کے جذبات نہ ہوں اس مقصد کے لئے تعلیم' ریڈیو' پریس وغیرہ کی پالیسی کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنا ناگزیر ہوگا۔

اگر آج ہم کو یہی صورت گوارا کرنی تھی تو کیا اس سے بہتر نہ تھا کہ کیبنٹ مشن کے پلان کو قبول کر لیا جاتا جس میں دفاع' رسل و رسائل اور خارجہ پالیسی کو ایک رکھ کر بقیہ امور میں کامل آزادی دی جارہی تھی اور مسلمانوں کو علاقہ بھی اس سے زائد ملتا تھا جتنا اب ملا ہے اُس وقت یہ پیشکش قبول کر لیتے ہیں وہ خون خرابہ بھی نہ ہوتا جو ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ آج اس تجویز کو قبول کرنا کئے کرائے پر پانی پھیرنا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے خود قائداعظم کو سخت انکار تھا۔ کیا اب قائداعظم کے جانشینوں کے لئے اسے قبول کرنے کی کچھ بھی وجہ جواز موجود ہے؟

کامل آزادی ہم نے اس لئے چاہی تھی ——— اگرچہ وہ نسبتہً بہت مہنگی پڑی ہے ——— کہ ہم اپنے اسلامی اصولوں پر ایک صالح نظام زندگی تعمیر کرسکیں۔ کیا اب اس نصب العین کو امریکہ و برطانیہ کی اغراض پر بھینٹ چڑھا سکتے ہیں؟

اگر نہیں تو اس کے خلاف آواز اٹھایئے اور اس سازش کو ناکام بنا دیجئے جو پردہ اسرار کے پیچھے منظم کی گئی ہے۔

ٹھنڈا گوشت

سعادت حسن منٹو ان ادیبوں میں پیش پیش میں جو ادب کو تمام اخلاقیات سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ آپ کی نگاہ میں آرٹ کا فرض یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کو ننگا کر کر کے پیش کرے اور گندگی اور تعفن کو زیادہ سے زیادہ حد تک اجاگر کرے۔ چنانچہ آپ کے قلم نے اس قسم کی بے شمار خدمات انجام دی ہیں۔ ازاں جملہ آپ کا ایک شاہ پارۂ فن "ٹھنڈا گوشت" کے نام سے مارکیٹ میں آچکا ہے۔

اس شاہ پارۂ فن پر حکومت کے احتساب کی مشین حرکت میں آئی اور مصنف اور پرنٹر پبلشر کے خلاف ایک غیر ترقی پسند

جج نے سزا کا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی گئی۔ یہ اپیل حال ہی میں منظور ہوئی ہے اور فاضل جج نے فیصلہ میں استدلال کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس افسانے کو فحش قرار دے کر سزا دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اس سے کئی گنا زیادہ فحش فلمیں ملک میں دن رات دکھائی جا رہی ہیں۔

ہم اس ریمارک کو اپنے ملک کے وزیر داخلہ حاجی شہاب الدین صاحب کی خدمت میں ہدیۃً پیش کرتے ہیں۔ فاضل جج کے فیصلے میں حاجی صاحب موصوف کے لئے جو طنز موجود ہے، کاش کہ وہ اسے قرار داد مقاصد کی روشنی میں سمجھ سکیں۔

ہماری رائے میں سعادت حسن منٹو کا اس وقت تک کوئی جرم نہیں، جب تک ہمارے اکابر پریس، ادب، آرٹ، سینما اور تعلیم کے متعلق اپنا فرض ادا کرنے میں کسی کوتاہ کاری کے مجرم ہیں۔

کچھ اپنے متعلق

چراغ راہ کو بروقت شائع کرنے میں چند ماہ سے برابر ہمیں ناکامی ہو رہی ہے۔ اس کے وجوہ کا بیان کرنا کچھ ضروری نہیں، البتہ معذرتاً اتنا عرض کرنا ہی پڑتا ہے کہ اس معاملے میں ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی حالات ایسے حائل ہو جاتے ہیں جن پر قابو پانا ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن ہم خود سوچتے ہیں کہ معذرتوں کی یہ نسل بھی آخر کب تک جاری رہے گی۔ فی الواقع ہم بے احساس نہیں ہیں، اور اب ان سطور میں اس عزم کا اظہار کرنا مطلوب ہے کہ انشاء اللہ اشاعت کو جلد از جلد بروقت کرنے کے لئے ہم پوری کوشش کریں گے۔

دوسرا مسئلہ مضامین کے تنوع کا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس معاملے میں بھی ہماری طرف سے ——— غیر اختیاری سہی کوتاہی ضرور ہو رہی ہے۔ اس کوتاہی کا اصل راز یہ ہے کہ اول تو اسلامی ادب کے تقاضوں کو سمجھ بوجھ کر لکھنے والوں کی تعداد ہمارے ہاں کتنی ہے، ابھی چند نوجوان ہیں جو اپنے آپ کو تیار کرنے میں منہمک ہیں، لیکن غنیمت تھا، اگر انہیں نوجوان رفقاء کی نگارشات ہمیں بہم پہنچتی رہتیں، لیکن غضب یہ ہوا کہ ہمارے ادبی رفقا میں سے قریب قریب ہر ایک نے پختہ نگاری کی سرحد میں پہلا قدم رکھتے ہی کسی نہ کسی ماہنامے یا اخبار کی ادارت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، بلکہ بعض کو بیک وقت دو دو جرائد میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ہمارا ہر جریدہ ایک ایک دو دو ادیبوں کے لئے مختص ہو جائے اور ادیب بھی کسی ایک جریدے کے لئے ریزرو ہو جائیں۔ خود راقم الحروف کے لئے اپنے مختلف جرائد کی قلمی معاونت کرنا نصیب میں نہیں رہا، اور ایسا ہی حال دوسروں کا ہے، یہ رفقا کی عنایت ہے کہ وہ اس پر بھی کبھی کبھار کچھ لکھ بھیجتے ہیں۔

ہمیں زیادہ تر مضامین نو مشق ساتھیوں کی طرف سے موصول ہوتے ہیں، جن کی حوصلہ افزائی کو ہم اپنا فرض سمجھنے کے باوجود ناپختہ تحریر کو چراغ راہ میں شائع کرنے سے معذور ہیں۔ پس قارئین اگر اس مجبورانہ صورت حالات کو سامنے رکھیں تو وہ تنوع کے تقاضوں کو پورا نہ ہوتے دیکھ کر ہمیں معافی کا مستحق سمجھیں۔ جہاں تک ایک آدمی کے قلم سے تنوع کی توقعات قائم کی جا سکتی ہیں ان کے پورا کرنے میں ہم نے کبھی کوئی کوتاہی نہیں کی، لیکن ایک آدمی کے کئی آدمی اور ایک دماغ کے کئی دماغ نہیں بنائے جا سکتے۔

ادیبوں کی محدود تعداد اور پھر ان میں زیادہ تعداد میں جرائد نکالنے کے کام زن ہوتی ہے تو ابتداً گو جوش کار اس غلط روش کے نتائج کو محسوس نہ ہونے دیتا، لیکن آگے چل کر اگر یہ ہو جاتا ہے کہ بعض جرائد تو دم توڑ دیں اور جو زندہ رہیں وہ بھی نیم جان ہوں یا یوں کہئے کہ "بقائے انفع" کے اصول پر زندہ رہ جائیں وہ بھی ادبی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

چراغ راہ کی ادارت اور اس کی دلچسپیوں میں گذشتہ چند شماروں سے جو کچھ کمی محسوس کی گئی ہے، اس کی تلافی کرنے کے لئے ہم برابر فکر کرتے

ہیں، اور اسی سلسلے میں "اسلامی معاشیات" نمبر شائع کرنے کا ٹھوس اقدام کیا جارہا ہے۔ علاوہ بریں آئندہ شماروں سے ہم نظام اسلامی کے متعلق کچھ تعمیری بحثیں چھیڑنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں یہ بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ اسلامی مکتب ادب کے تحت جو مواد شائع ہو رہا ہے اس پر ایک خاص نہج سے تنقید کرنے کا سلسلہ شروع کیا جائے اور آہستہ آہستہ اپنے اصولِ تنقید کو اجاگر کر دیا جائے۔

ترقی کا قدم آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ چراغ راہ کے قارئین، اس کے ایجنٹ اور اس کے مضمون نگار سب اپنی اپنی حدود میں ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون فرمائیں۔ ہم سب کی مجموعی مساعی ہی اپنی نوعیت کے اس واحد ماہنامے کو نشوونما دے سکتی ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کی کوتاہی اس کے زوال کا موجب ہو سکتی ہے۔

معاشیات نمبر کا خاکہ مضامین

معاشیات نمبر کا خاکہ مضامین شائع ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ہم قارئین اور مضمون نگاروں کے مشوروں کے منتظر ہیں۔ اگر مفید مشورے، تجاویز، مضامین کے لئے مزید موضوعات، سوالات اور تصریحات وغیرہ موصول ہوں تو ہم ایک خاص عنوان قائم کر کے انہیں شائع کرتے رہیں گے اور ان سے استفادہ بھی کریں گے۔

خاکہ مضامین جو پیش کیا جا چکا ہے، اس میں "توضیحی مضامین" کے زیر عنوان ایک مقالے کا خاکہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ اسے یہاں درج کیا جاتا ہے:—

اسلامی نظام معیشت میں منصوبہ بندی۔

ا۔ منصوبہ بندی کا اشتراکی نظریہ۔

ب۔ روس میں منصوبہ بندی کا عملی تجربہ۔

۱۔ کامل منصوبہ بندی کی وسعتیں اور قومی ملکیت کے اصول سے اس کی وابستگی۔

۲۔ پیدائش دولت پر اس کا اثر۔

۳۔ اس کے نفسیاتی، سیاسی اور معاشی مفاسد۔

ج۔ منصوبہ بندی سرمایہ دارانہ نظام میں۔

۱۔ برطانیہ، امریکہ وغیرہ کے نظام معاشی کا مطالعہ۔

۲۔ منصوبہ بندی اور اجارہ داری۔

۳۔ تنقید و تبصرہ (مسلم زاویۂ نگاہ سے)

د۔ منصوبہ بندی اسلامی نظام میں۔

۱۔ اس کی جائز حدود،

ہم توقع کرتے ہیں کہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر سوچنے والے حضرات اپنی قابلیتوں اور اپنے اوقات میں سے ایک حصہ چراغ راہ کے اس خاص نمبر کے لئے "فارغ" کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔

نیا معشوق

عاصی ضیائی رام پوری

سنو قدامت نشین سفیہو، کہ چال جن کی لگی بندھی ہے
مری نوا در پسند فطرت نے اک نئی راہ ڈھونڈھ لی ہے

مری حدودِ عمل کی وسعت میں دین و دنیا سمٹ چکے ہیں
مرے عزائم محال باتوں کو کرکے ممکن دکھا چکے ہیں

میں ذہنِ ملّت کا راز داں ہوں
میں فکرِ قومی کا ترجماں ہوں

مجھے زمانے کی روح جانو: زمیں پہ حاوی، فضا پہ طاری
مجھے بشر کی انا سمجھ لو: رگوں میں جاری، دلوں میں ساری

میں رہنمائے سخن طرازی، میں پاسبانِ بدی و احسان
میں ناقدِ پستی و فرازی، میں حافظِ اعتقاد و ایمان

میں وہ مُقنّن ہوں جس نے قدریں رواج کو دی ہیں نیک و بد کی
میں وہ مُعلّم ہوں کہ فراہم کسوٹی جس نے قبول و رد کی

میں ہوں وہ شاعر، معاشرے کو دیا مذاقِ جمال جس نے
میں ہوں وہ فائد، دلوں میں ہر کالی آرزوئے کمال جس نے

مرے اصول و فروع دلکش ہیں، میرے معیار دل نشیں ہیں
اور اس کا بس ایک سبب ہے یعنی وہ جامد و مستقل نہیں ہیں!

(۲)

نیا زمانہ، نئے مسائل، نئی منازل، نئے مراحل
بشر کے جذبے سہی پرانے، مجھے نہ پیش آئی کوئی مشکل

تصوراتِ جمیل و تازہ مری اپج نے سدا بنائے
انہی میں الجھا کے میں نے انساں کو اپنی عظمت کے گیت گائے

کبھی خداؤں کے ٹھوس پیکر،
کبھی تناسخ کے وہمی چکر،

کہیں پہ شاہوں کی حاکمیت　　کہیں پہ مزدور آمریت
حسب نسب کی کبھی حمیت　　کبھی کوئی اور جاہلیت

ہزاروں خانوں میں نوعِ انساں کو منقسم میں نے کر دیا ہے
اور اپنی ہستی کے پہلوؤں سے بھران خلاؤں کو بھر دیا ہے

(۳)

رہا ہے ہاوشِ بخیزا ابھی وہ طلسمِ تخیل شاعری کا
سُلایا صدیوں تمہیں سبق دے کے جس نے قسمت کی قاہری کا

وہ، پُرسکوں وادیوں میں جن کی، بنائیں تم نے فرار گاہیں
حقائقِ زندگی سے بچ بچ کے تم نے لی ہیں جہاں پناہیں

وہ محفلیں عشق و عاشقی کی،　　بہار و گلشن کے وہ مناظر
وہ، شوخیاں ناز و دلبری کی،　　جمال و الفت کے وہ مظاہر

وصال و ہجراں کے وہ فسانے؛　　کبھی توجہ، کبھی تغافل
گداز نالے، حسیں ترانے؛　　وہ شمع و کرمک وہ بلبل و گل

خصوصاً "اُس" "شوخ" کا سراپا، کہ تھا زمانے کا اک عجوبا
ہزاروں پیوند جوڑ کر جس کو تم نے شرفِ وجود بخشا

وہ نازنینی، وہ سحر گیری، وہ دلربائی، وہ کج کلاہی
عدو نوازی، جفا شعاری، ستم خرامی، غضب نگاہی
وہ سانپ کاکُل، کمان ابرو، کٹار پلکیں، خدنگ نظریں!
وہ سرو قامت، ادا قیامت، تبسم برق وش کی لہریں
نہیں ہے تفصیل کی ضرورت، تم اس سے واقف ہو مدتوں کے
یہ بات الگ ہے کہ آج منکر ہوئے ہو اس کی "لطافتوں" کے

(۴)

نکل چکے ہو اب اس فسوں سے، مگر مجھے اس کا غم نہیں ہے
مرا نیا تحفۂ طرفگی میں کچھ اس سے بہتر ہے، کم نہیں ہے!
یہ دیکھو، پہچانتے ہو اس کو؟ یہی وہ معشوقِ خوب رُو ہے
کہ جس کا سکّہ ہر ایک دل پر بٹھانے کی آرزو ہے

سیاست و دیں کا یہ مرکّب ہے شاعری میں نیا اضافہ
کیا ہے تیار میں نے صاحب یہ بھانپ کر قوم کا قیافہ
نئے ہیولائے آب و گل میں الوکھی اک رُوحِ تُند خُو ہے
"سفید جمہوریت" کے دل میں "سیاستِ سُرخ" کا لہو ہے
کمندِ نفسانیت کی زلفیں تو خود پسندی کی تیغ ابرو
نگہ میں محسن کُشی کی لہریں مژہ میں معصومیت کا جادو
"فرازیٔ صنفیات" چسپاں بڑے سے اک "مرکسی شکم" پر
"فرنگ مرعوب" ذہنیت سے بپا قیامت قدم قدم پر
عصائے "فسطائیت" کا لے کر کھڑا ہے، اِس دھج سے یہ سہارا
کہو پسند آیا؟ کتنا دلکش ہے یہ بت خوب رُو تمہارا!
اور اس پہ طُرّہ کہ میں نے اِس بُت کو نام "اسلام" کا دیا ہے
یہ ہے مرا شاہکار جس پہ میں ناز جتنا کروں بجا ہے!

مارکسیّت کا نشوو ارتقاء

انقلاب سنہ ۱۹۱۸ء

جیلانی: بی۔ اے

انقلاب سنہ ۱۸۴۸ء کا حال سننے سے پہلے ذرا برسلز کا حال سن لیجئے۔ یہ شہر بلجیم کا دارالخلافہ تھا اور صنعتی کار خانوں کے لئے مشہور۔ جب جرمنی کی حکومت کے ایماء پر فرانس کی حکومت نے مارکس کو پیرس سے نکل جانے کا حکم دیا تو مارکس نے سیدھا برسلز کا رخ کیا۔ یہاں پر مختلف الخیال اشتراکی پہلے ہی سے جمع ہو رہے تھے۔ مارکس اور انجلز کے آنے سے محفل اور گرم ہوگئی۔ یہ یاد رکھیئے کہ یہ واقعہ انقلاب سنہ ۱۸۴۸ء سے کچھ پہلے کا تھا۔ چونکہ یورپ مجموعی طور پر خلفشار اور بد امنیوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اس لئے ہر خیال کے ملک بدر انقلابی آنے والے انقلاب سے اپنی امیدیں وابستہ کئے برسلز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ شہر انکی جائے گرد آوری بنا ہوا تھا۔ یہاں پر جوانسال اشتراکی بھی تھے۔ باکونن جیسے جنونی فراجی (انارکسٹ) بھی تھے اور میزینی جیسے قوم پرست بھی غرض برسلز میں ہر خیال کے انقلابیوں کا جمگھٹا سا لگ گیا تھا۔ اگرچہ یورپ بحیثیت مجموعی قومیت کی جنگ کے لئے تیار ہو رہا تھا تاہم جہاں قوم پرست اس انقلاب کے انتظار میں بیٹھے تھے وہاں اشتراکی بھی اس سے فائدے کی امید لگائے ہوئے تھے۔ قہوہ خانوں میں قہوے اڑتے اور گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ سب نے مل کر سوچا کچھ کرنا چاہیئے۔ مارکس اور انجلز نے ایک سوسائٹی بنانے کی تجویز کی جس کے ذریعے سے مزدوروں میں طبقاتی احساس پیدا کیا جائے۔ اس سوسائٹی کا اجتماع ہفتہ میں دو بار یعنی بُدھ اور سنیچر کو ہوا کرتا تھا۔ اس اجتماع میں مباحثے تقریریں اور ہفتہ وار رپورٹیں پیش کی جاتیں۔ اسی سوسائٹی میں مارکس نے اپنا ایک مقالہ "ویج لیبر اینڈ کیپٹل" پڑھ کر سنایا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کے ذہن میں اپنے نظام فکر کا ہیولیٰ اسی وقت سے موجود تھا۔ اس میں اس نے مزدور کی لوٹ کھسوٹ اور قدر زائد کا مختصر سا خاکہ پیش کیا تھا۔

یہاں جن آدمیوں سے مل کر مارکس کے فکر کو جِلا ہوئی ان میں ایک روسی فراجی باکونن بھی تھا۔ اگر بے محل نہ ہو تو باکونن کے متعلق بھی کچھ معلومات بہم پہنچا دیجئے تاکہ آپ پر روشن ہو جائے کہ کمیونزم کا یہ پودا کس نوع کا تھا اور برسلز کی اس سوسائٹی کا فکر کتنے کی اس سوسائٹی کے فکر کچھ بھی لگا کھا سکتا ہے جس کے ارکان ابوبکر و عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) جیسے لوگ تھے۔

باکونن صاحب روس کے رہنے والے تھے۔ اور ۱۸۱۴ء ان کا سن ولادت ہے۔ جب مسیں بھوٹیں تو فوج میں بھرتی ہوگئے۔ مگر پولینڈ میں روس کا رویہ استبداد دیکھ کر ملازمت سے دستکش ہوگئے۔ چونکہ قدرت کی طرف سے ذہن فکر رسا پایا تھا۔ اس لئے مطالعہ شروع کردیا۔ ۱۸۴۷ء میں پیرس میں پرودان سے ملاقات ہوئی تو ان کی اشتراکیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے انہیں احتجاج کرنا سکھایا ۱۸۴۹ء میں جرمنی میں بغاوت کی جو چنگاری بھڑکی تو وہ انہیں کی لگائی ہوئی تھی۔ اس پر پکڑے گئے اور سزائے موت پائی خوش قسمتی سے اپیل پر ان کی سزائے موت چند سال کی قید میں بدل گئی۔ ۱۸۵۵ء میں انہیں روس بھجوا دیا گیا۔ روس والوں نے انہیں سائبیریا بھیج دیا۔ ۱۸۶۰ء میں وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ اور سوئیٹزرلینڈ میں اقامت گزین ہوگئے۔ یہاں پھر انقلابی سرگرمیوں کو ہوا دینے لگے کہ قاصد اجل پیغام لے کر آ پہنچا

سن وفات ۱۸۷۶ء۔

باکونن زاہد کا او تار تھا۔ اس نے اپنے خیالات کا اظہار ایک چھوٹے سے مضمون میں کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "خدا اور ریاست" باکونن ہر قسم کے مذہب اور خدا کو رد کرتا ہے۔ انسان کو صرف قوانین فطرت کی پیروی کرنی چاہیئے۔ وہ کہتا ہے "انسانی آزادی صرف قوانین فطرت کی پیروی

میں مضمر ہے۔ انسان کو قوانین فطرت کی پیروی اس لئے نہیں کرنی چاہئے کہ وہ کسی خدا یا انسان کے ذریعے سے معلوم ہوتے ہیں یا مجموعی و انفرادی ارادے سے اس پر ٹھونسے گئے ہیں بلکہ ان کی پیروی صرف اس لئے کرنی چاہیئے کہ انسان نے انہیں دریافت کیا ہے۔"

یہ تھا باکونن کے فلسفے کا نچوڑ۔

مارکس اور باکونن کی دوستی زیادہ دیر تک نہ نبھ سکی۔ مارکس پرلے درجے کا خودسر اور خود رائے تھا۔ اور اس معاملے میں باکونن بھی کم نہ تھا۔ بقول باکونن "اس نے مجھ کو جذباتی عینیت پرست کا خطاب دیا۔ وہ بھی صحیح تھا۔ اور میں نے اس کو وحشت پسند، غیر معتمد اور شیخی خورا کہا۔ اور میں بھی صحیح تھا۔"

ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ وہاں تو کئی تلواریں تھیں۔ آخر کوئی بھی نہ سما سکی۔ اور میان سونی کی سونی پڑی رہی۔ یہ سوسائٹی آہستہ آہستہ بے رونق ہوتی گئی۔ ادھر انقلاب دندناتا ہوا آپہنچا۔

یورپ کے باقی سب انقلاب اپنی اصل مشہور انقلاب فرانس ہی میں رکھتے ہیں اور یہ تعجب کی بات ہے کہ یورپ کا ہر انقلاب فرانس ہی کی سرزمین سے اٹھا۔ گویا کہ وہ انقلابوں کی جنم بھومی بن چکا ہے۔ شاید یہ فرانسیسی قوم کا خاصہ ہے کہ وہ کبھی ایک اعتقاد پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کا ثبوت ان کی آج کی سیاست سے بھی مل سکتا ہے۔ دنیا کی دوسری وزارتوں کی طرح وہ آج تک کبھی کوئی مستحکم وزارت ہی نہیں بنا سکے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء کا یہ انقلاب بھی فرانس ہی کی سرزمین سے اٹھا۔

اس انقلاب کی وجہ سمجھنے کے لئے ہمیں ایک بار پھر پچھلے بڑے انقلاب فرانس تک کے واقعات کو سامنے رکھنا ہوگا۔ عظیم انقلاب فرانس کی تمام خصوصیات جذبہ انتقام، درندگی اور ہوس سمٹ کر نپولین کی ذات میں جمع ہو گئیں۔ وہ دنیا جس کی نگاہیں انقلاب کے آزاد افکار کی دلفریبی پر جمی ہوئی تھیں وہ آزادی کی تلخیوں سے ہنوز ناآشنا تھے۔ لیکن جلد ہی نپولین کی فوجوں نے لذت آزادئ افکار سے انہیں شناسا کر دیا۔ اب سارا یورپ اس سے پناہ مانگ رہا تھا۔ اور وہ جو اس کے استقبال میں پیش پیش تھے اب وہی اس کے قلع قمع میں مقدم تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یورپ کی تمام حکومتیں اور بادشاہ نپولین کو شکست نہ دے سکتے تھے اگر خود عوام اس کے دست جابر کی سخت گیری محسوس نہ کرتے۔ انہوں نے پہلے پہل آزادی افکار کا مظہر سمجھ کر ہی اسے خوش آمدید کہا۔ لیکن جب اس نے اپنے آپ کو خالص فرانسیسی ظاہر کرنا شروع کیا تو ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

جونہی فرانس کا وہ پستہ قد سپاہی قید ہوا یورپ نے شکر کا سانس لیا۔ اب انگلستان کے بچے چین کی نیند سو سکیں گے۔ کیونکہ وہ خواب رہا ہوا سینٹ ہلینا کے جزیرے میں مقید اپنی گذشتہ زندگی کی غلط کاریوں پر کف افسوس مل رہا تھا۔ اس خوشی میں شہر چراغاں کئے گئے۔ کاک ٹیل پارٹیاں اڑیں۔ اور نئے نئے رقص ایجاد ہوئے۔ یورپ کو کسی مستحکم نیو پر کھڑا کرنے کے لئے ویآنا میں تمام حکومتوں کے نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا جس میں "لمبی پتلون اور چھوٹی پتلون" کا مزیدار مباحثہ بھی ہوا۔ فرانس کے بادشاہ گھٹنوں تک کی برجس پہنا کرتے تھے۔ لیکن جیکوبن پارٹی جو انقلاب فرانس کے اصلی محرک تھے لمبی پتلونیں پہنا کرتے تھے۔ برسر اقتدار آتے ہی فرانس کے بادشاہ نے لمبی پتلون کا پہننا خلاف قانون قرار دے دیا۔ جرمنی کے بادشاہ سلامت نے اسی اجتماع کے دوران میں اپنے لئے ایک برجس بھی سلوائی تاکہ سب پر ثابت ہو جائے کہ حضور انقلاب کے برجیس کو نگاہ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ایک اور جرمن نواب نے حکم جاری کیا کہ وہ سب ٹیکس جو اس کی رعایا نے فرانسیسی غاصب کو دیئے تھے دوبارہ ادا کئے جائیں۔ کیونکہ ٹیکس وصول کرنے کا اصل حقدار وہی تھا۔

لیکن عوام جو انقلاب اور آزادی سے چور چور ہو چکے تھے۔ اب تھوڑا سا چین اور سکون چاہتے تھے تاکہ آزادی عمل کے چرکوں کو مندمل ہونے کا موقع ملے۔

ویآنا کا یہ مشہور اجتماع مقدس عہد نامے پر منتج ہوا۔ اس عہد نامے کے ساتھ تقدیس کا پیوند اس لئے لگایا گیا کہ اس کے اندر جن مکاریوں اور فریب کاریوں کے منصوبے باندھے گئے تھے وہ سب خدا کے نام پر باندھے گئے تھے۔ یہ عہد نامہ ان بے لگام انقلابی میلانات کو کچلنے کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔ جن کی وجہ سے یورپ کا پورا ملوکی نظام متزلزل ہو گیا تھا۔ ایک تاریخ دان کے الفاظ میں وہ اجتماع نہ تھا شاہان یورپ کی ٹریڈ یونین

تھی۔ آزادی اور اخوت کا یہ صحیح ردِّ عمل تھا۔ اس اجتماع میں یورپ کے سارے نقشے کو سامنے رکھ کر کانٹ چھانٹ کی گئی۔ کچھ حصے برطانیہ نے لے لئے کچھ جرمنی کی تحویل میں دے دیئے گئے اور باقی ماندہ روس اور اٹلی کے حوالے کر دیئے۔

نپولین کی گرفتاری سے ۱۸۴۸ء تک کا عہد یورپ کے سیاست دانوں اور مدبّروں کی ان مساعی کا عہد ہے جو اُن قوتوں کو قابو میں لانے کیلئے کی گئیں جنہوں نے انقلاب اور نپولین کو جنم دیا۔ اب فرانس کے ہر گلی کوچے میں سپاہی ہی سپاہی نظر آتے تھے۔ وہ پارکوں میں بھی پائے جاتے تھے اور گھروں کی کھڑکیوں کے قریب بھی۔ وہ سیاسی شخصیتوں کی قیام گاہوں کے گرد بھی دکھائی دیتے تھے اور طالب علموں کے تعاقب میں بھی۔ غرانسیسی افکار کے متعلق ہر کتاب نذرِ آتش کر دی گئی۔ اور وہ پادری جنہیں انقلاب نے کلیسا بدر کر دیا تھا پھر جوق در جوق نمودار ہونے لگے۔ انہوں نے کلیساؤں کی دہلیز آنسوؤں سے تر کر دیں جن کے اندر انقلابی سیفٹی کمیٹی نے اکتوبر ۱۷۹۳ء سے خدا کی عبادت ممنوع قرار دے دی تھی۔ اب وہ پھر آ گئے تھے حکومتِ وقت کی اطاعت اور جابر فرمانرواسے محبت کا درس دینے۔ جرمنی میں شاعروں اور مصنفوں کی خانہ تلاشیاں ہو رہی تھیں، خطوط پڑھے جا رہے تھے اور ہر ذہین شخص کو مقررہ میعاد کے بعد تھانے میں حاضری کا حکم دیا جا رہا تھا اور یہی حال روس میں تھا۔

لیکن کیا یہ سختیاں انسان کو سوچنے سے روک سکتی ہیں؟ ہونٹوں پر تو پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں لیکن ذہنوں پر پہرے نہیں بٹھائے جا سکتے۔ محکوم قوموں کا احساسِ قومیت اس سے اور تیز ہوا۔ ابھی چند برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ دبی ہوئی چنگاری بھڑکی اور اس کے ساتھ ہی سارے یورپ میں بغاوت کی آگ پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا فرانس کے فتیلے کو آگ دکھانے کی دیر تھی کہ تمام یورپ کے ڈائنامیٹ بھک سے اڑ گئے۔ جن جن ملکوں میں برطانیہ جرمنی اور روس کے نگران دستے موجود تھے انہیں وہیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ اور ہر ملک کا نظام سیاسی باغیوں یعنی نئی قوتوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔

یہ انقلاب اصلاً قومی اور ملکی نوعیت کا تھا۔ ہر ملک کے جذبات غیر ملکی قابضوں کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔ لیکن اس ہلڑ سے اشتراکی بھی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ چونکہ ایسا انقلاب متوقع تھا اس لئے ہر خیال کے اشتراکی اپنی اپنی جگہ زمین ہموار کر رہے تھے اور عوام کی رائے کا رخ اپنی طرف موڑ رہے تھے تاکہ جبھی نیا نظام بنے وہ فوراً اس پر قبضہ جما لیں۔ چنانچہ فرانس میں موئی بلانک کامیاب بھی ہو گیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کامیابی محض نمائشی تھی۔ عوام یا مزدور اس اشتراکیت کو آج تک قبول نہیں کر سکا۔ اس کو اگر اپنایا ہے تو مشرق ہی نے اپنایا ہے۔ شاید اس لئے کہ مشرق کی آنکھیں یورپ کی طرح ہری چکاچوند سے خیرہ ہو چکی تھیں اور خود یورپ والے اس کی حقیقت سے واقف تھے۔ موئی بلانک کے اشتراکی طرز پر بنائے ہوئے اسٹور بری طرح ناکام رہے۔ اشتراکیوں کی مجنونانہ حرکات اس پر مستزاد۔ ایک اشتراکی فدائی نے غیر ملکی بے کار مزدوروں کی فوج تیار کر کے جرمنی پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کسی نے پوچھا۔ صاحب اس سے کیا مطلب؟ اس نے جواب دیا۔ میں جرمنی کو آزادی دلانے چلا ہوں۔ بدقسمتی سے وہ رستے راستے ہی میں مرکھپ گئے۔

مارکس اس وقت برسلز میں تھا جب انقلاب ۱۸۴۸ء بپا ہوا۔ نئی حکومت جو اشتراکی اصولوں پر مبنی تھی۔ اس نے اس کو واپس بلایا۔ "جمہوریۂ فرانس کی سرزمین محبانِ حریت کے لئے جائے عافیت ہے۔ استبداد نے تمہیں ملک بدر کیا۔ فرانس اپنے دروازے تمہارے لئے کھولتا ہے۔" چنانچہ وہ بسرعت تمام فرانس پہنچا تاکہ اس رو کو صحیح رخ پر موڑنے میں مدد دے۔ لیکن وہ یہاں ناکام رہا۔ کسی نے اس کی بات نہیں سنی۔ بددل ہو کر اس نے ادر انجلز نے رائن لینڈ (جرمنی) کا رخ کیا۔ یہ علاقہ کافی زرخیز تھا اور بڑے پیمانے کی صنعتوں اور امیر کبیر لوگوں کیلئے مشہور تھا۔ مارکس کو امید تھی کہ یہ علاقہ اس کا مرزبوم ہے اور یہاں کے لوگ اس کی رہنمائی کو بسر و چشم قبول کریں گے۔ اس خیال سے اس نے ایک روزنامہ "نیو رائن گزٹ" بھی جاری کر دیا۔ اس کے لئے اس کو بڑے بڑے اچھے لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ اس اخبار کا مقصد منشور کے نظریات کو عملی سیاست میں رو بعمل کرنا تھا۔ لیکن افسوس کہ کمیونسٹ لیگ جماعتی حیثیت سے روز بروز پستی کی طرف گر رہی تھی۔ کمیونسٹ اپنے اصولوں پر قائم رہنے کی بجائے قومی جذبات میں بہے جا رہے تھے۔ ولہلم ولف کی رپورٹ کے مطابق "کولون (جرمنی) کی جماعت مٹھی بھر رہ گئی ہے۔ برلن کی جماعت میں صرف تیس ارکان رہ

گئے ہیں اور وہ بھی باہم دگر گھتے ہوئے" برسوں میں سرے سے کوئی نظام ہی نہیں"

اس ناموافق حالات میں مارکس اور انجلز نے اپنا کام شروع کیا۔ ایک طرف اخباری کام کا ہجوم تھا اور دوسری طرف مزدوروں کی عملی تنظیم اور عوام کے اندر کمیونزم کے اصولوں کی اشاعت۔ صرف مارکس سا عظیم دماغ ہی اسے نپٹا سکتا تھا۔ انہوں نے ہفتہ وار جلسے بھی کرنے شروع کر دیئے۔ جس میں برسراقتدار حکومت پر خوب برسا جاتا۔ اس پر حکومت چوکنی ہو گئی۔ اس نے پکڑ دھکڑ شروع کر دی۔ ایک حادثہ میں ایک اشتراکی رابرٹ بلوم کے گولی بھی لگ گئی۔ اس پر اشتراکیوں نے حکومت کا لگان رکوانے کی کوشش کی۔ ایک تقریر میں مارکس نے حکومت کو مسلح مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اس پر مارکس گرفتار ہو گیا۔ لیکن اس نے اپنی مدافعت اس طرز سے کی کہ جج کو رہا کئے بغیر چارہ نہ رہا۔ لیکن اس کے اخبار کے درشت اور بےباک رویہ نے بالآخر اسے ملک سے نکلوا کے چھوڑا۔

ادھر اخبار بند ہوا۔ ادھر اندرونی کشمکش سے کمیونسٹ لیگ نے بھی دم توڑ دیا۔

اخبار کا یہ عہد یعنی ۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء اشتراکی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مارکس یہاں پر ایک پختہ کار مفکر کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ جو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے صحیح راہ کا تعین کر رہا ہے۔ یہ عہد تعین مسائل کا عہد ہے۔ اس زمانے کی تحریریں شگفتہ، صاف اور غیر مبہم تھیں اور یہیں پر ہمیں مارکسی خدعات پوری وضاحت سے ملتے ہیں۔ بالشویکی انقلاب اسی عہد کی تحریروں کی مدد سے برپا کیا گیا تھا۔ اس عہد کی تحریریں خاص طور پر تین رجحانات کو واضح کرتی ہیں۔

۱۔ بورژوا کو ہر ممکن طریقے سے نہتا کرنا۔

۲۔ انقلاب کی دہشت پھیلانا۔

۳۔ ایک ایسی انقلابی فوج تیار کرنا جو خوف و ہراس اور دہشت پھیلا سکے [illegible] سے زمین کا چہرہ سرخ کر دینے میں مشتاق ہو۔

جرمنی میں مارکس کی اتنی مساعی کے باوجود عوام نے مارکس کا دست [illegible] اور [illegible] بعد میں راڈبرٹس کی ہدایت قبول کی۔ انقلاب کے وقت جب جرمنی میں نئی حکومت بنی تو راڈبرٹس بھی اس کا رکن منتخب ہوا۔ بعض مورخین [illegible] سائنٹیفک سوشلزم کی تعمیر میں راڈبرٹس مارکس سے مقدم ہے اسکی معاشی تلقینات محنت پر مبنی ہیں یہ کہ محنت ہی سب سرمائے کا منبع ہے۔ اس کے [illegible] وہ حصہ ہے جس میں وہ بتاتا ہے کہ سرمایہ اور محنت کا قبضہ کس طرح ایک سرمایہ دار اور زمیندار کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ محنت [illegible] اس کے نظریات کا ایک حصہ معاشری ارتقاء سے متعلق ہے۔ وہ نوع انسان کے معاشی ارتقاء کو تین واضح ادوار میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا دور وہ عہد جاہلیت ہے جس میں ملکیت محض ایک دستور تھی۔ پھر وہ عہد آتا ہے جس میں زمین اور سرمایہ ذاتی تصرف میں آگئے۔ اور ان سب کے آخیر میں ایک اور زمانہ آنے والا ہے۔ جب ملکیت کا انحصار کام اور خدمت پر ہوگا۔ اور سرمایہ اور زمین قبضۂ قوم میں ہوں گے۔ مگر افسوس اس جنت نشان عہد کے آنے میں ابھی پانچ صدیاں لگیں گی۔

راڈبرٹس طبعاً سکون پسند اور کم گو تھا۔ اس لئے اس کا فکر انقلاب کے کانٹوں میں الجھنے سے بچتا ہے۔ اس کی تحریر بھی ایسی زوردار نہ تھی۔ اسکے مقابلہ میں مارکس کا اسلوب عام فہم اور دلنشین ہوتے ہوئے سیلاب کی مانند تھا۔ پھر جو جنت پانچ صدیوں کے بعد ملنے والی ہے اس کے لئے آج ہی بے چین ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

چودہ روز کے بعد وہ حکومت بھی ٹوٹ گئی جس میں راڈبرٹس شریک ہوا تھا۔

جرمنی سے پروانہ فرار لینے کے بعد مارکس نے پھر فرانس کا رخ کیا۔ مگر افسوس کہ یہاں حالات بالکل بدل چکے تھے۔ لوئی بلانک کی حکومت ٹوٹ چکی تھی۔ اور اس کی جگہ وہ پارٹی برسراقتدار تھی جو نپولین کے بھتیجے کو واپس لانا چاہتی تھی۔ خود لوئی بلانک بھی انگلستان میں پناہ گیر تھا۔ مارکس کو بھی قیام کی اجازت نہ ملی اور اس نے بھی لندن کی راہ لی۔ غیر جانبدارانہ سرد مہری انگریزی قوم کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ملک بدر سیاسی شخصیتیں انگلستان

ہی میں جائے پناہ ڈھونڈھتی ہیں۔ لینن بھی بھاگ کر یہیں آیا تھا۔ اور عہد ماضی میں تو نکلے ہوئے لوگوں کا یہی آخری ٹھکانا تھا۔ خفتظ

کوریا

نعیم صدیقی

سپید و سُرخ شیاطینِ انس کے صدقے　　زمیں پہ جنگ کی دوزخ وہ پھر دھک اُٹھی
فساد کی جو سرنگیں بچھی ہوئی تھیں یہاں　　انہیں میں ایک کو موقع ملا، بھڑک اُٹھی

جو بیج بوئے تھے اشرارِ مقتدر نے یہاں　　دو چار سال میں ہی اب وہ پھوٹ نکلے ہیں
جنہیں ریا کے قفس میں کیا گیا تھا اسیر　　پلید جذبے وہ آخر کو چھوٹ نکلے ہیں

زبانِ فتنہ پہ ہوں لاکھ امن کے نغمے　　کچھ اِن سے ٹھوس نتائج نکل بھی سکتے ہیں؟
دھن جو روز نگلتے رہے ہوں انگار سے　　کسی طلسم سے وہ پھول اگل بھی سکتے ہیں؟

اٹھا وہ جنگ کا طوفان اُس کنارے سے　　بموں کا بارِ گراں دوش پر اُٹھائے ہوئے
وہ اژدہاؤں کے لشکر لپکتے آتے ہیں　　وہ ہونکتے ہوئے وہ پیچ و تاب کھاتے ہوئے

وہ دلہنیں کسے معلوم ہے کہ کتنی ہیں　　سہاگ جن کے یکایک اجڑنے والے ہیں
نجانے کتنی ہی تیرہ نصیب مائیں ہیں　　جنہوں نے ذبح کرانے کو پوت پالے ہیں

خدا کے دین سے آزاد ہے سیاست تو　　بغیرِ فتنہ یہ کرتوت کیا دکھائے گی!
کرے نہ خانہ خرابی کے یہ اگر سامان　　تو اور کون سے آخر یہ گل کھلائے گی!

اعترافِ شکست

نعیم صدیقی

اذانِ حق پہ فضائیں ہیں تاؤ کھائے ہوئے   پھٹی وہ پَو ہے فلک تیوری چڑھائے ہوئے
بڑے وقار سے اسلام بڑھتا آتا ہے   ہیں دل ہی دل میں عدو پیچ و تاب کھائے ہوئے
صداقت ایک ہے اور اسکے ہیں ہزار حریف   لپکتے آتے ہیں کیسے پرے جمائے ہوئے
مجاہدینِ ترقی پسند کو دیکھو!   رگیں پھلائے ہوئے، منہ میں پہ جھاگ لائے ہوئے
یہ سرفروش دلائل سے جنگ کرنے کو   ہیں گالیوں کے جدید اسلحہ سجائے ہوئے
یہ بند باندھیں گے بوئے گلاب کے آگے   غلاظتوں کے کئی ٹوکرے اٹھائے ہوئے
ہے پُرسکون اِدھر صرف زورِ استدلال   اُدھر غضب کے ہیں جذبات تلملائے ہوئے
وہ "الکتاب" کی آیات سے اُلجھتے ہوئے   کبھی ہیں پنجۂ احادیث سے لڑائے ہوئے
نئی دکانِ معاشی لگی ہے منڈی میں   یہ دیس دیس سے اموال ہیں چرائے ہوئے
یہ کفر و دیں کے تضادوں کو جوڑنے والے   حباب و موج میں بھی آگ ہیں لگائے ہوئے
صحافت اور ادب پھاگ کھیلنے اُٹھے   خلوصِ فکر کے سلسلے سب ہیں بجھائے ہوئے
ہے ایک طرفہ تماشا یہ راستی کا جلوس   جنازہ دوش پہ اخلاق کا اُٹھائے ہوئے
ابھی غرور کی اونچی نظر تھی گردوں پر   ابھی ہیں ناز سے نیچے نظر جھکائے ہوئے
متاعِ صدق کے آئے ہیں بہتریں گاہک   خزانے اپنی شرافت کے خود لٹائے ہوئے

یہ وُہ کسان ہیں جو اپنی کشتِ فکری میں ہیں بد ظنی کے چمن زار لاکھ اُگائے ہوئے
کہاں بچیں گے یہ بے داغ سیرتوں کے لباس کہ تار کول کے بادل ہیں گھر کے آئے ہوئے
عوام کے لئے "روٹی" ہے مکر کا دانہ جو "دامِ سُرخ" کے حلقوں کو ہے چھپائے ہوئے
جہان بھر کے غریبوں کا درد ہے جن میں وہ خود ہیں عیش کی سو جنتیں سجائے ہوئے
یہ کس کے سحرِ تخیل کا اک کرشمہ ہے فضاءِ کعبہ میں میخانے تھرتھرائے ہوئے
بنا کے بحث کا کچھ لوگ سیفٹی قانون ہیں تبصرے کی عدالت نئی جمائے ہوئے

ہے التماس کے ہم آپ کے حریف نہیں لڑے بغیر شکست آپ سے ہیں کھائے ہوئے
چلا چلے یہ جلوسِ کلام تیز قدم بشوق ہم تو خود آنکھیں ہیں یاں بچھائے ہوئے

بس اتنا عرض کئے بن نہیں رہا جاتا کہ آنکھیں آپ ہیں تارِ تیغ سے چرائے ہوئے
ہمیشہ گو خس و خاشاک نے ہجوم کیا پھرے بھی ہیں کبھی سیلاب ہٹ کے آئے ہوئے؟
طلوعِ مہرِ جہاں تاب یوں نہیں رکتا ہوں لاکھ بُوم فضا میں غبار اُڑائے ہوئے
جو لوگ ضربِ کلیمی کے آج وارث ہیں فسون و سحر کے بازو ہیں آزمائے ہوئے
خدا کی راہ میں یہ تجربہ نہیں پہلا وہ کون چوٹ ہے جو ہم نہیں ہیں کھائے ہوئے
ہوئی اصول سے فتنے کی بارہا ٹکر یہ جنگ روز نتیجے ہے کیا دکھائے ہوئے
کوئی مثال بھی ہے کیا کہ پھبتیوں کے طفیل کبھی ٹلے ہوں نئے دور سر پہ آئے ہوئے

فلک ہے نور کے دریا نئے بہاتے ہوئے
سحر غبارِ طبا شیر کا اڑاتے ہوئے

تجلیاتِ مقدس کے صد ہزار ظہور
فضائے وقت میں ہر سمت چھپاتے ہوئے

ارادہ ہائے جواں کی ہے ریل پیل عجیب
نوائے شوق کی لہریں نئی اٹھاتے ہوئے

وہ دیکھئے کہ جو لشکر ہوا ہے صف آرا
نظامِ کفر کے یہ لوگ ہیں ستاتے ہوئے

ہیں اپنی زیست کی ساری کی ساری پونجی کو
نظامِ حق کے لئے داؤں میں لگاتے ہوئے

کبھی یہ غیر تھے جو آج ہو گئے یک جاں
اگرچہ کتنے ہی "اپنے" تھے جو "پرائے" ہوئے

ہٹیلے لوگ ہیں، ان سے نہ کیجئے امید
کہ کھینچ لیں گے یہ پیچھے، قدم بڑھاتے ہوئے

ستم ظریف حریفوں کو داد دینے کو
قدم یہ رکھتے ہیں کانٹوں پہ مسکراتے ہوئے

وہ جھوٹ جس کے طلسموں کو ٹوٹ جانا ہے
صداقت اس پہ بھی ہے، آہ! رحم کھاتے ہوئے!

دیارِ عرب میں چند ماہ

تبصرہ

نعیم صدیقی

سفرنامے اور روزنامچے ادب کا ایک مستقل شعبہ ہیں، چنانچہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اچھے اچھے سفرنامے اور روزنامچے موجود ہیں۔ خود اردو ادب کا دامن بھی ان سے خالی نہیں۔

"دیارِ عرب میں چند ماہ" بھی عراق و حجاز کے ایک سفر کی داستان ہے جو روزنامچے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ یہ سفرنامہ اور اس کے فاضل مؤلف جناب مولینا مسعود عالم صاحب ندوی اصحاب ذوق کے حلقوں میں اس تبصرے سے قبل متعارف ہیں۔

سب سے پہلے کسی سفرنامے کی قدر و قیمت مشخص کرنے کے لئے یہ پیش نظر ہونا ضروری ہے کہ مقصدِ سفر کیا تھا اور مسافر نے اپنی منازل کو طے کرتے ہوئے کس زاویۂ نگاہ سے حالات کا مطالعہ کیا۔ ایک مسافر وہ ہوتے ہیں جو سیر و تفریح کے لئے گھر سے نکلتے ہیں اور پھر وہ عجائبات کی تلاش میں رہتے ہیں، پس جہاں انہوں نے کوئی دلچسپ منظر دیکھا، کسی ملک کے تمدن کی کوئی نئی ادا ملاحظہ کی، کہیں کسی تقریب کے مظاہرات دیکھے، کسی تاریخی مقام سے گذر ہوا، تو انہوں نے اپنے جذبات و تاثرات کی نقشہ کشی کر دی۔ دوسری قسم کے مسافر وہ ہوتے ہیں جو سفر تو کسی خاص نجی، کاروباری یا سرکاری ضرورت سے کرتے ہیں، لیکن اپنے وطن کے لوگوں کے لئے معلومات عامہ کا ایک ذخیرہ اکٹھا کر کے لے جاتے ہیں۔ لیکن ایک داعی —— اور ایک انقلابی داعی —— اور پھر خاص طور پر نظام اسلامی کے داعی —— کا سفر سب سے جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے، "دیارِ عرب میں چند ماہ" ایسے ہی ایک نرالے سفر کی داستان ہے۔

ایک مسافر جو "السائحون" کے زمرے سے تعلق رکھتا ہے اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبے کا زادِ راہ لئے ہوئے اپنی ساری جسمانی ناتوانیوں کے ساتھ راولپنڈی سے چلتا ہے، کراچی سے ارض پاکستان کو الوداع کہتا ہے، پھر بصرہ کے ساحل پر قدم رکھتا ہے، اس کے بعد بصرہ سے بغداد، بغداد سے موصل، موصل سے کرکوک، کرکوک سے پھر بغداد، بغداد سے دوبارہ بصرہ اور زبیر، وہاں سے کویت، کویت سے ریاض، ریاض سے مکہ مکرمہ، مکہ سے طائف، طائف سے پھر مکہ اور مکہ سے مدینہ منورہ پہنچتا ہے، اور اس طرح ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء سے ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء تک ساڑھے سات ماہ غریب الوطنی میں گذار کر پاکستان واپس لوٹتا ہے، اس سرے سے اس سرے تک جس ایک ہی دھن سے سرشار رہتا ہے۔ وہ اس بات کا ذوق جستجو ہے کہ دنیا کا وہ خطہ جسے نام نہاد عالم اسلام کے قلب کی حیثیت حاصل ہے اور جو کبھی سرچشمۂ تحریک اسلامی بننے کی سعادت سے بہرہ مند ہوا تھا۔ کیا آج بھی اس کی فضا اسلامی انقلاب کے لئے کارگری کا کچھ ثبوت دے سکتی ہے، اور یہ کہ ان فضاؤں میں کیا ایسے مردانِ جانباز آج بھی موجود ہیں جو ساری متاع حیات کا سودا اللہ تعالیٰ کی جنت اِنعام کے عوض کرنے پر بخوشی تیار ہوں۔ اس جائزہ و مطالعہ کے لئے وہ مسافر راہ حق ہمہ تن احساس بن جاتا ہے اس کی آنکھیں سینوں کے اندر دھڑکنے والے دلوں تک اترنے لگتی ہیں۔ اس کی قوت سماعت اصوات کے طوفانوں کی گہرائی میں ڈوب کر انسانی ضمیروں کے بے آواز نغموں کو سننے کی کوشش کرتی ہے، اس کی قوت شامہ خلوص و ایمان اور جذبات صالحہ کی بوئے خوش

لگتی ہے،

اس کی قوتِ ذائقہ انسانی اخلاق و سیرت کی تلخیوں اور شیرینیوں کا پیمانہ بن جاتی ہے، اور اس کا لمس عقیدہ و مسلک کی پختگیوں اور نرمیوں کو محسوس کرنے کا آلہ بن جاتا ہے، مولینا مسعود عالم ندوی کو اس سفر میں محض ایک انسانی فرد کی حیثیت سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ یہ مسافر پاکستان کی تحریکِ اسلامی کی طرف سے دیارِ عرب کے نام ایک پیغام تھا ــ بلکہ ایک سوال ــ کہ

"من انصاری الی اللہ؟"

"دیارِ عرب میں چند ماہ" کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ دیارِ عرب نے پاکستان کو اس سوال کا کیا جواب دیا ہے۔

راقم الحروف نے کتاب کو ایک مرتبہ پوری طرح پڑھا ہے، لیکن افسوس کہ حریص مطالعہ نے اس کی مہلت نہ دی کہ ضروری نوٹ لئے جا سکتے ــ حالانکہ ضروری نوٹ لئے بغیر تبصرہ تشنہ رہ جاتا ہے۔ تاہم اس اندیشے سے کہ تبصرہ دوبارہ مطالعہ تک بعد از وقت نہ ہو جائے، میں اپنے تاثرات کو قلمبند کر رہا ہوں۔

جناب مؤلف جس قسم کی زبان میں لکھتے ہیں، ٹھیک وہی زبان اس سفرنامے میں بھی استعمال کی گئی ہے، کم از کم میں نے مولینائے موصوف کی جو کتابیں ابتک پڑھی ہیں ان سے بلحاظ زبان یہ سفرنامہ کسی درجے میں بھی مختلف نہیں ہے،

مولینا کا قلم جیسا "سیرت محمد بن عبدالوہاب" اور "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" جیسی ٹھوس تصانیف میں تھا۔ ویسا ہی پیشِ نظر روزنامچے میں ہے، حالانکہ راقم الحروف کے نزدیک روزنامچے کے لسانی و ادبی تقاضے ان تصانیف کے مقابلے میں مختلف تھے، مختلف موضوعات میں زبان کی ایک ہی سرشت کا برقرار رکھنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ایک غیر اختیاری صورتِ حالات ہے کہ مولینا محترم کی تحریر کا ایک مزاج بن چکا ہے اور بن ہی نہیں چکا، پختہ ہو چکا ہے بہرحال مولینا نے ادبیت اور محاورہ کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اور اگرچہ وہ اپنی ڈائری لکھتے ہوئے مؤرخ کا قلم استعمال کرتے رہے ہیں، تاہم لطافت و دلکشی کے تقاضے نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دئے گئے، کہیں کہیں تو بہت اچھے ادب پارے موجود ہیں، اور قلم جہاں بھی ذوقیت کے کوثر میں ڈوب کے ابھرا ہے تو اس نے باغ و بہار کا سماں پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس بارے میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اعتدال کی حدود سے آگے بڑھنا بھی صحیح نہیں تھا، یعنی لطافت، جمالیت، ادبیت اور رنگینی و خیال آرائی کی مقدار اتنی بھی نہ ہونی چاہیئے کہ کتاب "غبارِ خاطر" بن جائے۔ غبارِ خاطر کی ادبی قدر و قیمت کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو، مقصدیت کے لحاظ سے وہ بہت "قابلِ رحم" چیز ہے۔

اندازِ بیان میں سنجیدگی و وقار کا رنگ از اول تا آخر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ بالعموم اظہارِ مدعا میں اجمال ہے، اگرچہ اس اجمال میں تکرار کے نمونے موجود ہیں، مصنوعیت سے پرہیز برتا گیا ہے۔

کسی سفرنامے ــ خصوصاً روزنامچے ــ میں دو پہلو ہوتے ہیں، ایک پہلو تو وہ ہوتا ہے جس میں روزنامچہ نگار اپنے ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے، اور خارج کو جیسا کچھ وہ پاتا ہے، قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے، دوسرا پہلو وہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنی شخصیت کے داخلی حوادث و شخصیت قرطاس پر منتقل کرتا ہے، یہ دونوں چیزیں ایک روزنامچے اور ایک سفرنامے کا تانا بانا ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے تبصرہ نگار کے ذمہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ روزنامچے اور سفرنامے میں ان دونوں پہلوؤں کی عکاسی کے کمالات و نقائص اور دونوں کے توازن و تناسب کا جائزہ لے۔

پیشِ نظر سفرنامے میں بھی دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں اور ادنیٰ مبصر شکایت نہیں کر سکتا کہ مولینا ندوی نے کسی

کو چھوڑ دیا ہے، اور صرف دوسرے کو لے لیا ہے، اختلاف اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یا تو دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کے تناسب میں یا ان کے انداز میں۔

جہاں تک خارج کے مطالعہ و مشاہدہ اور اس کے اظہار کا تعلق ہے، مؤلف نے اپنے مقصد کے لحاظ سے کوئی کمی نہیں چھوڑی، منظر کشی سے لے کر، تاریخی حقائق کی توضیح، سیاسی احوال کے تجزیے، اخلاقی و دینی مظاہر کے تبصرے، تہذیبی و تمدنی روایات کے جائزے تک کے سارے پاپڑ بیلے گئے ہیں، پھر صحرائی بدوؤں کے بھیک منگے بچوں سے لے کر، موٹر ڈرائیوروں، دوکانداروں، قلیوں، دین کے علاموں، سیاسی لیڈروں، ادیبوں اور صحافیوں، اور عربی تاجداروں تک کی مختلف شخصیتوں کے متعلق تاثرات بھی جمع کر دیئے گئے ہیں، آپ "دیارِ عرب" کو پڑھنے کے بعد دنیائے عرب کے ما لہٗ و ما علیہ کا ایک جامع تصور حاصل کر سکتے ہیں، آپ کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے گا کہ وہاں کی زمین کیسی ہے اور فصل کیسی اُگ رہی ہے وہاں کا نظام کس نوعیت کا ہے اور اس نظام کے سایہ میں زندگی گذارنے والا اور اس کی باگ ڈور تھامنے والا انسان کیسا ہے؛ عربی معاشرت کا بیرونی لباس کیسا ہے اور اس کی اندرونی اخلاقی روح کس نوعیت کی ہے؟ وہاں کے قہقہوں اور وہاں کی آہوں کے درمیان جو ذہنی و معاشی دنیائیں حائل ہیں وہ کس قسم کی ہیں۔

آپ دیارِ عرب پڑھتے ہوئے مغرب کی اُس شیطانی سیاست کی سیہ کاریوں کا اندازہ بھی کر سکیں گے، جنہوں نے بین الاقوامی مفاد کا ایک غیرمرئی جال پھیلا رکھا ہے اور بڑے بڑے شہباز اس جال کی ڈوریوں سے اپنے نشیمن بنائے مست پڑے ہیں آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی ممالک کی دینی روح نوجوان طبقے میں کس طرح بیدار ہو رہی ہے اور اس بیداری کے نتیجے میں کس طرح کے جذبات ہیں جو ہر طرف کروٹیں لیتے معلوم ہوتے ہیں — اور پھر یہ بھی معلوم ہوگا کہ روحِ عرب کی اس نوجوان بیداری کو کچلنے کے لئے خود عرب کی برسرِ اقتدار طاقتوں نے امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی کیا خدمات انجام دی ہیں، آپ کو فلسطین کے مسئلہ کے بارے میں بھی بعض نئے حقائق کا علم ہوگا۔ آپ کو مغربی طاقتوں کی "روغنیاتی" "دخل یابی" کے سیاسی تعفنات سے بھی آگاہی ہوگی، آپ کو عربی ممالک میں کمیونزم کی زیرِ زمین بچھائی جانے والی سرنگوں کے متعلق بھی اندازہ ہوگا کہ دیارِ عرب زمانی حیثیت سے سرخ خطرے سے کتنی دوری پر ہے،

سب سے زیادہ دلچسپ چیز جو خارج کی نقشہ کشی میں قابل توجہ ہے وہ اُن بے شمار شخصیتوں کا تجزیہ اور ان کی تصویر کشی ہے جن سے "دیارِ عرب" کے فاضل مؤلف نے اپنے مقصدِ عزیز کے لئے ملاقاتیں کی ہیں، بحثیں کی ہیں، جن کی مہمان نوازیوں کا احسان اپنے سر لیا ہے، جن سے علمی و ادبی اور دینی و فقہی امور میں مشورے لئے ہیں اور جن کے ذریعے عرب کے ماحول اور انسان کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، اس خاص زاویے سے اگر مطالعہ کیا جائے تو مولٰنا ندوی کا روزنامچہ ایک نگارخانہ ہے، انسانی ذہنیتوں، سیرتوں اور کرداروں کا یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک عجائب گھر میں زندہ انسانوں کے زندہ مجسمے اس سرے سے اس سرے تک سجے ہیں اور ہر مجسمے کے سینے پر مولٰنا کے تاثرات منقش ہیں، شخصیتوں کے عجیب و غریب نمونے یکے بعد دیگرے سامنے آتے ہیں اور ہر ایک کے بارے میں روزنامچہ نویس اپنی معلومات کی حد تک تحریکِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے ہر ایک کا درجہ متعین کرتا جاتا ہے۔

اس کاغذی نگارخانے کی بنیاد کراچی کے ساحل سے الگ ہوتے ہی بحری جہاز ہی میں رکھی گئی تھی اور واپسی تک یہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اس نگارخانے کی سیر کرنے والے مبصر کے لئے اگر کوئی چیز خاص طور پر محتاجِ غور و توجہ ہے تو وہ یہ کہ فاضل مؤلف مردم شناسی اور شخصیت کے تجزیے کے فن میں کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے ہر ملاقات کے بعد — چاہے وہ کتنی ہی مختصر تھی — اپنی ایک

رائے قائم کی ہے اور اسے جوں کا توں روزنامچے میں درج کر دیا ہے۔ پھر جہاں جہاں موقع ملا ہے شخصیتوں کا ذہنی اور کرداری تجزیہ بھی کیا ہے ہم افسوس کے ساتھ معذرت کرتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی تفصیلی رائے عرض کرنے کے لئے تیاری مکمل نہیں ہے، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولینا نے عرب کے ان چند گلہائے سرسبد کو پہچاننے میں کوتاہی نہیں دکھائی جن سے اللہ کے دین کے بارے میں کچھ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

لیکن یہ بات ہمیں ضرور کھٹکی ہے کہ بعض اوقات شخصیتوں پر ریمارک، زیادہ تفصیلی ہو گئے ہیں اور کہیں کہیں صاف گوئی اتنی جلی ہو گئی ہے کہ لوگوں کے لئے اس کی فطری ناخوشگواری پر حقِ صبر ادا کرنا مشکل ہوگا۔ علاوہ بریں ہمیں یہ اندیشہ بھی ہے کہ تمام ملاقاتوں کو نام، مقام، تاریخ کی تصریح کے ساتھ اتنی وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے اور لوگوں کے خیالات کو اتنے کھلے طریق سے پیش کیا گیا ہے کہ شاید بعض افراد کے لئے سیاسی حیثیت سے یہ چیز بھی گیوں کی موجب ہو جائے، خصوصاً عرب جیسے خطّہ میں جہاں اسلامی تو کجا مغربی جمہوریت تک ابھی عنقا ہے، اور جہاں ارباب مفاد کی سازشی حرکات کے جال پھیلے ہوئے ہیں وہاں دشمنانِ حق کو بلا کم وکاست یہ معلومات بہم پہنچا دینا کہ خدا ورسول کے "خطرناک" دین کے بکٹیریا فلاں فلاں جگہ موجود ہیں، ممکن ہے کہ خلافِ مصلحت ہو، تاہم ایک روزنامچہ نویس کی یہ خود اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اندازہ کرے کہ کہاں اخفاء ضروری ہے، کہاں اشاریت سے کام لینا چاہیئے اور کس موقع پر پوری تصریح کرنا چاہیئے۔

بہرحال "دیارِ عرب" ایک ایسا سفرنامہ ہے کہ اس کے اسماء الرجال کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب ہو جانی چاہیئے جس میں تمام شخصیتوں کے نام، ان کا تعارف، اور ان سے صاحبِ سفرنامہ کی ملاقات اور روابط کا تذکرہ آ جائے۔ میرا ارادہ تھا کہ اس خدمت کو میں خود انجام دے دوں، کام شروع بھی کیا۔ لیکن مصروفیات اس کی اجازت نہیں دے رہیں، کاش کہ کوئی دوسرے رفیق اس طرف توجہ کریں اور کتاب کا ایک "اشخاص نامہ" مرتب کر کے چراغِ راہ میں اشاعت کے لئے بھیج دیں۔

اب سوال سامنے آتا ہے، مؤلف روزنامچہ کے داخلی اظہار کا۔ کتاب کا ایک بہت ہی اہم پہلو یہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ مولینا مسعود عالم ندوی کے بارے میں اگر کوئی شخص بقدرِ صفر معلومات رکھتا ہو، اور اسے "دیارِ عرب" پڑھنے کو دے دی جائے تو وہ مولانا مسعود عالم کے جسم، ان کی عمر، ان کی صحت، ان کی مختصر سوانح حیات ان کی عادات، ان کے ذوق، ان کی خوبیوں، ان کی کمزوریوں (یہ انسان میں کمزوریاں بہرحال ہوتی ہیں) — ان کے علمی مشاغل، ان کے مطالعہ، ان کے سیاسی نقطۂ نظر، ان کے دینی رجحانات ان کی دلچسپیوں، ان کے عزائم، ان کے کلچر وغیرہ کا پورا پورا نقشہ کھینچ کر اپنی نگاہوں کے سامنے لا سکتا ہے، اور وہ ٹھیک ٹھیک تبصرہ کر سکتا ہے، کہ اس شخص کی خلوت کیسی ہے اور اسکی جلوت کا کیا رنگ ہے، اس کا ظاہر کیا ہے اور اس کا باطن کیسا ہے اس کی محبت کا قبلہ کدھر ہے اور اس کی نفرت کا رخ کیا ہے، اس کی پشیمانیاں کیا ہیں اور اسکی حسرتیں کیا ہیں۔ آپ روزنامچے کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ روزنامچہ نگار پر بہار کا موسم کب آتا ہے۔ اور خزاں کا رنگ کب طاری ہوتا ہے اسکے انقباض کے اسباب کیا ہوتے ہیں، اور انبساط کے وجوہ کون سے ہوتے ہیں، اس کے جذبات میں اتار کب ہوتا ہے اور چڑھاؤ کب آتا ہے وہ کن محفلوں میں اپنی "طبع" کو رکتے ہوئے پاتا ہے اور کن مجالس میں وہ "ہوتی ہے رواں اور"

آپ کہیں اس کی انگریز دشمنی کو ابھرتا ہوا پائیں گے، کہیں مغربی تہذیب کے خلاف اس کے غم وغصہ کے جذبات سامنے آئیں گے، کہیں وہ عربوں کا شیدائی بن کے نمودار ہوگا، کہیں طائف میں وہ "مبلغِ اعظم" کے نقوشِ کفِ پا ڈھونڈتا نظر آئے گا، کہیں مدینہ کی فضا میں اس کے جذباتِ عقیدتِ نبوی میں نئی لہریں پیدا کرتی نظر آئیں گی جن کی زد سے وہابیت کا پتھریلا ساحل تک

ٹوٹتا پھوٹتا محسوس ہوتا ہے۔ کہیں وہ نماز باجماعت کی بے کیفیوں کا ماتم کرتا نظر آئیگا۔ کہیں وہ "سلفیت" کا قدردان ہے تو کہیں تنگ ظرف جزئیات پرستی پر نوحہ کرتا ہے۔ کبھی وہ عربی زبان و ادب کی ابتری سے اپنی لسانی حسیات کو تسکین دے رہا ہے تو کہیں معاً اس کی بزغاز شخصیت نکھر کے سامنے آجاتی ہے، ادھر وہ اخوان المسلمون کے جذبۂ صادقہ اور ان کے نصب العین پر اپنے دل کی کلی کو کھلتے ہوئے پاتا ہے اور ادھر اسے اس پاکیزہ تحریک میں شعوریت کی کمی مضطرب کرتی ہے، کبھی وہ عربوں کے جمود پر کڑھتا ہے اور کبھی بے پردگی اور بغی و منکر کے فروغ کی شکل میں ان کی "ترقی پسندیوں" سے اس کا دل خون ہوتا ہے ــــ الغرض "دیارِ عرب" کو پڑھنے کے دوسرے معنی "مسعود ندوی" کو پڑھنے کے ہیں۔

روزنامچوں میں بالعموم روزنامچہ نگار شروع سے آخر تک خود ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے اور بہت سے ایسے لوگ جو خارج سے منقطع ہوجایا کرتے ہیں، اسی وجہ سے روزنامچہ نویسی جیسی خشک ذمہ داری کو سر لیتے ہیں کہ ان کی شخصیت کو اظہار کا بہترین راستہ یہی ملتا ہے، چنانچہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر"[1] کا اگر باریک بینی سے مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوگا کہ ایک شخصیت جو سیاست کی پہنائیوں سے الگ کرکے قفس میں بند کر دی گئی ہے، وہ پر پھڑپھڑا رہی ہے ۔۔ ایسی ایسی تخیلاتی وادیوں میں جولانیاں دکھا رہی ہے جن تک "عبقریت" کے پر لگا کر اڑے بغیر کسی کی رسائی ہی نہیں ہوتی۔ غبارِ خاطر ایک شخصیت کی تشنگیٔ نمود کے اظہار کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

لیکن "دیارِ عرب میں چند ماہ" کا مؤلف اگرچہ اپنی کتاب کے ہر صفحے پر خود موجود ہے اور نہ خارج کی سیر کراتے ہوئے خود قاری کے سامنے موجود رہتا ہے تاہم کتاب اس بات کی ہرگز غمازی نہیں کرتی کہ مؤلف نے روزنامچے کو اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے لکھا ہے، بخلاف اس کے یہ حقیقت صاف صاف نمایاں ہے کہ روزنامچہ ایک خاص بلند نصب العین کے گرد نشو و نما پا رہا ہے۔ یہ البتہ ہماری نگاہ میں زیادتی ہے کہ مؤلف نے اپنی نجی زندگی کی بعض ایسی تفصیلات تک کو بیان کر دیا ہے جن سے ان کی تاثری کے قارئین کو کوئی براہِ راست مقصدی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً اپنی بیماری، علاج اور اپنی پرہیزی غذاؤں وغیرہ کے متعلق بلاکم و کاست سب کچھ کہہ دینا ــــ اور کہہ دینے کی حد تک ہی نہیں بلکہ اسے بار بار دہرانا ــــ ہماری نگاہ میں ایک ناجائز بارِ گراں ہے جو روزنامچے کی پشت پر لاد دیا گیا ہے، نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ حقیقت تجربات سے ثابت ہوچکی ہے کہ خالص شخصی و نجی احوال ــــ اور خصوصاً اپنے امراض کا تذکرہ ــــ دوسروں کے قریب ہونے میں مانع ہوتا ہے۔ ذاتی خط و کتابت اور پرائیویٹ مجالس میں ہو تو بہرحال اس قسم کے حالات کا تذکرہ آہی جاتا ہے، لیکن کسی مستقل تصنیف میں ایسی چیزوں کو شامل کر دینا موزوں نہیں۔

مولانا نے اپنے آپ کو جس طرح دیارِ عرب میں پیش کیا ہے، اس کے پیشِ نظر ایک مرتبہ یہ ارادہ بھی ہوا کہ مولانا کی شخصیت کو دیارِ عرب کے آئینے میں دیکھنے اور دکھانے کے لئے کوئی مقالہ سپردِ قلم کیا جائے۔ لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہوسکا یہ موضوع بھی کسی دوسرے رفیق کی توجہ کا محتاج رہے گا۔

مذکورہ بالا گذارشات کے ساتھ راقم الحروف کی رائے میں یہ سفرنامہ سفرناموں کی تاریخ میں ایک نئی چیز ہے، اور اصحابِ ذوق کے حلقوں میں اسے پڑھا جانا چاہیئے۔

(بقیہ برصفحہ ۳۶)

[1] "غبارِ خاطر" بظاہر روزنامچہ نہیں ہے، لیکن اس کی نیچر وہی روزنامچے کی سی ہے۔

ٹوٹی ہوئی اینٹیں

اسعد گیلانی

"بابوجی۔ ایک پیسہ۔ بابوجی۔ وَن پائس۔ وَن آنہ"

ایک شوخ لیکن لچکیلی سی آواز نے محمود کو چونکا دیا۔ اُس نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک ننھی سی بھکارن برآمدہ سونے والے مسافروں کو پھاند کر اس کی کھڑکی کے سامنے سلاخوں سے اندر کی طرف اپنا چھوٹا سا ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

"بھوکی ہوں بابوجی۔ روٹی دے دو" اُس نے ایک کونے میں برتنوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ سلاخوں میں سے اندر کی طرف بڑھا ہوا چھوٹا ہاتھ جیسے کوئی بچہ اپنے قیدی باپ سے ملنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ اپنی حالت پر غور کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اِس کمرے میں اُسے بیس پچیس دن ہو گئے تھے۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ اِس کمرے میں آ کر گر پڑتا تھا۔ جو اس نے اسٹیشن کے سامنے کی سرائے میں چھ آنے روز کی اُسے خاص رعایت اس لئے دی گئی تھی۔ کہ وہ بھی جنگی مشین کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ایک غلیظ دھجی کا کام دے رہا تھا۔ چھ آنے روز کی اُسے خاص رعایت اس لئے دی گئی تھی۔ کہ وہ بھی جنگی مشین کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ایک غلیظ دھجی کا کام دے رہا تھا کچھ دنوں سے اِس سرائے میں اس کے آوارہ محکمے کا پورا اسٹاف بھرا پڑا تھا۔ ایسا اسٹاف جس کی خوش مذاقیوں اور خوش الحانیوں سے تنگ آ کر ہمیشہ اپنا کمرہ بند رکھتا تھا۔ تاکہ کوئی اس کا انسان نما واقف خواہ مخواہ کمرے کو کھلا دیکھ کر اندر نہ گھس آئے لیکن اِس احتیاط کے باوجود سرائے کی مخلوط فضا میں ہر وارث شاہ۔ ساون کے نظارے نہ معلوم کیسی کیسی تانیں گونجا کرتیں۔ بھیانک اور سریلی۔ پھٹی ہوئی آوازیں۔ ملفوف گالیاں۔ اُردو۔ انگریزی پنجابی پشتو اور سندھی کے مرکبات فضا میں ایک سمع خراش شور پیدا کیا کرتے اور وہ یہ سب کچھ دروازے کے پار بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ انہیں سن رہا ہے۔ اپنے کمرے میں بیٹھا یا تو ان دوستوں کو خطوط لکھا کرتا جن کی صحیح قدر وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ یا اِدھر اُدھر سے لی ہوئی کتابیں پڑھتا رہتا۔ اس آوارہ زندگی میں کبھی کبھی اس کے دور افتادہ دوست بھی اسے ایک آدھ کتاب بھیج دیتے اور جب کچھ نہ ہوتا تو کمرے میں ایک طرف پرانی انگریزی کتابوں کا لگا ہوا ڈھیر اس کی مدد کرتا۔ وہ ان انگریزی مصنفوں اور پبلشروں پر بہت خوش ہوتا جنہوں نے کتنے لکھ لکھ کر اور چھاپ چھاپ کر کباڑ خانوں کو رسکن۔ گولڈ اسمتھ۔ اسکاٹ۔ ڈکنس اور ہیگرڈ جیسے مصنفوں سے بھر دیا تھا۔ اور اُردو کے متعلق کر اسے افسوس ہوتا۔ کہ یہاں کے پبلشر جاہل تھے اور صرف روپیہ کمانے کے لئے طوطا کہانیاں چھاپا کرتے تھے۔ کسی کتاب کی افادیت سے غرض نہ تھی۔ غرض یہ تھی کہ اس میں کتنا کمایا جا سکتا تھا چاہے وہ راتوں کی نیند حرام کرنے والی ہو یا چھپ چھپ کر پڑھی جانے والی اسی لئے کباڑ خانے میں اُردو ادب کے جو نمونے ملتے تھے۔ وہ بڑے ہی نادر ہوتے شیخ غلام علی اینڈ سنز کا چھپا ہوا آنے والا دیوانِ ذوق۔ دیوانِ ظفر۔ دیوانِ چرکین وغیرہ جن کا زیادہ حصہ کاتب کی اپنی تصنیف ہوتا۔ یا فلمی کہانیوں اور گانوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں یا تیرتھ رام فیروزپوری اور ندیم صہبائی کے چند ایک رسیلے ناول اور بہرام ڈاکو کے کارنامے۔ اور مختلف ہدایت نامے اور جنسی شاستر یا اس سے زیادہ ہوتا بھی کیا۔ انگریز بہادر نے نظام تعلیم مشرقی غلاموں کیلئے ترتیب دیا۔ وہ اسی مزاج کا تو تھا کہ مشرق میں مغرب کے بہتر سے بہتر غلام تیار ہو سکیں جو سیاسی نظام ظلم کے ساتھ غلام سازی کر رہا تھا اس کا تعلیمی نظام ایک مددگار ادارہ بنا تو ہو سکتا تھا۔ اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں اب اتفاق سے گھوڑے کی باگ آ گئی تھی۔ منزل ان کی بھی وہی تھی جو کلائیو کی تھی۔ کلائیو میں تو جذبہ حب الوطنی بھی تھا۔ لیکن یہ بیچارے جذبہ خود پرستی کے سوا کچھ رکھتے نہ تھے۔ آخر ایک غلط اقتدار مسلط رکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کون سا نظام تعلیم ہو سکتا تھا۔ جو تھوڑے ہی عرصے میں پوسٹ اور کاہل بنا دے ——— وہ کاہل تو ممکن ہے کہ ہو لیکن جاہل نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اپنے کباڑ خانے میں صرف انگریزی

ہی نظر آتی ہیں۔

"ایک پیسہ دو نا بابوجی!" اور وہ چونک پڑا کھڑکی میں سے اندر کی طرف ہاتھ بڑھائے ننھی لڑکی اسے شوخ لیکن ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

محمود نے "شی[1]" ایک طرف رکھ دی۔ شرارے کی طرح ایک خیال ناچ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اس نے سوچا "یہ لڑکی "شی" کی کتنی چھوٹی سی تشبیہ تھی۔ وہی ضد اور وہی شوخی۔ وہی استقلال" اور پھر اسے خود بھی اپنے خیال کی غلطی کا احساس ہوا "لیکن "شی" تو مر کر بھی بھیک نہ مانگتی۔ ہاں مر کر بھی!۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا۔

"یہ دنیاں۔ ں۔ ں۔ یہ دنیاں۔ ہے طوفان میل" اس کے کمرے کے باہر کسی نے پوری لَے کے ساتھ چیخنا شروع کر دیا۔

"کوئی آتا اور کوئی ہے جاتا۔ آ۔ آ!" سرلیٹے کے دوسرے سرے سے کسی نے اس کی سُر میں سُر ملا دی۔ اور اس طوفان بدتمیزی میں وہ صرف اسی بات پر اُلجھ کر رہ گیا۔ کہ خودداری میں زیادہ قوت ہے یا بھوک میں'۔ اور اس خیال نے گویا اس کے ذہن میں ضرب لگا دی۔

"ہاں میں تم سے پوچھتا ہوں اے انگریز کے چھوڑے ہوئے مکروہ نظامِ معیشت کے محافظو بتاؤ کہ خودداری میں زیادہ قوت ہوتی ہے یا بھوک میں؟" آخر وہ سینکڑوں میل کے فاصلے پر یہاں کیوں پڑا تھا۔ اس کی قسمت کی روزی کو تو گویا پَر لگے ہوئے تھے۔ اور وہ افتاں و خیزاں اس کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔ جیسے ایک تھکا ماندہ لڑکا کٹی ہوئی پتنگ کے پیچھے دوڑتا چلا جاتا ہے۔

"کھانا کھاؤ گی!" اس نے یونہی لڑکی سے پوچھا۔ حالانکہ ہوٹل میں کھاتے کھاتے خود اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔

"ہاں بابوجی" لڑکی نے مسکرا کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو ادھر سے ہو کر اندر آجاؤ" اس نے سرائے کے بڑے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اندر! نا۔ بابا۔ نا میں اندر نہیں آتی۔ نا۔ نا" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ کر توبہ کے انداز میں گال تھپتھپاتے ہوئے کہا "میری اماں مارے گی۔ میری ماں کہتی ہے کہ ایسا کام نہیں کرنا"

"کیسا؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"نا۔ بابا۔ میں اندر آؤں گی تو چوکیدار مارے گا!" اس نے اپنا گول سا سر جھٹک کر آنکھیں مٹکاتے اور گال پھیلاتے ہوئے کہا

"اچھا تو میں چوکیدار سے کہتا ہوں وہ تمہیں اندر آنے دے گا!" اس نے کہا۔ وہ تنہا بیٹھے بیٹھے اکتا رہا تھا اور لڑکی کی باتوں اور حرکتوں میں اسے ایک بے وجہ دلچسپی سی ہو رہی تھی۔ اگرچہ بچوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن چھ سات سال کے شوخ و شنگ بچے اسے بُرے معلوم نہ ہوتے۔ اور پھر اسے دیکھ کر محمود کو اپنے ایک دوست کی شریر بچی یاد آ رہی تھی۔ لڑکی نے گالوں کو ہلکا سا پھیلایا ہونٹوں کو لٹکایا پیشانی پر لٹکتی ہوئی بالوں کی لٹ کو جھٹک کر پیچھے کیا۔ اپنے چھوٹے سے لہنگے کو ہلکا سا جھٹکا۔ کرتی کے بٹن لگائے اور اس کی طرف عجیب عجیب نظروں سے گھورنے لگی۔ پھر انگوٹھے کو انگلی کے ساتھ ملا کر روپیہ پیسہ کھنکانے کے انداز میں ہلانے لگی۔

"ہاں پیسہ بھی دونگا" اس نے مسکرا کر کہا۔

محمود کے چوکیدار کے پاس جانے سے پہلے ہی وہ سرائے کے اندرونی دروازے میں کھڑی تھی۔ محمود کو دیکھتے ہی اس نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چوکیدار کی طرف طنزیہ اور فاتحانہ نظروں سے دیکھتی ہوئی محمود کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی۔

---

[1] ہیگرڈ کا ایک مشہور ناول۔

"وہاں بیٹھ جاؤ" اس نے فرش پر بچھے ہوئے اپنے بستر کی طرف اشارہ کیا اور وہ خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔ لیکن لڑکی اسے خالی خالی سکیڑ نظروں سے گھورتی رہی۔ اس نے دیکھا وہ چھ سات سال کی ایک ننھی سی لڑکی تھی۔ وہ ایک گھیر دار لہنگا اور چھوٹی سی کرتی پہنے ہوئے تھی کرتی بالکل نئی چھینٹ کی تھی اور لہنگا دھلا ہوا صاف ستھرا تھا۔ کانوں میں چھوٹے چھوٹے کانٹے چمک رہے تھے۔ بال جو کافی لمبے لمبے تھے اچھی طرح کنگھی کئے گئے تھے اور ایک نیلے فیتے میں بندھے ہوئے تھے۔ جیتہ اس کے گول سے چہرے والے گول سے سر پر لپٹا ہوا اس کے کانوں کے پاس سے بالوں کے نیچے گردن کی طرف غائب ہو گیا تھا اور اس کے دونوں سرے ایک پھول کی طرح اس کے سر پر بڑی صفائی سے بندھے ہوئے تھے اسکا رنگ کافی صاف تھا۔ وہ خود بہت صاف ستھری تھی لہنگے کے نیفے میں لٹکی ہوئی ایک چھوٹی سی کپڑے کی تھیلی تھی جس میں چند ایک پیسے اس کے خالی پن کو بوجھل بنا رہے تھے۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے پھر کہا لیکن وہ کھڑی اسے بے معنی سی نظروں سے دیکھتی اور اپنے نیفے میں لٹکی ہوئی تیلی سے کھیلتی رہی۔

اس نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور وہ کھلکھلاتی ہوئی بستر پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی وہ اس کی حرکات کو بچوں کی سی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے!" اس نے پوچھا۔

میرا نام حیات بیگم ہے" اس نے کہنیوں پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

حیات بیگم ——— ! اور محمود کو سینکڑوں میل کی دوریوں میں سرحد پار پڑا ہوا ایک گاؤں یاد آ گیا اور اس گاؤں کی ایک لڑکی جو ایک زری کی جوتی اور طرہ دار پگڑی پہننے والے باپ کی بیٹی تھی۔ زری دار جوتی پہننے والا انسان ہونے کے باوجود اختلافِ قومیت کے الزام میں خاک و خون کے طوفان میں کھو گیا تھا اور زندگی کی ننھی سی بیٹی کسی کھوٹے سکے کی طرح اپنے باپ کے خون سے بنائی ہوئی سرزمین میں بے رحم انسانوں کے ہاتھوں کی طرف تکتی ہوئی بھٹکتی پھر رہی تھی۔ وہ اس ملک کے شرفاء کے در در پر بھٹکی تھی لیکن ان شرفاء کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ بڑے بھاری بھاری ٹھیکوں اور رشوتوں کی ریل پیل کے ذریعے تعمیرِ ملک کی مہم سے فارغ ہو کر قوم پرستی کی اس ٹوٹی ہوئی اینٹ کی طرف بھی توجہ کرتے۔ اور محمود نے اس ٹوٹی ہوئی اینٹ کی طرف دیکھا جو ننھی سی کہنی کے بل ہتھیلی پر اپنا گول چہرہ رکھے اس سے پیسہ مانگ رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ شاید اس کے باپ کا چہرہ بھی گول تھا۔ گول اور چپٹا بالکل زمین کی طرح۔ اس نے جغرافیہ میں پڑھا تھا کہ زمین گول ہے۔ یعنی اگر کوئی محل پنجاب کی مشرقی زمینوں میں کھنڈر بن کر زیرِ زمین ہو جائے تو اس محل کی ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ جنوب مغرب کے صحرائی بیابانوں میں سے گزرتی ہوئی اور ساحل کی تپتی ہوئی ریتوں پر ٹھوکریں کھاتی ہوئی اس محل کی دوسری اینٹوں کی طرح زیرِ زمین دفن ہو سکتی تھی۔ یہ خوب۔۔ اس نے سوچا۔ زمین کے گول ہونے کی کیسی کھلی ہوئی دلیل تھی اور زمین تو کیا انسانی زندگی کے قوانین بھی بالکل زمین کی طرح گول تھے جیسے مشرقی پنجاب کے دور دراز گاؤں میں چھوٹی سی حیات بیگم ——— پھر زری دار جوتی والے باپ کی بیٹی دور دراز شہروں کی گلیوں میں بھٹکتی ہوئی پریشان حال حیات بیگم ——— پھر زندگی کو کراچی پہ ——— اور محمود نے سوچا کہ اس سے آگے وہ سوچ نہ سکتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ نفرت اس کے دل کو مسکن نہ بنا لے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے ذہن کی رَو کو تھاما۔

"تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"وہ تو مر گیا ہے" لڑکی نے کہا۔ محمود نے سوچا اس نے کتنا صحیح جواب دیا تھا۔ "وہ مر گیا ہے" اسے یقیناً مر ہی چکا ہونا چاہئے تھا۔ جسمانی طور پر یا ذہنی طور پر۔ بہرحال اسے مر ہی جانا چاہئے تھا۔ جبکہ اس کی حیات بیگم بھیک مانگ رہی تھی۔

"تم لوگ کہاں رہتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا

"اسٹیشن پر۔ مال گاڑی کے خالی ڈبے میں!" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اس سے بہتر اور مناسب جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے" محمود نے سوچا "تمہارے حصے کی زمین پر فرعونوں نے قصرِ اقتدار تعمیر کر لیا ہے اور تمہارے مکانوں اور کھنڈرات اور تمہارے باپوں کی ہڈیوں پر تو ہوس پرستوں نے اپنی بڑائی کے تخت بچھا لئے ہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ انہوں نے تم کو مال گاڑیوں کے خالی ڈبوں میں رہنے کی اجازت دے رکھی ہے ——— یہ بھی نہ دیتے تو پھر تم کیا کرتے ——— ہاں ننھی حیات پھر تم کیا کرتے"

محمود کے ذہن نے خاموش الفاظ میں دھرایا۔

"تمہاری ماں کیا کرتی ہے؟" اس نے کہا

"وہ بھی اسٹیشن پر رہتی ہے۔ رات کو بھیک مانگنے جاتی ہے" اس نے "ذہنی زلزلے" میں تصویریں دیکھنے کے لئے اسے الٹتے ہوئے کہا۔

"ذہنی زلزلوں سے تمہیں کیا ملے گا میری ننھی بھکارن۔ ان زلزلوں کو تو تمہارے بھائیوں کے سینوں کی تلاش ہے" محمود بڑبڑایا اور کتاب اس کے ہاتھ سے لے کر الگ رکھ دی

"زمینی زلزلوں نے تو تیری عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ لیکن تو جس عمارت کی ایک ٹوٹی ہوئی اینٹ ہے وہ عمارت ذہنی زلزلوں سے مدت سے محروم ہے۔ کاش یہ ذہنی زلزلے اس کی قسمت میں بھی ہوتے ——— محمود کے ذہن میں سے کسی نے پکار کر کہا۔

"یہ تم نئے نئے کپڑے کہاں سے لیکر پہنتی ہو؟" اس نے اس کی کرتی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میرے ماموں ——— !"

"بابو جی ان لوگوں کو دیکھے ہیں بابو جی۔ ایک آدمی اس کا ماموں بنا ہوا ہے۔ وہ کبھی کبھی آ کر ان کو تانگے میں سیر بھی کراتا ہے جی۔ وہی ان کو نئے کپڑے بنا کر دیتا ہے۔ بابو جی ان لوگوں کو بہت تجے ہیں۔ خدا کے لئے ایک پیسہ دے دو۔ ایک روٹی۔ بھوکی ہوں بابو جی ———!"

ایک دوسری بھکارن لڑکی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ محمود ایک ذہنی کرب کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔

"کیوں ری۔ تیرا کوئی ماموں بھی ہے؟" اس نے ننھی حیات بیگم سے پوچھا۔

اس نے اپنا گول سا سر ہلا دیا۔

"تو تم اس کے گھر میں جا کر کیوں نہیں رہتیں۔ بھیک کیوں مانگتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بابو جی وہ تو تھوڑے دن سے ماموں بنا ہے۔ اس نے ہم کو کپڑے بھی بنوا دئے ہیں؟" حیات نے اپنی تھیلی میں سے پیسے نکال کر گنتے ہوئے کہا۔

"بابو جی۔ خدا کے نام پہ۔ بھوکی ہوں۔ روٹی دے دو" کھڑکی میں کھڑی ہوئی لڑکی نے کہا۔

"بابو جی۔ اس کو مت دو۔ یہ اچھی نہیں ہے" حیات نے کہا۔

"اس کے تو بہت ماموں ہیں بابو جی۔ سب لوگ اس کے ماموں بن جاتے ہیں۔ میں بھوکی ہوں بابو جی۔ میری ماں مر گئی ہے" اس لڑکی نے کہا۔

محمود نے اسے ایک آنہ دے دیا اور وہ چلی گئی۔ پھر آٹھ نو سال کا ایک لڑکا کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"بابو جی۔ خدا کے نام پر!" اور پھر اس کی نظر حیات پر پڑ گئی۔ " ارے تم یہاں ہو؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ماموں یہ میرا بھائی ہے۔" لڑکی نے اس کے کندھے سے لپٹتے ہوئے کہا " قادر اندر آجاؤ" پھر اس نے لڑکے سے کہہ دیا۔

"دیکھو حیات بی بی۔ مجھے ماموں نہ کہنا" محمود نے کہا اور حیات نے پورے تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں مٹکائیں اور اتنے میں لڑکا بھی کمرے میں آگیا۔

"ماموں اسے بھی کھانا دو۔" حیات نے کہا۔

محمود نے گھور کر اسے دیکھا۔ ماموں کے لفظ میں اسے ایک شدید تعفن سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھا جیسے ننھی حیات نے اسے گالی دی ہو۔ حالانکہ اس نے گالی محمود کو نہ دی تھی بلکہ ان کو دی تھی۔ جن کی کرسیوں کے پایوں تلے اس کے باپ کی سر دلاش رکھی ہوئی تھی۔ حیات کا باپ انہیں ماموؤں کے سہارے پر تو اپنی ننھی اور بیوہ کو چھوڑ گیا تھا کہ وہ انہیں ایک ایسا نظام دیں گے جوان کی دیکھ بھال کرے گا اور انہیں شریفوں کی طرح رہنے دے گا۔ اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ انہیں مال گاڑی کے خالی ڈبوں میں ٹھونس کر غنڈوں کے حوالے کر دیں گے ——— تاکہ اس کی بیوہ حیات کے بنے سنے ماموؤں کی تلاش میں رہے اور اس کی ننھی بچی سراؤں کے پریشان خیال بابوؤں سے بھیک مانگتی پھرے۔

" بیٹھ جاؤ قادر ——— " آخر محمود نے لڑکے سے کہا اور وہ وہیں جوتوں کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم لوگ بھیک کیوں مانگتے ہو۔ تم محنت مزدوری نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس قلیوں کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ تم سے بھی چھوٹے چھوٹے لڑکے کام کرتے ہیں" محمود نے پوری سنجیدگی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بابو جی میں تو بھیک نہیں مانگتا۔ میں تو اسٹیشن پر سامان اٹھاتا ہوں" لڑکے نے مسکینی سے کہا ——— " میرے ابا ہوشیار پور میں شہید ہو گئے۔ ان کے پاس بہت پیسہ تھا۔ سب سکھوں نے لوٹ لیا اور ان کو شہید کر دیا۔ بابو جی ہم قافلے کے ساتھ پیدل چل کر پاکستان آئے ——— ' لڑکے نے مزید کہا۔

" کیا تو بھی پیدل آئی ——— !" محمود نے ننھی حیات سے پوچھا۔

" بابو جی ہمیں تو قافلے کے ساتھ دوڑ دوڑ کر آئی تھی۔ کبھی میری اماں بھی مجھے اٹھا لیتی تھی" لڑکی نے کہا۔

" جھوٹی کہیں کی۔ میں ہی تو تمہیں کندھوں پر اٹھا کر لایا تھا" لڑکے نے کہا۔

"اور تم کہ کندھوں پر لاسنے تھے۔ بڑے آئے ماشاء اللہ" لڑکی نے تنک کر کہا۔

" دیکھو بھیک مانگنا بہت بُری بات ہے۔ تم لوگ بھیک مانگنا چھوڑ دو " محمود نے ایک مصلح قوم کی طرح کہا۔ لیکن اسے اپنے الفاظ کے کھوکھلے پن پر خود نفرت سی محسوس ہوئی اسے اپنا جملہ عجیب سا معلوم ہوا۔ بالکل بے معنی سا ——— اسے مظلوم تو رونا چھوڑ دے۔ اسے زخمی تو تڑپنا چھوڑ دے۔ اسے مقتول تو مرنا چھوڑ دے۔ اسے بھوکے تو بھیک مانگنا چھوڑ دے ——— اسے محسوس ہوا کہ اس نے ایک نہایت بے معنی بات کہہ دی تھی ——— اسے بے باپ کے بچو! اسے قصر ملت کی ٹوٹی ہوئی اینٹو اسے ضیا فتوں کے ہجوم میں رہنے والے حکمرانوں کے بھوکے ماتحتو۔ اسے تخت اقتدار کو اپنے کندھوں پر اٹھانے والے کنکروں کے ناچیز ذرّو! تم بھیک مانگنا چھوڑ دو ——— کیسی عجیب بات تھی ——— !

" اچھا بابو جی ' لڑکے نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" بابو جی ایک آنہ دو نا" لڑکی نے اس کے گلے میں ہار بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھوں تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں" محمود نے لڑکی کو ہٹا کر بستر پر بٹھا دیا۔

"یہ لو۔ دیکھ لو" لڑکی نے پیسوں کی چھوٹی سی تھیلی اپنی ہتھیلی پر الٹ دی۔ پیسوں۔ ادھنوں اور اکنیوں سے اس کی مٹھی بھر گئی۔ کاغذ کی ایک پڑیا سی تھیلی میں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑی۔

"دیکھوں تو یہ کیا ہے!" محمود نے وہ پڑیا اٹھا کر کھولتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے پیسے گننے میں مشغول رہی۔ بلیڈ کا ایک ٹکڑا کاغذ میں لپٹا ہوا تھا۔

"اری یہ کیوں رکھا ہے۔ کہیں ہاتھ کٹ جائیگا باہر پھینک دوں!" محمود نے کہا۔

"نا۔ بابو جی۔ نا" اور اس نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے چھین لینے کی کوشش کی۔

"بتاؤ اسے کیا کرو گی!" محمود نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"قادر کی جیب کاٹوں گی" حیات نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا اور بڑھ کر محمود کے ہاتھ سے بلیڈ لے لیا۔ محمود کو محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی بچی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں گر گئی تھی بلکہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی قوم کی آنے والی پوری نسل ہاتھوں میں قینچیاں اور بلیڈ لئے بازاروں میں نکل آئی تھی۔ اقتدار نے ان کی حمیت، وخودداری کی جیب کاٹ لی تھی اور اب وہ پیسوں والی جیبیں کاٹنے کے لئے ہاتھوں میں قینچیاں اور بلیڈ لے کر نکلے تھے تاکہ انسانیت کی جیب کاٹ کر اسے مفلس وقلاش کر کے اپنی سرزمیں سے جلا وطن کر دیں۔ جن لوگوں نے، انہیں جلا وطن کیا تھا اب انہیں کے اشاروں پر یہ انسانیت کو بھی جلا وطن کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے نام کی کوئی چیز اس سرزمین میں نہ رہ جائے اور جن پر ذرا بھی انسانیت کی زندگی کا شبہ ہوا انہیں ہنگامی قوانین کے تحت تہ خانوں میں محفوظ کر لیا جائے اور جوانوں کو چھوڑ دیا جائے کہ ملک کے گلی کوچوں میں کلیلیں کرتے پھریں ـــــــــــ اسے ذرائع ووسائل سے بھرپور اس ملک میں کوئی ایسا ہاتھ نظر نہ آتا تھا جو ایک بے سہارا عورت اور بے بس لڑکی کے سامنے زندہ رہنے کی کوئی شریفانہ راہ کھول سکے۔ اسے خطرہ ہوا کہ غیرت وحمیت کے خلاف یہ منظم مہم شرافت کو کب تک اس ملک میں رہنے دیگی۔

گھرر گھرر ــــــــ فوجیوں سے بھری ہوئی ایک موٹر چوراہے پر آکر رکی۔

"بابو جی - بابو جی ، ایک پیسہ۔ ون آنہ دو نا بابو جی" لڑکا اور لڑکی دونوں اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود نے دونوں کو ایک ایک آنہ دے دیا۔

"دیکھو بھیک مانگنا بہت بری بات ہے" اس نے ایک ایسے خشک واعظ کی طرح کہا جو دنیا کا انتظام ظالموں اور فاسقوں کے ہاتھ میں دے کر خود ایسے الفاظ کے مفہوم سے بھی بے خبر ہو چکا ہو۔

"اچھا بابو جی۔ سلام بابو جی" دونوں نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر بھاگ گئے۔

فوجیوں کی قطاریں سینما کی طرف جا رہی تھیں۔

"بابو جی ایک پیسہ۔ بابو جی ون پالش۔ ون آنہ صاحب" دونوں بہن بھائی ان کے پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ محمود انہیں یوں ہاتھ پھیلائے ان کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے آنے والی ساری نسل کاسۂ گدائی لئے دنیا کے چوراہے پر بھیک مانگنے کے لئے بھاگی جا رہی تھی۔ اس نئی پود میں وہ اپنے ہونے والے بچوں کو بھی دیکھ رہا تھا ـــــــــ قصر ملت کی ایک ایک اینٹ شکستہ حالت میں اس کے سامنے پڑی تھی۔

"انگریز کی چھوڑی ہوئی ان چھچھوندروں نے قصر ملت کی بنیادیں کھود ڈالی ہیں" اس کے مشاہدے نے کہا ان بنیادوں کی ایک ایک

اینٹ اس کے سامنے بکھری ہوئی پڑی تھی۔

"ان گھونسلوں کا سر کچلنا ہی پڑے گا" اس کے عزم نے کہا۔

اور بہت دیر تک وہ اندر ہی اندر کھولتا رہا۔

بقیہ دیارِ عرب میں چند ماہ،

کاغذ اور کتابت معیاری نہیں، تھوڑی بہت اغلاط بھی موجود ہیں، ضخامت ۲۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہے، لیکن مواد کم سے کم پانچ سو صفحات کا ہے۔ کتاب مجلد اور خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت ساڑھے چار روپے ہے "مکتبہ چراغِ راہ۔ ۹۔ لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ کراچی سے شائع ہوئی ہے"

گلگشت

(ادارہ)

تسنیم روزنامہ "تسنیم" جو بزمِ صحافت سے دیر تک غیر حاضر رہا ہے گذشتہ جون سے پھر اپنی مسند پر جلوہ آرا ہے۔ تسنیم کا یہ تیسرا دور پہلے دونوں دوروں کے مقابلے میں باوقار اور پائدار معلوم ہوتا ہے۔ یہ واحد روزنامہ ہے جو نظامِ اسلامی کے قیام کا داعی اور تحریکِ اقامتِ دین کا نقیب ہے۔ یہ صحافت کی انجمن میں تنہا ہے اور یہ تنہا ایک انجمن ہے۔ بے باکی کی جو مقدار حق گوئی کے لئے درکار ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے اسے اول روز سے نوازا ہے۔ سنجیدگی و متانت اور دیانت وراستی اس کے بنیادی اصول ہیں۔ با اصول ایسا کہ اگر راگ رنگ کو اسلام کی فطرت سے ناساز گار تسلیم کرتا ہے تو پھر ریڈیو پروگرام تک سے وہ اجزا الگ کر کے شائع کرے گا جن میں "آرٹ" دینِ برحق کی اخلاقی حدود کو پھاند جاتا ہے۔ پھر غیور اتنا کہ بھوکوں مر جائے گا۔ لیکن کسی ایسے اشتہار کی کمائی سے پیٹ نہ بھرے گا جو کاروبار کی نوعیت یا عبارت اور ترتیب کے لحاظ سے پابندِ اسلام نہ ہو۔

پورے پاکستانی پریس میں غیر اسلامی رجحانات کے خلاف لڑنے والا یہ واحد روزنامہ اس کا حقدار ہے کہ ملک کے اسلام پسند عناصر اس کا خیر مقدم کریں۔

تسنیم کی ادارت ملک کے مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز، مصباح الاسلام فاروقی صاحب کی معاونت سے فرما رہے ہیں یہ "المسرور" بنک اسکوائر دی مال، لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ بیالیس روپے۔

نمک پاش کراچی سے ایک مزاحیہ ہفت روزہ مجید لاہوری اور رشید بھٹی کی مشترکہ ادارت میں "نمکدان" کے نام سے نکل رہا تھا۔ لیکن یہ پبلک میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ ساتھ "نمک موازی" کی آزمائش میں پڑ گیا۔ آخر اسے "کان نمک" میں گرتے دیکھ کر رشید بھٹی بچارے نے اپنی جان بچائی۔ مجید صاحب کے لاہوری نمک کے کاروبار سے الگ ہونے کے بعد بے بس ہو کر رشید بھٹی نے "نمک پاش" نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نمک اپنی نمکیت کھونے سے بچ گیا، ورنہ اگر نمک ہی نمکیت کھو دے تو آخر دنیا کی چیزیں کس چیز سے نمکین کی جاسکتی ہیں۔

نمک پاش کا پہلا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ بہت سے پہلو ارتقا طلب ہیں۔ لیکن پرچہ اس قابل ہے کہ اس کے مستقبل سے اچھی توقعات وابستہ کی جائیں۔ خصوصاً اس کی فطرت میں رشید صاحب کی غیرت و حمیت کا جو خمیر شامل ہے، وہ سفارش کرتا ہے کہ لوگ نمک پاش کو قدر کی نگاہوں کا مستحق قرار دیں ——— مستثنیٰ صرف وہ حضرات ہیں جو اپنے ساتھ اخلاقی ناسور لئے ہوئے ہوں، ان کی بہرحال خیر نہیں!۔ چندہ سالانہ، پانچ روپے۔ پتہ اخبار منزل، کراچی ملہ۔

مشیر کراچی کی جوانمرد سرزمین سے ایک نیا ماہنامہ "مشیر" نکلا ہے۔ عبد الغفور بیگ اس کے مرتب ہیں، جن سے ہمارا غائبانہ تعارف پہلی مرتبہ مشیر ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ اس نئے ماہنامے کا ہم اس بنا پر دلی خیر مقدم کرتے ہیں کہ اس نے ملک کے اسلام پسند عناصر کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مزید کی حد تک حق گوئی کی جرأت موجود ہے۔ جس کا مظاہرہ گذشتہ

دو شماروں میں اعتدال کے ساتھ کیا گیا ہے۔

"مشیر" بالعموم ایسی اونچی تحریروں اور ترجموں کا مجموعہ ہوتا ہے جو ایک اوسط درجے کے انسان کو تجربیات میں ذہنی، نفسیاتی اور اخلاقی لحاظ سے مدد بہم پہنچا سکتی ہیں۔ "مشیر" کو اگر کوئی مشورہ دیا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنے گلدستے میں جن جن پھول پتیوں کو جگہ دے، ان کے متعلق یہ حوالہ دے دیا کرے کہ کون کس چمن اور کس کیاری کا پروردہ ہے۔ اس طرح وہ ایک مختصر سے "ڈائی جسٹ" کا صحیح مقام حاصل کرلے گا اور یہ مقام اردو جرائد کی صف میں خالی چلا آرہا ہے۔

چندہ سالانہ : تین روپے

مقام اشاعت : بندر روڈ، کراچی ملہ

کارنامۂ اسلام

میاں بشیر احمد صاحب (ہمایوں) جو آج ترکیہ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے مامور ہیں ایک صاحب نظر ہستی ہیں۔ معلومات جمع کرنے اور مرتب کرنے کا خاص ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ اسی ملکہ کا مظاہرہ انہوں نے اپنی تازہ تالیف "کارنامۂ اسلام" میں کیا ہے۔

کارنامۂ اسلام میں تاریخ اسلام اور عالم اسلام (باصطلاح مروجہ) کے متعلق جو معلومات جمع کی گئی ہیں اُن سب میں زیادہ قیمتی وہ نقشے اور چارٹ ہیں جن کے ملاحظہ سے تاریخ اسلام سمٹ کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خصوصیت سے "نقشۂ تاریخ اسلام" بہت اچھی چیز ہے۔ دورِ نبویؐ سے لے کر آج تک جتنی مسلم حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ ان سب کو تاریخی ترتیب کے ساتھ (سن آغاز اور سن خاتمہ کی تصریح کے ساتھ) ایک چارٹ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ ان حکومتوں میں سے متعدد ایسی ہیں جو اوسط درجے کے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بالکل نئی ہوں گی۔

جناب مؤلف نے "کارنامۂ اسلام" اور "کارنامہائے مسلمین" کو اگر ایک ہی چیز نہ بنا دیا ہوتا تو کتاب کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی۔ افسوس کہ کوئی ایسا خطِ فاصل موجود نہیں جو ان دوگونہ حقیقتوں کو جدا جدا کر دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ "مسلمان" کہلانے والوں کا ایک بڑی تعداد میں کرۂ ارضی کا مالک بنے رہنا بھی کارنامۂ اسلام قرار پاگیا۔ ... پھر یہی وجہ ہے کہ جناب مؤلف نجد کی وہابی تحریک اور ... تحریک ... معاملوں کو ایک ہی معیار پر رکھتے ہیں۔ ادھر ہندوستان کی تاریخ میں ... شاہ ولی اللہ اور سرسید احمد خاں کے کارناموں میں بھی کوئی اصولی فرق نہیں واضح فرماتے۔

تاریخ پر اگر کوئی زیادتی ہوسکتی ہے تو یہی کہ واقعات و احوال کی قدر و قیمت مشخص کرنے کے لئے کسی اصولی معیار کو اختیار کئے بغیر اس کا مطالعہ کیا اور کرایا جائے۔

مؤلف اسلام کو ایک "انقلابی تحریک" قرار دیتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے عالم اسلام میں ——— اور خصوصاً پاکستان میں اسلام بہ حیثیت انقلابی تحریک کے کتنے ایک مسلمانوں نے اختیار کیا ہے؟ پھر آپ نے بجا فرمایا کہ "اسلام کی آمد دنیائے قدیم کی موت تھی اور دنیائے جدید کی آفرینش" لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس "دنیائے جدید" کو قتل کر کے دنیائے قدیم کو پھر کس نے زندہ کر دیا ——— اور آج جو لوگ اسلام کی دنیائے جدید کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے ساتھ خود مسلمانوں کی طرف سے کیا سلوک ہو رہا ہے؟

آپ نے یہ بھی صحیح فرمایا کہ "اسلام دنیائے حاضر کے لئے اپنا ایک خاص مقصد و منتہا رکھتا ہے جس کی دنیا کو اشد ضرورت ہے" اور یہ کہ "صرف اسلام ہی اخلاقِ جدید پہ انسان کو اس بھاری ذمہ داری کیلئے تیار کرسکتا ہو جو سائنس نے اسکے کندھوں پر ڈال دی ہے" [illegible] عالم اسلام کیا کررہا ہے

[illegible]

——— اور جو لوگ اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہتے ہیں ان پر کیا کیا کرم ہو رہے ہیں؟ کاش کہ میاں صاحب اس پر بھی قلم اٹھاتے ——— اور وہ اس کی پروا نہ کرتے کہ وہ آج کل ترکیہ میں پاکستان کے سفیر ہیں، کیونکہ مصنف کی ذمہ داریاں سفارت سے زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ سفارت کا منصب ختم ہو جائیگا، لیکن آپ کی کتاب "کارنامۂ اسلام" برقرار رہے گی۔

بہرحال میاں صاحب کا جو نتیجۂ محنت ہمارے سامنے ہے۔ وہ قابلِ مطالعہ اور معلومات افزا ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ آٹھ آنے ——— ملنے کا پتہ۔ مکتبہ ہمایوں۔ ۳۲۔ لارنس روڈ۔ لاہور۔

رہنمائے انسانیت

اس کتاب میں صفوۃ الرحمٰن صاحب صابر نے اسلام کے دینِ فطرت ہونے کو واضح کیا ہے تصوف کے پُر پیچ زاویۂ نگاہ سے اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کی پیدا کردہ ذہنی پیچیدگیوں کو مؤلف نے بڑی محنت سے صاف کیا ہے۔ پوری کتاب قرآنی استدلال پر مبنی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ ——— ملنے کا پتہ: ادارۃ الحق۔ ڈیوڑھی یار جنگ۔ ڈاک خانہ شاہ علی بنڈہ۔ حیدرآباد دکن۔

خیر الکلام فی شہر الصیام

جناب مولوی محمد ابراہیم صاحب مدرس و مفتی دار العلوم حنفیہ اجمیر شریف نے اپنی اس تالیف میں روزہ کے احکام و مسائل فقہ حنفی کے مطابق جمع فرمائے ہیں۔ بلاشبہ یہ کوشش ایسی ہے کہ اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، مگر زبان، ترتیب، حکمت تبلیغ اور فن توضیح کے لحاظ سے یہ کتاب آج کے لکھے پڑھے آدمی پر گہرا اثر نہیں ڈال سکتی۔ جزئیات کا استقصاء ضرورت سے زائد بھی ہے اور پھر ایسے فرضی جزئیات کو خواہ مخواہ سمیٹا گیا ہے جن کے مطالعہ سے دورِ حاضر کے ذہن کو دین سے اور زیادہ دوری ہو سکتی ہے

قیمت ۱۲ آنے۔ ملنے کا پتہ: کارخانہ انیس الصحت۔ پوسٹ آفس مارکیٹ۔ حیدرآباد پاکستان

نوائے ادب

یہ سہ ماہی رسالہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے زیر اہتمام ظہیر الدین مدنی صاحب کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب اور اس کے خدام کے متعلق تحقیقی مقالات پیش کئے جاتے ہیں جو اصحاب ذوق، خصوصاً اردو ادب کے طلباء کے لئے اپنے اندر افادیت رکھتے ہیں۔

اس رسالے میں ایک باب "مقالہ نما" کے عنوان سے ایسا قائم کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف علمی ادبی جرائد میں شائع ہونے والے علمی مقالات کا ایک انڈکس جدا جدا موضوعات کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ یہ اردو زبان میں اپنی طرز کی بالکل نئی کاوش ہے، اور بہت مفید ہے

چندہ سالانہ تین روپے۔ ملنے کا پتہ ۹۲۔ اربتی روڈ۔ بمبئی

ہماری کتاب

یہ اردو زبان دانی کی ابتدائی تعلیم کے لئے درسیات کا ایک جدید سلسلہ ہے۔ پورا سیٹ چھوٹی کتاب بیگا قاعدہ اور پہلی، دوسری اور تیسری کتاب پر مشتمل ہے۔

اس سیٹ کو افضل حسین صاحب ایم اے، ایل ٹی۔ ناظم درس گاہ جماعت اسلامی رام پور (ہند) نے مرتب کیا ہے

یہ پہلا سلسلۂ درسیات ہے جو اس نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اور کرۂ ارضی پر انسانی زندگی کی صالحیت کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت کو عملاً اختیار کرنے پر ہے۔

چھوٹو منو کی کتاب میں صرف اسماء و اشیا اور ان کے ساتھ تصاویر دی گئی ہیں۔ مقصد بچے میں تعلیم کا ذوق پیدا کرنا ہے قاعدے میں خطِ نسخ اختیار کیا گیا ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے الفاظ کے انتخاب، فقروں کی ساخت، معلومات بڑھانے کی تدریج اور پورے سلسلہ کی ترتیب بڑی حد تک قابلِ داد ہے۔ قاعدے کے بعد کی کتابوں میں خطِ نستعلیق استعمال کیا گیا ہے۔

اگرچہ اس سلسلۂ درسیات میں شروع سے آخر تک ہند کا ماحول جھلکتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا لیکن اس کے باوجود پاکستان میں اس سلسلہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اس حال میں جبکہ اسلامی نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی درسیات کا ابھی تک پاکستان میں وجود نہیں ہے

قیمت :- چھوٹو منو کی کتاب ۴/ قاعدہ ۸/ پہلی کتاب ۸/ دوسری کتاب ۸/ تیسری کتاب ۱۰/

ملنے کا پتہ :- مکتبہ جماعت اسلامی، رام پور، یوپی - انڈیا۔

اخبارِ تنظیم اہلِ سنت کا مرزا غلام احمد نمبر

پاکستان میں قادیانیت ایک مذہبی فتنہ ہی نہیں، بلکہ ایک خطرناک سیاسی فتنہ بھی ہے یہ گروہ سرکاری ملازمتوں، صنعتوں اور تجارتی اداروں پر قابض ہو کر آہستہ آہستہ وہی شکل اختیار کرنا چاہتا ہے جو جرمنی میں یہود نے پیدا کر لی تھی ——— اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو مناظروں کی وبا میں مبتلا کر کے ان کو ٹھوس مسائل سے غافل کرنے اور قیامِ نظامِ اسلامی میں رکاوٹیں پیدا کرنے اور پھر عوام کے عقائد کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے ایک مہم شروع کئے ہوئے ہے۔

دراصل اس فتنہ کا استیصال کا صحیح راستہ تو یہ ہے کہ اس کی کلامی ہنگامہ آرائیوں میں الجھے بغیر اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے برپا کرنے کی جدوجہد کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا جائے، لیکن کچھ اصحاب اس دورس طریقِ کار کے بجائے ڈائرکٹ مناظرانہ طریقوں سے قادیانیت کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ اس میدان میں ادارۂ تنظیم اہلِ سنت نے جو کچھ کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی "مرزا غلام احمد نمبر" بھی ہے۔ اس میں قادیانی فلسفۂ نبوت، مرزا صاحب کی سیرت، ان کے اقوال و افعال اور امتِ قادیان کے احوال و ظروف کو واضح کرنے کے لئے نثر و نظم مضامین جمع کئے گئے ہیں۔

یہ نمبر اگرچہ بہت مقبول ہوا ہے اور اب اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے لیکن ہم بادب اتنی گذارش ضرور کریں گے کہ بعض مواقع پر سطحیت نمایاں ہے اور کہیں کہیں گفتگو پایۂ ثقاہت سے گر کر بالکل قادیانی سطح پر چلی گئی ہے، حالانکہ دعوت الی الحق کے لئے یہ چیز کبھی سودمند نہیں ہو سکتی۔

قیمت فی پرچہ ۱۰/ ملنے کا پتہ۔ دفتر تنظیم اہلِ سنت - چوک جھنڈا - لوہاری دروازہ لاہور۔

جاگیروں کو ختم کرنے کے لئے صحیح طریقِ کار

(نعیم صدیقی)

موجودہ نظامِ جاگیرداری جس قسم کے مفاسد رکھتا ہے، اُن کے بارے میں کئی سال سے لکھا اور بولا جا رہا ہے اور کوئی درد مند دل نہ ہوگا جو ان مفاسد سے نفرت نہ رکھتا ہو اور خلوص سے اِن کا ازالہ نہ چاہتا ہو۔ تاہم اِس مسئلے میں کچھ اختلافات موجود ہیں اور ان اختلافات پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے مناسب طریق سے بحث و تمحیص کی جا سکتی ہے، یہاں تک کہ کسی مسلک کی صحت واضح ہو جائے۔ اور دوسرے مسلکوں کی کمزوریوں سے لوگ واقف ہو سکیں۔ لیکن اِس مسئلے میں جو بحث سامنے آ رہی ہے وہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ پن کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم یہاں ٹھنڈے دل سے سوچنے والے اصحاب کے سامنے اپنا مسلک واضح کئے دیتے ہیں۔ اور اُن کو حق دیتے ہیں کہ وہ اِس سے سنجیدہ اور بااخلاق طریق سے ایک صالح بحث کی حدود میں رہ کر اعتراض و اختلاف کریں۔ ایسے اصحاب کے لئے چراغ راہ کے صفحات حاضر ہیں۔

چار مسلک | جاگیرداریوں کے متعلق ہمارے ہاں حسب ذیل مسلک پائے جاتے ہیں!

(۱) جاگیرداریاں برحق ہیں اور ان میں سے کسی کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔

(۲) جاگیرداریاں صحیح بھی ہو سکتی ہیں، غلط بھی، لیکن دی ہوئی جاگیروں کو واپس لینے کے لئے از روئے اسلام کوئی راہِ استدلال موجود نہیں ہے۔

(۳) جاگیرداریاں بیشتر غلط ہیں، اور شاذ ہی کوئی ہونگی جن کو اسلامی قانون کے تحت حدِ جواز میں رکھا جا سکے؛ اور یہ بھی قطعی ہے کہ ناجائز جاگیروں کو واپس سلب کر لینا چاہئے لیکن اس معاملہ میں تحقیق ضروری ہے اور اسلام کی چھلنی میں سے چاہے ایک جاگیر بھی بچ کر نہ نکلے۔ تاہم اِس چھلنی میں سے چھانے بغیر گول مول طور پر مجموعی حکم لگا دینا صحیح نہیں ہے۔

(۴) جاگیریں تمام کی تمام غلط بھی ہیں اور اُن کو سلب بھی مجموعی طور پر بغیر کسی تحقیق کے کر لینا چاہئے۔

اِن چاروں مسلکوں میں سے نمبر تین وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں، آخری مسلک وہ ہے جس کے حامی چاہے کتنے ہی مختلف قسم کے لوگ ہوں، لیکن اُس کی بنیاد اسلامی فلسفے پر نہیں بلکہ مارکسی نظریئے پر ہے۔ پہلے دو مسلک درحقیقت ایک ہی ہیں، صرف اندازِ بیان کا فرق ہے۔ اِن کے علمبردار خود جاگیردار، اِن کے متوسلین، حکمراں طبقہ، کچھ علماء اور قادیانی حضرات ہیں۔

دوسرے مسلکوں پر بحث کرنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے یہاں ہم اپنے مسلک کی وضاحت کر دینا چاہتے ہیں تاکہ جو اسے صحیح تسلیم کرے وہ بھی اور جو اس سے اختلاف کرے وہ بھی، باقاعدہ جان بوجھ کر کرے۔

جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا ریزولیوشن | جاگیرداری کے مسئلہ پر ... ہمارا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے بہترین توجیہ کا مستحق جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا وہ ریزولیوشن ہے جو اس نے اپنے اجلاس منعقدہ [illegible] تا [illegible] میں پاس کر کے جماعت کی پالیسی کا تعین کر دیا ہے۔ اِس ریزولیوشن کا وہ حصہ یہاں درج کیا جاتا ہے جس کا تعلق ہمارے

موجودہ موضوع گفتگو سے ہے :-

"مجلس شورائے جماعت اسلامی پاکستان اس بات پر نہایت افسوس اور تشویش کا اظہار کرتی ہے، کہ جب قرار داد مقاصد پاس کر کے یہ مملکت اپنے لئے اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے قبول کر چکی ہے۔ تو پھر جاگیرداری و زمینداری کے مسئلے کو اسلام کے مطابق حل کرنے میں تساہل سے کام لیکر ایسے حالات کیوں پیدا کئے جا رہے ہیں جن سے اس ملک میں طبقاتی جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ قرار دادِ مقاصد کے بعد اس ملک میں ایسے نظریات کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے جن کا مقصود ذرائع پیداوار کی ملکیت کو ختم کر کے ایسا پر اجتماعی ملکیت قائم کر دینا ہو، یا جن کی رو سے معاشی ذرائع کو از سر نو کسی ایسے طریق پر تقسیم کرنا تجویز کیا جائے جس میں افراد کی جائز اور ملکیتوں کے درمیان اسلامی شریعت کے مقرر کئے ہوئے امتیاز کو ملحوظ نہ رکھا جائے یہ مملکت پہلے ہی اس بات کو طے کر چکی ہے کہ یہاں جو کچھ بھی کیا جائیگا حدود اللہ کے اندر رہ کر کیا جائیگا اور اجتماعی عدل و انصاف کے قیام میں اُن اصولوں کی پیروی کی جائیگی جو اسلام نے ہم کو دئیے ہیں۔ لہٰذا قبل اس کے کہ جاگیرداری و زمینداری کا مسئلہ ایک خطرناک طبقاتی کشمکش کی صورت اختیار کر جائے، یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جلدی سے جلدی علمائے شریعت اور مسائل زمین سے واقفیت رکھنے والے تجربہ کار لوگوں کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو زمینداریوں اور جاگیرداریوں کے بارے میں پوری تحقیق کر کے یہ طے کرے کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے کن لوگوں کو زمینوں پر جائز حقوقِ ملکیت حاصل ہیں اور کن کو نہیں ہیں، پھر جن کے حقوق ثابت نہ ہوں، اُن کی ناجائز ملکیتوں کو بلا معاوضہ ختم کر دیا جائے، اُن کی املاک کو مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور ان کے لئے صرف اس بات کا انتظام کیا جائے کہ وہ اپنے ذرائع معیشت سے بالکل محروم ہو کر نہ رہ جائیں اور جن کے حقوق شرعاً ثابت ہوں اُن کی ملکیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے انہیں ایسی حدود کا پابند بنایا جائے جن سے وہ اپنی املاک کا صرف جائز فائدہ اٹھا سکیں اور اپنے مزارعین پر ظلم کرنے کے قابل نہ رہیں مجلس شوریٰ کی رائے میں زمینداری و جاگیرداری کے مسئلے کو اسلامی طریقے پر حل کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے اور اس پر بلا تاخیر عمل ہونا چاہئے"

اس قرار داد کا جوہر ذیل کی چند باتیں ہیں :-

(۱) زمینداری و جاگیرداری کو موجودہ غلط صورت میں قائم رکھ کر طبقاتی کشمکش کے پھوٹ پڑنے کے لئے جس طرح حالات سازگار کئے جا رہے ہیں، جماعتِ اسلامی کی مجلس شوریٰ اس پر تشویش محسوس کرتی ہے۔

(۲) زمینداری و جاگیرداری کے بارے میں جو اصلاحی قدم بھی اب اٹھائے جائیں وہ لازماً اسلامی اصول اور حدود اللہ کے پابند ہونے چاہئیں اور ان نظریات کو رنگ و تاز کا موقع نہیں دینا چاہئے جو خواہ مخواہ طبقاتی کشمکش ہی بپا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۳) مسائل زمین کو حل کرنے کے لئے جن بنیادی اصول و حدود اور جائز و ناجائز ملکیتوں کو متعین کرنے کے لئے جن اسلامی ضوابط کو پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے اُن کو سامنے لانے کے لئے جلد از جلد ایک ایسی مجلس مقرر کی جانی چاہئے جس میں اسلامی قانون و حدود کے علماء شریک ہوں اور مسائل زمین کے ماہرین بھی شامل ہوں۔

(۴) مذکورہ بالا مجلس پوری طرح غور و تحقیق کے ساتھ فیصلہ دے کہ زمین کی کونسی ملکیتیں اسلامی اصول و حدود کے لحاظ سے جائز ہیں اور کونسی ناجائز ہیں۔

(۵) جو ملکیتیں ناجائز قرار پائیں اُن کو بلا معاوضہ ختم کر کے مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۶) جن لوگوں کی ملکیتیں جائز قرار پائیں اُن کو ایسی حدود کا پابند بنایا جائے کہ وہ اپنی املاک کا صرف جائز فائدہ اُٹھا سکیں اور اپنے مزارعین پر ظلم کرنے کے قابل نہ رہیں۔

چند اشارات مذکورہ بالا چھ نکات میں سے ایک ایک پر غور کیجئے اور خود انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ ان میں سے آخر کونسا نکتہ (POINT) ایسا ہے جو شریعت اسلامی کی نگاہ میں باطل یا عقل سلیم کے معیار سے گرا ہوا ہے؟

یہاں اُن نکات سے متعلق چند مزید اشارات عرض کئے جاتے ہیں جو آپ کو سوچنے میں مزید مدد دے سکیں گے۔

نکتہ اوّل سے یہ بات ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کے اہل حل و عقد کو زرعی مفسدات کے برقرار رہنے میں اسلام نقصان اور طبقاتی نزاع کے بپا ہونے کا واضح امکان بشدت محسوس ہو رہا ہے اور وہ اُن وجوہ کا سدباب چاہتی ہے جو بالآخر سوسائٹی کا شیرازہ کردے سکتے ہیں کیا اس میں کوئی اختلاف ہے؟

نکتہ دوم میں اُس کی طرف سے جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زرعی مفسدات کا ازالہ اسلام کے اصول و قانون کے ذریعے کیا جائے، نہ کہ غیر اسلامی نظریوں کے تحت۔ کیا یہ وہ چیز ہے جس پر گالیاں دی جارہی ہیں؟

نکتہ سوم میں جو تجویز بیان کی گئی ہے وہ قانونِ عدل کے ایک تقاضے پر مبنی ہے کہ ملکیتوں میں مداخلت بہرحال جب قانونی طریق سے ہونی چاہیئے اور جو قدم اٹھایا جائے وہ حدود اسلامی کو متعین کر کے اُن کی پابندی میں اٹھانا چاہیئے کیا جھگڑے کا موضوع یہ ہے؟

اس سلسلے میں یہ بھی واضح رہنا چاہیئے کہ مجلسِ شوریٰ نے اپنے ریزولیوشن میں جائز و ناجائز ملکیتوں کا تعین بطور خود اس لئے نہیں کیا ہے کہ یہ کام بہرحال ایک ادارۂ مجاز ہی کے کرنے سے ہو سکتا ہے، نہ کہ محض جماعت اسلامی کے چند اہلِ علم و فکر کے پرائیویٹ مشوروں کے تحت! پھر کیا آپ اس روش کو غلط سمجھتے ہیں؟

نکتہ چہارم کی رُو سے نکتہ سوم ہی تقاضوں کے پیشِ نظر یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ جائز ملکیتوں کی بھی ایک قانونی تعریف اور ناجائز ملکیتوں کی بھی قانونی تعریف اسلامی قانون کے مآخذ اور خلفاء راشدین اور ائمۂ فقہا کے اجتہادات کی روشنی میں باقاعدہ متعین کردی جائے کیا سارا فساد اس نکتہ پر بپا کیا جارہا ہے؟

نکتۂ پنجم میں یہ کہا گیا ہے کہ جو ملکیتیں ناجائز ثابت ہو جائیں ـــــ چاہے وہ کتنی ہی کثیر ہوں ـــــ انھیں بلا معاوضہ سلب کر لیا جائے اور مستحقین میں تقسیم کر دیا جائے کیا اختلاف اس سے ہے؟

نکتۂ ششم میں یہ چاہا گیا ہے کہ شرعاً زمین پر جن لوگوں کے حقوق جائز قرار پاتے ہوں، اُن کو ایسی حدود کا پابند بنا دیا جائے کہ ان سے صرف جائز فائدہ اُٹھا سکیں اور اپنی ملکیتی زمینیں میں جن لوگوں کی محنت کو استعمال کریں اُن پر کسی طرح کا ظلم نہ کرسکیں۔

کیا شور مچانے والے عناصر کو اس چیز سے چڑ ہو رہی ہے؟

آپ براہِ کرم ہر ہر جزء پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے بتائیے تو سہی کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی ہے کہ جس پر گالیاں دینا، جھوٹے الزام لگانا، کیچڑ اُچھالنا اور گندہ ذہنی کا مظاہرہ کرنا مباح ہو جائے؟

ہم انصاف و دیانت رکھنے والے ہر متنفس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان چھیوں نکات میں سے کسی ایک کے خلاف اگر کوئی استدلال اللہ کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کی سُنت کی روشنی میں کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ جہاں ہم پر ہماری غلطی واضح ہو جائیگی ہم اپنی اصلاح کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کریں گے۔ رہے گالیاں دینے والے تو انھیں معلوم رہنا چاہیئے

کہ جب تک ہم اپنے آپ کو اسلام پر قائم محسوس کرتے ہیں، ہم اس طرح کی زیادتیوں کے دباؤ سے اپنا موقف بدلنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں اِن چیزوں کا پہلے ہی تجربہ ہے اور آئندہ کے لئے بھی بہ تائیدِ ایزدی اِن کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

جاگیروں کے متعلق مزید تصریحات

جہاں تک مجلسِ شوریٰ کے مذکورہ بالا ریزولیوشن کا تعلق ہے وہی حیثیت جماعت جماعتِ اسلامی کی پالیسی کا آئینہ دار ہے اور اسی کے لفظ لفظ پر جماعت کے نمائندہ اصحاب کی مجلس کا فرد فرد متفق ہے اِس سے آگے بڑھ کر افرادِ جماعت اور اکابرِ جماعت کی تصریحات کا مفاد صرف یہ ہے کہ اس ریزولیوشن کو سمجھنے کے لئے مزید معلومات سامنے آجائیں چنانچہ ذیل میں چند تصریحات درج کی جاتی ہیں:—

(۱) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے فرمایا :

"اسلام میں یہ بات فی نفسہٖ ناجائز نہیں ہے کہ ایک حکومت کسی کو کسی خدمت کے صلہ میں یا کسی آئندہ خدمت کے لئے معاوضہ کے طور پر آباد کاری کی خاطر زمین عطا کرے۔ اِس کی مثالیں خود خلافتِ راشدہ میں ملتی ہیں"

(نمائندہ تسنیم کی رپورٹ)

(۲) مولانا ئے موصوف نے فرمایا:—

"اسلامی قانون عطیۂ زمین کو بجائے خود ناجائز نہیں ٹھہراتا بلکہ جائز اور ناجائز قسم کے عطیہ میں فرق کرتا ہے"

(نمائندہ تسنیم کی رپورٹ)

(۳) مزید فرمایا :—

"چھان بین کا یہ اصول ہونا چاہیئے آیا حکومت نے یہ جاگیریں عطا کی تھیں وہ قانونی طور پر ایسا کرنے کا حق رکھتی بھی تھی یا نہیں؟ یہ دیکھنا پڑے گا کہ یہ زمین افتادہ (موات تھی) یا سرکاری (خالصہ)؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ یہ جاگیریں قومی خدمت کے بدلے دی گئی تھیں یا نہیں اور قومی خدمت کس نوعیت کی تھی؟ اور کیا وہ خدمت اِس قابل ہے کہ اُس کے بدلے جاگیریں ابھی تک باقی رکھی جائیں؟"

(ایسوسی ایٹڈ پریس کی رپورٹ)

(۴) پھر یہ بھی فرمایا :—

"اُس مسئلہ کا فیصلہ اسلامی قانون کے مطابق باقاعدہ تحقیقات کے ذریعے ہونا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ موجودہ جاگیرداروں میں کسی ایک کی جاگیر بھی جائز نوعیت کی نہ ہو۔ لیکن اس کا فیصلہ بہرحال کسی ضابطے اور اصول کے تحت ہی ہونا چاہیئے اسلام اپنی مملکت کی رعایا کو چند بنیادی حقوق عطا کرتا ہے۔ اُن میں سے ایک حق یہ ہے کہ کسی کے قبضے سے کوئی چیز اُس وقت تک نہ نکالی جائے جب تک کہ واجبی قانونی کارروائی (Due process of Law) کے ذریعہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ شخص اُس چیز پر ملکیت کے حقوق نہیں رکھتا، یا اُس نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کی بنا پر اس کے حقوق سلب کئے جانے چاہئیں اگرچہ مجھے یقین ہے کہ قانونی چھان بین کے بعد بہت تھوڑی سی زمینداریاں (بعض جاگیروں کے لئے مخصوص نہیں کی گئی) جائز ثابت ہوسکیں گی لیکن اس کے باوجود بھی شخصی آزادی کے بنیادی حق کے پیشِ نظر قانونی تحقیقات ضروری ہے"

(ایسوسی ایٹڈ پریس کی رپورٹ)

(۵) پھر فرمایا :-

تحقیقات کے اُصول پر عمل اسلئے بھی ضروری ہے کہ اگر آج کسی چیز کو قانونی تحقیق کے بغیر چھین لیں تو کل دوسری چیزوں کے لئے بھی اِس لٹھ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔" (تسنیم مورخہ ۲۴ جون ۱۹۵۰ء)

(۶) مزید صراحت کے لئے فرمایا :-

طبقاتی جنگ کو ہوا دینے والے اُشتراکی انقلاب لانے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں، اسلئے تحقیقات کے بغیر فیصلہ دینے پر بھی یہی طبقہ مجبور کر رہا ہے تاکہ اِن کے نظریہ کے مطابق زرعی جائداد کی شخصی ملکیت کا خاتمہ ہو جائے؛ بعد میں دوسری قسم کی انفرادی ملکیتوں کو قومی ملکیت میں تبدیل کرنا آسان ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ جاگیرداریوں کی تنسیخ کا اندھا دھند مطالبہ کر رہا ہے، ورنہ یہ بھی کوئی قابلِ نزاع بات تھی کہ تحقیقات کی جائے۔ اگر اُصولی اعتبار سے کوئی جاگیر بھی جائز نہیں ثابت ہو سکی (جیسا کہ ظن غالب ہے) تو معترض طبقہ کو اضطراب کس چیز کا ہے؟ ڈر کس بلا کا ہے؟ اور اِس قدر ناراضگی و برہمی کیوں؟ تحقیقات تو آئینی کارروائیوں کی جان ہے آخر اس کو کیوں بلاوجہ نظر انداز کر دیا جائے؟

(۷) آپ نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ :-

"اگر ایک حکومت کسی شخص کو ایسی زمین عطا کرتی ہے جس کے عطا کرنے کی وہ مجاز تھی، اور ایسی خدمات کے سلسلہ میں دیتی ہے جو کسی نہ کسی طرح اجتماعی مفاد سے تعلق رکھتی ہوں اور اُس کے عطا کرنے میں حدِ اعتدال سے بھی تجاوز نہ کیا گیا ہو تو یہ جائز نوعیت کی جاگیر ہے۔ اب براہِ کرم ان تصریحات کو بھی پڑھئے اور انگلی رکھ کے بتائیے کہ کہاں اسلام سے انحراف ہوا ہے؟ کہاں معقولیت اور انصاف کا دامن ہاتھ سے دیا گیا ہے؟ اور کون سا موقع ہے جس میں اسلام کے کسی اُصول کو نظر انداز کر کے کوئی خواہشاتی فیصلہ دیا گیا ہے؟

ایک اور حوالہ

جماعتِ اسلامی شہر لاہور کے ہفتہ وار مقامی اجتماعِ عام میں چند سوالات کا جواب دیتے ہوئے مولینا امین احسن صاحب اصلاحی نے فرمایا کہ :-

ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم محض سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی خاطر حق اور انصاف کے اُصولوں کو قربان کر دیں۔"

"ہمارے پیشِ نظر اصلی مسئلہ جاگیروں کا نہیں ہے، بلکہ حق اور عدل کے اُصولوں کا ہے جن کی حفاظت کے بغیر ہم ایک اسلامی جماعت ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ جاگیروں کے متعلق اسلام کا اپنا ایک اُصول ہے اور اِس اُصول پر چھان پھٹک کے بعد ہی ہم کسی جاگیر کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اِس اُصول پر پرکھنے کے بعد ممکن ہے کہ مغلوں اور انگریزوں کی بخشی ہوئی ایک جاگیر بھی سلامت نہ رہے، اور ظن غالب یہی ہے کہ شاید ہی کوئی سلامت رہے، لیکن خدائی نظام قائم کرنے والوں کو آخر کیا حق ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر کے کسی کا حق بغیر تحقیق اور بغیر انصاف کے غصب کر لیں؟

ہم اِس طریقِ استدلال کو صحیح نہیں سمجھتے جو حکومت پنجاب نے سیفٹی ایکٹ کی حمایت میں استعمال کیا تھا کہ ہم نے تو اس ایکٹ کے تحت صرف چھ آدمی نظر بند کئے ہیں۔ اصل سوال اُصول کی حفاظت کا ہے، جاگیروں کی حفاظت کا نہیں۔ اگر تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ تمام جاگیریں غلط بخشی کا نتیجہ ہیں تو سب کو مٹا دیجئے، لیکن بغیر تحقیق کے ایسا کرنا انصاف کے خلاف ہے۔"

اِس حوالہ کو بغور پڑھیئے جو ہمارے نقطۂ نگاہ کا ترجمان ہے اور پھر خدا لگتی کہئے کہ اس میں کونسا فقرہ اور لفظ انصاف و دیانت کے خط سے ذرا بھی اِدھر یا اُدھر ہٹا ہوا ہے؟

اختلاف کا حق

تاہم آپ کو اور ہر شخص کو اس نقطۂ نظر سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ اور ہم اس حق کو تسلیم کرنے کے لئے اپنے ذہن ظرف کو وسیع پاتے ہیں جس کا ایمان اسلام پر ہو اُس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ جس حد تک بھی اختلاف کرے، اپنی رائے کی بنیاد یں خدا کی کتاب اور اُس کے رسولؐ کے فرمودات پر رکھے اور سند لائے تو خدا کے دین سے لائے، نہ کہ دھندلے زعم تصورات کو نصِ قطعی قرار دے بیٹھے اور جس کو اسلام کے سوا کسی دوسرے اُصول اور طریقے سے دلبستگی ہو، اس کے لئے دیانت کی راہ یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اسلام کو پیش کرنے والے شخص پر کیچڑ اُچھالنا شروع کر دے اور اسلام کے اُصولوں کے خلاف اپنے دلائل دے اور واضح طور پر دعویٰ کرے کہ میں اسلام ہی سے اختلاف رکھتا ہوں۔

بہر حال اختلاف کرنے کے لئے اور بحث کرنے کے لئے یہ دونوں دروازے ہماری طرف سے کھلے ہیں۔

فتنہ انگیزی

لیکن مشکل یہ ہے کہ جن اصحاب نے اس سلسلے میں قلم کو حرکت دی ہے، اُنہوں نے حقِ اختلاف کا گندے سے گندہ اور ذلیل سے ذلیل طرزِ استعمال ممکن تھا وہ اختیار کیا ہے۔ اس میدان کے ہم شہسوار نہیں ہیں۔

آپ ہمارے مذکورہ بالا جوابوں کو سامنے رکھ لیجئے اور پھر لاہور کے روزناموں کے نوٹ، ماہنامہ طلوعِ اسلام، ہفتہ وار چٹان ہفتہ وار آفاق، روزنامہ الفضل، پندرہ روزہ احساس، ہفتہ وار ترجمان مسلم لیگ اور اسی طرح کے دوسرے جرائد کے وہ بیسیوں "محاسن" ضرور ملاحظہ فرمائیں گے:۔ جمع کر لیجئے جن میں جماعت اسلامی اور جاگیرداری کے موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے۔ آپ کم و بیش ان سب بحثوں اور نوٹوں میں حسبِ ذیل

(۱) لکھنے والوں کو مذکورہ بالا ارشادات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ملی جس کو وہ قابلِ قدر قرار دیتے کہ یا اتنی بات جو کہی گئی ہے وہ حق ہے اور ہم اس کو پیش کرنا [illegible] سمجھتے ہیں۔

(۲) کسی نے یہ نہیں کیا کہ جماعت کے ریزولیشن یا مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی تصریحات کو جوں کا توں پیش کر کے یا کم سے کم اُن کے مطلبوں کی دیانتدارانہ ترجمانی کرتے ہوئے اُن کے بارے میں سنجیدہ رائے دی ہو، بلکہ اکثر نے یہی کیا ہے کہ ایک [illegible] ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور ٹکڑوں کو بری طرح مسخ کر کے، بیشتر اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(۳) بالعموم اکثر لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں اختلاف کا زور دکھانے کے لئے پہلے جماعت اور مولانا مودودی سے وہ باتیں منسوب کیں جن کا کوئی سراغ بھی اُن کے اعلانات و تصریحات میں نہ مل سکے گا۔

(۴) اکثر نے انتہائی جذبات نفرت و اشتعال کا مظاہرہ کیا ہے اور ان میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا بچا ہو جس نے مہذب انداز میں گالیاں نہ دے لی ہوں۔

(۵) اختلاف کرنے کی بنا پر بہت سے بھونڈے الزامات ——— بلکہ انہیں صرف بدگوئی کہنا چاہیئے ——— بلا تحقیق کھل کر عائد کئے گئے ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) جماعت اسلامی حریف مسلم لیگ کی علمبردار ہے۔

اب "تحقیقات" کا نظریہ اسلئے ایجاد کیا گیا ہے کہ آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جاگیرداروں سے روپیہ حاصل ہو سکے۔

ا ت [illegible] ہو تے ہوئے مولانا مودودی نے حکومت سے جاگیرداروں کی حمایت کے لئے سازباز کر لی ہے۔

یہ سارے الزامات کس بنیاد پر دئے جا رہے ہیں؟ ——— اس پر کہ تحقیقات کی ضرورت واہمیت کیوں تسلیم کی جا رہی ہے بجائے اس کے سیدھی طرح بحث اس موضوع پر ہوتی کہ تحقیقات اسلام کی رو سے، یا جس نظام پر کوئی ایمان رکھتا ہو اُسکی

رُو سے فلاں فلاں دلائل کے تحت صحیح نہیں ہے امیرِ جماعت اور جماعت کے خلاف کیچڑ اچھالنے کی مہم شروع کر دی گئی بلا سوا یا معنی؟

(۶) بہت سے لکھنے والوں نے اپنے مضامین میں ایک ہی سانس میں کئی کئی بحثیں چھیڑ رکھی ہیں اور ہر مسئلے میں ان کو جماعت غلط ہی نظر آتی ہے ——— صرف اس لئے کہ اُس نے جاگیرداریوں اور زمینداریوں کی تحقیق کا مطالبہ کیا ہے۔ بعض نے تو اس موضوع پر قلم اُٹھانے کے بعد "غلامی" وغیرہ کے مسائل پر سوال چھیڑے ہیں جنہوں نے بیش ازیں موضوع کے تحت غیر متعلق سوال نہیں چھیڑے انہوں نے متوازی دوسرے موضوعات پر سلسلۂ مضامین شروع کر رکھے ہیں جن کی محاذ آرائی کی سعی ہے۔

(۷) طنز، پھبتیوں، تمسخر، تحقیر، گندہ بیانی وغیرہ کی قسموں سے مضامین اٹے پڑے ہیں۔

جو لوگ دو طرفہ ربط رکھتے ہیں، اور بحث کا دونوں پہلوؤں سے مطالعہ کرتے ہیں، اُن سے گزارش ہے کہ انہیں ہم نے [illegible] کو مختصر اشارات کی صورت میں درج کر دیا ہے، آگے بالمقابل اصحابِ اختلاف کی تحریروں کو جمع کر کے دیکھئے اور پھر اس کا تجزیہ کیجئے کہ ان میں مذکورہ بالا سات محاسن میں سے کون کون کیا تناسب رکھتا ہے۔ اسکے بعد ان ٹھوس باتوں کو نوٹ کیجئے جو ان سات قسم کی نگارشات کے علاوہ ہوں۔ پھر ان معقول باتوں کو جانچئے کہ ان میں حق کی مقدار کتنی ہے۔

اصل وجہ نزاع

اگر آپ دو طرفہ خیالات کا جائزہ لے کر یہ اندازہ کریں کہ اصل بنائے نزاع کیا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گی کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے قانونِ عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے باقاعدہ تحقیق کر کے ناجائز ملکیتوں کو بلا معاوضہ سلب کر دو۔ لیکن فریق ثانی یہ چاہتا ہے کہ تحقیق کے بغیر ملکیتوں پر سیفٹی ایکٹ کا رولر پھیرنا چاہیئے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس ملکیت کو ذبح کرنا ہو اُسے خدا کا نام لیتے ہوئے، اُسکی حدود حلال و حرام کی پابندی کرتے ہوئے اسلام کی چھری سے ذبح کرو۔ ہم سے اختلاف کرنے والے اس پر بضد ہیں کہ نہیں جھٹکا کرنا چاہیئے اور جماعتِ اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ جھٹکے کے جائز ہونے کا اعلان کرے۔

ہماری لڑائی جاگیروں کے بچاؤ کے لئے نہیں، بلکہ اسلام کے اصولوں کے بچاؤ کے لئے ہے۔ ہم قومی ملکیت کے اصول کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں اور کسی طاقت کے لئے یہ اختیار تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں کہ وہ لوگوں کی ملکیتوں میں اسلام کے حدود قانونی سے بے نیاز ہو اور واجبی کارروائی کئے بغیر جس طرح چاہے تصرف کرے۔ یہ طرزِ عمل خدا کی حاکمیت کے اصول کی جڑ کاٹ کے رکھ دیتا ہے اور [illegible] کے آئینی بنیادی حقوق کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے جن کی ضمانت اسلام نے دستوری طور پر دی ہے۔

جھگڑا صرف زاویۂ نگاہ (approach) کا ہے، ایک زاویۂ نگاہ کمیونسٹ فلسفے کے اثرات کے تحت پیدا ہوا ہے، وہ جاگیروں کا خاتمہ ایک خاص طریق سے چاہتا ہے، دوسرا زاویۂ نگاہ اسلام کا عطا کردہ ہے اور وہ جاگیروں کا [illegible] دوسرے طرز پر کرتا ہے ——— دونوں ایک ہی مقصد کو حاصل کرتے ہیں لیکن ایک جائز ذریعے سے کرتا ہے، دوسرا ناجائز ذریعے سے، ایک خدا کے نائبِ مطیع کی حیثیت سے خدا کے قانون کے مطابق اقدام کرتا ہے، دوسرا خدا سے آزاد ہو کر [illegible] انسان کو سرچشمۂ قانون بناتا ہے۔

پس نزاع اور بحث اور اختلاف کرنے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ خدا کے قانون کی پابندی کرنے کا راستہ حق ہے یا ہوائے نفس اور [illegible] کی راہ سچائی کی راہ ہے۔

بتائیے کہ کیا اس قسم کی بحث پر [illegible]؟ ——— ان لوگوں کو [illegible] پروپیگنڈے کا طوفان اُٹھانا ہے، جس کے علی الرغم [illegible] حق کی علمبرداری کر رہی ہے۔

اُنیس ۱۹ ماہ کے بعد . . .

نسیم جاوید

شکستِ خارِ مغیلاں کا وقت آ ہی گیا — رہِ وفا میں تیرے پاؤں ڈگمگا نہ سکے
تیری حیات، دلیلِ ثبات بن کے رہی — یہ شمعِ حق تھی بگولے اسے بجھا نہ سکے

•

سیاہ خانۂ شب سے اُنیس ماہ کے بعد — شعاعِ "مہر و صداقت" کا آفتاب آیا
افق سے تا بہ افق ظلمتوں کے پہرے تھے — دعائے نیم شبی کا مگر جواب آیا

•

نظامِ کہنہ کے مفلوج شاطرانِ کہن — یہ سوچتے ہیں کہ کس طرح "شہ" کو مات ہوئی
وہ مردِ حق جسے زنداں میں کر دیا تھا اسیر — اسی کی ذات، دلیلِ رہِ نجات ہوئی

•

اور اب یہ حال ہے جس سمت بھی نظر کیجئے — رواں ہے قافلۂ انقلابِ اسلامی
دلوں میں ولولۂ حق کی ہے لگن پیدا — لہو رُلاتی ہے، باطل کو اس کی ناکامی

•

اُفق سے پھوٹ رہی ہیں وہ آتشیں کرنیں — کہ جن سے برف کے تودے پگھلنے والے ہیں
پھر آج تیرہ صدی بعد بخت جاگے ہیں — پھر آج دہر کے نقشے بدلنے والے ہیں

•

یہ انقلاب حقیقت ہے رُک نہیں سکتا
نئی حیات کا در باز ہونے والا ہے
یہ کہنا ہے ہیں گلستاں چہک رہے ہیں طیور
کہ اب بہار کا آغاز ہونے والا ہے!

جب کبھی آپ بیمار ہوں

[illegible] اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے تو اس وقت قدرتی طور پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتے [illegible]
[illegible] وہ دواخانہ جس سے آپ اپنی دوائی لینا یا منگانا چاہتے ہیں اپنے مرکبات میں قیمتی اور اصلی ادویہ نسخوں کے صحیح وزن کے مطابق
استعمال کرتا ہے۔

کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپ کے لئے صحیح دوا تجویز کر رہے ہیں۔

[illegible] یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی ان دعووں کا باز آور [illegible] زمانے میں بھی [illegible]
[illegible] اعتماد ہے۔

عالیجناب امام طب حکیم نذیر احمد دہلوی کی سرپرستی حاذق دواخانہ کی

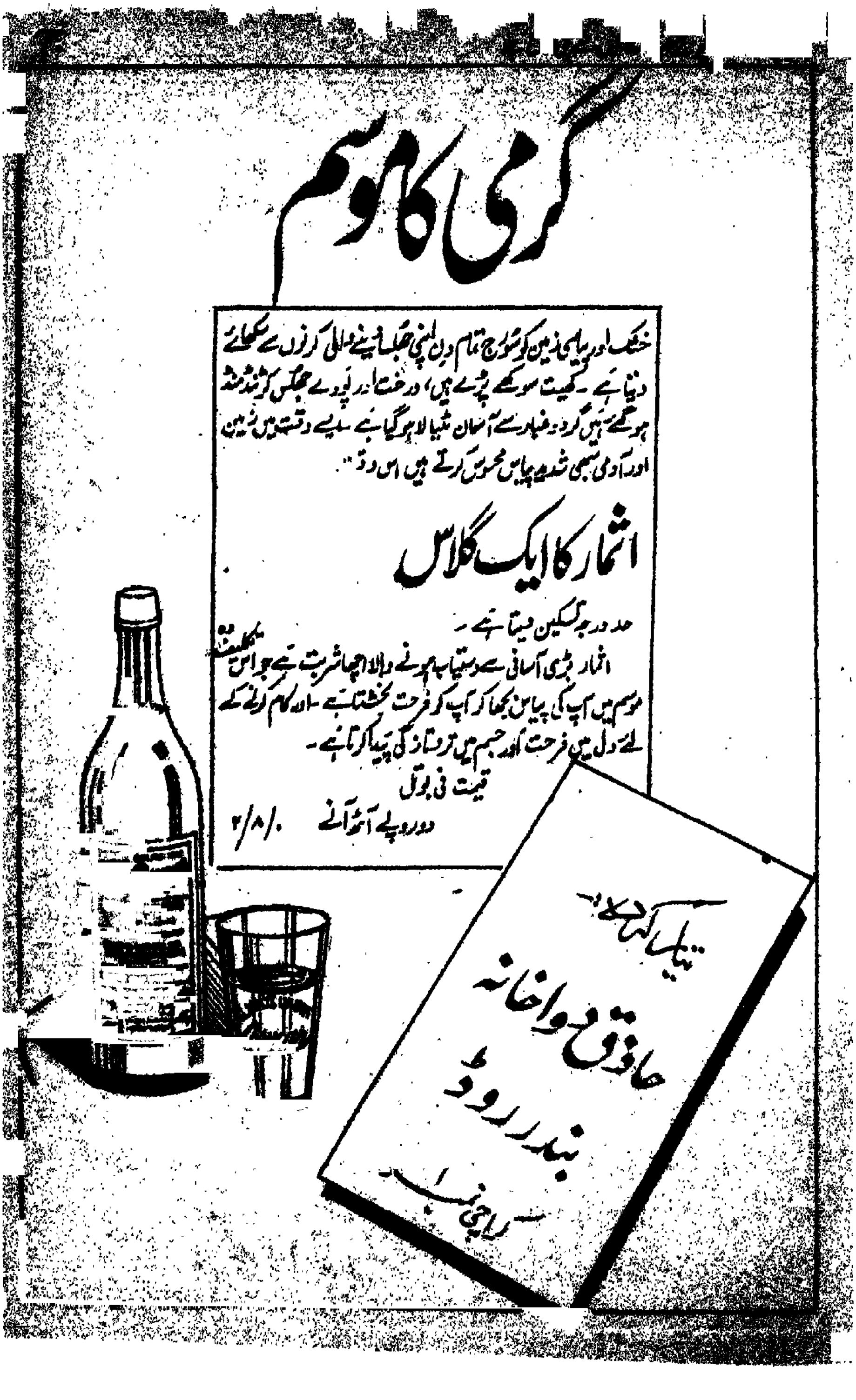
صداقت کی بہترین دلیل ہے،

[illegible] کسی تعارف کے محتاج نہیں ہندوستان کی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات خصوصاً آپ [illegible]
[illegible] طرح جانتے ہیں آپ فن طبابت میں ۵۰ سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے بہترین سال مسلسل طور پر مسیح الملک
[illegible] صاحب مرحوم دہلی کے طبیب پیشی کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں گزرے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ دہلی کے [illegible]
[illegible] رہ چکے ہیں کتاب حاذق اور مطلب کلاں آپ کی [illegible] تالیفات ہیں جو [illegible] تعریف [illegible]
[illegible] آپ کی طبی خدمات کے اعتراف میں [illegible] طبیہ کالج [illegible] کے جشن [illegible] کے [illegible]
[illegible] امام الطب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

[illegible] صاحب [illegible] حاذق دواخانہ کے [illegible] ہیں [illegible] تمام [illegible]
[illegible] دواخانہ کے [illegible]

[illegible] حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی


گرمی کا موسم
خشک اور پیاسی زمین کو سورج تمام دن اپنی جھلسا دینے والی کرنوں سے سکھا دیتا ہے۔ کھیت سوکھے پڑے ہیں، درخت اور پودے جھلس کر ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں گرد و غبار سے آسمان مٹیالا ہو گیا ہے۔ ایسے وقت میں زمین اور آدمی سبھی شدید پیاس محسوس کرتے ہیں اس وقت
اثمار کا ایک گلاس
حد درجہ تسکین دیتا ہے۔
اثمار بڑی آسانی سے دستیاب ہونے والا اچھا شربت ہے جو اس تکلیف دہ موسم میں آپ کی پیاس بجھا کر آپ کو فرحت بخشتا ہے۔ اور کام کرنے کے لئے دل میں فرحت اور جسم میں تر و تازگی پیدا کرتا ہے۔
قیمت فی بوتل
دو روپے آٹھ آنے ۲/۸/۰
تیار کردہ
حاذق دواخانہ
بندر روڈ
کراچی نمبر ۱

اپنے بچّے کو مضبوط بنائیے

نونہال

آخر کیا وجہ ہے کہ آپ کا بچہ قبض میں مبتلا رہے؟ اس کی صحت ناقابل اطمینان رہے؟ دستوں اور بدہضمی کی تکلیف کا شکار رہے؟ اور کمزور رہے
آپ اپنے بچے کو شروع ہی سے "نونہال" دیجیے۔
ان کو مضبوط بنانے والا اور ان کا دل پسند ٹانک ہے۔ جو بچوں کو بیماریوں سے بچاتا ہے۔ اور ان کو ہمیشہ صحت مند رکھتا ہے۔ دانت نکلنے کے زمانے میں بھی "نونہال" ایک ضروری چیز کے طور پر بچوں کو دینا چاہیے۔ اس سے بڑی آسانی سے بچے کے دانت نکل آتے ہیں۔

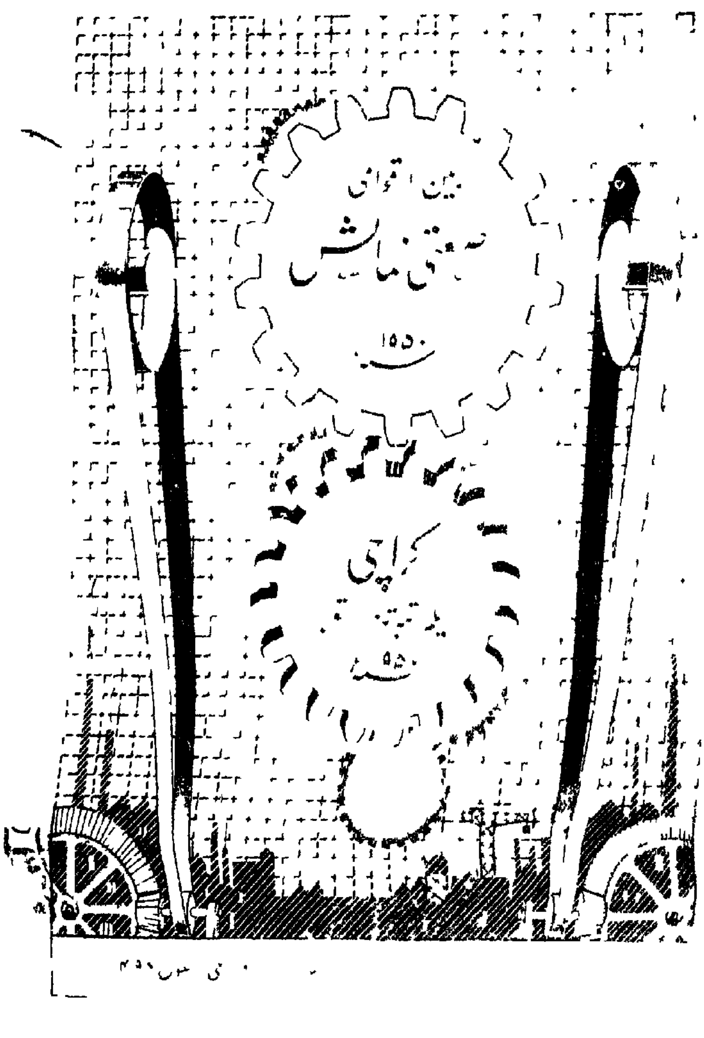
قیمت فی شیشی ایک روپیہ



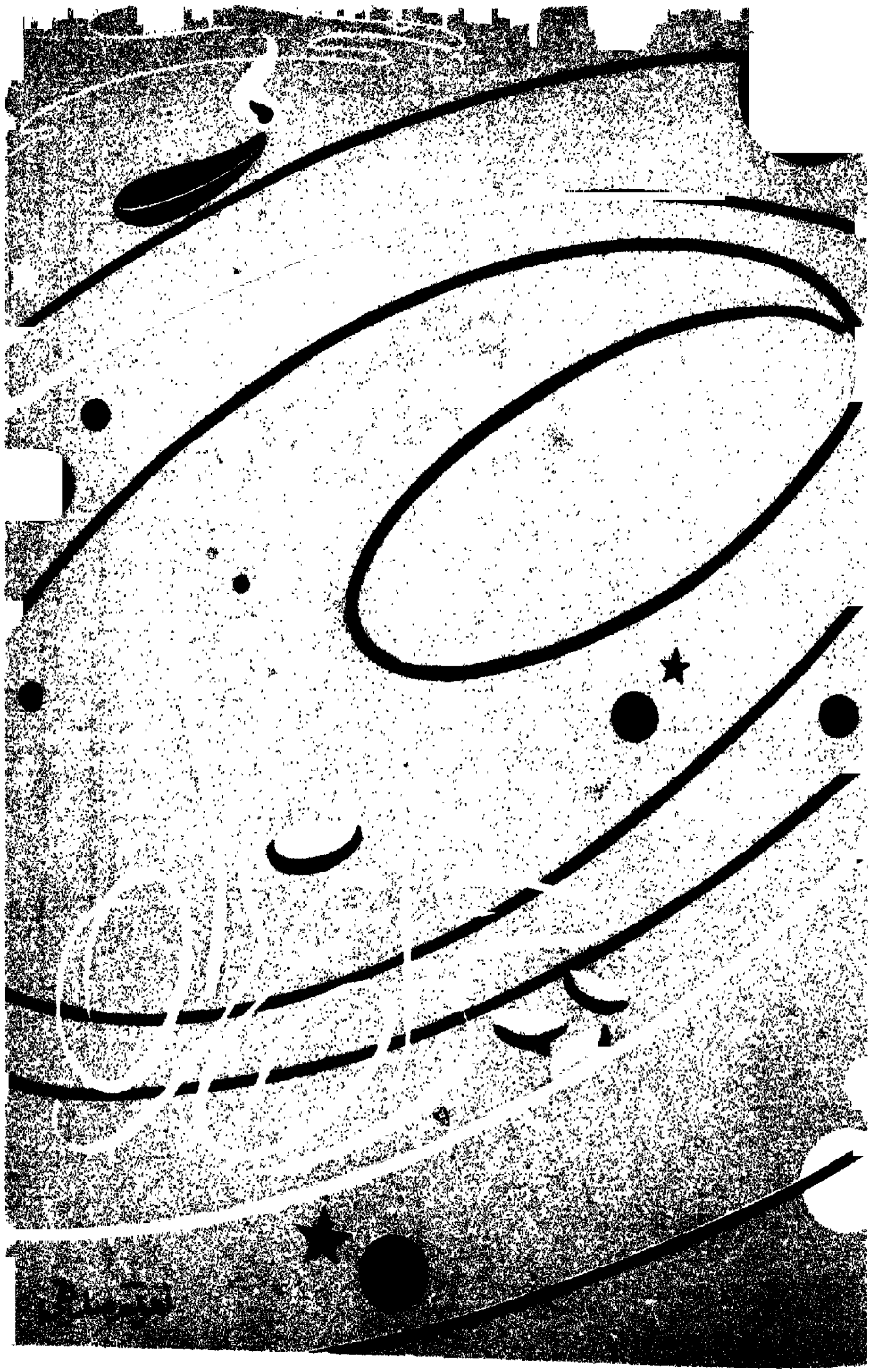
NAUNEHAL
THE — BEST — TONIC
— FOR — CHILDREN —

ساختہ ہمدرد دواخانہ، کراچی

. No. 1047 CHIRAGH-E-RAH KARACHI August 195(



Only Title Printed at the Shan Electric Press, Aramoaugh Road, Karachi.



ماہنامہ

چراغ راہ

جلد ۴۔ عدد ۷۔ ۹ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی نمبر ۱۔ ماہ جولائی ۱۹۵۰ء

چندہ سالانہ —— پاکستان ۔۔۔ روپے ہند ۔۔۔ روپے آٹھ آنے ‖ فی پرچہ —— پاکستان ۔۔۔ ہند ۔۔۔ آٹھ آنے

چودھری غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس ... روڈ کراچی سے چھپوا کر لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا

سوچ بچار

ہماری خارجہ پالیسی

ایک اہم ترین سوال آج ہمارے سامنے ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے پاکستان کیا حیثیت اختیار کر رہا ہے، اور ہماری سیاست و معیشت کی باگ ڈور جن حضرات کے ہاتھوں میں ہے وہ اپنی ملت کو کونسا مقام دلوا رہے ہیں؟

اس سوال کو سوچنے سمجھنے والے لوگ اول تو ہیں ہی کم، اور جو اس پر غور و فکر کرتے ہیں ان میں بہت بڑی تعداد کمزور قسم کے آدمیوں کی ہے جو اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے ان حقائق تلخ کو عوام کے سامنے کھول کر بیان نہیں کر سکتے ہیں جن سے اقتدار کی جبین پر بہر حال بل پڑ جانا چاہئیں۔ ان حالات میں ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ اس کے لیڈر اگر اس کا باقاعدہ کہیں سودا بھی کر ڈالیں اور زرِ ثمن وصول کر کے جیب میں ڈال لیں تو بھی وہ تالیاں پیٹ کر داد دے گی اور زندہ باد کا نعرہ بلند کر دیگی۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہماری خارجہ پالیسی جس نہج پر نشوونما حاصل کر رہی ہے، وہ ہر ذی فہم کے لئے سخت تشویشناک ہے۔ لیکن سیاسی کارکن، پریس، علماء اور ادیب باستثنائے چند اس معاملے میں انتہائی فرض ناشناسی کا ثبوت دے رہے ہیں، اور عوام پر اب تک واضح نہیں ہے کہ ان کی قسمتوں کی تعمیر کس طرح کی جا رہی ہے۔ اس موقعے پر اگر ہم بھی دوسروں کی طرح خاموش رہیں، حقائق سے صرفِ نظر کریں یا کہنے کی بات کو لپیٹ لپاٹ کے کہیں تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارا مقصدِ وجود کیا رہ جاتا ہے؟

"چراغِ راہ" کا مقام روزِ اول سے یہ رہا ہے کہ کہنے کی جس بات کو کوئی دوسرا نہیں کر سکا، اسے "چراغِ راہ" نے کھل کر کہا ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اسے حق گوئی کی کیا سزا کس کی طرف سے ملے گی۔ آج بھی جو سوال ہمارے پیش نظر ہے، اس کا جواب اگر کسی اور طرف سے عوام کے سامنے وضاحت کے ساتھ نہیں بیان کیا گیا تو چراغِ راہ پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کے اپنا فرض ادا کرے۔

پاکستان کے کارفرما طبقہ کی طرف سے خارجہ پالیسی کی جو تقدیر ملتِ پاکستان کی لوحِ جبین پر نقش کی جا رہی ہے اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی صورتِ حال کا نقشہ سامنے رکھنا ضروری ہے۔

آج کی پوری دنیا ایک طرح کی جاگیرداری کے نیچے جی رہی ہے۔ اس دنیا پر چند جاگیردار مسلط ہیں جن کے دو دھڑے ہیں۔ عالمگیر جاگیر کا ایک دھڑا وہ ہے جو سوویٹ روس جیسے بڑے جاگیردار کے جھنڈے تلے جمع ہے اور دوسرا وہ جو امریکہ کے گرد منظم ہو رہا ہے۔ دنیا کی چھوٹی حکومتیں ان جاگیرداروں کے مقابلے میں بالکل مزارعین کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیا کا سیاسی نظم و نسق اور معاشی اقتدار حقیقت میں بڑے جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہے، چھوٹی قومیں اور حکومتیں ان کی آلۂ کار ہیں۔ دونوں بڑے جاگیرداروں کے درمیان اصول کا بھی اختلاف ہے اور مفاد کا بھی۔ یہ اختلاف اس حد تک پروان چڑھ چکا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے لئے مستقل روگ اور جانی دشمن قرار دے چکے ہیں اور اس فیصلے پر پہنچ چکے ہیں کہ ایک ہی کرۂ ارضی پر دونوں کا بیک وقت اطمینان سے جینا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ایک محبوب ادیب نے [illegible] کشمکش جنگ [illegible] کی تیاریاں [illegible] تیاریوں کے تقاضے کے [illegible]

پالیسی صرف یہی ہے کہ کوئی اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ممالک کی حکومتوں اور عوام کو وابستہ کر لیتا ہے۔ اس مسابقت کے تحت بڑے بڑے کانفرنسیں ہو رہی ہیں، معاہدات استوار کئے جا رہے ہیں، چھوٹے ممالک کو زیر اثر لیا جا رہا ہے، بحری اور ہوائی اڈے قائم کئے جا رہے ہیں اور آئندہ جنگ کے لئے میدان اور محاذ تجویز کئے جا رہے ہیں۔ نیز دونوں طاقتیں بڑی سے بڑی قیمتوں پر قوموں کو قربانی کا بکرا بنانے کے لئے خرید رہی ہیں۔

سفید اور سُرخ دھڑے سے الگ کوئی تیسرا بلاک موجود نہیں ہے جو کسی نئے اصول پر منظم ہوا ہو اور نہ کوئی ایک ملک ایسا ہے جو ان دو دھڑوں کی کشمکش سے الگ رہ کر آئندہ جنگ کی روک تھام یا کم سے کم اس کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت اختیار کرے۔

ایک پاکستان ایسا ملک تھا جس کے عوام کی متفقہ خواہش یہ تھی اور ہے کہ وہ کسی کے گھوڑے کی پچھلی نہ بنیں اور نہ کسی طاقت کے خیمہ بردار وں میں شامل ہوں بلکہ اسلام کے منشا کے مطابق کامل استقلال کا عزم لے کر نئی زندگی کی تعمیر کریں۔ لیکن بدقسمتی سے اس ملک کے اقتدار کی باگ ڈور انگریز نے جن لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کی ہے اُن کو وہ ذہنیت ارزانی ہوئی ہی نہیں جس کے ساتھ کسی آزاد ملک کی سربراہ کاری کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسے طبقے کے لوگ ہیں جو برسوں سے علمی، تہذیبی، مجلسی، سیاسی اور معاشی ہر میدان میں مغربی آقاؤں کی غلامی کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے طرزِ فکر میں مغرب کی تقلید و مرعوبیت کی خصلت انتہائی حد تک رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گھر کے اندر کی فضا کو انگریزی اثرات سے آزاد کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، کجا کہ یہ خارجہ تعلقات میں آزادی کا مظاہرہ کر سکیں ان میں یہ استطاعت ہی نہیں ہے کہ یہ قانون، تعلیم، بنکنگ، عدلیہ، دفتری نظام، مارکیٹ سسٹم، اور معاشرت کے شعبوں میں کوئی ایسی تبدیلی کر دکھائیں جو یہ ظاہر کرے کہ فی الواقع اب انگریزی تسلط اس ملک سے ختم ہو چکا ہے اور ایک نیا نظام تہذیب و تمدن نشوونما پانے لگا ہے۔ بخلاف اس کے انگریز کے یہ جانشین وہ کچھ کرنے کے لئے بے چین ہیں جسے انگریز کرنا چاہتا تھا مگر "غیر" ہونے کی وجہ سے نہ کر سکا تھا۔ بقول —

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

ان حضرات کی نفسیات کا اگر صحیح تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساحل سے رخصت ہو جانے والے غیر ملکی اقتدار کے پیچھے لپک رہے ہیں اور اسے برابر پکار پکار کر اطمینان دلا رہے ہیں کہ ہم بدستور وفادار ہیں، آخر ہم نیاز مندوں سے یہ گریز کیوں؟ جو سانپ نکل گیا ہے، اس کی لکیر پیٹی نہیں جا رہی، پوجی جا رہی ہے اور بار بار لذتِ گزیدگی کا تصور حسرت بن کے سامنے آتا ہے کہ اب کون ہو گا جو ہمیں اس سرور انگیز طریق سے ڈسے گا!

ظاہر بات ہے کہ جب تک یہ ذہنیت ہم پر حکمران ہے پاکستان کس طرح اپنے لئے کوئی مستقل اور آزاد حیثیت حاصل کر سکتا ہے! یہ ذہنیت اُسے آہستہ آہستہ اینگلو امریکن بلاک کی مستقل غلامی کی طرف گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔

سیاسیات اور معاشیات میں ہمارے اکابر کی ذہنی غلامی کیا گُل کھلا رہی ہے، اس کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان حضرات کی فکری آزادی و غلامی کی حدود کیا ہیں؟

آج ہماری قیادت کی باگ ڈور جس طبقے کے ہاتھ میں ہے وہ میدانِ علم و فکر میں مغرب سے پوری شکست کھا چکا ہے۔ اس طبقے کے پاس سرے سے اپنے کوئی خیالات ہی نہیں ہیں، اپنا کوئی نظریہ و اصول تک نہیں ہے، بلکہ جو کچھ ہے وہ مستعار ہے، یا نقل یا سرقہ سے۔ مذہب، سیاست، قانون، ادب، فنون ہر پہلو سے یہ صرف وہی کچھ سوچ سکتے ہیں جو کچھ کہ ان کے آقاؤں نے سوچ لیا ہے۔

بڑی قوموں کے افکار سے آزاد ہو کر کوئی چیز سوچتے ہوئے یہ شرماتے ہیں اور اُن سے اختلاف کرتے ہوئے انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ ہماری نکشتی نہ ہو جائے۔ حد یہ کہ اِدھر اسلامی نظام کے قیام کا دعویٰ کریں گے اور اُدھر اپنے آقایانِ نامدار کو اطمینان دلانے کیلئے دوڑیں گے کہ ہمارا اسلامی نظام اِس طرح کا نہیں ہوگا جو حضور کو ناپسند ہو!

اس فکری غلامی کا نتیجہ ہے کہ مغربی تہذیب کے سارے مکروہات و مذمومات کو یہ اپنے ہاں فروغ دینے پر بضد ہیں چونکہ وہاں شراب نوشی علامتِ تہذیب ہے' اس لئے یہاں بھی اسے حرام ٹھہرانے کی جرأت نہیں کی جاسکتی' پھر اگر وہاں رقص و سرود اور بے نگری کا نام آرٹ ہے تو یہاں کی " اسلامی تہذیب" کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ان منکرات کو ترقی دینے کا اہتمام کرے' اگر وہاں بے حیائی لازمۂ ترقی ہے تو یہاں بھی ملکی استحکام کے لئے یہ بات فرض عین قرار پائی ہے کہ سوسائٹی کو زنا کے محرکات سے بھر دیا جائے' اگر وہاں عورت کو سڑکوں پہ گھمانا' پارکوں میں ٹہلانا اور کیمرے کے سامنے اُس سے پریڈ کرانا' گارڈ آف آنر کے لئے اسے استعمال کرنا اور بازیچۂ ہوس بنانا عقلیت پسندی کی معراج ہے تو یہاں بھی ہمارے اکابر کا " اسلامی نظام " اسی پر بضد ہے کہ ایسی قیامت کو ضرور بپا ہونا چاہئے۔

پھر فکری غلامی کے صدقے ہی میں یہ صورت حال نمودار ہوتی ہے کہ " اسلامی اسٹیٹ " کے قیام کا اعلان کرنے کے بعد اب مسلسل پسینے چھوٹ رہے ہیں کہ مہذب دنیا بدگمان ہو رہی ہے۔ راتوں کی نیند اس فکر میں اڑی جا رہی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ کیسی گھٹیا قوم ہے جو آج کے روشن دور میں بھی مذہب کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے' اتنا ہی نہیں اسے نظامِ ریاست میں بھی دخیل کرنا چاہتی ہے۔ ان حضرات کو برابر یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کیا طریقہ ہو جس سے اپنی ریاست کے لفظاً نہیں تو عملاً لادین (SECULAR) ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں کہ یہ امریکہ و برطانیہ کی جمہوریت کے نقشے میں کوئی بنیادی ترمیم ہی کر سکیں۔ ان میں اتنا بھی بل بوتہ نہیں کہ کھل کر یہ کہہ دیں کہ ہماری حکومت کے کلیدی مناصب ان لوگوں کو نہیں مل سکتے جو اُن بنیادی اصولوں پر یقین نہ رکھتے ہوں۔

اس طرح کی زندگی گیر فکری غلامی کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس میں مبتلا ہوں وہ اپنے آپ کو آگے چلنے والی قوموں کے مقابلے میں گھٹیا اور فروتر سمجھیں اور ان کی بالاتری کو تسلیم کر کے ان کی تقلید کریں؛ اُن سے وابستہ ہوں' اُن سے کامیابی اور ترقی کے گُر سیکھیں' انہی سے اپنے مسائل حل کرائیں' اُن سے ہر طرح کی امداد چاہیں ——— اور پھر اُن کے آلۂ کار بنیں' ان کی سیاسی چالوں کا شکار ہوں' اُن کو راضی رکھنے کی کوشش کریں اور ان کے لئے قربانی کے بکرے بننے کو خوشی خوشی تیار ہو جائیں۔

ٹھیک یہی رُخ ہے جس پر ہمارے رہنما گامزن ہیں اور اپنے پیچھے پوری قوم کو گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔ آج اینگلو امریکن بلاک سے ہمارے جو تعلقات استوار ہیں اور ہو رہے ہیں' ان کی نوعیت بالکل یہی ہے

آیئے' ذرا غور کیجئے کہ مالیاتی اور اقتصادی حیثیت سے بین الاقوامی طور پر ہمارا مقام کیا ہے؟ ——— آزادی یا غلامی؟ پاکستان میں ابھی تک انگریزی بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کا پلہ بھاری ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ قریب قریب ۹۰ فیصد بنکی سرمایہ غیر ملکی ہے۔ اس سرمایے پر ہر سال ایک گراں بہا رقم منافع کی پاکستان کی معاشی حدود سے نکل جاتی ہے اور اس سرمایے میں مزید اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ غیر ملکی (امریکی' برطانوی وغیرہ) سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو براہ راست پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے مہیا نہیں

ہیں، کیونکہ اس طرح ان کی صنعتی پیداوار کی کھپت میں کمی آسکتی ہے۔ بخلاف اس کے وہ بکی سرمایہ فراہم کرکے ہماری جیبوں سے سود وصول کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کو مالیاتی اور صنعتی لحاظ سے کمزور رکھنے کی اس پالیسی کو خود ہماری قیادت ہی کی سرپرستی حاصل ہے۔

پھر ہمارے ملک کی بہت سی بڑی بڑی کاروباری کمپنیوں پر بھی غیر ملکی اجارہ دار قابض ہیں۔ روئی، پٹ سن، چائے، پٹرول، جہاز رانی، اور ہائیڈرو الیکٹرک وغیرہ کاروبار ایسے ہیں کہ جن پر زیادہ تر غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعے پاکستان کی جیب سے لاکھوں روپیہ سالانہ برآمد کیا جارہا ہے۔

پھر برطانیہ کو پاکستان کی طرف سے خاص تجارتی ترجیحات حاصل ہیں۔ یہ ترجیحات دورِ غلامی کی افسوس ناک یادگاریں ہیں، جنہیں ہماری قیادت آزادی کے بعد بھی ختم نہیں کر سکی۔ ان ترجیحات کی رُو سے برطانوی مال پر دوسرے ملکوں کے مال کے مقابلے میں ۱۰ فیصدی کم محصول عائد کیا جاتا ہے۔ اس طرح پاکستان کو برطانیہ کے لئے نفع بخش منڈی بنائے رکھنے کا خاص اہتمام جاری ہے۔

پھر پاکستان کی ریلوں اور نہروں پر جو برطانوی سرمایہ لگایا گیا تھا اس پر کروڑوں روپیہ سود ہر سال پاکستان سے برطانیہ کو منتقل ہوتا ہے۔ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱۔ مارچ ۱۹۴۹ء تک تقریباً تین کروڑ روپیہ بطور سود ادا کیا گیا ہے۔ این، ڈبلیو، آر کی مد میں سے ۵ کروڑ روپیہ سالانہ برطانوی سرمایہ داروں کو ادا ہو رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ۴۰ کروڑ روپیہ کے جملہ سرمائے پر تقسیم سے قبل ۴۸ کروڑ روپیہ سود ادا کیا جا چکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

بین الاقوامی مالیات کے میدان میں پاکستان کی گردن اسٹرلنگ بلاک کی دُم سے بندھی ہوئی ہے۔ ہمارے اسٹرلنگ فاضلات بحق برطانیہ کے ذمے ہیں، ان کا ڈالر سے تبادلہ تمام تر برطانوی بنکوں کے واسطے سے ہوتا ہے اور وہ اس پر مسلسل کمیشن وصول کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مالیاتی وابستگی ہی کا یہ ایک نتیجہ تھا کہ جب برطانیہ کی پونڈ کی تقلیلِ قدر (devaluation) کا فیصلہ کیا تو ہمارے فاضلات میں از خود ۳۳ فیصد کی کمی واقع ہو گئی۔ اس طرح تقریباً ۶۰.۵ کروڑ روپیہ کا نقصان ہمیں اٹھانا پڑا۔ پھر اس مالیاتی وابستگی ہی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ آپ صنعتی ضروریات کی خریداری میں برطانیہ کے رحم و کرم پر ہیں۔ خود اس کی اپنی پالیسی یہ ہے کہ وہ آپ کو اشیائے صرف خصوصاً تفریحات زیادہ فراہم کرے اور مشینیں کم دے ——— اور اگر آپ امریکہ سے مشینری درآمد کرنا چاہیں تو وہ اپنے ڈالر اخراجات کا رونا رونے بیٹھ جاتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنی مالیاتی فوقیت کے زور سے پاکستان کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ ڈالری حلقے سے اپنی خریداری کو کم کر دے۔

یہ مالیاتی غلامی کوئی معمولی بلا نہیں ہے، بلکہ یہ محکومی کی وہ بدترین قسم ہے جس سے نجات پانے کی کوئی شکل تلاش کرنے کی وجہ سے ہماری قیادت بے بسی کے ساتھ بین الاقوامی سیاسیات میں اپنی ملت کو امریکی برطانوی بلاک کے آگے رہن رکھ دے رہی ہے۔

اب آیئے سیاسیات کی طرف!

سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت اینگلو امریکن بلاک اپنے مفاد کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ایک تو اس کے حریف رُوس کو اقوامِ متحدہ کے اداروں میں بھی اور سیاسی جوڑ توڑ کے عام میدان میں بھی شکست دی جا سکے، دوسرے مشرقِ وسطیٰ اور ایشیائی ممالک میں اسے جو سیاسی و معاشی بالادستی اب تک حاصل رہی ہے وہ زیادہ سے زیادہ حد تک برقرار رہے اور مصنوعات کو گراں خریدنے اور اجناس خام کو سستا بیچنے والی منڈیوں کے دروازے اس پر برابر کھلے رہیں، تیسرے یہ کہ رُوس سے مستقبل قریب میں اس کی جو جنگ ہونے والی ہے اُس جنگ کے لئے نہ صرف یہ کہ جنگی اڈے اور قربانی کے بکرے مہیا ہو جائیں بلکہ آڑے کام آنے والی حکومتوں کی ایک صف کی صف روسی

امپیریلزم کا مقابلہ کرنے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو جائے۔

ان تینوں مقاصد میں ہمارے اکابر امریکی برطانوی بلاک کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہو رہے ہیں

اقوام متحدہ میں روسی بلاک اور امریکی بلاک میں جو کشمکش ہو رہی ہے، اس میں ہمارے نمائندوں کی تقاریر اور ان کے ووٹ ہمیشہ امریکی بلاک کے لئے ریزرو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اریٹیریا اور سومالی لینڈ کا مسئلہ جب پیش ہوا اور سومالی لینڈ کو دس سال تک کیلئے از سر نو اطالوی قبضے میں دیئے اور اریٹیریا کے معاملے کو ایک سال کے لئے معرض التوا میں رکھنے کی تجویز اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے سامنے آئی تو ہمارے نمائندے کا ووٹ اسی غلام سازی کے پروگرام کے حق میں تھا

اب تک سفید بلاک کی طرف سے جتنی سازشی کانفرنسیں منعقد کی گئی ہیں ان میں پاکستان کے نمائندوں نے شریک ہو کر طے شدہ پروگراموں میں تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خصوصاً کامن ویلتھ کے ادارے اور اس کے مقاصد کی ہمیشہ تصدیق و توثیق کی گئی ہے اور ان کو حاصل کرنے میں اپنی پوری خدمات پیش کی گئی ہیں۔ اسی ادارے کے فیصلے کے تحت حکومت برما کو سینتالیس لاکھ روپیہ نقد اور ۲۵ ہزار رائفل پاکستان نے فراہم کی ہے، کیونکہ موجودہ حکومت برما کا وجود ہی برطانوی کاروباریوں کے لئے برما کے تیل اور ٹنگسٹن (دھات) پر قابض رہنے کا ذریعہ ہے۔

ابھی ابھی منیلا میں جو بوگیو کانفرنس جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے امن اور مفاد کو بچانے کے لئے فلپائن، آسٹریلیا، انڈیا، پاکستان، تھائی لینڈ اور لنکا کے درمیان "عالم بالا" کے اشاروں کے تحت منعقد ہوئی ہے، اس میں بہت جلد "مشترکہ مفاد" کو بچانے کے لئے "متحدہ اقدام" کا ریزولیوشن پاس ہو گیا۔

اس سے زیادہ دلچسپ یہ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ۲۵ مئی کو اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ ہند چینی کی جنگ میں فرانس کی کمزوری نمایاں ہے، اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اس پر ایک ممبر مسٹر جان ہوپ نے تقریر کرتے ہوئے۔ اصل مدعا کو یوں ظاہر کیا کہ:-

"یہ واضح ہے کہ اگر ہند چینی ہاتھ سے جاتا ہے تو برطانیہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ملایا کو بچا سکے۔ ملایا ہی نہیں، سنگاپور، اور برما بھی جائیگا، اور اگر ایسا ہوا تو پھر سیام، انڈونیشیا اور فلپائن کی بھی خیر نہیں۔"

اس خطرناک صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تجویز یہ سامنے آئی کہ برطانیہ، امریکہ، انڈیا اور پاکستان کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک یہ طے ہے کہ انڈیا اور پاکستان بہرحال ہمارے مفاد کے تحفظ کی ساری اسکیموں میں ہمارے زیر استعمال رہنے ہی والے ہیں۔

وہ تمام بین الاقوامی معاہدات جو اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے استوار کئے گئے ہیں اُن میں سے کچھ وہ ہیں جن پر انڈیا اور پاکستان کے دستخط ثبت ہیں اور بقیہ وہ ہیں جن پر دستخط کرنے کے وجوہ موجود نہ تھے اور ان کے لئے ولی تائید بہرحال شامل حال ہے۔

اینگلو امریکن بلاک مشرق وسطی کے مسلمان ممالک میں آزادی پسند اور اسلام پسند عناصر کو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے کچلوا کر جن "کارآمد" کٹھ پتلیوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھائے ہوئے ہے اور جن کی معرفت اس جنگی اہمیت کے علاقے کی سیاسیات

مالیات پر وہ بالواسطہ حکمران ہے' ان کے ساتھ ہمارے برسر اقتدار طبقہ کے دوستانہ تعلقات روز بروز گہرے ہو رہے ہیں۔ ان ممالک کے عوام اور خصوصاً عوام میں سے اسلام پسند اور فرنگ دشمن عناصر سے جس طرح اینگلو امریکن بلاک چڑھتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر کو بھی ان سے ایک گونہ بُعد ہے۔

ان ممالک کو روس کے مقابلے میں ایک مدافعتی بلاک بنا کے کھڑا کرنے کے لئے جو سازشی طریق کار اینگلو امریکن بلاک نے اختیار کر رکھا ہے' اس میں ہمارا برسر اقتدار طبقہ پورے پورے تعاون کا ثبوت دے رہا ہے۔ اتحاد ——— اور مسلم ممالک کا اتحاد — کس مسلمان کو محبوب نہ ہوگا' لیکن یہ اتحاد حب اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے نہ ہو بلکہ دشمنان اسلام کے اشاروں سے ہو اور انہیں کی اغراض کے لئے ہو تو معاملہ دوسرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس پُر معنی اتحاد کو تکمیل دینے میں پاکستان کے لیڈروں نے اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ ہمارے سفارتی تعلقات' ہمارے وزرا کا مصر اور دمشق میں نزول اجلال' چوہدری خلیق الزمان صاحب کا اسلامستان بنانے کے لئے سفر کرنا' ہمارے وزیر داخلہ کا ج مبروڈ سر آغا خاں کا پاکستان میں ورود اور شاہ ایران کے قدوم میمنت لزوم کا سرزمین پاکستان کو چار چاند لگانا اور پھر وہ استقبال جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی ——— یہ سب کچھ منصوبہ کے مطابق (According to plan) ہوا ہے اور منصوبہ بہرحال ہمارا بنایا ہوا نہیں تھا' بلکہ "عالم بالا" میں مرتب ہو کر القا ہوا تھا۔ اس منصوبہ کا منتہا بجز اس کے کچھ نہیں کہ فلسطین' مصر' عراق' عرب' ایران اور پاکستان کو آئندہ جنگ کا میدان بنانے کے لئے سازگار کیا جائے۔

ہر ملک کے لئے دفاع کا مسئلہ شدید اہمیت رکھتا ہے' خصوصاً پاکستان جیسے نوخیز ملک کے لئے جسے اس کے حصہ کا پورا جنگی سامان بھی نہیں مل سکا اور نہ برعظیم ہند کے اسلحہ ساز کارخانوں میں سے کوئی اس کے دائرۂ قسمت میں آیا ہے' دفاعی لوازم کی فکر کرنا اشد ضروری ہے۔ لیکن ایک نوخیز غیر صنعتی اور پسماندہ ملک کے سامنے صرف ایک دفاع ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ قومی معیشت کی تعمیر اور صنعتی استقلال کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ خود دفاعی قوت کی اصل بنیاد بھی قومی معیشت کی مضبوطی پر قائم ہوتی ہے۔ لیکن کچھ تو انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کی نوعیت نے اور ایک حد تک اینگلو امریکن پالیسی نے ہمارے رہنماؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی توجہات جنگی ضروریات کی طرف خاص طور پر منعطف کر دیں۔ اس حالت کو پیدا کرنے میں امریکہ و برطانیہ کے لئے چند در چند ٹھوس فوائد ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ جنگی ذہنیت پیدا ہو جانے کے بعد کسی مشرقی ملک کے سامنے جو ضروریات آتی ہیں اُن کے لئے وہ ان ممالک کا دستِ نگر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے' دوسرے یہ کہ ان ممالک کی اسلحہ ساز سرمایہ داروں کا کاروبار فروغ پاتا ہے' تیسرے یہ کہ پسماندہ ممالک میں صنعتی اور تعمیری کاموں کی ترقی رک جاتی ہے اور اس طرح امپریلیسٹ طاقتوں کے لئے منڈیوں کی پیشانیاں سالہا سال تک کے لئے وسیع رہتی ہیں چوتھے یہ کہ اسطرح زیر اثر ملکوں کی جنگی حس بیدار رہتی ہے اور اس سے بر وقت کام لیا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے لئے امریکہ و برطانیہ اپنے تمام زیر اثر ممالک میں جنگی ذہنیت پیدا کر رہے ہیں' اور جہاں یہ اچھی طرح نہیں پھیلتی وہاں کسی چال کے تحت ڈالری امداد دے کر یا بلا قیمت اسلحہ بھیج کر با آسانی پیدا کر لی جاتی ہے۔ دنیا کے جن ممالک میں جس حد تک یہ جنگی ذہنیت پیدا ہو جائے اس کا پیمانہ حکومتوں کے بجٹ ہوتے ہیں۔ ہر ملک کا بجٹ یہ بتا دیتا ہے کہ اس ملک کی قیادت کا رجحان تعمیری ہے یا جنگی۔ چنانچہ ہمارا مرکزی بجٹ دفاع کے لئے ۵۰ کروڑ روپیہ مخصوص کرتا ہے اور یہ رقم کل اندازۂ مصارف کا ۶۵ جز ہے۔

دفاع بلاشبہ ہمارے لئے اشد اہمیت رکھتا ہے اور ایک اسلامی ریاست کے وجود کو بچانا "عین جہاد فی سبیل اللہ" ہے جس کیلئے

ہم جو کچھ بھی قربان کریں وہ تھوڑا نظر آتا ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے لوازم پورے کرنے کے لئے صحیح طریقہ یہ نہیں کہ ملک کی تعمیر معیشت کی مدات سے رقمیں بچا کر ادھر صرف کر دی جائیں، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عوام الناس میں اسلامی جذبات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر کے ان کے اندر اتفاق و ایثار کا ایک عام ولولہ پیدا کر دیا جائے ——— لیکن یہ ولولہ وہ لوگ کیسے پیدا کریں گے جو اپنی بڑی بڑی تنخواہوں میں کوئی کمی کرنے اور اپنی عیاشیانہ عادات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے پر تیار نہ ہوں۔ ایسے لوگ اس کے سوا اور کر ہی کیا کر سکتے ہیں کہ تعمیر معیشت کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر دفاع کی ضروریات پوری کریں۔ اور یہی مطلوب ہے اینگلو امریکن بلاک کو! ان کا یہ مطلوب پورا کرنے میں ہمارے اکابر بھلا کوئی کوتاہی کیسے کر سکتے ہیں۔

مشرقی ممالک کو مسخر کرنے کی اینگلو امریکن پالیسی نے انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کو درست کرنے میں بھی اپنا پورا پارٹ ادا کیا ہے۔ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا ہوگا کہ دونوں حکومتوں کے اکابر جو ایک وقت میں گذشتہ جنگی جذبات کے راستوں پر بھاگ رہے تھے، دوسرے وقت میں یکایک گلے مل گئے اور ایک دوسرے کی تعریف میں رطب اللسان نظر آنے لگا، تو آخر یہ "معجزہ" کیسے رونما ہوا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس وقت چونکہ امریکہ و برطانیہ سمجھتے ہیں کہ اگر مشرقی ممالک اور خصوصاً انڈیا اور پاکستان میں کوئی تصادم ہو تو کمیونزم کے جراثیم کو گھس کر اپنا کام زور شور سے کرنے کا موقع مل جائیگا۔ لہٰذا وہ اس پر تیار نہیں ہیں کہ یہاں تصادم برپا ہونے دیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں جب دونوں ہمسایہ حکومتوں کے مابین کھچاؤ بڑھ گیا تھا اور دونوں طرف جنگ کے امکانات پر گفتگو میں ہونے لگی تھیں، ہماری قطعی رائے یہ تھی کہ جنگ کا کوئی امکان نہیں، کیونکہ اس وقت "عالم بالا" اس کی اجازت نہیں دے سکتا اور وہاں سے جب تک اذنِ جنگ نہ ہو۔ کوئی بڑے سے بڑا جنگ جو پروپیگنڈہ کی جنگ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بعد کے واقعات نے ہماری اس رائے کا ایک واضح ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

اِدھر صرف اتنی دھمکی کافی ہے کہ اگر تم لوگوں کو باہم جنگ ہی لڑنی ہے تو یہ سمجھ لو کہ پھر نہ تمہیں ماہرین کی خدمات ہی بہم پہنچائی جائیں گی اور نہ اسلحہ اور دیگر مادی ضروریات ہی کی امداد دی جائے گی بہرحال یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ آناً فاناً گفتگو مصالحت کی سلسلہ جنبانی شروع ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے فضا کا نقشہ پلٹ گیا۔ یہ ٹھیک وہی نقشہ تھا کہ نبی صلعم پر خدا تعالےٰ کی طرف سے حرمتِ شراب کا حکم نازل ہوتے ہی جونہی منادی ہوئی شراب نوشی کا سلسلہ پورے عرب میں یک قلم منقطع ہو گیا اور جس کے ہاتھ میں صراحی تھی اس نے صراحی پٹخ دی اور جس کے ہاتھ میں پیالہ تھا اُس نے پیالہ انڈیل دیا۔ یہاں بھی ادھر حکم آئی اور ادھر جن زبانوں سے رجز ابل رہے تھے وہ امن کے ترانے گاتی نظر آئیں۔

دونوں ملکوں کو معاہدۂ صلح اور جذباتِ صلح مبارک ہوں اور اس چیز کی بہت شدید ضرورت تھی، چنانچہ پبلک نے بڑی گرم جوشی

---

[1] ہم نفس معاہدہ اور دوستانہ روابط کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس قسم کے تعلقات کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ خصوصاً اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں اسلام کے جو تقاضے ہیں ان کے پیش نظر ہماری رائے میں ہمیں حدود شرعی کے اندر اس سے بھی زیادہ حسن سلوک کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جتنا کہ معاہدے کے ذریعے کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ہم اقلیتوں کے معاہدے اور بجا تی معاہدے میں استوار رشتہ و مستمر نظم کے پورا کرنے کو بھی حکام اور عوام کے لئے لازم یقین کرتے ہیں۔ یہاں بحث دوسری چیز سے ہے۔ محمدتقی سے۔

ے سنے سوالات کا خیر مقدم کیا۔ لیکن آپ اس پر ضرور حیران ہونگے کہ پاکستان کے لیڈروں نے معاہدۂ صلح کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ لوگ کبھی تیار نہیں ہو سکتے جو ملک و ملت کے مفاد کو خود اپنی عقل سے سوچتے ہوں؛ بلکہ آنکھیں بند کرکے قربانیاں صرف وہی دے سکتے ہیں جو کسی "وحی" پر ایمان رکھتے ہوں۔

آیئے ذرا اس سیاسی اور تجارتی معاہدے کے چند پہلوؤں کا جائزہ بھی لیتے چلئے جس کی رُو سے پاکستان نے اپنے مفاد کی بڑی قربانی دی ہے۔

اس معاہدے کے لئے قُرب و یگانگت کی فضا بنانے کے لئے جو گفتگو انڈیا اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے درمیان ہوئی اُس کا ایک موضوع یہ تھا کہ آیا پاکستان موجودہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہے یا وہ دینی حکومت قائم کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ موضوع کتنی دیر زیر بحث رہا اور اس پر کیا کچھ کہا اور سنا گیا' لیکن جانبین نے جو بیانات دئے ہیں اُن سے حقیقت حال کی کچھ وضاحت ہو جاتی ہے۔ جناب لیاقت نے پاکستان کی ریاستی نوعیت کے بارے میں صرف اتنا فرمایا کہ:-

"ان لوگوں کی طرف سے جو اسلامی ریاست کا صحیح تصور نہیں رکھتے وقتاً فوقتاً کچھ اس طرح کے خدشات ظاہر کئے جاتے رہتے ہیں کہ یہ ریاست لازماً ایک دینی ریاست ہوگی اس کی پالیسی کی بنیادیں اس میں رہنے والی اقلیتوں کے لئے شہریت' مرتبہ اور حقوق کی مساوات کے اصولوں پر نہیں ہونگی............... حالانکہ ..... ہر اس شخص پر جس نے دستور یہ پاکستان کی پاس کردہ قرار دادِ مقاصد کا مطالعہ کیا ہے' یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ اسلامی ریاست کا دارومدار آزادی' مساوات اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو قبول کرکے انہیں بلا لحاظ مذہب و ملت تمام شہریوں کے لئے عام کر دینے اور اس کے ساتھ ساتھ اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے کلچر کی حفاظت کرنے پر ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ غلط خیال کلیتہً ختم ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان ایک ایسی دینی ریاست بننے والا ہے جس میں کسی طرح کا فرق و امتیاز کیا جائیگا"

مگر پنڈت نہرو نے ان اشارات کو اور زیادہ کھول دیا ہے۔ ملاحظہ ہو وہ بیان جو معاہدۂ دہلی کے متعلق پنڈت جی نے انڈین پارلیمنٹ میں دیا ہے:-

"لوگوں کے دلوں کا یہ شبہ کہ پاکستان کسی فرقہ پرستانہ نظریئے پر قائم ہو رہا ہے اور اس وجہ سے اس میں اقلیتوں کے لئے مساویانہ حقوقِ شہریت کا کوئی امکان نہیں' اس کی تردید وزیر اعظم پاکستان نے پورے زور سے کر دی ہے' اور مجھے یقین دلایا ہے کہ ان کی حکومت (پاکستان) جدید جمہوری ریاست کے تصور پر ایمان رکھتی ہے' اور جدید حالات میں اس کے سوا ریاست کے لئے کوئی دوسرا ڈھانچہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وزیر اعظم پاکستان نے معاہدے میں یہ حقیقت پوری طرح صاف کر دی ہے کہ ان کی ریاست بالکل جدید جمہوری نظریات پر مبنی ہے۔"

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ قرار دادِ مقاصد پر بحث ہونے کے دوران کی تقاریر کو ملاحظہ فرمائیں اور ان میں خود وزیر اعظم صاحب کی تقریر کو بھی دیکھیں۔ ان تقاریر میں مغربی جمہوریت کے ناقص ہونے کا تذکرہ بھی ہے' ان میں ایک نئے نظام حکومت کے قیام کا دعوٰے بھی ہے اور ان میں مذہب و سیاست کے ایک ہونے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ان میں لادینیت (SECULARISM) کی تردید بھی

کی گئی ہے، ان میں نظامِ اجتماعی کے سلسلہ اسلامی اخلاق اور حدود اللہ کی اہمیت پر بھی استدلال کیا گیا ہے، ان میں مساوات، جمہوریت، عدل اور آزادی کے ان تصورات کو اختیار کرنے کا اعلان بھی ہے جو اسلام ——— کتاب وسنت ——— سے ملتے ہیں۔

قراردادِ مقاصد اور اس کی تائیدی تقاریر کو ایک طرف رکھ کے جب آپ اوپر کے دونوں بیانات کو غور سے دیکھیں گے تو پھر اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے وزیرِ اعظم نے امن پسندی اور اقلیت نوازی کے جذبۂ پاکیزہ سے سرشار ہو کر کتنی بڑی قربانی پیش کرنے کی مثال قائم کی ہے۔

پھر آپ تجارتی معاہدہ کا جائزہ لیجئے۔ اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اکابر کی امن پسندی نے بڑے بڑے ایثار کئے ہیں۔ مثلاً ———

جیوٹ کا سودا کئی بلندیوں سے نیچے گرنے کے بعد کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ محرکات بھی تھے۔ ایک یہ کہ برطانیہ وغیرہ کی طرف سے جیوٹ اٹھانے میں دیر کی جا رہی تھی اور اس کو کارآمد اور معیاری حالت میں فروخت کرنے کا موسم گذرتا جا رہا تھا ——— (یہ انڈیا کی بالواسطہ حمایت ہو رہی تھی) ——— علاوہ بریں اُدھر سے جیوٹ کی قیمت گرانے کا مطالبہ بھی تھا۔ پھر مغربی ممالک ہندوستانی مشینوں سے تیار کی ہوئی جیوٹ لینے کے عادی تھے، لیکن اب پاکستان انہیں خام جیوٹ دینے پر مجبور تھا، یہ صورتِ حالات بھی فروخت کی رفتار کو کمزور کرنے کا موجب تھی۔ اس طرح پاکستان پر جیوٹ کے معاملہ میں شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ علاوہ بریں جیوٹ کی ناجائز برآمد کو روکنے کی کوششیں بھی سو فیصدی کامیاب نہیں ہو سکیں، کیونکہ مشرقی پاکستان کے طویل سرحدی خطہ کے ہر انچ پر نگرانی قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ انڈیا کی طرف سے کامل تجارتی بائیکاٹ کا دباؤ بھی بہت شدید ہو چلا تھا۔

اپریل سال گذشتہ میں جیوٹ (درمیانہ اوسط) کی قیمت ۳۰ روپے فی من تھی لیکن اب اسے ۴۰ تا ۴۲ روپیہ فی من کے حساب بیچا جا رہا ہے۔ بروئے معاہدہ انڈیا سے یہ طے ہوا ہے کہ جیوٹ کو PACK کرنے اور اسے انڈیا پہنچانے کی ذمہ داری اور مصارف "فروخت کنندہ" کے سر ہونگے نہ کہ خریدار کے ذمے! فروخت کنندہ مال کو روانہ کرتے وقت بھی تول کے دیگا اور پھر خریدار مقامِ وصولی پر اسے اگر دوبارہ تلوانا چاہے تو وہاں پھر وزن پورا کر کے دینے کی ذمہ داری فروخت کنندہ ہی پر ہوگی۔

قیمت کی ادائیگی کے متعلق یہ بدقسمت معاہدہ یہ بھی طے پایا ہے کہ قیمتوں کا لین دین ہندوستانی سکے کے ذریعہ ہوگا۔ اس فیصلے نے انڈیا کے سکے کو وہی فوقیت حاصل ہو گئی ہے جو امریکہ کے ڈالر کو حاصل ہے۔ امریکہ جو کچھ خریدتا ہے ڈالر سے خریدتا ہے اور جو کچھ بیچتا ہے ڈالر ہی سے بیچتا ہے۔ ایک ملک کے سکے کو جب اس طرح کا اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی تجارت بھی زیادہ کامیاب رہتی ہے اور بعض مالیاتی امور میں بھی اسے برتری حاصل رہتی ہے۔ ہمارے ماہرین مالیات نے بین الملکی تجارت میں اپنے سکے کو "آنریری" بنا کر غلطی کی ہے۔ اس کے نتائج آئندہ واقعات کی روشنی میں واضح ہونگے۔

پھر اس "آزاد تجارت" میں حکومت نے ادائیگیوں اور وصولیوں کی کوئی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے اور یہ بات دونوں طرف کے تاجروں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ بطور خود جو انتظام چاہیں کریں۔ اب تک کوئی بنک اس پر تیار نہیں ہے کہ وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لے، دوسرے یہ کچھ تبادلے باہمی سمجھوتے سے ہو رہے ہیں جن میں بنکوں کا تبادلہ من مانی شرحوں سے کیا جا رہا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ پاکستانی، ہندوستانی کا سکہ علی الترتیب ۱۰۰ اور ۱۴۴ سے لے کر ۱۰۰ اور ۱۱۰ کی شرح سے تبدیل ہو رہا ہے بلکہ بسا اوقات معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔

اس معاہدے نے پاکستانی سکے کی بحالیٔ قیمت کے فیصلے کی جو مخالفت کی ہے۔ آپ اپنے فنڈ اور ہاں کے لئے بلند و بالا بات سے دکھائیں گے ہم برابر یہ کہتے چلے جا رہے ہیں کہ بحالیٔ قیمت کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت حال بالکل دوسری ہے۔ فرض کیجئے" آپ انڈیا سے کپڑا خریدتے ہیں، تو انڈیا کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ پاکستانی سکے کے لحاظ سے اس کے دام کیا بیٹھیں گے، وہ تو اپنے سکے کے حساب سے قیمت محسوب کرے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر وہ پاکستان سے کوئی مال خریدتا ہے تو اس میں بھی پاکستانی سکے کی مداخلت نہیں ہوگی، بلکہ اس کی قیمت بھی وہ اپنے سکے میں چکائے گا۔ آپ کا روپیہ ہندوستان کے روپے کے مقابلے میں دس گنی قیمت کا ہوتا ہے، معاملہ تو ہندوستان کے سکے کے لحاظ سے ہوتا ہے اور اس وجہ سے تمام معاملات میں ہندوستان اپنے مارکیٹ ریٹ کو ملحوظ رکھے گا۔

سکے کی بحالیٔ قیمت کے فیصلے کی رُو سے تو لازم آتا ہے کہ جو چیز ہندوستان میں ایک سو چالیس روپے کی ہے وہ پاکستان والوں کو ایک سو روپے میں ملے، اور اسی طرح جو چیز پاکستان میں سو روپے کی بکتی ہے وہ ہندوستان میں ایک سو چالیس روپے کی قرار پائے۔ لیکن تازہ معاہدہ کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ سکے کی بحالیٔ قیمت کا فیصلہ ہمیں کتنا گراں پڑا ہے۔ اس فیصلے کے لئے ہم نے حسب ذیل قربانیاں دی ہیں۔

ا۔ ہمارے اسٹرلنگ فاضلات کی قیمت گر جانے کی وجہ سے ہمارے مالیات کو ۵۰ ، ۶۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے۔

ب۔ برطانیہ اور برطانیہ کے جن تابع ملکوں نے پونڈ کے ساتھ ساتھ اپنے سکوں کی قدر گرا دی تھی، ان ممالک میں ہمارے جتنے حسابات جمع تھے ان سب کی قیمت بھی گر گئی ہے۔ ہمارے تجار پر اس نقصان کی چوٹ بہت سخت پڑی ہے۔

ج۔ ہمارے شہریوں کی جو پنشنیں اور دوسرے حسابات انڈیا کے ذمے تھے ان کی قیمت بھی گر گئی ہے۔ مثلاً کل جس پنشن خوار کو انڈیا کی طرف سے ۱۴۴ ہندوستانی روپے ملتے تھے وہ ان کے بدلے میں پاکستان کے ۱۴۴ ہی روپے حاصل کرتا تھا، لیکن اب وہ ۱۴۴ کے بدلے میں ۱۰۰ پاتا ہے۔ یہی حال دوسرے حسابات کا ہے۔

د۔ سکے کی قیمت بحال رکھنے کی وجہ سے ہمیں انڈیا سے جس تجارتی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کی وجہ سے ایک کروڑ روپیہ روزانہ کی تجارت لمبے عرصے کے لئے بند رہی ہے۔ اس طرح تاجر ملک کی ایک بیش بہا مقدار سے محروم ہوئے ہیں۔ علاوہ بریں انڈیا اور پاکستان کے تجارتی تعلقات کے انقطاع کی وجہ سے ہمیں اپنی بہت سی ضروریات دور کے ممالک سے مہنگے داموں خریدنی پڑی ہیں اور اسی طرح اپنی خام اجناس دور کے ممالک کو سستی دینی پڑی ہیں (کیونکہ ان پر مصارف حمل و نقل زیادہ ہوتے) اس میں ہمارے لئے بہت بڑا خسارہ تھا۔

ہ۔ وہ برآمدی اجناس جن میں سکے کی قیمت گرانے والے ممالک سے ہمارا مقابلہ ہو رہا تھا، ان میں ہمارے تاجر طبقے کو قیمتیں گرانے کی وجہ سے بڑا بھاری نقصان ہوا ہے۔ مثلاً سیالکوٹ میں جو لوگ کھیل کے سامان کا کاروبار کرتے تھے، ان میں سے بہت سوں کو تباہی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

و۔ انڈیا اور پاکستان میں متروکہ جائدادوں کا مسئلہ بھی سکے کی بحالیٔ قیمت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اب اگر پاکستان آنے والے مہاجرین میں سے کوئی اپنی جائداد انڈیا میں فروخت کرے تو وہ انڈیا کے روپے کی جتنی مقدار حاصل کرے گا، پاکستانی سکے اس کے مقابلے میں کم ملیں گے۔ بخلاف اس کے ہندوستان جانے والے غیر مسلم تارکین وطن۔ اپنی پاکستانی جائدادوں کو اگر فروخت کریں

انہیں پاکستانی روپیہ کے بدلے میں ہندوستانی پیسے زیادہ مقدار میں ملیں گے۔ اب اگر دونوں حکومتیں مجموعی طور پر دونوں طرف کی جانثاروں
تبادلہ کریں یا ان کی قیمت کا لین دین کرنا چاہیں تو اس تبادلے یا سودے میں جیت ہندوستان کی ہوگی اور ہمارے سر خسارہ اتنا آئے گا کہ
اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پیسے کی بحالی قدر جس کے لئے اتنا کچھ کیا گیا تھا، ہندوستان سے تجارتی معاہدہ کرتے وقت اسے بالکل درکنار کر دیا گیا ہے
یہ کیوں؟ اسلئے کہ اس کے بغیر تجارتی معاہدہ ہو نہیں ہو سکتا تھا، اور تجارتی معاہدے کے بغیر سیاسی تعلقات درست ہونے ممکن نہ تھے
اور ہندوستان سے سیاسی تعلقات درست نہ ہوتے تو "عالم بالا" سے باران رحمت کا انقطاع ہو جاتا۔ یہ مجبوری در مجبوری کا ایک چکر
ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔

یہ معاہدہ جب منظر عام پر آیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے ایک رفیق نے پیشنگوئی کی کہ یہ معاملہ "مشترکہ دفاع"
(JOINT DEFENCE) پر منتج ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس کے دو چار ہی روز بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے
اپنے بیان میں دفاع کا مشترکہ نظم قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ "، "روایتی" " کیا باتیں اس موضوع پر
ہیں، لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ ہونی بات ہے۔ اگر حالات اسی رخ پر ارتقا کرتے رہے جس پر رہ رہے ہیں تو آخر کار یہی ہوگا کہ
مملکتوں کے دفاعی نظم و نسق کی باگ ڈور کسی ایک کے ہاتھ میں ہوگی ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہاتھ "اینگلو امریکن" ہاتھ
لیکن اس طرح کی کوئی صورت اگر نمودار ہو بھی تو کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کے بعد ہوگی، جب کہ دو طرفہ فضا بالکل
ہو جائے۔

جہاں تک آئندہ جنگ کے لئے باقاعدہ اڈے قائم کرنے کا تعلق ہے، اینگلو امریکن بلاک اس وقت تک حسب ذیل کارروائیاں
کامیابی سے سر انجام دے چکا ہے: ———

ا۔ مغربی یورپ کے سرمایہ دار ممالک کا ایک مشترکہ فوجی جنرل اسٹاف قائم کیا گیا ہے اور اس کا مرکز فرانس میں جم چکا ہے
ب۔ اسپین میں ہوائی اور بحری اڈے حاصل کئے جا چکے ہیں۔
ج۔ برطانیہ میں ایٹم بم برسانے والے ۹۰ بھاری بمبار طیارے منتخب مواقع پر مامور کر دیے گئے ہیں۔
د۔ ترکی اور ایران میں فوجی اور ہوائی مستقر بنا دیے گئے ہیں۔
س۔ فلسطین، مصر، عراق، حجاز وغیرہ میں پہلے ہی اس قسم کے مراکز موجود ہیں۔

لہ پاکستانی روپیہ کی بحالی قدر کے فیصلے سے قدرتی طور پر ہماری عام اجناس کی قیمتیں بڑھتی ہیں۔ چنانچہ جیوٹ کے دام بھی اضافت ہو
چاہئیں، لیکن برطانیہ زور ڈال رہا ہے کہ جیوٹ کی قیمتیں گرا دی جائیں اور یہاں فی الواقع قیمتیں گرانے کا مسئلہ زیر غور ہے اس سے اندازہ کا
ہے کہ وہ طاقتیں جو عالمی مارکیٹ پر تسلط رکھتی ہیں ان کے مقابلے میں ایک کمزور ملک اپنے فیصلے مشکل ہی سے منوا سکتا ہے۔ اب تک
ملک کے عوام کو مجموعی طور پر بحالی قدر کے فیصلے سے کوئی محسوس فوائد حاصل نہیں ہوئے، البتہ نقصانات نے اپنا اثر نمایاں
دکھایا ہے۔

ص - امریکہ نے گذشتہ جنگ میں جو فوجی اڈے قائم کئے ہوئے تھے ان میں ۲۴۴ کو جو سوویٹ یونین کے خلاف جنگ لڑنے میں استعمال ہو سکتے ہیں، بدستور قائم رہنے دیا ہے۔

اس مقصد میں ہمارے حکمرانوں کی طرف سے انگریزوں تعاون کی پیشکش نہ ہوتی۔ ایسوشی ایٹڈ پریس کا بیان ہے کہ حکومت پاکستان نے امریکہ کو اپنے ہوائی اڈوں کو بوقت ضرورت استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ علاوہ بریں برطانیہ کو کراچی کے قریب ایک ہوائی اڈہ مستقل طور پر دیا گیا ہے اور اس کو "رجیل پوسٹ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی مخفی نہ رہنی چاہئے کہ ہمارے فوجی نظم ونسق میں انگریزی افسر پوری طرح دخیل ہیں۔

اینگلو امریکن بلاک کی پوری کوشش یہ ہے کہ آزادی و استقلال کو پسند کرنے والے اسلام پسند عناصر مسلم ممالک پر کے اقتدار پر قابض نہ ہو سکیں، بلکہ مسلم ممالک کے نظم ونسق کی باگیں فرنگیت مآب سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں رہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ پورا بلاک اپنا دباؤ ڈال کر حکومتوں کو "لادین" (SECULAR) جمہوریت کا پابند رکھنے پر مصر ہے نیز اسلام، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے خلاف مسلسل پروپگنڈہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بلاک کی طرف سے تعاون، حمایت اور امداد کی ہر شکل کی قیمت لادینی (SECULARISM) اور افرنگ زدگی ہے ہمارے پالیسی بنانے والے دماغ سفید بلاک کے اس تقاضے کو خوب سمجھتے ہیں اور اسے پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں دکھا رہے۔ تمام مناصب اور اختیارات افرنگ زدہ اور اسلام سے بُعد رکھنے والے طبقے میں تقسیم کئے جا رہے ہیں اور اسلام پسند عنصر کو کچلنے کی دوسری ناپاک کوششوں کے ساتھ ساتھ سیفٹی قوانین کو بروئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی ایک افرنگ پرست قادیانی کے ہاتھ میں ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کے پے در پے مطالبات کے باوجود اس صورت حالات میں تبدیلی نہیں پیدا کی جا رہی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وزیر خارجہ برطانیہ کے خاص منظور نظر ہیں اور برطانوی پالیسی کے سانچے میں پاکستانی پالیسی کو ڈھالنے کے لئے پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ پس کسی کی مجال نہیں کہ ان کو ان کے منصب سے ہٹا سکے

ہمارے وزیر اعظم کا حالیہ دورۂ امریکہ بھی ہماری پالیسی کے تابع ہے۔ اس دورہ کا مقصد ادھر سے تو یہ ہے کہ "نظر عنایت" حاصل ہو اور مالیاتی اور اسلحاتی امداد حاصل کی جا سکے، اور اُدھر سے یہ ہے کہ پاکستان اپنے ہاتھ میں رہے۔ دونوں کام ہو رہے ہیں۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!

پاکستان کی طرف سے یہ یقین دہانی ہو رہی ہے کہ ہم اس روشن دور میں "ملائیت" کے قائل نہیں ہیں، ہمارا اسلام تو بالکل وہی ہے جس پر امریکہ میں عمل ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سے ترقی کا سبق سیکھنے آئے ہیں کہ کن اصولوں سے بڑی قومیں وجود میں آتی ہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان اور امریکہ کا کلچر مشترک جڑیں رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ ہم مسلم اور غیر مسلم میں مذہب کی بنیاد پر کوئی فرق کرنے والے نہیں ہیں پھر یہ کہ ہم اپنی عورتوں کو اسی تہذیب میں رنگ رہے ہیں جس میں امریکہ کی عورتیں رنگی ہیں ———— (بیگم صاحبہ تو اس دعوے کے زندہ ثبوت کے طور پر خود اپنا مظاہرہ کر ہی رہی ہیں) پھر یہ یقین دلایا گیا کہ ہم ہندوستان سے جنگ نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہمارا میلان تو ہمیشہ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی طرف رہا ہے۔

اُدھر امریکہ کی طرف سے وہ تمیں ضیافتیں اور شاہانہ استقبال ——— اس خوشی میں کہ ساری غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔ پھر تقریروں اور بیانات میں یہ اعتراف کہ پاکستان تین ہی سال میں دنیا کا بہت بڑا ملک بن گیا ہے اور وزیر اعظم ایک بین الاقوامی سیاسی شخصیت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ "ایجاب" جب وہ ہو تو "قبول" ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اگر کشمیر ہماری موجودہ خارجہ پالیسی کے اثرات سے مستثنیٰ رہ گیا تو یہ صورت ہمارے لئے فالِ نیک ہوگی، لیکن اگر کشمیر کے مسئلے کو بھی اسی خارجہ پالیسی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو پھر نہ معلوم کیا ہوگا۔ ہمارے عوام چاہتے ہیں کہ کشمیر ایک وحدت کی حیثیت سے بذریعہ آزاد استصواب اپنی قسمت کا فیصلہ کرے اور وہ پاکستان سے کسی حالت میں الگ نہ ہونے پائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے جملہ اکابر بھی اس فیصلے کے ساتھ متفق ہیں، جیسا کہ انکی تقاریر اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک امریکہ و برطانیہ کا تعلق ہے، وہ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ در پردہ ان کی خواہش اس کے خلاف ہے کہ کشمیر ہمہ تن پاکستان کے ساتھ آجائے اور ہندوستان بالکلیہ محروم رہ جائے۔ وہ دونوں کو راضی رکھنا چاہتے۔ چنانچہ ان کے سامنے دو اسکیمیں ہو سکتی ہیں: ———

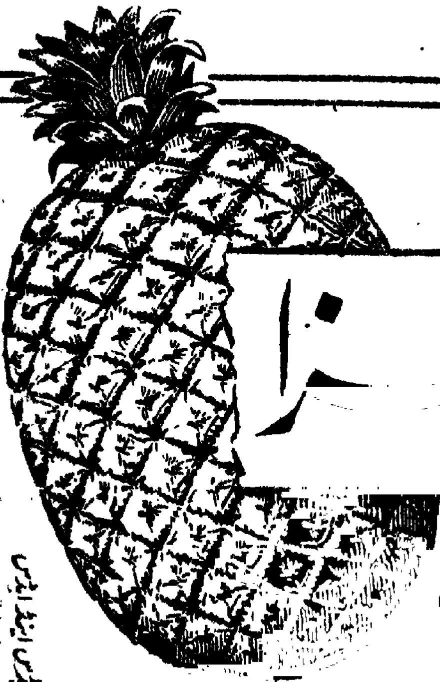
ایک یہ کہ کشمیر میں آزادانہ استصواب ہو تو سہی لیکن وہ تین صورتوں کے لئے ہو: پہلی صورت پاکستان میں شامل ہونے کی، دوسری ہندوستان سے الحاق کرنے کی اور تیسری آزاد و مستقل ہو کے رہنے کی۔ اس قسم کے استصواب میں امریکہ و برطانیہ لازماً یہ چاہیں گے کہ کشمیر جداگانہ آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کرلے اس پر ہندوستان اور پاکستان بھی مطمئن ہو جائیں گے اور اینگلو امریکن بلاک کو کشمیر میں اپنے مقاصد کے لئے مداخلت کرنے کے بھی وسیع تر مواقع حاصل ہونگے۔ اتفاق سے جداگانہ "آزاد کشمیر" کا نعرہ کشمیریوں میں بلند کرنے والے لوگ موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں اور شاید اس نعرے میں کشمیریوں کی دو لاکھ قیادتوں کا اتحاد بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت امریکہ و برطانیہ کے سامنے یہ ہو سکتی ہے کہ آزادانہ استصواب ہو تو ضرور، لیکن کشمیر کے تین حلقوں کی رائے الگ الگ طلب کی جائے ایک حلقہ جموں کا، دوسرا سرینگر کا اور تیسرا موجودہ آزاد کشمیر حکومت کا مقبوضہ علاقہ۔ اس طرح امریکہ و برطانیہ کے خیال میں جموں والے غالباً بھارت سے ملحق ہونے کا فیصلہ کریں گے، پونچھ وغیرہ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہو جائیگا اور سرینگر کا علاقہ شاید ایک آزاد ریاست قرار دیا جائے جس پر یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ مدت کے لئے اقوام متحدہ کی نگرانی قائم کر دی جائے۔

ہمارے اکابر چونکہ عوام کے رجحانات کی شدت کو جانتے ہیں، اس لئے وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس طرح ریڈ کلف ایوارڈ کے ذمہ دار کمیشن کو پیشگی لکھا دیا گیا تھا کہ وہ جو سرحدی خط بھی کھینچ دے گا، اسے قبول کر لیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی ادارۂ اقوام متحدہ اور اس کے کمیشن اور اس کے مقرر کردہ نگران کے آئندہ فیصلوں کے بارے میں پیشگی قول دیا جا چکا ہے۔

بہرحال ہم اب جس خارجہ پالیسی کے چکر میں پھنس گئے ہیں، اس کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کیا گل کھلائے گی۔

اب اس خارجہ پالیسی کے چکر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ملک کی طرف سے نئے انتخابات جلد از جلد منعقد کرانے کا مطالبہ پوری قوت سے شروع ہو اور پھر عوام کو ذہین اور ملت کے خیرخواہ عناصر کی طرف سے ایسی رہنمائی بہم پہنچائی جائے کہ ان کے ووٹوں سے ایسے نمائندے منتخب ہو کر اقتدار پر بیٹھیں جن کے ذہن اسلام کے تابع ہوں، جن میں فکری آزادی برسرِ عمل ہو۔ جو ملت کو آزادی و استقلال پہ لے چل سکیں اور غیر ملکی اثرات کی زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑنے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ورنہ ہم دنیا کی بڑی قوموں کے لئے قربانی کے بکرے بن کے رہ جائیں گے اور ہماری حیثیت وہی ہوگی جو آج عراق اور ایران جیسے ملکوں کی ہے۔



ثربت روح ا زا

س سے بھی بہتر کوئی افطاری ہو سکتی ہی؟

پکے ہمدرد دواخانہ نے بنایا اور چالیس سال سے بنا رہا ہی۔

مولانا امین احسن اصلاحی

ابن انوار

یوپی کے ایک متوسط زمیندار گھرانے کا تصور کیجئے۔ تعلیم و تعلم سے بے بہرہ۔ زمین سے چمٹا ہوا کدال اور پھاوڑا جس کا اثاث البیت پٹواری، تحصیلدار اور تھانیدار جس کے خدایان مجازی۔ مقدمہ بازی اور جعل سازی سب کی طبقاتی خصوصیات۔ مولانا اصلاحی ضلع اعظم گڑھ کے اسی طرح کے ایک دیہاتی زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عزت اور شہرت کے لحاظ سے اپنے علاقہ کا ایک نامور گھرانہ ——— لیکن علم و فضل سے بے گانہ۔ صرف دینی تعلیم کا کچھ چرچا۔ لیکن وہ بھی برائے نام۔ اور انتہائی بے روح۔ البتہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور قرآن سے ایک غائبانہ عشق اس خاندان کی خصوصیت ہے۔ عورت اور مرد یکساں جاہل اور آن پڑھ تھے۔ زمیندار کا یہ لڑکا جب پیدا ہوا تو اس کے دادا نے اس کے مستقبل کے متعلق اپنی جس عظیم خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ ضلع کچہری میں اس کو کوئی ملازمت مل جائے۔ لیکن بوڑھے دادا کی اس خواہش پر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ بوڑھے نے خواہش بھی کی تو اتنی معمولی۔ اور کیسے بے ذوق لوگ ہیں کہ جس کو مقام رشد و ہدایت پر فائز ہونا ہے۔ اس کو ضلع کچہری کے تیرہ و تاریک اور بدبودار نظام عدالت کی کرم خوردہ کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ جس پر بیٹھ کر ایک انسان اپنے ضمیر، انسانیت، شرافت اور غیرت کا سودا کرتا ہے اور ایک فاحشہ عورت کی طرح اپنے آپ کو بیچتا ہے۔

مولانا اصلاحی کا سن پیدائش غالباً ۱۹۰۴ء ہے۔ ان کے والد محترم جو ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں اور نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں نام مرتضیٰ احمد ہے۔ جو حافظ قرآن بھی ہیں۔ اور حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ مولانا اعظم گڑھ سے ۴ میل کے فاصلے پر دریائے ٹونس کے کنارے ایک گاؤں "بمہور" میں پیدا ہوئے۔

یہ گاؤں غدر ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا مرکز بھی رہ چکا ہے۔ اعظم گڑھ کے نواح میں انگریزی استبداد کو ختم کرنے کی جو منظم تحریک چلی تھی۔ یہ گاؤں اس تحریک کا قائد تھا۔ اور اس نے اپنی انگریز دشمنی کی روایات کو ہندوستان کی آزادی تک قائم رکھا۔ مولانا اصلاحی اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار گھرانے کے ایک رکن ہیں۔ جو اب مادی اور تعلیمی لحاظ سے اپنے علاقہ کا سب سے بااثر گھرانہ ہے مولانا کی والدہ ایک آن پڑھ خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑے لاڈ پیار میں اپنے اس ہونہار بچے کی تربیت کی۔ اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے کہ ان کی کوکھ میں ایک ایسے بچے نے پرورش پائی۔ جس سے آج اسلام کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ مولانا کے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ جو عمر میں ان سے چھوٹے ہیں۔ جن میں بشیر احسن اصلاحی قابل ذکر ہیں۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ ابھی وہ گاؤں کے اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے کہ اعظم گڑھ کے ایک مشہور قصبہ سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح قائم ہوا۔ جس کے صدر مدرس مولانا شبلی متکلم مقرر ہوئے۔ جو مولانا کے ہم قریہ تھے۔ اور جو مولانا کے والد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مولانا اصلاحی کے والد سے خواہش ظاہر کی کہ امین احسن نہایت ذہین بچہ ہے۔ اس کو میرے پاس مدرسۃ الاصلاح بھیج دیجئے میں اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی نگرانی میں کروں گا۔ حافظ صاحب نے مولانا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں مدرسۃ الاصلاح میں داخل کرا دیا۔ جہاں انہوں نے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل کی۔

مدرسۃ الاصلاح

مولانا اصلاحی اور مدرسۃ الاصلاح ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی سوانح حیات پر اس وقت تک تبصرہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ مدرسۃ الاصلاح کے متعلق مختصر طور پر قارئین کو کچھ نہ بتایا جائے۔ مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے رکھی تھی۔ علامہ مرحوم جب ندوۃ العلماء کے اصلاح احوال سے مایوس ہوگئے۔ اور انہیں یقین ہوگیا کہ رجعت پسند مولوی انکی روشن خیالی اور اصلاح نصاب کی تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ تو انہیں خیال ہوا کہ اب ایک ایسی درس گاہ قائم کرنا چاہئے۔ جو ان کے تصورات کے عین مطابق ہو۔ چونکہ ان کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اس لئے وہ اس درس گاہ کو ضلع اعظم گڑھ ہی میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس درس گاہ کے لئے انہوں نے "سرائے میر" کو منتخب کیا۔ اور یہیں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا شبلی نعمانی اس مدرسہ کے اغراض ومقاصد کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں اس کو ضلع کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ایک گروکل کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اور میرا مقصد ایسے مبلغین کی تیاری ہے۔ جو مسلمانوں کو بتاسکیں کہ اسلام کیا ہے۔ مولانا شبلی کے فیض اور خلوص نے اثر کیا۔ اور مدرسۃ الاصلاح سے وہ ترقی کہ ندوۃ العلماء اور دیوبند کے چراغ گل ہونے لگے۔ اور یہاں سے جدید وقدیم علوم کے ایسے ایسے عالم دین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مولانا شبلی کی تمام روحانی یادگاروں میں مدرسۃ الاصلاح ہی وہ واحد یادگار ہے۔ جس نے ان کے منشا کے مطابق یوپی اور اعظم گڑھ کے عوام کی نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ ہزاروں گھروں میں خدا کے کلام اور اسلام کی تعلیمات کا چرچا کر دیا۔

مولانا اصلاحی نے اس مدرسے میں اسلامی علوم کی تحصیل کی۔ اور یہیں ان کی صلاحیتوں کو نشوونما پانے کا موقع ملا۔ اس مدرسے کا ماحول نہایت علمی اور سنجیدہ تھا۔ وقت کے روشن خیال علماء کا اجتماع تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ صلاحیتیں وافر تھیں۔ اسی ماحول میں مولانا اصلاحی نے اپنی زندگی کے کچھ قیمتی سال بسر کئے۔ یہیں انہوں نے تحریر وتقریر کی مشق کی۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ اخبار مدینہ ———— جو یوپی کا ایک نہایت بلند پایہ اخبار تھا ———— کی ادارت انہیں پیش کی گئی۔ اس وقت مولانا کی عمر بیس سال سے کم تھی۔ لیکن ان کی تحریر اور ان کے اسلوب میں بڑی پختگی تھی۔ وہ وقت کے مقبول انداز تحریر میں پوری طرح حاوی تھے جسے مولانا آزاد نے ایجاد کیا تھا۔ اور جس میں خطابت کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ مولانا اصلاحی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا یہ پہلا اعتراف تھا۔

مولانا چار سال تک مدینہ کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن کام کی زیادتی نے ان کی صحت کا ستیاناس کر دیا۔ اور انہیں مجبوراً مدینہ کی ادارت سے استعفا دینا پڑا۔ اور وہ لکھنو چلے آئے۔ اور مشہور اخبار "الناظر" کے ادارہ تحریر میں شامل ہوگئے۔ جس میں ملک کے دو صاحب طرز ادیب پہلے سے موجود تھے یعنی مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ کام کرنے اور ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مولانا کے فکر وقلم میں بڑی پختگی پیدا ہوگئی۔ تقریباً ایک سال کے بعد مولانا نے بعض وجوہ کی بنا پر "الناظر" کو بھی چھوڑ دیا اور گھر تشریف لائے۔

مولانا اصلاحی کے اساتذہ میں جن بزرگوں نے ان کی صلاحیتوں کو جلا دینے میں محنت کی۔ ان میں مولانا عبدالرحمان صاحب نگرامی ایک مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ جو اردو اور عربی کے ایک شگفتہ بیان ادیب اور مقرر تھے۔ مولانا اصلاحی فرمایا کرتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے میں حقیقی فائدہ انہیں مولانا نگرامی مرحوم ہی سے پہنچا۔ جو ایک شفیق اور محبت کرنے والے استاد تھے۔

الناظر کے بعد مولانا اصلاحی مشہور اہل حدیث عالم اور شارح ترمذی مولانا عبدالرحمان مبارک پوری سے حدیث کا درس لینے لگے۔ مولانا عبدالرحمان مبارک پوری کا علم حدیث میں بڑا اونچا مرتبہ تھا۔ اپنے وقت میں ان سے بڑا کوئی محدث ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ دور دور سے شائقین حدیث نبوی ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور مولانا بڑے مزے ان کو رسول کا کلام پڑھاتے تھے۔ مولانا اصلاحی کے والد سے مولانا مبارک پوری کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ یہی تعلق مولانا اصلاحی کو مولانا کی خدمت

ہوسنے گیا۔ انھوں نے حدیث کی تدریس کی۔ مولانا مبارک پوری سے حدیث کی تعلیم کے دوران میں انہیں اطلاع ملی کہ مشہور مفسر قرآن مولانا حمیدالدین فراہی حیدرآباد کے مدرسۃ العلوم (حال عثمانیہ یونیورسٹی) کی پرنسپل سے استعفا دے کر اپنے وطن مالوف پھریا واپس تشریف لے آرہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کو قرآن سے چونکہ عشق تھا۔ اس لئے وہ حدیث کا درس مکمل کئے بغیر مولانا فراہی کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ اور ایسے حاضر ہوئے کہ مولانا کی وفات تک دن رات کے خادم رہے

مولانا فراہی

مولانا حمیدالدین فراہی برِعظیم ہند کے اسلامی اور جدید علوم کے ایک نہایت حکیم اور فاضل بزرگ گذرے ہیں۔ خاص کر قرآنی علوم میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ان سے بڑا قرآن کا مفسر نہیں پیدا ہوا۔ وہ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور لاطینی زبانوں کے لکھنے پڑھنے پر ماہرانہ قادر تھے۔ مولانا فراہی مولانا شبلی نعمانی کے پھوپھی زاد بھائی اور ان کے شاگرد بھی تھے مولانا شبلی ان کی قابلیت اور لیاقت کے نہ صرف معترف بلکہ مداح تھے۔ مولانا فراہی کے اساتذہ میں مولانا شبلی، شارح حماسہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا فاروق چریا کوٹی، جیسے فاضل بزرگ اور عالم دین شامل تھے، مولانا فراہی علی گڑھ میں زیر تعلیم ہی تھے کہ سرسید کی نگاہ مردم شناس نے تاڑ لیا کہ یہ نہایت صاحب صلاحیت انسان ہیں۔ چنانچہ مرحوم سید نے مولانا شبلی کی معرفت خواہش ظاہر کی کہ مولانا حمیدالدین ان کی تفسیر کا عربی میں ترجمہ کردیں۔ جب مولانا شبلی نے اس کا ذکر ان سے کیا تو فرمایا کہ "میں سرسید کی گمراہ کن تفسیر کا عربی میں ترجمہ کرنا تعاون علی الاثم سمجھتا ہوں۔ سرسید کو مجھ سے ایسی توقع نہ رکھنی چاہیئے روایت ہے کہ سرسید کو اس جواب سے بہت صدمہ پہنچا۔ اور مرتے دم تک انہوں نے حمیدالدین کو معاف نہیں کیا۔

مولانا نے قرآن کے علوم و تفسیر پر متعدد کتابیں عربی میں تصنیف فرمائی ہیں۔ کچھ سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ زیادہ تر کتابیں قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں پر ہیں۔ مولانا فراہی کو قدرت نے کلام الٰہی کے اسرار و رموز تک پہنچنے کا جو خاص ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ اس کا اعتراف اس عہد کے تمام سنجیدہ بزرگ کرتے ہیں۔ مولانا اصلاحی انہیں مولانا فراہی کے خاص الخاص شاگرد ہیں۔

مولینا اصلاحی نے مولانا فراہی کی بیشتر عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کیا۔ اور ان کی عربی تصانیف کو ایڈٹ کیا مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کی وفات پر معارف میں جو اشارات لکھے ہیں۔ ان میں فرماتے ہیں کہ مولانا حمیدالدین نے علم و فضل اور قرآن حکیم کے معارف و اسرار چھوڑے ہیں۔ ان کے حامل ان کے دو شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی ہیں۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی مستقل طور پر مدرسۃ الاصلاح میں قیام کرنے لگے اور منتہی طلبا کو قرآن حکیم کا درس دیتے۔ اور بقیہ اوقات میں مولانا فراہی کے مسودات کی تبییض اور ان کو ایڈٹ کرتے۔ نیز ان کی شائع شدہ عربی مطبوعات کو اردو کا جامہ پہناتے۔ مولانا فراہی کی تصانیف کو جس حزم و احتیاط کے ساتھ مولانا اصلاحی نے اپنے رفیق کار مولانا اختر احسن کی امداد سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ وہ ان کا شاندار تفسیری کارنامہ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں نے قرآن پر غور و فکر کے طریقے بدل دیئے۔ اور ہزاروں تشنگان قرآن نے ان تفسیری کتابچوں (   ) سے قرآن فہمی کے اصول اور راستے سیکھے۔

مدرسۃ الاصلاح پہلا تعلیمی ادارہ تھا۔ جو صرف عربی علوم کی تحصیل کے لئے نہیں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے پیش نظر یہ عظیم مقصد تھا کہ برعظیم ہند میں ایک ایسا اسلامی انقلاب برپا ہو جو اس ملک کی حالت بدل دے۔ چنانچہ عربی مدارس میں یہ پہلا مدرسہ تھا جس نے قرآن کو زندگی کے ایک مکمل پروگرام کی حیثیت میں پیش کیا۔ اور دنیا کو بتایا کہ عربی علوم کی تحصیل کا مقصد مسجدوں کے لئے امام تیار نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ایسے افراد کی تربیت کرنا ہے۔ جو اسلامی انقلاب کی قیادت کرسکیں۔ اس عظیم مقصد کے پیش نظر مروجہ تعلیمی اور تدریسی نظام میں تبدیلیاں پیدا کی گئیں۔ اور وہ جمود اور فرسودگی کو ختم کیا گیا جو کئی سو سالوں سے عربی مدارس کی خصوصیات میں داخل تھیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے طلبا کے سامنے قرآن

اس شکل میں پیش کیا گیا کہ وہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے اس سے پروگرام حاصل کریں۔ انہیں معلوم ہو کہ قرآن انسانی زندگی کی تشکیل، تبدیلیوں کا تقاضا کرتا ہے وہ تمدن اور سیاست کی گاڑی کس طرح چلانے کا حکم دیتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کا پیغام تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنی اپنی زندگی پر نظرِ ثانی کریں۔ اور اس انقلاب کو برپا کریں جو اس ملک کی اجتماعی زندگی میں اسلام کے نقوش کو اجاگر کر دے۔ مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی یہی خواہش تھی۔ اور وہ اپنے دل کی اس مقدس آرزو کو لے کر اپنے خدا کے پاس پہنچ گئے گو ان کی اس خواہش نے ان کے زمانے میں عملی صورت نہیں اختیار کی۔ لیکن چونکہ خدا کو اپنے اس نیک بندے کی خواہش منظور تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں تحریک اسلامی کا قیام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی لیڈرشپ میں عمل آیا۔ اور "اصلاحیوں" نے اس منظم اسلامی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور آج خدا کے فضل سے پورا مدرسۃ الاصلاح تحریک اسلامی ہند کے ڈسپوزل پر ہے۔ اور یہ واضح رہے کہ حضرت مولانا مودودی بھی مولانا فراہی کے شاگرد ہیں انھوں نے حیدر آباد میں مولانا سے عربی کے اسباق پڑھے ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح مولانا اصلاحی کی رہنمائی میں ایک مدت تک قرآن اور اسلام کی خدمت کرتا رہا یہاں تک مولانا ۱۹۴۵ء میں تحریک اسلامی کے مرکز دار الاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ اور جب تحریک اسلامی تقسیم ملک کے بعد دو جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تو مولانا پاکستان کے حصے میں آگئے۔ اور آج تک پاکستان ہی میں ہیں۔

الاصلاح مولانا اصلاحی نے اسلامی افکار و نظریات اور مولانا فراہی کی قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ۱۹۲۹ء میں "الاصلاح" نام کا ایک ماہوار رسالہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے نکالا۔ جو ۱۹۳۹ء تک نکلتا رہا۔ یہ رسالہ اپنے وقت کے موقر رسالوں میں تھا اور اسلامی فکر کی اشاعت میں اس نے بہت نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ یہی دور تھا جب حیدر آباد سے مولانا مودودی ایداللہ بنصرہ اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعہ برِعظیم ہند سے اس تاریکی کو دور کرنے کی جدوجہد فرما رہے تھے۔ جو مختلف سیاسی تحریکوں، مذہبی گروہوں اور مغربی تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے مسلمانوں پر مسلط کر دی تھی۔ مولانا مودودی بیک وقت ان تمام سیاسی، معاشی، اور معاشرتی فتنوں سے نبرد آزما تھے۔ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیات کو کفر اور لادینی کے ذریعہ پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ کانگریس کی متحدہ قومیت مسلمان نوجوانوں کو کفر کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وطن کے نام پر اسلام کو قربان کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے علماء اسلام کی قربانی میں ہندو قوم پرستی کے ممد و معاون تھے دوسری طرف تقلیت اور [illegible]زم کی نام نہاد تحریک مسلمانوں کو بے دین بنانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اور مسلمانوں کو تعلیم دے رہی تھی کہ اسلام آج کی مہذب زندگی کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ سائنس نے مذہب کے بطلان کو ثابت کر دیا ہے۔ تیسری طرف مسلم معاشرت میں تبدیلیوں کے خواہش مسلمان عورتوں کو تیار رہے تھے کہ وہ پردہ اور حجاب کی "لعنت" ترک کر دیں۔ اور یورپی عورتوں کی طرح آزادانہ زندگی بسر کریں۔ چوتھی طرف اسلام کے دشمن دین کی راہ سے مسلمانوں کو تعلیم دے رہے تھے کہ حدیث کا انکار کر دیں۔ کیونکہ رسول کی زندگی اور اس کے اقوال سند نہیں ہیں۔ حدیث کا موجودہ ذخیرہ محض گھڑنت ہے۔ مولانا مودودی بیک وقت ان تمام فتنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اور ان مفاسد کے استیصال میں مولانا اصلاحی کا الاصلاح ان کا معاون تھا۔ ترجمان القرآن نے الحاد اور لادینیت کے سیلاب پر جس پامردی اور اسلامی بصیرت سے بند باندھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اس کی اتنی بڑی اسلامی خدمت ہے کہ پوری ملت اسلامیہ اس کی مشکور ہے۔ ہزارہا نوجوانوں کو لادین ہونے سے بچانے کا سہرا ترجمان القرآن کے سر ہے۔ اور اسلامی ہند کی جب دینی تاریخ لکھی جائیگی تو ایک مستقل باب ترجمان القرآن کے لئے مخصوص ہوگا۔ اور آج "اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے" کی جو آواز ہم کو ہر گلی کوچے میں بلند ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی نے لگائی تھی۔ اور اس وقت محض چند انسان تھے۔ جو اس آواز کے متفق تھے۔ مولانا اصلاحی انہیں لوگوں میں ہیں۔

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کا اختلاف مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ایک زمانہ میں ایک جزوی مسئلہ پر

لاف ہوگیا تھا۔ اور یہ اختلاف ایک غلط فہمی پر مبنی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی جب سیاسی کشمکش اور مسلمانانِ لکھ رہے
۔ اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس کے معاشی، سیاسی اور عمرانی نظریات پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے۔ تو مولانا اصلاحی کو شبہ پیدا
ا مولانا مودودی وطنی نیشلزم اور متحدہ قومیت کے تو مخالف ہیں لیکن مسلم قوم پرستی کے حامی ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کا کیس اصولی نقطہ نظر سے نہیں
قومی بالادستی کے پیش نظر لڑ رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح وطنی نیشلزم مردود ہے۔ بعینہٖ اسی طرح مسلم قوم پرستی بھی
۔ غیر اسلامی نقطہ نظر ہے۔ اس لئے ہمیں صرف اس اصولی قومیت کی حمایت کرنا چاہئے۔ جس پر ہماری ملت کی شیرازہ بندی کا دارومدار
۔ مولانا اصلاحی کا خیال تھا کہ جس طرح ایک وطن کو ہم بت نہیں بنا سکتے۔ اس طرح اس قومیت کو بھی بت نہیں بنا سکتے کہ ہر مسلمان گھر میں
ہونے والا مسلمان ہے۔ چاہے اس کے سیاسی معاشی اور عمرانی عقائد اعلانیہ اسلام کے مخالف ہوں۔ مولانا مودودی فرما رہے تھے
ایک ترتیب سے چل رہا ہوں اور یکے بعد دیگرے حسب مراتب تمام جاہلیتوں کو زیر بحث لاؤں گا۔ چنانچہ مولانا نے اسی ترتیب سے مسلمان
سیاسی کشمکش کے تینوں حصے لکھے۔ پہلے حصے میں جمعیۃ علماء پر، دوسرے حصے میں کانگریس پر، تیسرے حصے میں مسلم لیگ پر تنقید کی گئی۔ اور جب اصلاحی
صاحب کو یقین ہوگیا کہ مودودی صاحب مسلم قوم پرستی کے حامی نہیں ہیں تو ان کے مابین اختلافات ختم ہوگئے۔ اور ایک وقت آیا کہ جب مولانا
مودودی نے تحریک اسلامی کے لئے اپنے دوستوں کو پکارا تو مولانا اصلاحی السابقون الاولون میں تھے۔ اور آج تک اس تحریک کے
قائد ہیں۔

…لانا کے نظریات

مولانا اصلاحی تحریک اسلامی کے قیام سے پہلے بھی اسلام ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی سربلندی چاہتے تھے۔ اور
وہ انگریز کے اخراج کے لئے ہندو مسلم تعاون کے قائل تھے۔ لیکن اس مقصد کے لئے خود اسلام کی قربانی دینا انہیں
گوارا نہیں تھا۔ انہیں ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے افکار و نظریات سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ وہ متحدہ قومیت کے قائل کبھی
نہیں رہے۔ اور نہ انہیں مسلم قوم پرستی نے کبھی اپیل کیا۔ وہ مسلمانوں کے صرف اس معنیٰ میں ایک قوم کہتے تھے کہ جو شخص اسلام کو
بحیثیت نظریہ زندگی کے تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ
کا رکن ہے۔ وہ اسلامی اصولوں میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ صوبہ بہار کے ایک
مشہور و معروف قصبہ میں حضور نبی کریم کی سیرت کا ایک جلسہ تھا۔ اور جس کی صدارت بھارت کے موجودہ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد فرما
رہے تھے۔ اور اس جلسے میں تقریر کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بڑے بڑے لیڈر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ صدارت
میں کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت کی تبلیغ شروع کردی۔ اور قرآن سے ثابت کرنے لگے کہ اسلام پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ ہر مذہب
سچا ہے۔ کسی ایک نبی پر ایمان لانا کافی ہے۔ مولانا اصلاحی نے اسی بھرے مجمع میں ڈاکٹر صاحب کی تردید کردی۔ اور نہایت سخت الفاظ
میں فرمایا کہ اسلام کے نزدیک وہ کافر اور مشرک ہیں۔ جو اسلام پر اور خدا کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ اور
جن کو ہم ایک جداگانہ قوم سمجھتے ہیں۔ جو عقائد اور نظریات میں اسلامی اصولوں کو نہیں تسلیم کرتے۔

موجودہ وقت میں تمام مذاہب کی سچائی کا فتنہ درحقیقت مولانا آزاد کا پیدا کردہ ہے۔ جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے
اسی اشتراک کی خاطر قرآن کے ایک بنیادی اصول میں تحریف کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم مولانا آزاد کی علمی اور ذہنی برتری کا انتہائی احترام
کرنے کے باوجود اسے ایک کھلی ہوئی گمراہی تصور کرتے ہیں۔ اور ان کی اس جسارت کو تحریف دین گردانتے ہیں۔

اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ جس زمانے میں بھارت کے سابق گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے
انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہہ دیا کہ جو لوگ گاندھی جی کے مابعد الطبیعاتی سیاسی اور معاشرتی نظریات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ نہ سچے

کانگریسی ہیں اور نہ ان کے لئے کانگریس میں کوئی جگہ ہے۔ اس بیان کے خلاف سب سے پہلی آواز مولانا اصلاحی نے بلند کی۔ مولانا نے ان تمام مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی جو کانگریس میں اس لئے شامل تھے کہ انگریزی استبداد کو ہندوستان سے نکال باہر کریں انہوں نے علماء کو للکارا کہ جنرل سیکرٹری کے اس بیان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ راج گوپال اچاریہ کو اپنا بیان واپس لینا پڑا۔ اور کانگریس ہائی کمان نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کا گاندھی جی پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔

مولانا اصلاحی کا فکر ہمیشہ سے سلجھا ہوا تھا۔ اور صحت فکر کی یہ نعمت انہیں مولانا فراہی سے حاصل ہوئی۔ مولانا فراہی ان علماء دین میں تھے۔ جو مسلمانوں کی اجتماعی تنظیم کو اسلامی اصولوں کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں مرحوم ——— یہ تینوں مولانا حمید الدین کے بڑے مداح اور معتقد تھے۔ کو متعدد مرتبہ دعوت دی کہ یہ لوگ مسلمانوں کو خالص اسلامی اصولوں پر منظم کریں۔ لیکن روایت ہے کہ ان تینوں لیڈروں نے راہ کی مشکلات کا رونا رو کر مولانا فراہی کی بات ٹال دی اور حسبِ دستور مسلمانوں کو وطنی اور قومی تحریکوں میں گھسیٹے رکھا۔ مولانا محمد علی اپنے آخری ایام میں اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے۔ لیکن موت نے ان کے رشتہ حیات کا خاتمہ کر دیا۔ اور وہ بھی یہ خواہش لے کر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے

مطالعہ اور طرزِ تحریر

مولانا اصلاحی جدید و قدیم علوم کے مجمع البحرین ہیں۔ ان کا مطالعہ اور ان کی تحقیقات نہایت ٹھوس ہیں مولانا اُردو کے ایک انشاء پرداز اور شگفتہ بیان ادیب اور مقرر ہیں۔ ان کی تحریروں میں رس، زندگی، بانکپن اور تشبیہات کا بڑا اچھوتا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی تحریروں میں خطابت کا رنگ غالب ہے۔ وہ بائیبل کے انداز میں بھی خوب لکھتے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے ۱۰ برس کی عمر سے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا . راقم الحروف نے ان کے بچپن کی بعض تحریریں دیکھی ہیں۔ جن میں ادب اور انشاء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اتنا ضرور مانتا ہوں کہ پختگی ادب، عمر کی پختگی کا ردِ عمل ہے۔ لیکن انشاء اور شادابی ہر دور میں ادیب کے ساتھ ہوتی ہے۔ مولانا اصلاحی گو تحریک کے تقاضوں کے مطابق لکھتے ہیں۔ اور ان کے ادب کا مزاج پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریر کی جو خصوصیت پہلے دن تھی۔ وہ آج بھی باقی ہے۔ یعنی پختگی اور شادابی۔ انشاء اور ادبِ لطیف کا امتزاج۔ چونکہ اس وقت میرے سامنے وہ تحریریں نہیں ہیں۔ اس لئے میں انہیں نقل نہیں کر سکتا۔ انشاءاللہ پھر کبھی انہیں پیش کیا جائیگا۔

مولانا زندگی کے ہر معاملہ میں جس طرح انتہائی ستھرے انسان ہیں۔ اس طرح مطالعہ میں بھی وہ اول درجے سے نیچے نہیں اُترتے۔ وہ مطالعہ کے بہت شوقین ہیں۔ لیکن منتخب کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ مصنفین میں علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، مولانا حمید الدین فراہی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو تاریخ اسلام کے اکثر و بیشتر فلاسفہ، متکلمین، مورخین اور ادیبوں کو مولانا نے اچھی طرح کھنگالا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا متکلمینِ اسلام سے ان کی دلچسپی اس لئے زیادہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے بحیثیت ایک نظامِ حیات کے پیش کیا۔ اور یونانی اور ایرانی افکار سے آزاد ہو کر اسلام پر سوچا۔ مغربی مفکرین میں انہیں بیکن، جی ویلز، جوڈ، برٹرینڈ رسل، ٹالسٹائی، بلیچلی اور ہیگل وغیرہ بہت پسند ہیں۔

مولانا کے تراجم اور تصانیف

مولانا کی سب سے پہلی کتاب ایک عربی ناول کا ترجمہ "ہندوستانی جاسوس" ہے۔ جس میں ایک ہندوستانی جاسوس کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ جو مرحوم مصطفےٰ کمال پاشا کو قتل کرنے کی غرض سے ترکی گیا تھا۔ اس ناول کا ترجمہ نہایت سلیس اور زبان نہایت شگفتہ ہے۔ اخبار مدینہ بجنور کے کتبہ سے اب تک یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ محی الدین الخیاط کی تاریخ اسلام کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ

کتاب بھی مدینہ سے شائع ہو رہی ہے۔ مولانا اصلاحی نے مولانا فراہی کی اکثر عربی تفاسیر کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو تعداد میں دس بارہ ہیں۔ مولانا نے علمی اور تحقیقی مضامین بہت کثرت سے لکھے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کی اور مجمل تصانیف میں حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، نماز کی حقیقت، اور اسلامی ریاست ہیں۔ اس کے علاوہ حقیقت تبلیغ پر ایک ضخیم کتاب بھی ہے۔ جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔

حقیقتِ شرک

حقیقت شرک مولانا کی پہلی تصنیف ہے۔ جس میں شرک کا فلسفہ، اس کے اقسام، تمدن پر اس کے اثرات، شرک کی تباہ کاریاں، شرک خفی و جلی، جدید نظریات زندگی میں شرک کا ظہور۔ غرضیکہ شرک کے موضوع پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ شرک صرف ایک اعتقادی فساد کا نام نہیں ہے۔ اور نہ صرف بت پرستی شرک ہے، بلکہ ہر وہ نظام زندگی مشرکانہ ہے جس میں خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور عقیدہ آخرت کے اصول تسلیم نہ کئے گئے ہوں۔ تمدن میں، سیاست میں، معیشت میں اور معاشرت میں آج بگاڑ اور فساد کی جو قوتیں ظہور کر رہی ہیں۔ ان کا سرچشمہ درحقیقت یہ عقیدہ ہے کہ تمدنی نظام میں انسان کو خود ضابطے اور قانون بنانے کا حق ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو غیر الٰہی نظام سیاست و تمدن کی اطاعت پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ انہیں اس عقیدے کے باوجود شرک میں دھکیل رہے ہیں کہ خدا ہی ہمارا معبود، حاکم اور قانون ساز ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ان صوفیانہ گمراہیوں کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ جو وحدۃ الوجود، اشراقیت، رواقیت اور تصور شیخ کے مختلف ناموں سے مسلمانوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

حقیقتِ توحید

مولانا کی دوسری تصنیف توحید ہے، جس میں الٰہی نظام تمدن کے اصول بتائے گئے ہیں۔ جو خدا کی حاکمیت پر قائم ہوتا ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ عقیدۂ توحید مجرد عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اثر پورے نظام تمدن پر پڑتا ہے۔ افراد کو ایک خدا کا تصور اس دنیا میں جواب دہی اور پابندی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے اندر یہ خوف پیدا کرتا ہے کہ اسے اپنے اعمال کا بدلہ خدا کے یہاں سخت عذاب کی صورت میں ملے گا۔ اور بھلے افعال پر وہ انعام کا مستحق ٹھرایا جائے گا اسی طرح ایک سوسائٹی میں خدا پرستی کا جذبہ ہی اسے انصاف اور عدل کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تمدن میں عقیدہ توحید ہی جفاکاری، بددیانتی، فساد انگیزی، ظلم و جور اور چیرہ دستی کو ختم کر کے تعاون، نیکی، خدمت، خدا پرستی، نیک چلنی، انصاف کے داعیات پیدا کرتا ہے۔ اور انسانی سوسائٹی انسانوں کی حاکمیت سے نجات پاکر خدا کی حاکمیت اور صالح بندوں کی قیادت میں اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔

حقیقتِ تقویٰ، تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ لمبی لمبی نمازیں، متعدد قسم کے اوراد و وظائف، اور اس کے ساتھ ساتھ طاغوت اور کفر کی خدمت؟ مولانا نے بتایا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ ایک انسان اور سوسائٹی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کے حکم اور رسول کے اسوۂ حسنہ پر چلے۔ ہر وہ انسان متقی ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی اطاعت کا پابند ہو۔ یہ تقویٰ نہیں ہے کہ لمبی لمبی نمازوں کے ساتھ سود کا کاروبار بھی جاری ہے۔ وظائف کے ساتھ انگریز کی نوکری بھی کی جا رہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ لمبی لمبی نمازیں اور الشد مد کے ورد کرنے والا متقی نہیں ہے۔ بلکہ متقی وہ ہے جس کی پوری زندگی خدا کی اطاعت کی مظہر ہو۔

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کیا ہے؟ اس کے اصول و مبادی، اس کے اندر شہریوں کے حقوق و فرائض، اس کے چلانے والوں کی صفات، اس میں ذمیوں کا مقام، عورتوں کے حقوق، غرضیکہ ایک ریاست کے تمام اجتماعی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے بارہ ابواب ہیں۔ جن میں سے تین اب تک شائع ہوئے ہیں، یہ کتاب نہایت مدلل اور تحقیقی ہے۔ جس میں اسلامی فکر

کے رسوخ اور تاریخ اسلام کے استفادہ کا نچوڑ موجود ہے۔ مولانا کی یہ کتاب اسلامی نظام سیاست پر اب تک شائع شدہ سارے مواد پر بھاری ہے۔ اس کتاب کی مکمل اشاعت کے بعد ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کا ذہین عنصر اسلامی ریاست کے ایک منظم اور مکمل نظام سیاست و تمدن ہونے کی حیثیت میں پوری طرح مطمئن ہو جائیگا۔ یہ کتاب موجودہ حالات میں ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے اور آئندہ پاکستان جب صحیح اسلامی ریاست بنے گا تو یہ کتاب اس کی رہنمائی کرے گی۔ بلکہ اس کا اساسی دستور ثابت ہوگی۔

اوصاف وعادات

مولانا اصلاحی کے قدموں میں راقم الحروف کو کچھ دن رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میرے سامنے ان کی ظاہر اور باطن کی پوری زندگی ہے۔ ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے اشتہار کو وہ بھی ناپسند کریں گے۔ اور مجھے خود یہ بات پسند نہیں ہے۔ اور یوں بھی اس کا تعلق عوام سے نہیں بلکہ خدا سے ہے' لیکن ان کی بعض خوبیاں ایسی ہیں۔ جن کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اوصاف پر بہرحال مجھے کچھ لکھنا ہے۔ مولانا فطرتاً ایک قناعت پسند انسان ہیں۔ ان کے استغنا کا یہ عالم ہے کہ دُنیا ان کے پیچھے پھرتی ہے۔ لیکن وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں پھرے۔ اور نہ دنیا انہیں کبھی باطل کے ساتھ مصالحت پر راضی کر سکی۔ ان کی زندگی میں شدید عسرت آئی۔ لیکن یہ عسرت انہیں سیم وزر کا بندہ نہیں بنا سکی۔ وہ بھی چاہتے تو طاقوت کی خدمت کر سکتے تھے۔ اور اس سے آخرت میں آگ اور دنیا میں آرام فراہم کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی پوری زندگی میں ہمیں کوئی ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ملتا کہ انہوں نے باطل کی خدمت کر کے اپنے لئے ایک دمڑی کا نوالہ بھی حاصل کیا ہو۔ میرے خیال میں ایک انسان کی خداپرستی کا اصلی امتحان اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ مصیبتوں میں خدا کی اطاعت پر قائم رہے۔ مولانا اصلاحی کی تاریخ اس معاملہ میں بے داغ ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت حق گوئی ہے۔ وہ سچی بات کہنے میں مشہور ہیں۔ اور لپیٹ کر بات کرنی انہیں نہیں آتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض کم فہم لوگ انہیں غیر ڈپلومیٹ کہتے ہیں۔ حالانکہ ایک سچے مسلمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جو بات کہے۔ وہ سچی ہو۔ مولانا اس معاملہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ انہیں ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو گھما پھرا کر بات کہنے کے عادی ہیں۔

مولانا ایک محبت کرنے والے انسان ہیں۔ گو وہ فطرتاً کم آمیز ہیں۔ لیکن جب کسی کو دوست بنا لیتے ہیں تو آخری دم تک نباہتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے انتہائی مخلص اور اپنے دشمنوں کے لئے کم مضر ہیں۔ وہ اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی قدر بھی کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا مودودی سے جب ان کے اختلافات چل رہے تھے تو اس وقت بھی وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اور لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرو کیونکہ اسلام پر ان سے بہتر لٹریچر ابھی تک کسی نے نہیں لکھا ہے۔ راقم الحروف سے انہوں نے خود ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ اگر دین ومذہب کی کچھ قلمی خدمت کرنا چاہتے ہو تو ان کے صاحبانہ طرز تحریر کو اپناؤ۔

احباب کے انتخاب میں مولانا نہایت محتاط انسان ہیں۔ ان کے دوستوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ احباب کے انتخاب میں وہ دو باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صاحب علم اور صاحب ذوق ہو۔ دوسرے زندگی کے مسائل میں ان کا ہم مسلک اور ہم نظریہ ہو۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ تحریک اسلامی میں شرکت کرنے سے پہلے وہ شبلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ یہ دونوں بزرگ بھی انہیں بالکل اپنے عزیزوں کی طرح چاہتے تھے۔ لیکن جماعت اسلامی کے تعلق کے بعد جب ان کے دونوں بزرگوں نے تحریک کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا تو مولانا اصلاحی نے ان تمام تعلقات کو یک لخت ختم کر دیا۔ جو برسہا برس سے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ قائم تھے۔ کیونکہ فرض کا تقاضا تھا کہ ان تمام جذباتی تعلقات کو ختم کر دیا

اشتراکیت اور مذہب و اخلاق

(۴)

ادب اور لٹریچر

نذر محمد خالد

روس کی نوخیز نسلوں کی نظر میں قدیم ادبی ذخیرے بورژوا نظام کے جراثیم سے لبریز ہیں۔ سرگے پشکن ایسے نامور ادیب کو لٹریچر کے عام طالب علم بورژوائی مصنف کا لقب دیتے ہیں اور پرانے روسی ادب کے ہر نقیب کو اسی طرح بلا تخصیص تنقید کرخت تنقیدوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مسکوف۔ تالستائی۔ کوریلنگو اور چیخوف وغیرہ کی ادبی شہرت پوری اشتراکی دنیا میں زوال پذیر ہے تالستائی کے متعلق لینن کا فیصلہ ہے کہ وہ بلاخوف تردید تخیلی (Idealist) اور رجعتی ہے (Lenin on Art & Literature — page 32) وہ رجعتی اور تخیلی کیوں ہے؟ اس لئے کہ اُس کے ہاں دین و مذہب کا تصور ملتا ہے اور اپنی زندگی میں وہ اخلاقِ انسانی کا بہت بڑا داعی اور مبلغ رہا ہے۔ لینن اپنی بیان کردہ رائے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا کہ "تالستائی انسان کے داخلی اخلاق پر یقین رکھتا ہے۔ مذہب کی دائمی سچائیوں کو مانتا ہے ——— اور بغیر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ سب پرانے مردہ فکر کی نشانیاں ہیں" (ایضاً۔ ص: ۳۲) اسی جگہ آگے چل کر لینن لکھتا ہے کہ "ایک طرف تو وہ ناقابلِ بیان ذہانت کا ادیب ہے اور دوسری جانب ایک ایسا زمیندار ہے جو مسیح کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے ..... ایک جانب تو وہ ایک حقیقت نگار فن کار ہے۔ جو وقت کے چہرے سے مکر و فریب کے سارے پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب اِس دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت و ملامت شئے "مذہب" کا وہ داعی اور موئید ہے۔ اور کلیسا پر سرکار پرست پادریوں کے بجائے حق پرست پادریوں کو برسرِ اقتدار لانا چاہتا ہے (ایضاً: ص۔ ۳۳)

تالستائی اور اُس کے ہم عصر ادیبوں کا یہی سب سے بڑا قصور تھا۔ جس کی نشان دہی لینن نے اِن الفاظ میں کر دی ہے اسی جرم پر ان سب ادیبوں کو اشتراکی ادب کے دائرے سے خارج کر دیا گیا اور جو جدید ادب ان کی جگہ لینے کے لئے اٹھا وہ اپنی ہر تفصیل میں لینن اور اسٹالین سے ہم آواز تھا۔ انسانی زندگی کا سر رشتہ تو معاش اور ذرائع معاش پر قبضہ کر کے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لیا جا چکا تھا۔ اب اشاعتِ کتب اور چھاپہ خانوں پر بھی حکومت کی اجارہ داری قائم کر دی گئی۔ دنیا کی ہر انقلابی دعوت کے لئے خواہ وہ نظامِ باطل کی دعوت ہو یا نظامِ حق کی بہر حال ادب اور لٹریچر ایک ایسا کارگر حربہ ہے جسے وہ عوام کی مرضی اور منشا پر آزاد نہیں چھوڑ سکتی۔ خصوصاً۔ اشتراکی روس میں جہاں اشتراکیوں کو عوام الناس پر ایک بالکل ان جانا ان دیکھا نظام قدر اور معیار اخلاق و معاشرت مسلط کرنا تھا اور وہ بھی ایک ارتقائی تدریج سے نہیں بلکہ جبر و اکراہ سے ——— ایسی حالت میں بالشویک لوگ کیونکر ادب اور لٹریچر کے مورچہ کو خالی چھوڑ سکتے تھے" اپنے اقتدار کے پہلے دنوں ہی سوویٹ سرکار نے ملک بھر کے تمام پریسوں۔ اخباروں۔ رسالوں۔ اشاعت گھروں اور کتب خانوں کو

اپنی تحویل میں لے لیا" (ص ۱۱: P. Yudin : Soviet Culture) اور ایک لٹریری کنٹرول (RAPP) قایم کر دیا گیا۔ جس کے استبداد کی شہرت چند مہینوں میں ہی سارے ملک میں پھیل گئی اور اپنے متشددانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ملک بھر میں "ریپ ڈکٹیٹر شپ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موریس ہنڈس اپنی کتاب (Great Offensive) میں لکھتا ہے کہ "اگر یہ محکمہ (RAPP) اپنے دائرۂ عمل کو کسانوں مزدوروں میں نئے لکھنے والوں کی نشو و نما تک محدود رکھتا تو وہ ملک کی شایانِ شان خدمت انجام دے سکتا تھا۔ مگر اُس نے اپنے دائرۂ کار کو غیر ضروری طور پر بہت وسیع کر لیا اور مجموعی طور پر ملک کے ادب و لٹریچر کو اپنے اجارہ میں لے کر اسے اُس متعین سیاسی سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا۔ تصویر۔ ادب۔ ڈرامہ موسیقی سب اس ٹھوس سیاسی مقصد کے لئے استعمال ہونے پر مجبور ہو گئے" (ص: ۲۶۴) ۱۹۳۲ء میں اس ادبی آمریت کو ملک پر قائم ہوئے پورے سولہ سال بیت چکے تھے۔ اس طویل مدت میں متشددانہ مساعی سے اُس نے روسی ادب اور آرٹ کی پوری روح کو کچل دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اور اُس کی مرضی و منشا کے عین مطابق ایک ایسا ادب عالمِ وجود میں آ گیا تھا جس میں پرانے اخلاقی معیارات کی بو تک باقی نہیں بچی تھی اور جو قدیم ادبی روایات کی ایک الٹی تصویر تھا۔ موریس ہنڈس اپنی متذکرہ صدر کتاب میں اس دور کے افسانہ اور ناول کی کردار نگاری پر ایک مختصر تنقید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ان کے بناوٹی اور جھوٹے کردار خود کمیونسٹوں کے ادبی مذاق پر بوجھ ہو گئے ہیں۔ یہ کردار یا تو بالکل فوق البشر ہوتے ہیں اور یا پورے پاجی اور مکمل بدمعاش مشکل سے ان میں کوئی جیتا جاگتا انسان دکھائی دیتا ہے۔ سب کٹھ پتلیاں سی معلوم ہوتی ہیں جو وقت کے سیاسی دباؤ کے تحت ناچنے لگی ہوں" (ص ۲۶۷-۲۶۸) مذہب کے خلاف ریپ ڈکٹیٹر شپ نے جس زور کا مخالفانہ پروپگنڈہ کرایا۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ ماسکو میں میکسم گورکی کا ڈرامہ (Yegor Bulitchew) فلمایا گیا اور جب سکرین پر وہ سین آیا جہاں زمانہ ماقبل انقلاب کا ایک شہری قریب المرگ دکھایا گیا تھا۔ اور اُس کی آخری خواہش کی تکمیل کی خاطر پادری صاحب مرنے والے کو آخری آشیرباد دینے کے لئے بلائے گئے تو سینما ہال میں بیٹھا ہوا ہجوم پادری کے اسٹیج پر آتے ہی قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ اور چاروں جانب سے آوازے کسے جانے لگے (ص: ۲۴۹) لیکن اس آمرانہ حکمت عملی سے صرف مذہب کو ہی نقصان نہیں پہنچا بلکہ خود روسی ادب کا ارتقا بالکل رک کر رہ گیا۔ اچھے اچھے لکھنے والوں نے سرے سے لکھنا ہی چھوڑ دیا "الستائی ایسے پایہ کے ادیبوں کو افسانہ نگاری سے کنارا کر کے اپنی تصنیفی صلاحیتیں تاریخ نگاری کی طرف منتقل کر لینا پڑیں۔ بیبل جس کے خانہ جنگی کے عہد کے افسانے اس کی شہرتِ دوام کا باعث ہوئے تھے۔ بالکل خاموش ہو گیا۔ سیفولینا (Seifulina) جو ایک نہایت ذہین و فطین ناولسٹ تھی نے جدید طرز پر کچھ لکھنا چاہا مگر شدید طور پر ناکام رہی۔ پلنیاک جس کا ناول (Naked Year) ایک عظیم ادبی کارنامہ شمار ہوتا ہے پروپگنڈہ ناول لکھنے لکھتے حضرت یاس ناکامی سے دوچار ہوا۔ لیونوف (Leonov) روس کے افسانوی ادب میں ایک مشہور شخصیت تھا۔ اُس نے ایک جدید کارخانہ کی تعمیر کے موضوع کو لے کر ایک طویل کہانی تخلیق کرنا چاہی مگر اپنی ادبی صلاحیتوں کے باوجود ایک پست اور مفلس قسم کی کتاب لکھ کر رہ گیا۔

روس کے ادبی مطلع پر آج تک میکسم گورکی سب سے زیادہ چمکنے والا ستارا ہے۔ جدید اشتراکی ادیب کے جلو میں میکسم گورکی ایک ایسے مینار کی طرح کھڑا ہے کہ دوسرے ادیب اُس کے سامنے بالشتئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس ادب کی بابت میکسم گورکی ان ادیبوں کا سرپرست تھا مگر ان کی رہبری کرنے کا اُسے کبھی وقت جو ملا نہیں ہوا۔ وہ لینن۔ سٹالین اور ان کے

ہم ماہیوں سے ہمیشہ خائف رہا۔ لینن ایک مرتبہ کیپرے کے جزیرے پر میکسم گورکی کو اس کی سیاسی غلطیوں پر متنبہ کرنے گیا تھا گورکی نے بلا چوں و چراں لینن کی سرزنشیں سنیں اور شکست خوردگی اور پژمردگی کے عالم میں جواب دیا" میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک ناقص العلم مارکسی ہوں اور پھر ہم آرٹسٹ لوگ بہرصورت غیر ذمہ دار ہوتے ہیں" لینن گورکی کے متعلق ایک خط میں لکھتا ہے کہ" آخر گورکی سیاسیات میں دخل ہی کیوں دیتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ گورکی کا یہ (متنازعہ فیہ) خط بورژوائی تعصبات کا ایک کریہہ مرقع ہے۔ حالانکہ ہماری پارٹی کی تمام تر مساعی انہی تعصبات کی بیخ کنی میں صرف ہونی چاہئیں (Collected Works.

(Lenin : Vol-20: p: 41

بیسویں صدی کے اوائل ہی سے جب وہ نیا نیا انقلابی بنا اُسے آدمی کی حیثیت سے ایک دنیا میں اور ادیب کی حیثیت سے دوسری دنیا میں رہنا پڑا اور ان دونوں کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل رہی کہ مرتے دم تک گورکی سے پٹ نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورکی نہ اس دنیا کا رہا نہ اُس دنیا کا اور آخر میں اُس نے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ انقلاب کے بعد کی زندگی کا رنگ ایسا تھا کہ کاغذ پھیکا ہی رہ گیا تھا۔ اُسے یہی جھجک لاحق رہی کہ کہیں قلم اور تلوار کے درمیان لڑائی نہ ہو جائے۔ سیاست اور ادب کا باہم اختلاف نہ ہو جائے اگر تصویر کا رنگ انقلابی تعلیم سے میل نہ کھاتا اور بات بے موقع ہوتی تو بلاشبہ انشا پردازی کی کھلی رسوائی تھی کہ وہ بالشویک سیاست کے رکاب در رکاب نہ چل سکی۔ روس کے اس ادبی دیو کے آخری ایام اسی اُدھیڑ بن میں بیت گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن کی ساری شوخی انقلاب سے پہلے ہی کھو چکا تھا۔

اِس عہد میں کسی رفیق نے لینن کو مشورہ دیا کہ وہ ایک لٹریری اور فکشن ڈیپارٹمنٹ کے نام سے کھول کر گورکی کی تحویل میں دے دے مگر لینن ایسا ہوشیار آدمی جو گورکی کے متعلق خوب جانتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے اس مطالبہ سے اپنا پہلو نہایت چالاکی سے بچا گیا اُس نے کہا" یہ مشورہ سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے مگر گورکی ایسی عظیم ادبی شخصیت کو جرنلزم کے جھاڑ میں پھنسا کر میں عالمگیر ادب پر ظلم نہیں کرنا چاہتا" (Lenin on Art & Literature: page 67)

، دراصل لینن گورکی کو انقلاب کے کسی مصرف کا نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گورکی پر اُس کی ناقدانہ تعزیر بہت سخت تھی۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اِس آوارہ ادیب کی شخصیت بالشویک انقلاب سے اتنی بے جوڑ تھی تو بالشویکوں نے اُسے دوسرے ہم عصروں کے مقابلہ میں اتنی عظیم شہرت کیوں دے دی اور اشتراکیت کے ادبی مطلع پر اُسے اس قدر کیوں چمکا دیا کہ تالستائی، چیخوف اور پشکن وغیرہ اُس کے سامنے مدھم پڑ گئے ؟ اس کی وجہ صرف اتنی سی بات تھی کہ اپنے ہم عصروں میں صرف ایک میکسم گورکی ہی تھا۔ جس نے اشتراکیت کے غیر اخلاقی اور الحادی نظریہ کو بطیب خاطر قبول کر لیا تھا۔ اشتراکیت کی غیر اخلاقی قدروں کو تو اُس نے اِس قدر اپنا لیا تھا کہ وہ امریکہ کی سیر کو آیا (۱۹۰۵ء) اور ہر جگہ اس کا بہت دھوم دھام سے استقبال ہوا لیکن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ عورت جو گورکی اپنے ازدواج میں ساتھ لئے پھرتا ہے اُس کی بیوی نہیں ہے بلکہ خالی دوست ہے۔ تو سب لوگ اس سے خفا ہو گئے۔ گورکی کو یہ ادا قدامت پسندی پر موقوف معلوم دی اور اتنی ناگوار گذری کہ اہلِ امریکہ کے خلاف اُس نے ایک زہرناک کتاب لکھ ماری۔

گورکی کی مشہور تصانیف میں اُس کے دو مشہور ناول" بچپن" اور" غیروں میں" انقلاب سے بہت پہلے لکھے گئے تھے۔ ان دونوں ناولوں میں اُس نے اپنی زندگی کے اُن ایام کا نقشہ کھینچا ہے جو انتہائی غربت و افلاس میں کٹے تھے" چلکاش"" میرا ہم سفر" اور" مالوا" اُس کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک مفلس و نادار آدمی کے دکھ درد کی داستان کو کچھ اس طرح سنایا گیا ہے کہ ماحول پر

ایک خلائی اور معاشرتی جس طاری ہو جاتا ہے۔ فلسفہ۔ مذہب۔ انسانیت سب سے جی اکتا اٹھتا ہے اور زندگی سے کہیں دور بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ مگر باہر نکلنے کو کوئی راستہ نہیں ملتا۔ گورکی خود اس تنگ دھارے سے نکلنے کا کوئی راستہ پانے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ دوسری کتاب "غیروں میں" وہ ایک ان پڑھ فلسفی کے بھیس میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت فلسفی کے اُسے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے جہاں کہیں اپنے مخصوص موضوع "آوارگی" سے ہٹ کر کچھ لکھا ہے اُس کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں انقلاب کے موضوع پر اُس کا ناول "ماں" اس بات کی روشن دلیل ہے یہ ناول ان سطور کے لکھنے والے نے اپنے زمانہ طالب علمی میں انگریزی زبان میں پڑھا تھا اور اپنے زمانے کے اشتراکیوں میں اُس کے اس ادبی شاہکار کا غلغلہ سنا تھا۔ پورا ناول (Disintegration) انداز میں لکھا گیا ہے عوام کے مذہبی معتقدات۔ اور اہل کلیسا کا خاکہ اڑایا گیا ہے اگرچہ یہ واحد ناول ہے جو گورکی نے انقلاب کے موضوع پر انقلاب کی خاطر لکھا تھا مگر تاریخ کے اعتبار سے اپنے مقصد میں بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔ اور جس وقت روس میں اشتراکی انقلاب عملاً رونما ہوا تو مصنف کی تخلیقی ٹھوکریں سب پر واضح ہو گئیں "میری تعلیم گاہیں" اور "میرا روزنامچہ" یہ دو تو انقلاب کے بعد کی چیزیں ہیں۔ ان میں جا بجا۔ اخلاق۔ مذہب شادی وغیرہ کی تضحیک کی گئی ہے اور کہیں دہریت کی عملی تبلیغ۔ گورکی لکھتا ہے "ہم دونوں کے لئے دہریت پر اعتقاد رکھنا بہتر ہوگا کیونکہ زندگی میں ہمیں صرف اپنی ذات پر اعتماد ہونا چاہیئے۔ آخر خوف کس بات کا۔ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا خوف دل میں نہ ہونا چاہیئے" پھر روس کی جنسی انارکی کا نقشہ اپنے روزنامچہ میں کھینچتا ہے۔ ایک محفل عیش و نشاط کا ذکر ہے جہاں روس کے نوجوان مرد و زن داد عیش دے رہے ہیں۔ لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر لیا ہے اور لڑکوں کو دوسری قطار میں۔ پھر حکم ہوتا ہے "لڑکیوں سے ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔ بس دو قدم اور پیچھے۔ سامنے جھک جاؤ۔ لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنا رفیق چن لیں گی۔ کسی کو دباؤ کا اختیار نہیں" (دہریت شادی۔ رقص)

میکسم گورکی کے بعد ادیبوں کی نوخیز نسل جو ریپ ڈکٹیٹر شپ (RAPP) نے پیدا کی ہے وہ اس لحاظ سے اپنے پیش رو سے بھی آگے معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں اُن کا مطمح نظر وہی آزاد اخلاق اور آزاد محبت کا اصول تھا جو فرانس کی مشہور ادیبہ جارج سان (۱۸۳۳ء) کی پیش گوئی میں درج ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ نکاح کی غیر مہذبانہ ازدواجی رسم بہت جلد موقوف ہو جائے گی۔ انسانی نسلوں نے اگر عدل و انصاف کی راہ پر پیش قدمی جاری رکھی تو جنسی ملاپ کا طریقہ مہذب ہو کر رہے گا۔ اور وقت آئے گا جب مرد اپنے عہد کی عورتوں پر کوئی ازدواجی پابندی باقی نہیں چھوڑیں گے" چنانچہ اشتراکی روس کی جدید ادبی کاوشوں پر ایک ادنےٰ نظر اس بات کے بین ثبوت بہم پہنچا دیتی ہے کہ فرانس کی اس مشہور ادیبہ کی پیشگوئی حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔ ادیبوں کی اس نوخیز نسل کے جن ادبی شاہکاروں کے تراجم انگریزی زبان اور دیگر غیر روسی زبانوں میں ہو چکے ہیں وہ اُن ادبی اور اخلاقی قدروں کا مکمل نمونہ ہیں جو اشتراکیت عملی زندگی میں اپنے پاس رکھتی ہے۔ ان ناولوں میں سے چار مشہور ناول انگریزی زبان میں منتقل ہوئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا تو مشہور مصنف رومونف کا ہے "تین جوڑا ریشمی جرابیں" (Three pairs of Silk Stockings) اور "پھولوں کے بغیر" (Without Flowers) تیسرا عشق سگاں (Dogs Love) اور چوتھا (Squaring the Circle) ہے۔ یہ سب ناول روسی ادب کی موجودہ فحش نگاری کی ایک نہایت کریہہ تصویر ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں موریس ہنڈس اس آخری ناول کے متعلق تحریر کرتا ہے کہ "یہ ناول جس کی فلم ماسکو میں حیرت ناک کامیابی کے ساتھ دکھائی جا رہی ہے اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ روس میں جنسی فحاشی کا دیوالیہ نکل چکا ہے"

Great Offensive — p. 192.

(ص۔۱۹۸۰ء Great Offensive) متذکرہ صدر ناولوں میں سے ایک ناول "پھولوں کے بغیر" میں رومونوف لکھتا ہے "ہم لوگوں میں محبت مفقود ہو چکی ہے۔ اور اس کی جگہ آزاد جنسی ملاپ نے لے لی ہے۔ جو لوگ محبت میں عضویات (فزیالوجی) سے کچھ زیادہ معنی کے متلاشی ہوتے ہیں ہمارے ہاں وہ نیم پاگل لوگ ہیں" (بحوالہ مدر رشیا: مورس ہنڈس ص: ۲۲۸) ایک دوسرا اشتراکی ناول نویس ارسے بیشوف اپنے ناول (E amine) میں رقم طراز ہے کہ "شراب خوری اور زنا کوئی قابل شرم چیزیں نہیں ہیں۔ گناہ کوئی چیز نہیں۔ محبت کرنا، خوب پینا۔ اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے یہ چیزیں ایک فطری جذبہ ہو وہ گناہ کیسے ہو سکتی ہے (بحوالہ ص: ۱۲۴ ——— Religion under the Soviet) مورس ہنڈس جیسی کی کتابوں کے چند اقتباسات پہلے دیئے جا چکے ہیں کہ موجودہ روسی ادب میں سوسائٹی کے ان تین اداروں مذہب، کاروبار شخصی اور خاندان کو مسخرے پن سے بہتر کوئی نام نہیں دیا جاتا۔ یہ تینوں چیزیں وہی ہیں جن پر قدیم بہترین لکھنے والوں نے اپنا زور قلم صرف کیا ہے اور انہی تینوں چیزوں کا اب روسی ادب منہ چڑاتا ہے۔

اِن سطور میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ روسی ادب کی نقش نگاری پر کوئی طویل بحث شروع کی جائے پڑھنے والا اگر اس سلسلہ میں مزید تفصیل دیکھنا چاہتا ہے تو ہم سہولت کے لئے تین چار کتابوں کے نام لکھ دیتے ہیں۔ جن کے تراجم انگریزی زبان میں بھی ہو چکے ہیں اور اچھے کتب فروشوں کے ذریعے باہر سے منگوائے بھی جا سکتے ہیں۔ راقم الحروف کے پاس یہ کتابیں موجود نہیں ہیں اس لئے کسی ذمہ داری سے اِن پر لکھا نہیں جا سکتا ہے اِن ناولوں میں سے ایک (Alexandra Kollontai) کا ناول "مزدور لڑکی کی محبت" ہے جس کا انگریزی ترجمہ (Free Love) "آزاد محبت" کے نام سے ہو چکا ہے پھر رومونوف (P. Romanov) کا ناول "پھولوں کے بغیر" ہے جس کا انگریزی ایڈیشن (Without Cherry Blossoms) کے نام سے چھپا ہے اس کے بعد شولوخوف (M. Sholokhov) کا (The Soil Upturned) بھی دیکھا جا سکتا ہے

اشتراکی ادب کے اس مختصر سے جائزے میں اگر سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان مملکتوں کی جدید ادبی روایات پر بھی ایک ہلکی روشنی ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

یہ ۱۹۲۲ء کی بات ہے جب امیر سعید عالم خاں بخارا چھوڑ کر افغانستان چلا گیا تھا۔ اور یہی سال وہ آخری سال ہے جب وسط ایشیا کے مسلمان مجاہدین اشتراکیت کی ترنغ یلغار سے شکست کھا کر منتشر ہو گئے۔ یہ وسط ایشیا کی مملکتیں تنظیمی لحاظ سے جتنی گری ہوئی تھیں اِس سے زیادہ علمی لحاظ سے کوری تھیں۔ بعض ایسی قومیں بھی موجود تھیں جو اپنے پہاڑی و دشوار گزار راستوں کی وجہ سے تہذیبی لحاظ سے بالکل پس ماندہ رہ گئی تھیں اسلام اپنے پر جوش داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ اُن تک کسی زمانے میں ضرور پہنچ گیا تھا مگر امتداد وقت سے اِس پر بھی اتنی گرد جم گئی تھی کہ صورت پہچاننا مشکل تھا۔ علمی زبان فارسی ہی تھی۔ مگر اشتراکی اقتدار نے اپنے مفادات کے لئے مناسب سمجھا کہ ہر قوم و قبیلہ اپنی مادری زبان پڑھے اور لکھے۔ چنانچہ ایسی کئی قومیتیں ہیں جن کی بولیاں صرف بولی جاتی تھیں اور ماضی میں آج تک کبھی لکھی نہیں گئی تھیں اور جو اپنے پاس حروف ابجد بھی نہیں رکھتی تھیں۔ ایسی سب بولیوں کو اشتراکی حضرات نے از سر نو مرتب کیا اُن کی ابجد تیار کی اور اُن میں لٹریچر کے ذخیرے پیدا کئے۔ بعض قومیں تو ایسی چاری ایسی بھی ہیں جو اب تک سوائے گڈریوں کے دو ہروں کے اپنے پاس اور کوئی ذخیرۂ ادب نہیں رکھتی تھیں۔ اشتراکی لوگوں نے اب انہی قدیم گڈریا شاعروں کی مردہ شخصیتوں کو مبالغہ و رنگ آمیزی کے ساتھ ابھارا ہے کہ یہ اچھے خاصے "فردوسی" بن گئے ہیں۔ اِن نوزائیدہ زبانوں کی بقیہ کسر روسی زبان کے اشتراکی مصنفوں کی کتابوں کے کثیر تراجم سے پوری کر دی گئی ہے۔ یہاں ہمیں وسط ایشیا

کے عرت الحادی ادب سے بحث کرتا ہے۔ اس لئے ہم بوشا کشزی کی کتاب صبح سمرقند Dawn over Samarkand کو سامنے رکھ کر قارئین کے سامنے ایک مختصر خاکہ پیش کریں گے۔

۱۹۲۰ء سے پہلے صدر الدین آئینی بخارا کا مشہور اشتراکی شاعر مسلمان تھا۔ خدائے عالم کو خطاب کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ: ـــــ

"اے خدائے بزرگ و برتر۔
تو کیا زندگی کی شاہ رگ نہیں ہے؟
تو سب طاقت وروں سے قوی ہے۔
اور سب جابروں پر غالب ہے۔
یا خدا! ان بلند محلوں کی عالی چھتوں کو،
خانوں اور امیروں کے تاجدار سروں پر ڈھا دے۔
اے خدائے جہاں ہمیں ان کی قید مصیبت سے نجات دلا۔
اور یہ خان اور امیر کانپتے ہوئے اپنے غلاموں پر سرنگوں ہو جائیں۔

لیکن انقلاب کے دو ہی سال بعد جس طرح سارے وسطی ایشیا کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اسی طرح صدر الدین آئینی بھی بدل گیا۔ اس کے متعلق صبح سمرقند کا مصنف لکھتا ہے۔ "بلند محلات کے چھت پر غرور تاجداروں کے سروں پر ڈھا دئے گئے اور لرزاں شہزادے غلاموں کے قدموں پر دو زانو ہو گئے۔ مگر اس انقلاب میں اللہ یا خدائے جہاں کا بھی کوئی ہاتھ تھا؟ صدر الدین آئینی اب یہ نہیں مانتا تاآنکہ عوام کا یہ محبوب شاعر کسی دوسرے مقام پر اس حقیقت کو صاف ستھرے طرزِ استدلال سے یوں واشگاف کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ اور اس کے نبیوں کی برکت سے نہیں ہوا بلکہ یہ سب کچھ تاجکستان کے بالشویک فدائیوں کے دست و بازو کے مرہون منت تھا"

انقلاب کے فوراً بعد سویٹ ایشیا کے ادب کو جاگیر دار سرمایہ دار ملّا اور مذہب کے خلاف کھڑا کر دیا گیا اور بالشویزم کے ان چاروں دشمنوں پر بہ یک پہلو سے حملہ کر دیا گیا۔ ترکمان شاعر کا رمولا لکھتا ہے۔

جاگیردار، سرمایہ دار، ملا اور امیر۔
انسانیت کو کھا جانے والے چار کیڑے۔
خانوں اور امیروں سمیت پیوند زمین ہو گئے۔
تم نے قبائل کی مصیبتوں کے اٹھتے ہوئے لشکر کو مار بھگایا۔
شہری فتح کا میٹھا پھل سب غریب مل کر کھائیں گے۔

مرحبا! اے بالشویک مرحبا!

اسلام قرآن اور پیغمبر اگرچہ اشتراکی اقتدار کے نافذ اور مسلط ہو جانے کے بعد بھی بہت سے مسلمانوں کے لئے قابلِ عزت و احترام رہے مگر اشتراکیوں کی الحادی ادبی تحریک خدا و رسول اور قرآن و حدیث کے خلاف انتہائی ذلیل پروپیگنڈے سے لبریز ہو گئی تاجکستان کا ایک دیہاتی شاعر مسعود شوپنچی ایک نظم میں کہتا ہے،

اے ملّا تیاہ مکرم!

تم نے کہا کہ تاج ان سروں سے نہ اتر سکیں گے۔
لیکن یہ اُتار لئے گئے۔
تم نے کہا تھا کہ تخت زمین بوس نہیں ہو گا۔
لیکن یہ پیوند خاک ہو گیا۔
تم کہتے تھے کہ قرآن کے الفاظ دائمی ہیں۔
اور وادی کی پری چہرہ دوشیزائیں۔
نقاب الٹ نہیں سکیں گی۔
انہوں نے الٹ دیئے۔
تم نے کہا تھا کہ مسجدیں کبھی خالی نہ ہوں گی۔
اور اسلام ہمیشہ حکومت کرے گا ——— لو وہ مٹ گیا۔
تم نے کہا تھا کہ حکمران کا خون مقدس ہے۔
دیکھو میری تلوار کیا اُن کے خون سے رنگین نہیں!
تم نے کہا تھا کہ قاضی اور شریعت ملک بدر نہیں ہوں گے۔
دیکھو لو وہ سب نکل بھاگے۔
مُلّا! کہاں ہیں وہ پیش گوئیاں۔
مُلّا! تمہارے تصور سے مجھے تھکن ہوتی ہے۔

وہ سادہ لوگ جن کی زندگیاں کبھی خدا کی حمد و ثنا کی شیدائی ہوتی تھیں وہ پہاڑی چوٹیاں جو کبھی آیات قرآنی کی دلنواز تلاوت سے گونجا کرتی تھیں وہ سینے جو کبھی احادیث رسول کے خزانے ہوتے تھے۔ وہ بخارا جو کبھی امام بخاری کو جنم دیتا تھا اب یہاں لینن و اسٹالن کی ثنا و حمد ہوتی ہے اور خدا و رسول کی ہجو۔

پامیر کی بلندیاں زمین کے ساتھ ہموار ہو جائیں۔
اور سمندر خشکیوں پر چڑھ آئیں
صدیاں اپنے ارتقا کی آہنی دیوار میں پھاند جائیں۔
لوگ اپنے اب و جد کا نام و پتہ فراموش کر دیں۔
اور ملک اپنی زبانیں بھول جائیں۔
لیکن لینن کبھی بھولنے نہ پائے گا۔

ان سو فی صد مسلم آبادیوں میں جہاں کوچے کوچے آذانوں کی آواز آتی تھی۔ اب وہاں پر ریڈیو تاشقند کے مشہور عوامی دو ہرے الاپے جاتے ہیں۔ جن سے خدا اور مذہب کی اعلانیہ تضحیک ہوتی ہے۔ جلال امیر حسیدو کی یہ سطور۔ مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے خلاف عوام میں بالشویکوں کے پروردہ بغض و عناد کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ملّا! تم اب واپس نہ آؤ۔ واپس آنے سے پہلے ہمارے سلسلہ ہائے کوہ سے پا پیادہ تمہارے سر کو کچلنے کے لئے اپنی چوٹی پر عجیب گلشن اٹھائے کھڑے ہیں۔ اب ہم تمہارا نام نہیں سننا چاہتے۔ سینکڑوں برس ہم نے اپنے دلوں میں جو دکھ

قانونِ شریعت کی اندھا دھند تقلید کی ہے۔ ہمارا کچھ نہیں بنا اور نہ اب بنے گا۔ مُلا تم اب واپس نہ آؤ۔ اگر تم آئے تو یاد رکھنا ہم اپنی معصوم بھیڑوں کو تمہاری تبلیغ سے بچائیں گے" تاجکستان کے ایک دوسرے شاعر جی لاھوتی کی نظم سن لیجئے۔

Today we have a Muslim Holiday,	آج ہمارا ایک اسلامی تہوار ہے۔
Ruza, we call it here,	جسے ہم روزہ کہتے ہیں۔
And what a Holiday it was in past,	زمانۂ ماضی میں یہ تہوار کیا تھا
Deserted the homes, deserted the fields,	گھر خالی اور کھیت سنسان ہو جاتے تھے
Crowds kneeling all day in the mosques,	اور لوگوں کی بھیڑ سارا دن مسجدوں میں سربسجود رہتی تھی۔
But now who has time to think of Ruza	اور اب اس روزہ پر تضیع وقت کون کرتا ہے
Who has time for the nonsense slavish past	اس بیوقوفانہ عہد غلامی کی یادگار کو منانے کا وقت اب کس کے پاس ہے۔
Our Unions call for Brigades.	ہماری حکومت ہمیں جنگ پر بلا رہی ہے

سوویٹ ایشیا کے لٹریچر میں موجودہ بدلے ہوئے رجحانات اُس زبردست انقلاب کی نشاندہی کرتے ہیں جو تیس سال کے عرصہ میں وہاں کی تمدنی معاشرتی اور مذہبی زندگی میں وارد ہو چکا ہے۔ اِس انقلاب کے پس پشت وہ معاشی اسباب اور تقاضے بھی ہیں جو بالشویکوں نے ملک میں پیدا کر دیئے۔ ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ ایک ایک دانۂ گندم جو وسطی ایشیا کی مسلم آبادیوں کے حلق سے گزرتا ہے وہ سوویٹ حکومت کے راشننگ ڈپو سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس طرح سوویٹ حکومت نے ہر شہری اور دیہاتی کی رگ جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اُس کے نظام استبداد سے ذرا کسی نے شکایت نہیں کی کہ اُس کی روزی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور رگ زندگی کٹ گئی۔ ان بے چارے مسلمانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی ہی نہ تھا کہ یا تو وہ سوویٹ سرکار کی نمک خواری کا دم بھریں۔ اور یا پھر اپنے وطن سے نکل جائیں۔ کثیر آبادیوں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ باقی باشندے اشتراکی خداؤں کی بندگی پر رضامند ہو گئے۔ معاش کیساتھ ادب و شعر کے میدان میں بھی یہی ہوا۔ چنانچہ ایک ایسے ادیب کے لئے جو اشتراکی اسٹیٹ کے زاویۂ نگاہ سے اتفاق نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے لئے اشاعت اور پریس کی ساری سہولتیں مفقود ہو جاتیں۔ اب اُس کی کوئی نظم کوئی مضمون ملک کے کسی اخبار یا رسالہ میں چھپ نہیں سکتی تھی اور نہ ہی دوسری پابندیوں کے سبب یہ کسی کو ایسی نظمیں یا تحریریں لکھ ہی سکتا تھا۔ دوسری طرف اشتراکی اعمال و افکار پر مہر تصدیق ثبت کرنے والے ہر ادیب کے لئے اشاعت اور پریس کی ساری سہولتیں مکمل تھیں اُس کی معاشی ضروریات کا نہایت معقول انتظام موجود تھا۔ وظائف اور رائیلٹی کی گرانقدر رقوم حکومت سے ملتی تھیں۔ اسٹالین سے فخر و افتخار کی ہزاروں سندیں اور تحفے ملتے تھے۔ ان حالات و اسباب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب عوام سے کٹ کر حکومت کی منشا و رائے پر موقوف ہو گیا۔ اور غیر اشتراکی ادب اپنی جگہ پر سوکھ کر مرجھا کر نابود ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

انتباہ

ارشد کاظمی

مظالم و ستم و جور کے منکہب تو — بتاؤ گردشِ تقدیر کون روکے گا
ہر اک طرف سے اُٹھیں گے عذاب کے بادل — جسارتِ فلکِ پیر کون روکے گا
فریب کارِ سیاست کو مٹتے دیکھا ہے — ہمارے خواب کی تعبیر کون روکے گا

ابھی تو خیر بہت نرم خیز ہیں لہریں — مگر بتاؤ کہ سیلاب کون روکے گا
تمہارے بس میں ہے خاموش کر دو ساز کو — فرازِ نغمۂ جیتا سب کون روکے گا
ستارے ماند پڑے ہیں تو ماند رہنے دو — شعاعِ مہرِ جہاں تاب کون روکے گا

بجا ہے میرے تخیل کو روک سکتے ہو — ہمارے کھولتے جذبات کون روکے گا
زمانہ ساز حکایت کے چھیڑنے والو — زمانہ سوز روایات کون روکے گا
نئے نظام کی آمد ہے لازمی اب تو — بدل رہے ہیں جو حالات کون روکے گا

شاکر کی نئی نظمیں

اداره

ہمارے پنجابی زبان میں اسلامی انقلاب کی دعوت دینے والے شاعر —— عبداللہ شاکر —— سے قارئین چراغ راہ متعارف ہو چکے ہیں۔ یہ بے پناہ لکھنے والا شاعر چند دن میں انتہائی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی نظموں کے ۵، ۵ ہزار کے ایڈیشن بالعموم پندرہ روز میں ختم ہو جاتے ہیں پنجاب کے دیہاتی ان نظموں کے ذریعے اسلام کو بھی اور ملک کی سیاست کو بھی بڑی خوبی سے سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا اصل پاکستان جو دیہات میں رہتا ہے، اسے شاکر کی نظموں کے ذریعے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا ہے کہ یہاں قرآن کے اسلام اور برسرِ اقتدار طبقہ کے فرنگی اسلام میں کش مکش بپا ہے اور اس کش مکش میں اُن کو بھی کوئی پارٹ ادا کرنا ہے۔

عبداللہ شاکر کی نظموں کے چار نئے ہفلٹ حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ قارئین چراغ راہ کی ضیافت کے لئے ان نظموں کے کچھ اقتباسات، مع اردو ترجمہ درج کئے جا رہے ہیں تاکہ پنجابی جاننے والے بھی اور نہ جاننے والے بھی اس شاعر کی عظمتِ فکر سے لذت اندوز ہو سکیں۔ (مرتب)

"نورانی صبح" :——

اسلامی قانون خدا دے بندے جدوں چلاون گے
رحمت دیاں ہواواں والے تُلّے نار دکھاون گے
فصلاں والے بدّل برکت بھریا مینہ وساون گے
سکے کھیت تے خشک بغیچے ہرے بھرے ہو جاون گے
ٹہکن، مہکن، ٹہکن والے پھیر سمیں دکھلاون گے
پاکستان رہوے گا باقی ظالم ختم ہو جاون گے
ٹھنڈی دا رسول اللہ نوں آئی پاکستان وچوں
تھپیا گیا اے خطہ حکم الٰہی لئی جہان وچوں
اک اک نقش تیار ہوئے گا اس دا خاص قرآن وچوں
لتّاں باہیں بھاویں کتیاں مارے پیا شیطان وچوں

جب خدا کے بندے اسلام کا قانون جاری کریں گے
تو رحمت کی ہواؤں کے جھونکے خرامِ ناز دکھائیں گے
خدا کے کرم کے بادل برکتوں بھرے مینہ برسائیں گے
ویران کھیت اور خشک باغیچے ہرے بھرے ہو جائیں گے
اور پھر اپنے لہکنے مہکنے اور چہکنے کے مناظر سامنے لے آئیں گے
پاکستان تو باقی رہے گا، البتہ ظالم ختم ہو جائیں گے
رسول اللہ صلعم کو پاکستان ہی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا پہنچی تھی
یہ خطہ سارے جہاں میں سے خاص طور پر احکامِ الٰہی کو جاری کرنے کیلئے منتخب کیا گیا ہے
اب اس کا ایک ایک نقش قرآن میں سے تیار ہو گا
چاہے شیطان بیچ میں کتنے ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہے

له اشارہ ہے اس پیغام کی طرف جو علامہ اقبال مرحوم نے یہ کہہ کر دیا تھا کہ "میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"

حکم خدا دے جالو ہو کے اپنا رنگ وکھاون گے
پاکستان رہوے گا باقی ظالم ختم ہو جاون گے

جدوں چک انگریزاں والی بے شک چال وکھالن پئے
اسلامی پردے دے اوہلے بے دینی نوں پالن پئے
انگریزی سچے دے اندر ملک تے قوم نوں ڈھالن پئے
پیچ دکان دہی تے دُودھ دی بھنگ شراب اُچھالن پئے
وانگ مداری نرا تماشہ کد تک پئے وکھاون گے
پاکستان رہوے گا باقی' ظالم ختم ہو جاون گے

کعبے دا جو راہ نہ جانے اوہنے راہ وکھانا کی؟
لندن ول منہ ہووے جس دا کعبے نوں اُس جانا کی؟
منزل ولے کنڈ ہے جس دی منزل اس پچانا کی؟
آپ پیا جو غوطے کھاوے اُس نے پار لنگھانا کی؟
ایہہ جانے لندن جانے جس دم قوم ہٹا دے گی
اودوں پاکستانیاں تائیں سُکھ دی نیندر آوے گی

مسکیناں' محتاجاں والے حق دبا دن والیاں توں'
ملک دی دولت جشناں دے وچ نت اڈاون والیاں توں
بے گناہاں تائیں ایویں جیلیں پا دن والیاں توں
نال گھر دی' قانوناں دے رعب جماون والیاں توں
قوم اساڈی گردن اپنی جد ول آزاد کراوے گی
اودوں پاکستانیاں تائیں سکھ دی نیندر آوے گی

بے ایمانی سیفٹی ایکٹ اپنا نام دکھایا اے
ظلم جوراں نے قانوناں واسطے تلک لگایا اے
نامردی نے چوراں وانگوں لُک لُک تیر چلایا اے
جدول سبے دلیلا ہو گئے دا لگاون آیا اے
غیر شرعی قانوناں تائیں جد تک موت نہ کھاوے گی
اودوں تک ساڈے تائیں ناہیں سکھ دے نیندر آوے گی
سیفٹی ایکٹ دیمک کھادیاں کندھاں ہیٹھاں تھمی ایں
ڈگدے محل کھلارن والی کوشش ایہہ نکمی ایں
کویں درخت کھلوتا رہسی جڑھ جس دی جمی ایں

اللہ کے احکام جاری ہو کر اپنا رنگ ضرور دکھائیں گے
پاکستان تو باقی رہے گا' البتہ ظالم ختم ہو جائیں گے
خوشامدی حیثیت رکھنے والے لوگ انگریزوں کی چال چلتے ہیں تو چلا لیں'
اسلام کے پردے کے پیچھے بیٹھ کر بے دینی کو پرورش دے لیں
انگریزی سانچے میں قوم اور ملک کو ڈھالنے کی کوشش کر لیں'
دودھ دہی کی دکان میں بھنگ اور شراب کو فروغ دے لیں
آخر مداریوں کی طرح محض تماشا گری سے کب تک کام چلے گا!
پاکستان باقی رہے گا اور ظالم ضرور ختم ہو جائیں گے۔
جو کعبے کا راہ جانتا ہی نہ ہو' وہ راہ دکھائے گا کیسے؟
جس کا منہ ہی لندن کی طرف ہو' وہ کعبے جائے گا کیا؟
جو پشت بہ منزل ہو کے چلے' وہ دوسروں کو منزل تک کیا پہنچائے گا
جو خود ہی ڈبکیاں کھا رہا ہو' وہ اوروں کو کیسے پار اتارے گا؟
ان لندن جانے والے ناخداؤں کو جس وقت قوم برطرف کر دے گی
اس وقت پاکستانیوں کے لئے چین کی نیند سونا ممکن ہو گا
مسکینوں اور محتاجوں کے حق مارنے والوں سے'
ملک کی دولت کو مسلسل جشنوں میں اڑانے والوں سے'
بے گناہوں کو یونہی جیل میں ڈال دینے والوں سے
خانہ ساز قوانین کے بل پر رعب جمانے والوں سے
جب ہماری قوم اپنی گردن آزاد کرا لے گی
تو اس وقت پاکستانیوں کے لئے چین کی نیند سونا ممکن ہو گا
بے ایمانی نے اپنا نام سیفٹی ایکٹ رکھ لیا ہے
یہ جناب ظلم ہیں جنہوں نے اپنی پیشانی پر قانون کا قشقہ لگا رکھا ہے
نامردی چوروں کی طرح آڑ لے لے کر تیر چلاتی ہے
جب دلائل ختم ہونے پر داؤں سے کام لینے کیلئے بڑھا
اس قسم کے غیر شرعی قوانین کو جب تک موت لقمہ نہ بنا لے
اس وقت تک ہم لوگوں کو سکھ کی نیند نہیں آ سکتی۔
سیفٹی ایکٹ اقتدار کی دیمک خوردہ دیوار کے لئے سہارا ہے
گرتے ہوئے محلوں کو استوار رکھنے کی یہ کوشش بالکل فضول ہے
وہ درخت کیسے کھڑا رہے گا جس کی جڑ مضبوط نہیں ہو سکی۔

ڈگا اسفر کرسی کولوں پیٹیا منزل لئی ایں
جدوں کنجدوزارت والی پگ کے دنر بنائنگی
اودوں پاکستانیاں تائیں سکھ دی نیند آوے گی

منزل تھڈ اور راہ دراز ہے تو آخر لنگڑا اسے کیسے طے کریگا
جس دن وزارت کی پگڑیا گر کر مذہبیوں کے ہاتھ آئے گی۔
اس وقت پاکستانیوں کو چین کی نیند آسکے گی۔

شیطانی وحی

فتنے دی ڈھول پچھوں بہ کے وجائی جاؤ
پورے پارسا بن کے لوکاں نوں ستائی جاؤ
روندی جاؤ آپ نالے جگ نوں رُوائی جاؤ
کھائی جاؤ کھائی جاؤ تے اُتوں رولا پائی جاؤ

پیچھے بیٹھ کے فتنے کی ڈھولک بجاتے رہو
پوری طرح پارسا بن کے عوام کو خوب ستاؤ
قوم کا رونا خود بھی روتے رہو اور ساری دنیا کو بھی رلاتے جاؤ
بس کھاتے جاؤ اور اوپر سے شور بھی مچاتے رہو!

کرے جو مطالبہ نظام اسلام دا
بنے وانگ سچا اللہ والے نام دا
فتوے غداری والا اوس تے لگائی جاؤ
کھائی جاؤ کھائی جاؤ تے اُتوں رولا پائی جاؤ

جو کوئی بھی اسلامی نظام کا مطالبہ کرے
اور اللہ کے نام کا شیدائی بن جائے
اُس پر غداری کا فتوے لگاتے جاؤ
بس کھاتے جاؤ اور اوپر سے شور بھی مچاتے رہو۔

عمل دے میدان وچ قدم بھاویں دھرنہ
ایہو وعدے کرن لگے ڈھل نہ کرو نہ
سبز باغاں والے خواب لوکاں نوں وکھائی جاؤ
کھائی جاؤ ———

عمل کے میدان میں چاہے آپ قدم نہ دھریں
لیکن وعدے کرنے میں کوئی دیر اور کوتاہی نہ کریں
بس عوام کو سبز باغوں کے خواب دکھاتے جائیے
اور پھر کھاتے جائیے ———

اندر بیٹھ کے گھڑو پاکستان دا قانون
کسے نوں وکھاؤ نا ایں اوہدے مضمون نوں
عمل ویلے دھکو دھکی سراں تے چڑھائی جاؤ
کھائی جاؤ ———

اندر بیٹھ کر پاکستان کا دستور بناتے جائیے
اور کسی کو اس کے نفس مضمون سے واقف نہ کیجئے
جب عمل کا وقت آئیگا تو زبردستی لوگوں پر ٹھونس دیجئے گا۔
بس کھاتے جائیے ———

آگیا زمانہ ہن دنیا تے نواں ایں
جتھاں اسلام تماشا جتھاں مذہب مکان ایں
اپنے کرائے اُتے مولوی چلائی جاؤ
کھائی جاؤ ———

اب دنیا میں ایک نیا دور نمودار ہو رہا ہے
اب بغیر اسلام کے آپ کی بات نہ بنے گی
پس کرائے پر اپنے مولویوں کو خوب استعمال کیجئے
اور کھاتے جائیے ———

پھیر اوہنوں کریئے کی؟ ـــــــــ

ڈھگا جو ہل چلاندا نہیں
کھوہ دے وی نیڑے جاندا نہیں
پٹھے وی ماڑے کھاندا نہیں
پر کم ول پیر اپاندا نہیں
سمجھاؤ ساہنوں جی!
پھیر اوہنوں کریئے کی؟
کئی بنگلیاں وچ رہندے نے
تنخواہ ہزاراں لیندے نے
اوہ کردے نہیں جو کہندے نے
پر اگو بن بن بہندے نے
روہڑن پئے دودھ تے گھی
اوہناں نوں کریئے کی!

جو بیل ہل نہ کھینچتا ہو،
جو رہٹ کی طرف بھی منہ نہ کرے،
چارہ بھی گھٹیا کھانے پر تیار نہ ہو،
لیکن کام کے قریب بھی نہ پھٹکے
ہمیں یہ سمجھایئے تو جناب!
کہ پھر ہم اسے کریں کیا؟
کئی بڑے لوگ جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں،
ہزاروں روپے تنخواہ لیتے ہیں،
جو کچھ دعوے کرتے ہیں، ان پر عمل نہیں کرتے
لیکن ہر حال میں آگے ہی آگے ہو کے بیٹھتے ہیں۔
دودھ گھی مسلسل لنڈھا رہے ہیں۔
آخر ہم ان کو کیا کریں؟

"سکھ جو پچاوے ناں اوہ بھلا سرکار کی؟": ـــــــــ

پھل نہ کھڑاوے جو دسّو اوہ بہار کی
سکھ نہ پچاوے جو اوہ بھلا سرکار کی؟
دکھ نہ گنواوے جو وید اتنا کار کی؟
غم نہ ونڈاوے جو یار غم خوار کی؟
ساہنوں اوہدے نال پھیر دسو سروکار کی؟
سکھ جو پچاوے نہ اوہ بھلا سرکار کی؟
چارے کوٹاں ویکھ لو سکھ اے نہ چین اے
وڈی اماں اج کل بنی ہوئی ڈین اے
دکھاں وچ دنیا ہو گئی سودین اے
ٹھنڈے ہوکے بھر بھر لنگھ جاندی رین اے
دوون پناں ساڈا ہور دن نوں دیا رکی؟
سکھ جو پچاوے نہ اوہ بھلا سرکار کی

جو پھول کھلا نہ سکے، وہ آخر بہار کیا ہوئی، بتاؤ تو سہی!
جو حکومت سکھ نہ دے سکے وہ حکومت کس کام کی؟
جس کی مہارت مرض نہ دور کر سکے وہ ماہر حکیم کیسے ہوگا؟
جو شریکِ غم نہ ہو، وہ یارِ غم خوار کیسے بن گیا؟
بتاؤ پھر اس کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ؟
جو حکومت سکھ نہ دے سکے وہ حکومت کس کام کی؟
چاروں طرف دیکھ لو کہیں سکھ اور چین نہیں ہے۔
آج کل بڑی اماں بالکل ڈائن بن کے رہ گئی ہیں۔
دکھوں کی ماری دنیا دیوانی بن گئی ہے۔
رات ٹھنڈی آہیں بھرتے بھرتے گذر جاتی ہے۔
اور دن کو رونے کے سوا ہمارا اور کوئی مشغلہ نہیں رہا۔
جو حکومت آرام نہ پہنچا سکے، وہ حکومت کس کام کی؟

"پھیر بہاراں آن گیاں":—

انگریزاں دی پُود پرانی باگوں جدوں پٹیجے گی
اپھل کھیتی سمجھ نکمی کھیتوں باہر سٹیجے گی
پھیر نہ کدی گڈ سیجے گی
راہیں، گلیں، رلیجے گی
پھلاں پھُلاں خوشبوآں والیاں شاخاں تازہ وکھان گیاں
پھیر بہاراں آن گیاں

انگریزوں کی لگائی ہوئی پود جب ملت کے باغ میں سے اکھیڑ دیجائیگی
اپھل فصل کھیتوں سے باہر پھینک دی جائے گی
اور پھر اس کو کبھی نہ بویا جائیگا،
یہ راستوں اور گلیوں میں پامال ہو جائے گی۔

تو پھر پھلوں پھولوں والی خوشبودار شاخیں اپنے ناز دکھائیں گی۔
گئی ہوئی بہار پھر آئیں گی!

"دیہو جواب!":—

کس نے خانہ شرع محمدی والا کیتا آن خراب؟
بے دینی بدکاری والے لکھاں کس نے کھولے باب؟
پردیسی بے وطن نمانے کیتے کس نے بجھن کباب؟
اس گل دا کجھ دیہو جواب!

ہتھیں بدکاری دے کون لیسنس عطا کریندا اے؟
ناچ تے راگ سکھاون والے کون سکول کھولیندا اے؟
ڈھولی، طبلہ، بھنگڑا پاوے کس دا پاکے اذن جناب؟
اس گل دا کجھ دیہو جواب

قومی لڑکیاں تائیں ایتھے میماں کون بناندا اے؟
ہرنیاں وانگوں چھالاں مارن کیہڑا سبق پڑھاندا اے؟
غیرت تائیں انھا کیتا، پیلکے دھوکے دی شراب
اس گل دا کجھ دیہو جواب

اک لکھ پنجی ہزار ورہے دا صاحب بہادر لیندا اے
دمڑا دیہاڑی عاماں لوکاں تائیں مشکل پیندا اے
اسلامی ہمدردی والا رہیا نہ باقی ادب آداب
اس گل دا کجھ دیہو جواب

شریعت محمدی کو کس نے خانہ خراب کیا ہے؟
بے دینی اور بدکاری کے لاکھوں باب کھولنے والا کون ہے؟
کس کے ہاتھوں بے وطن اور بے سہارا لوگوں کے کباب ہو رہے ہیں؟
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

وہ کون ہے جو اپنے ہاتھوں۔طوائفوں کو بدکاری کے لائسنس عطا کرتا ہے
پھر وہ کون ہے جو ناچ گانے سکھانے کے لئے سکول کھولتا ہے
پھر طبلہ اور شہنائی کس کی اجازت سے ہنگامہ مچاتے ہیں؟
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

قوم کی بچیوں کو کون میمیں (لیڈیاں) بنا رہا ہے؟
یہ جو ہرنیوں کی طرح کلیلیں بھرتی پھرتی ہیں، آخر ان کو یہ سبق کس نے پڑھایا؟
یہ کون ہے جس نے دھوکے کی شراب پلا کر غیرت کو اندھا کر دیا ہے
اس بات کا کوئی جواب دیجئے

صاحب بہادر یعنی گورنر جنرل ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ لیتے ہیں
عام لوگوں کے حصے میں دمڑی روزانہ بھی مشکل سے پڑتی ہے۔
اسلامی اخوت کا طور طریق ختم ہوگیا!
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

، جو بعض اوقات انسان کو صحیح راستہ پر چلنے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

مولانا اصلاحی زندگی کو ایک آرٹ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سلیقہ، شائستگی اور نفاست سے زندگی میں حسن پیدا کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی نفاست سے بھرپور ہے۔ وہ عمدہ غذا کے شائق ہیں۔ وہ صاف ستھرا لباس استعمال کرتے ہیں اچھے ہ لکھتے ہیں۔ عمدہ اور منتخب کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ اپنے استعمال کی چیزوں میں شرکت گوارا نہیں کرتے۔ گھر میں ان کی ایک جداگانہ ت ہوتی ہے۔ جس میں بیوی بچوں کو پر مارنے کی بھی مجال نہیں ہے۔ مشترک استعمال کی چیزوں میں بھی وہ توحید کے اصولوں کے قائل ہیں ور امور خانہ داری سے سخت گھبراتے ہیں۔ حالانکہ ماشاء اللہ پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مقامات پہ جہاں بدقسمتی سے وہ بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکے۔ دوسری وجہ ان کی کم آمیزی ہے۔ وہ زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے طبیعت رواقع ہوئی ہے۔ بعض اوقات ناگوار باتوں پر سختی سے جھڑک بھی دیتے ہیں۔ گندے اور بدسلیقہ آدمی سے انہیں ابدی نفرت ہے۔

چراغِ راہ کا "اسلامی معاشیات نمبر"

— (خاکہ مضامین مطلوبہ) —

اخبارات و جرائد کی مستقل روایات میں یہ چیز داخل ہو چکی ہے کہ وقتاً فوقتاً خاص نمبر نکالے جائیں۔ یہ خاص نمبر مالکان جرائد کے لئے بھی ذریعۂ منفعت ہوتے ہیں۔ اور پبلک کے لئے بھی ذہنی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن "خاص نمبروں" کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اکثر خاص نمبر بہت ہی عامیانہ سے ہوتے ہیں۔ اور ایسے خاص نمبروں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی ہے جنہیں ہر لحاظ سے قابلِ قدر سمجھا جا سکے۔ بہ حیثیت مجموعی ہمارے خاص نمبروں کا معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا ہونا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے خاص نمبروں کا محور کوئی عالی قدر مقصدیت نہیں ہوتی۔ بلکہ بالعموم ان سے جرائد کی مقبولیت مطلوب ہوتی ہے۔ اور بہتر حضرات کے سامنے علم و ادب کی خدمت کا مقصد بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی خاص نمبروں کی ایک خاص بنی بنائی ڈگر پر چلنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے خاص نمبروں کے کچھ ادبی موضوعات تو بالکل اٹل قسم کے بن گئے ہیں۔ مثلاً "افسانہ نمبر" "ڈرامہ نمبر" "اقبال نمبر" وغیرہ۔ یہی حال "نوروز نمبر" "سالگرہ نمبر" اور "سالنامہ" کے موضوعات کا ہے۔ پھر "آزادی نمبر" "استقلال نمبر" وغیرہ سیاسی موضوعات بھی اپنی مستقل جگہ بنا چکے ہیں۔ پھر بعض جرائد وقتاً فوقتاً بعض خاص شخصیتوں کے نام پر خاص نمبر نکالتے رہتے ہیں۔ مثلاً "قائد اعظم نمبر"۔ اس طرح خاص نمبروں کی تاریخ ایک کولہو کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس تاریخ کو بعض جرائد نے گزشتہ دو سال میں نئے راستے بھی دکھائے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک روزنامے نے دستور نمبر نکال کر اپج کا مظاہرہ کیا ہے۔ علاوہ بریں سہ روزہ کوثر لاہور نے قرار دادِ مقاصد نمبر نکال کر جدت کی ایک نئی شاہراہ کھول دکھائی ہے۔ پھر "حیاتِ نو" دہلی نے "اشتراکیت نمبر" پیش کر کے ذوقِ جدت کا اچھا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح "چراغِ راہ" کو خدا نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ اس نے "قیادت نمبر" شائع کر کے ایک نیا مقام پیدا کیا۔ اس خاص نمبر کی انتہائی مقبولیت کے پیشِ نظر یہ خیال دل میں پرورش پاتا رہا ہے کہ اب اس سے زیادہ بلند موضوع پر اور زیادہ اونچے معیار کا کوئی خاص نمبر ملک و ملت کے سامنے پیش کیا جائے جس میں قیادت نمبر سے بھی بڑھ چڑھ کر مقصدیت موجود ہو۔

چنانچہ بار بار غور و فکر کرنے کے بعد ذہن ایک نئے موضوع پر مرتکز ہو گیا۔ وہ موضوع تھا "اسلامی معاشیات نمبر" کا۔ اس موضوع سے ہمارے تین مقاصد وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس سوال کا ایک ٹھوس اور حتمی جواب دیا جا سکے کہ کیا اسلام کا کوئی معاشی نظام ہے؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ یہ واضح کیا جا سکے۔ کہ فی الواقع اسلام کے معاشی اصول اس قابل ہیں کہ وہ موجودہ دورِ تمدن کے پیچ در پیچ معاشی مسائل کو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اور بہتر طریق سے حل کر سکتے ہیں۔ اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی معاشیات کے فلسفہ و نظام کو ایک سائینس کی شکل میں مرتب کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کی زیرِ تشکیل اسلامی ریاست کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے اور تقسیم دولت کے طریقہ کو

...ب و منت کے مطابق تصانیف کے لئے ... ایک جامع اسکیم ... کا ... ضروری ہو ایک با ہو جائے۔ ضمناً اس نمبر سے ایک ...دہ یہ بھی مدنظر ہے کہ جدید علم معیشت (Economics) کے ماہرین اور طلباء کو معاشی مسائل کے متعلق اسلام کی ...شنی بہم پہنچ جائے۔ اور دوسری طرف ہمارے علماء دین کو جدید علم معیشت کے ضروری پہلوؤں کا تعارف حاصل ہو جائے ...ز فریقین کو دوطرفہ علمی آفند اور اصطلاحات کے بارے میں خاص معلومات مل جائیں۔ تاکہ دونوں اسلامی علم معیشت کی تدوین ...ر اسلامی نظام معاشی کے تعمیر میں تعاون کرنے کی صلاحیت کو نشوونما دے سکیں۔

لیکن مقاصد کے ساتھ جب موضوع کی اہمیت پر غور کیا۔ تو بہت مشکل سے یہ حوصلہ پیدا ہو سکا کہ اس موضوع پر خاص نمبر نکالنے ...اعلان کر دیا جائے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود مرتب چراغ راہ کو اپنی علمی بے بضاعتی کا پورا احساس ہے۔ خصوصاً اس موضوع ...متعلق جو پیش نظر ہے۔ علاوہ بریں گوناگوں مصروفیات کا ہجوم اتنا ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری سر لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے لیکن ...صد کی محبت ہر حال میں آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے ؎

یہ میری پروانے کی سی فطرت اڑائے جاتی ہے آگے آگے
کہیں افق کے قریب شاید کہ شمع کوئی جھلک رہی ہے

دوسری طرف یہ سوال بھی قابل غور تھا کہ اپنے قلمی رفقاء جو ایک طرف اپنی روزی کمانے سے فرصت نہیں پاتے اور دوسری ...رف جن کو اپنے آرام کے لمحات میں سے بڑا حصہ تحریک اسلامی کی سرگرمیوں میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ آخر مخصوص موضوعات پر لکھنے کے ...ے مطالعہ و فکر کرنا چاہیں بھی تو وقت اور قوت کہاں سے لائیں گے۔ پھر ان میں معاشیات سے براہ راست دلچسپی رکھنے والوں ...ی تعداد بھی کم ہے۔

تیسری طرف یہ مسئلہ بھی زیر توجہ تھا کہ اگر اپنے حلقے کے رفقاء اسلامی معاشیات نمبر میں اپنا حصہ ادا کرنے کا حق پوری طرح ادا کر بھی ...یں تو بھی موضوع ایسا ہے کہ باہر کے اسلام پسند ماہرین معاشیات سے مضامین حاصل کئے بغیر "نمبر" کبھی مکمل نہ ہوگا۔ اور ...یہ کہا جا سکتا کہ باہر کے بڑے بڑے اہل قلم سے کوئی کام لینے کے لئے محض خدمتِ اسلام کا جذبہ کافی محرک ثابت ہو بھی ...کے گا یا نہیں۔ اور پھر کیا معلوم کتنے ہی حضرات کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی فکری اختلاف اور کوئی سیاسی مصلحت ...حائل ہو کر ہماری اسکیم کو تکمیل سے محروم کر دے گی۔

ہماری چوتھی مشکل سرمایہ کی مشکل ہے۔ ایک اہم اور وسیع علمی موضوع پر ایک ضخیم اور معیاری نمبر شائع کرنے کے لئے صرف زرکثیر ...کی ضرورت ہے۔ اور یہاں ہر لحظہ یہ کیفیت کہ "زر می طلبی سخن در یں ست"! ہمارے پاس اگر کوئی سرمایہ ہے تو صرف ایمان، جذبۂ صادق ...اور محبت مقصد کا ہے۔ بحمد اللہ اس سرمائے کے ہوتے ہوئے ہمارا کوئی کام کبھی مادی سرمائے کی کمی کی وجہ سے نہیں اٹکا۔ اور مجھے امید ...، اسلامی معاشیات نمبر کی اشاعت بھی انشاء اللہ محض روپے کی کمی کی وجہ سے نہ رکے گی۔ روپے کی کمی کو ہمارے رفقائے ...ر کا احساس ذمہ داری اور جذبۂ تعاون پورا کرتے جائے گا۔

ان ساری مشکلات کا جائزہ لینے کے بعد بہت بڑی حد تک توکلاً علی اللہ ایک ایسے خاص نمبر کا اعلان کیا جا رہا ہے جسے ...اگر ہم یہ تاشید ایزدی اپنے سوچے ہوئے نقشے اور معیار پر نکال سکے تو خاص نمبروں کی تاریخ میں ہمارا یہ نمبر ایک سنگ میل بن کر ...نصب ہو جائے گا۔ اور اس کے نتیجے ہمارے ملک کے جرائد کو خاص نمبروں کے لئے ایک نئے میدان کی طرف رہنمائی ...میسر ہو سکے گی۔

اسلامی معاشیات نمبر کے بارے میں مضمون نگار حضرات کے لئے حسب ذیل گزارشات قابلِ لحاظ ہیں:۔

(۱) یہ نمبر اگر ممکن ہو تو ہم یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ حتی الوسع ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک مقالات مرتب کے پاس جمع ہو جانے چاہئیں۔ بعض اصحاب اگر ناگزیر وجوہ کے تحت تاخیر پر مجبور ہو جائیں تو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ یکم اکتوبر تک کی مہلت ہوگی۔ لیکن یکم اکتوبر یا اس کے بعد آنے والے مضامین کو پورے مجموعے میں مناسب جگہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اور ترتیب معیاری نہ رہے گی۔

(۲) مقالات بہرحال ضروری مطالعہ کے بعد ہی لکھے جائیں۔ اور محض قلم برداشتہ قسم کے مضامین کو کم سے کم اس خاص نمبر میں شریک نہ کیا جا سکے گا: کیونکہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر اگر سرسری قسم کی تحریریں ہم نے پیش کیں۔ تو اس سے چراغ راہ ہی کی شہرت خراب نہ ہوگی۔ بلکہ خود اسلام اور اسلام کے معاشی فلسفے و نظام کی ہیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ پس اس نمبر کے مقالہ نگاروں کو وقت دینا ہوگا۔ اور عرق ریزیاں کرنی ہوں گی۔

(۳) مقالہ نگاری میں حتی الواسع اجمال بھی ملحوظ رہے۔ لیکن نہ اس حد تک کہ بحث ادھوری اور تشنہ رہ جائے۔ بلکہ موضوع کا حق ادا کیا جائے۔ اور اس پر کہنے کے لئے آپ کے پاس جو کچھ ہو اتنا لازماً کہہ دیا جائے۔ ہم موضوع کی ضروریات کے مطابق ضخامت کو بڑھا سکتے ہیں

(۴) مقالہ نگاروں پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ کس زبان میں اپنا مقالہ قلم بند فرمائیں۔ اردو۔ انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں سے جن میں لکھنے والے کو اظہار خیال کی زیادہ قدرت ہو وہ اس میں مقالہ لکھیں۔ چراغ راہ کے پڑھنے والوں میں تینوں زبانوں سے دلچسپی لینے والے اصحاب شامل ہیں۔

(۵) جملہ مقالہ نگار حضرات اپنے مقالوں میں جتنی اصطلاحات کو استعمال فرمائیں۔ چاہے وہ جدید علم المعیشت سے متعلق ہوں یا اسلامی معاشی فقہ سے متعلق، سب کا ایک انڈکس (حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ) مرتب کرکے شامل کر دیں۔ جس میں ہر اصطلاح کی ضروری وضاحت درج ہو۔ اس طرح پورے نمبر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا ایک مکمل انڈکس مرتب ہو کر شریک اشاعت ہو جائے گا۔ یہ چیز بہت بڑی افادیت کی حامل ہوگی۔ علاوہ بریں انگریزی قاعدے کے مطابق جتنے مخففات (Abbreviations) استعمال کئے جائیں۔ ان کی توضیح کے لئے بھی انڈکس شامل کر دیا جائے۔ نیز دنیا کے مختلف سکّوں (Coins) یا اوزان کے جن پیمانوں کا تذکرہ آئے، وہ چاہے حال کے ہوں یا ماضی کے ان کی قیمتیں اور وزن وغیرہ بھی انڈکس میں واضح کر دینے ضروری ہیں۔ اس سے قارئین کو بہت ہی سہولت ہوگی۔ علیٰ ہٰذالقیاس جن کتابوں سے مقالہ نگاری میں مدد لی گئی ہو یا جن کا حاصل مطالعہ مضمون کے پس منظر میں کام کر رہا ہو۔ ان کی فہرست بھی بھیجی جائے۔ جس میں ہر کتاب کے مباحث کا چند سطری تعارف شامل ہو۔ اس سے قارئین کو ماخذ کا پورا پورا تعارف ہو جائے گا۔

(۶) مقالات کے لئے جو خاکے بطور مشورہ پیش کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد صرف ایک آئیڈیا دینا ہے۔ ورنہ مقالہ نگار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ خوشہ بہ خوشہ ان کی پابندی کرے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ مضامین کی روح صالح اور ان کی بحث کی سمت صحیح اور ان کا استدلال جامع ہو۔ خاص طور پر یہ اہتمام رہے کہ:۔

(۱) مروجہ نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکی کے طرزِ فکر سے بالکل الگ ہو کر ایک آزاد اسلامی ذہنیت کے

ساتھ سوچا جائے تاکہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ میں کسی نئے طرزِ فکر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

(ب) ہمارے ذہنی ماحول میں جو غیر اسلامی تصورات جڑیں چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان کا تجزیہ کرکے نشترِ تنقید کو حرکت میں لایا جائے۔

(ج) آج کل بالعموم جو سوالات اسلامی معیشت کے بارے میں پائے جاتے ہیں ان کو ساتھ کے ساتھ صاف کردیا جائے۔

(د) حتی الوسع اس کا لحاظ رکھا جائے کہ علم معیشت کے طلباء مضامین سے پورا پورا استفادہ کرسکیں۔

(۷) مقررہ موضوعات سے آزاد ہوکر اپنے پسندیدہ موضوعات پر اگر کچھ اصحاب اپنے فکر و تحقیق کے نتائج پیش کرنا چاہیں تو ہماری طرف سے آزادی ہے۔ اس آزادی کی انتہا یہ ہے کہ ہم اسلام کے صحیح طرزِ فکر سے ہٹ کر نیم اسلامی یا غیر اسلامی نقطۂ نظر سے معاشیات پر قلم اٹھانے والوں کو بھی موقع دینا چاہتے ہیں۔ کہ وہ بھی اپنے نتائجِ افکار سامنے لاسکیں ـــــ البتہ اس قسم کے مضامین کو ایک جداگانہ شعبے میں درج کیا جائے گا۔

(۸) انگریزی مضامین ٹائپ کئے ہوئے ہوں تو بہتر ہوگا۔ اور اردو مقالات اچھے کاغذ کے صرف ایک طرف کھلا حاشیہ چھوڑ کر خوش خط لکھے جائیں۔ نیز عنوان بندی۔ علاماتِ وقف، اور پیراگراف کے آغاز کو نمایاں کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے

(۹) اس خاص نمبر کے لئے جتنے مقالات ہمیں موصول ہوں گے۔ ان کا حق تابعہ (Royalty) مقالہ نگار ہی کو حاصل رہے گا۔ البتہ ہر مقالہ جو ہمیں موصول ہو اس کے متعلق مولف کی جانب سے ہم اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھیں گے کہ اسلامی معاشیات نمبر کے کتابی ایڈیشن میں بھی اسے شائع کرتے رہیں

(۱۰) جن اصحاب کے مضامین اس نمبر میں شریکِ اشاعت ہوں گے۔ ان کی خدمت میں اس کی دو دو کاپیاں ہدیۃً پیش کی جائیں گی۔

(۱۱) ذیل میں مضامین کے عنوانات کی فہرست مختصر خاکوں کے ساتھ درج کی جارہی ہے۔ ان عنوانات میں سے اہلِ قلم حضرات اپنی اپنی دلچسپیوں کے مطابق ایک یا ایک سے زائد کو منتخب فرما سکتے ہیں۔ لیکن بعض عنوانات ایسے بھی ہیں جن پر لکھنے کی صلاحیت ہماری نگاہ میں بعض خاص اصحاب ہی کو حاصل ہے۔ الا ان سے بہتر دوسرے لوگ ہمارے سامنے نہیں ہیں لہٰذا ایسے عنوانات کے بارے میں خود ہم جن حضرات سے درخواست کریں وہ اگر ہماری درخواست کو قبول فرمالیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

فہرست مقالاتِ مطلوبہ (مع خاکہائے مباحث)

قسم اوّل

اسلامی فلسفہ معاشیات Muslim Ideology Of Economics

مقالہ (۱) دنیا کے معاشی تصورات کی تاریخ ارتقاء اسلامی نقطۂ نظر

- معاشی فلسفوں اور عقیدوں کی تاریخ کے مختلف دور
- ان پر تبصرہ اور تنقید
- اسلام کے معاشی نظریے کا تعارف دوسرے نظریوں سے مقابلہ کرتے ہوئے اور وجوہ اختلاف کو واضح کرتے ہوئے۔

مقالہ (۲) معاشیات کے اسلامی اصول

(مولانا مودودی کی تشریحی تقریر کے ساتھ تشریحی نوٹس لکھ کر پیش کرنے کی ضرورت ہے)

مقالہ (۳) عقیدہ، اخلاق اور معاش۔

- پیدائش دولت کے دوگانہ عوامل (Factors)
  ا۔ مادی — سرمایہ، ذرائع ووسائل، آلات، انسانی جسمانی قوی وغیرہ
  ب۔ غیر مادی۔ علم، تجربہ، تنظیم، اصول وضوابط خیالات، جذبات، اخلاق۔
- بنیادی عقائد کے دوررس اثرات فلسفہ ونظام معاشیات پر
- معاشیات میں اخلاق کی مداخلت
- اخلاقیات کی دو نوعیتیں اور ان دونوں کے معاشی اثرات کا جائزہ
  ا۔ وہ اخلاقیات جو احترام حقوق پر مبنی ہوں
  ب۔ وہ اخلاقیات جو مفاد پرستی (Utilitarianism) پر مبنی ہوں۔

(اول الذکر پیداوار دولت کو بڑھانے اور تقسیم دولت کی صحت کا وسیلہ ہیں ثانی الذکر پیداوار اور دولت کو گھٹانے اور تقسیم دولت کے فساد کا وسیلہ ہیں۔

مقالہ (۴) مسلمانوں کے نظریات معاشی اور نظام معیشت کی تاریخ

- عرب سوسائٹی اسلام سے قبل (معاشی نقطۂ نگاہ سے)
  ا۔ اس کے اچھے پہلو۔
  ب۔ اس کے برے پہلو۔
- اسلام کا با اخلاق اور پرامن معاشی انقلاب (ان تبدیلیوں کا جائزہ جو اسلامی انقلاب کے تحت ہدایات اخلاق، قانون اور خاندانی و معاشرتی زندگی میں نمودار ہوئیں اور جن کی وجہ سے معاشی ناہمواریوں کے وجوہ واسباب کا خاتمہ ہوگیا)
- دورِ نبوتؐ کی مسلم سوسائٹی کا معاشی طرزِ فکر
- مسلم سوسائٹی میں معاشی ردِ عمل کی پہلی حرکت (فتنۂ مانعین زکوٰۃ کی وضاحت)
- دورِ خلافتِ راشدہ میں اسلامی معاشی نظام کی تکمیل۔
  ا۔ عوام کی معاشی حالت کا تحقیقی جائزہ
  ب۔ خلفاء راشدین کی معاشی پالیسی (تنخواہیں وظائف، تقسیم غنائم، جاگیروں کے بارے میں طرزِ عمل۔ زراعت اور رفاہ عامہ وغیرہ)
- دورِ عثمانی میں حضرت ابوذرؓ کے نظریۂ کفاف کا ظہور
  ا۔ حضرت عثمانؓ کی پالیسی کے معاشی پہلو
  ب۔ حضرت ابوذرؓ کا نقطۂ نظر اور اس سے صحابہ کا اختلاف
  ج۔ فریقین کے نقطۂ نگاہ پر تبصرہ
- خلافتِ راشدہ میں بیت المال کا مقصد اور اس میں تصرف کے اصول۔
- خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی نظام معیشت میں چند دوررس تبدیلیاں
  ا۔ مظاہرہ شان وشوکت
  ب۔ مخصوص شاہی حقوق کا ظہور
  ج۔ بیت المال میں بے باکانہ تصرفات کا آغاز
  د۔ نمائش، تکلفات اور امرانیات کا سوسائٹی میں فروغ
- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی معاشی اصلاحات (اور ان کے فوری نتائج کا جائزہ)

- قرون مابعد میں معاشی مفسدات کا مزید ارتقاء
  - ا۔ ملوکیت اور اس کی پیدا کردہ ناہمواریاں
  - ب۔ جاگیرداری کا ظہور اور اس کا ارتقاء
  - ج۔ عوام سے حکومتوں کے مالی مطالبات اور ان کی مختلف صورتیں
  - د۔ ہندوستان میں مسلم سلطنت (معاشی نقطۂ نظر سے)
- ائمہ فقہا کا معاشی مسائل میں طرزِ فکر (۔ Approach)
  - ا۔ ابن خلدون اور معاشی مسائل
  - (ب) حنفی اسکول
  - ج۔ امام ابن تیمیہ اور ابن قیم۔ ابن حزم ظاہری
  - د۔ شاہ ولی اللہ دہلوی
  - س۔ مالیات و معاشیات پر اسلامی لٹریچر (کتاب الخراج۔ کتاب الاموال ۔۔ کنز العمال وغیرہ پر تبصرہ)
  - ص۔ مختلف ادوار میں معاشی مسائل میں اجتہاد
- مغربی سرمایہ داری کا نفوذ مسلم ممالک میں (دورِ غلامی)
- مسلم ممالک میں معاشی پستی اور معاشی ناہمواریوں کا
- کمیونزم کا ظہور اور مسلمانوں کے ذہین طبقوں پر اس کے مختلف اثرات:۔
  - ا جدید طبقے پر ۔۔ علماء پر
  - ب۔ لٹریچر اور صحافت کی فضا میں فکری کشمکش
  - ج کمیونزم کی مدافعت میں سہ گونہ عناصر کا
    - اول۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت اسلامی پیرایہ میں
    - دوم۔ خالص مسلم ذہنیت
    - سوم۔ کمیونزم سے مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت

قسم دوم:۔

اسلامی علم معیشت کی تدوین کیلئے ضروری مواد

مقالہ (۱) اسلامی علم معیشت

- تمہیدی امور۔
  - ا۔ اسلامی علم معیشت کی تدوین کی ضرورت اور اب تک کے علمی کام کا جائزہ
  - ب۔ اسلامی علم معیشت کے بحیثیت سائنس ارتقاء نہ کرنے کی اصل وجہ (نظامِ اسلام کا سقوط)
  - ج۔ سرمایہ داری اور کمیونزم کے مقابلے میں اسلامی معاشیات کی مخصوص اور مستقل حیثیت
  - د۔ بنیادی اصول اور اجتہاد کا میدان
  - س۔ علم معیشت کا تعلق دوسرے علوم کے ساتھ (معاش کا مقام زندگی میں)
- تعارف مسئلہ:۔
  - ا۔ علم معیشت کا اصل منشاء
  - ب۔ معاشیات انسانی میں قوانین فطرت کا
  - ج۔ مختلف معاشیاتی مدارس فکر کے مقابلے اسلامی مکتب فکر کا مقام۔
    1. Liberal School.
    2. Socialist School.
    3. State Socialism School.
    4. Christian Social Reform School.
    5. The Solidarity School.
    6. Others.
- پیدائش دولت:۔
  - ا۔ عوامل پیدائش:۔ (اسلامی احکام و حدود کی روشنی میں)
    - (۱) عطیات فطرت
    - (۲) محنت

(۳) سرمایہ۔

ب۔ پیدائش دولت کے لئے تنظیم بندی۔

(۱) پیدائش دولت میں انضباط (Regulation)

(۲) تقسیم کار (Division of Labour)

(۳) پیدائش دولت کا ارتکاز (Concentration)

(۴) پیدائش دولت کیلئے اتحاد کار (Association)

—— اہل سرمایہ میں

—— اہل محنت میں

(۵) پیدائش دولت بذریعہ "ریاست"

● گردش دولت۔

ا۔ تبادلے کے اصول اور اس کی تاریخ (اسلامی اصولوں کی وضاحت)

(۱) بارٹر سسٹم

(۲) خرید و فروخت کا طریقہ

(۳) قیمت بہ حیثیت ذریعہ تبادلہ

(۴) طلب و رسد کا قانون وغیرہ

ب۔ ذرائع و وسائل

ج۔ تجارت اور تجارت (اسلامی ضابطہ تجارت اور اس کا عملی مسائل پر انطباق)

د۔ فلزاتی سکے اور نقدی کا نظام (ضمناً زر کاغذی پر بحث)

س۔ بین الاقوامی تبادلہ (اس کے مفاسد اور مطلوبہ اصلاحات)

(۱) اس کی صورتیں

(۲) توازن تجارت کا مفہوم

(۳) توازن حسابات

ص۔ تجارتی پالیسی (تنقیدی جائزہ و اصلاحات)

(۱) مروجہ بین الاقوامی تجارت میں مختلف ممالک کی پالیسی پر تبصرہ

(۲) بین الاقوامی تجارت میں تحفظاتی مسلک

(۳) آزاد تجارت کا مسلک

(۴) تجارتی معاہدات

(۵) محصولات۔

ض۔ گردش دولت اور تبادلہ و تجارت میں بنکنگ کا مقام۔

(۱) موجودہ بنکنگ کی تھیوری اور اس کی بین الاقوامی تاریخ۔

(۲) اس پر مسلمان کی نگاہ سے تبصرہ و تنقید

(۳) اسلامی بنکنگ سسٹم کے لئے بنیادیں۔

● تقسیم دولت۔

ا۔ تقسیم دولت کے مختلف اصول، سرمایہ دارانہ اور اشتراکی)

ب۔ ان اصولوں پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید۔

ج۔ اسلام کا اصول تقسیم۔ (ہر ایک سے اس کی قوت و صلاحیت کے مطابق، ہر ایک کو اس کی خدمت کے مطابق —— لیکن کم از کم اتنا جو پانچ بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے)

● دولت کے مختلف حصہ دار (موجودہ نظام میں —— اور اسلامی نظام میں)

ا۔ زمیندار (زمین، مزارعت، لگان، جاگیرداری وغیرہ پر بحث)

ب۔ سرمایہ دار بحیثیت مہاجن (سود پر بحث)

ج۔ مزدور (۱۔ صنعتی مزدور ۲۔ زرعی مزدور ۳۔ ملازم)

د۔ منتظم بہ حیثیت تقسیم کنندۂ دولت۔

(منافع اور نظام تقسیم منافع پر گفتگو)

س۔ ریاست (تقسیم دولت میں ریاست کا دخل اور ٹیکسیشن وغیرہ)

● مصرفِ دولت

ا۔ مصارف (جائز و ناجائز) اور ان کے قوانین۔

(مارشل ... کی تنقیحیں اور اس کے نقائص)

ب۔ مصارف کی نوعیتیں۔

(۱) ضروریاتِ زندگی { غذا۔ لباس۔ مکان / صحت۔ تعلیم۔ تفریح }

(۲) تعیشات اور ان کی مختلف صورتیں

(۳) انفاق فی سبیل اللہ (افراد، ادارت اور ریاست کیلئے)

(۴) مصارف کی تحدید میں ریاست کا طریقِ کار

(۵) اجتماعی مصارف۔

ج۔ بچت۔ اس کی مختلف صورتیں اور اس کے اثرات۔

● پوری بحث کا ماحصل

ا۔ اسلامی معاشیات اور غیر اسلامی معاشیات میں بنیادی اختلافات کی نشان دہی

ب۔ اسلامی معاشیات کے اصلح تر ہونے کے دلائل و وجوہ

ج۔ موجودہ مسائلِ معاشی اور اسلامی اصولِ معیشت۔

مقالہ (۲) مسلم معاشیات

● ابتدائی مباحث (مقالہ (۱) کے مطابق)

● کمائی (اور آمدنی)

ا۔ بذریعہ سرمایہ { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں }

ب۔ بذریعہ محنت { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں }

ج۔ سرمایہ و محنت دونوں کے مشترکہ استعمال سے { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں }

(کتاب و سنت کی تصریحات کے مطابق کمائی میں حلال و حرام)

(حلال کمائیں)

● مصارف (جائز و ناجائز صورتیں)

ا۔ ذاتی مصارف (اشیاء اور خدمات کی خریداری)

ب۔ دوسروں کے حقوق (زیرِ کفالت افراد کے حقوق، اقربا نوازی، حق الجار کی ادائی، امدادِ حاجتمندوں)

ج۔ ریاست اور سوسائٹی کے اجتماعی مطالبات (محصولات، ٹیکس، چندے۔ دماغی و جسمانی خدمات)

● بچتیں

ا۔ بچتیں بطورِ کنز

ب۔ بچتوں کا استعمال مزید کمائی کے لئے۔

ج۔ بچتوں میں دوسروں کے حقوق

د۔ بچتیں اور حقِ ملکیت۔

ہ۔ قانونِ وراثت۔

قسمِ سوم:۔

(مخصوص جامع مباحث)

مقالہ (۱) اسلامی نظام میں مالیاتِ ریاست

● خلافتِ راشدہ کے مالیاتی نظام پر ایک نظر

● اسلامی ریاست کی مداتِ آمد

ا۔ عشر و زکوٰۃ

ب۔ اوقاف

ج۔ چندے

د۔ ٹیکس

ہ۔ غنائم

و۔ فے (قدرتی ذخائر و خزائن کی آمدنیاں)

ز۔ ذمی ٹیکس

ط۔ خراج

ی۔ دیگر آمدنیاں

- اسلامی ریاست میں مَدّاتِ صرف
  - ا۔ دفاع
  - ب۔ ایڈمنسٹریشن
  - ج۔ مفادِ عام
    - (۱) ذرائع رسل و رسائل
    - (۲) ذرائع حمل و نقل
    - (۳) انہار، جنگلات، وغیرہ
    - (۴) تعلیم
    - (۵) صحت
    - (۶) شہریوں کو بارو‌زگار بنانا۔
    - (۷) ضرورتمند شہریوں کی براہِ راست کفالت،
    - (۸) تعمیرِ معیشت کے مختلف منصوبوں کو عمل میں لانا
- دورِ حاضر کا بجٹ سسٹم اور اسلامی ریاست
- رفاہی اور تعمیری ضروریات کے لئے پبلک سرمایہ کا استعمال
- اسلامی ریاست اور غیر ملکی قرضے۔
- بین الاقوامی مالی تعلقات اور ان کی پیچیدگیاں۔
- موجودہ بنکنگ سسٹم میں انقلاب لانے کی ضرورت۔

مقالہ (۲) سود اور بنکنگ بلا سود

- سود (Interest) کی ماہیت اور اسکے معاشی اثرات
  - ا۔ جدید معاشیین کے نظریات
  - ب۔ اسلامی نقطۂ نظر
- موجودہ بنکنگ پر ایک جامع تبصرہ
  - ا۔ بنکوں کی مفید خدمات
  - ب۔ اخلاقی اور معاشی قباحتیں۔
  - ج۔ موجودہ بنکنگ سسٹم اور نظامِ سرمایہ داری۔
- اسلامی بنکنگ سسٹم کے لئے مضاربت (حصہ داری نفع و نقصان) کا اصول (اس کی تشریح و توضیح)
- مطلوبہ بنکنگ سسٹم کے لئے ایک جامع اسکیم
- تبدیلی کیسے لائی جائے۔

- بین الاقوامی مالیاتی تعلقات اور ہمارا نیا بنکنگ سسٹم

مقالہ (۳) اسلامی ضابطۂ تجارت اور موجودہ مارکیٹنگ سسٹم

- تاجر کا مقام مسلم سوسائٹی میں (اور اس کی ذمہ داریاں)
- اسلامی ضابطۂ تجارت (اصول اور ائمہ فقہا کے استنباطات)
  - ا۔ کاروبار کے جائز پہلو
  - ب۔ 〃 〃 ناجائز پہلو
- اسلامی ضابطۂ تجارت کا انطباق موجودہ نظامِ تجارت پر
  - ا۔ اندرونِ ملک
  - ب۔ بین الاقوامی طور پر
- چند متعلقہ مسائل۔
  - ا۔ تجارت اور ٹیکس
  - ب۔ راشن بندی اور قیمتوں پر کنٹرول
  - ج۔ مارکیٹ کی مستقل نگرانی
  - د۔ بین الاقوامی مقابلہ اور تحفظات

مقالہ (۴) زمین اور اُس سے تعلق رکھنے والے مسائل

- ملکیت زمین کا مسئلہ
- مزارعت اور اس کی جائز و ناجائز صورتیں (مزارعین کے حقوق از روئے اسلام)
- اسلام کے زرعی نظام میں مفاسد کا داخلہ اور ان کا ارتقاء
- موجودہ جاگیرداریوں پر تبصرہ
- موجودہ زمینداریوں پر تبصرہ
- زرعی نظام اور اشتراکیت
- زرعی نظام کے مفاسد کی اصلاح کا اسلامی نقشہ
  - ا۔ ناجائز ملکیتوں کا خاتمہ
  - ب۔ غصب کردہ حقوق کی واپسی
  - ج۔ اسلامی قانونِ وراثت کا نفاذ
  - د۔ اجتماعی کاشت (Collective farming)

کا اسلامی طریقہ

- پاکستان کے زکوٰۃ اعداد و شمار

مقالہ (۵) محنت کار کی معاشی اہمیت اور اسکے مخصوص مسائل

- پیدائشِ دولت میں محنت کا مقام
- محنت کار بہ مقابلۂ سرمایہ دار

(موجودہ پیداواری نظام کا تجزیہ)

- محنت کار کے مخصوص مسائل

ا ۔ اُجرتیں

ب ۔ اوقاتِ کار

ج ۔ صحت، اعضا اور جانوں کے نقصانات کا مسئلہ

د ۔ مظالم کی مدافعت کا مسئلہ

س ۔ رہن سہن کا معیار

- ان مسائل کو حل کرنے کے طریقے

ا ۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت

ب ۔ اشتراکی نظام کے تحت

- اسلامی نظام کے تحت محنت کار کے مسائل کا حل

ا ۔ محنت کار کے کم سے کم حقوق

ب سرمایہ دار کی ذمہ داریاں

ج ۔ حکومت اور بیت المال کی ذمہ داریاں

- محنت کاروں کی تنظیمیں اور ان کے طریقہ ہائے کار
- اسلامی اصولوں پر مبنی تنظیم حقوق طلبی کی جدوجہد کا صحیح طریقہ

مقالہ (۶) اسلامی قانونِ وراثت اور اس کا معاشیاتی عمل

- اسلامی قانونِ وراثت کی مخصوص نوعیت

(دوسرے قوانینِ وراثت کے مقابلے میں)

- اس کے اصول
- اسلامی قانونِ وراثت کی تفصیلات نئی ریاضی کی روشنی میں
- اسلامی قانونِ وراثت کا معاشیاتی عمل

ا ۔ موجودہ زمینی ہکاں عادی املاک میں فوری طور پر

ب ۔ ملک کی مجموعی معاشیات میں ۲۰ سال کی مدت میں

مقالہ (۷) تنخواہوں اور اُجرتوں کی شرح بندی کیلئے اسلامی اصول

- اسلام کا اصولِ کفالت اور اس کی توضیح
- دورِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں تنخواہوں کا نظام

اس کی خصوصیات:
(۱) ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری
(۲) افرادِ کنبہ کا لحاظ
(۳) کم سے کم تفاوت
(۴) شبہ سے عہدیداروں کیلئے مقامِ عزیمت

- پاکستان میں معاوضہ بندی اور تنخواہ کے سرکاری اسکیل

اس کے مفاسد:
(۱) بڑوں کو ضروریات سے بہت زیادہ
(۲) چھوٹوں کو ضروریات سے بہت کم
(۳) افرادِ کنبہ کا کوئی لحاظ نہیں۔

- پے کمیشن
- اصلاح کی اسکیم

ا ۔ ذہنیت کو بدلنے کا اہتمام

ب ۔ معاوضوں کے تفاوت کو کم کرنے کیلئے تدریجی کوشش

ج ۔ اسلامی اصولوں پر تنخواہوں کے نئے اسکیل۔

د ۔ مشکلات اور ان کا حل

- معاوضہ بندی کے اسلامی سسٹم کے دوررس اثرات۔

ا ۔ معاشی ناہمواریوں میں ایک گونہ کمی۔

ب ۔ افسروں اور ماتحتوں میں بُعد کا خاتمہ۔

ج ۔ سرکاری ملازمین اور پبلک کے ربط میں اضافہ

د ۔ رشوت ستانی میں کمی۔

س ۔ معاوضوں کے "مارکیٹ ریٹ" میں انقلاب

مقالہ (۸) اسلامی نظامِ معیشت اور زکوٰۃ

- ابتدائی مباحث

ا ۔ سوسائٹی میں زکوٰۃ کا عمل معاشیاتی نقطۂ نظر سے

ب ۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

ج ۔ زکوٰۃ بیک وقت حق اللہ بھی ہے۔ اور حق العباد بھی

- ضابطۂ زکوٰۃ :۔

ا ۔ زکوٰۃ کس پر واجب ہے ؟

ب ۔ کن اموال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے ؟
(اور کونسے اموال مستثنیٰ ہیں)

ج ۔ کسی مال پر زکوٰۃ کب واجب الادا ہوتی ہے ؟

د ۔ اموال زکوٰۃ کا نصاب

ہ ۔ شرح زکوٰۃ

س ۔ زکوٰۃ کے مستحقین اور اس کے مصارف

- چند خاص مسائل :۔

ا ۔ زکوٰۃ کا انتظام وصول و صرف
(۱) اسلامی حکومت کے ذریعے
(۲) اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو۔ تو صالح نظام جماعت کے ذریعے
(۳) اگر صالح جماعت موجود نہ ہو۔ تو انفرادی طور پر

ب ۔ کیا اجتماعی ادارات اور رفاہِ عام کی مدات میں زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے ؟
(شرطِ تملیک وغیرہ کی بحث)

ج ۔ اسلامی حکومت کا بجٹ اور زکوٰۃ
(کیا زکوٰۃ کے آمد و صرف کا حساب علیحدہ ہوگا)

د ۔ صنعتی سرمایے سے اخذ زکوٰۃ
(کیا مشینری میں لگے ہوئے سرمائے پر بھی زکوٰۃ عائد ہوگی)

ہ ۔ کاروباری سرمایے کی زکوٰۃ کی محسوب کرنے کا موزوں طریقہ۔

س ۔ زکوٰۃ اور قرض

ص ۔ نابالغ بچوں کی املاک کی زکوٰۃ

ط ۔ کیا "صاحبِ نصاب" زکوٰۃ سے استفادہ کر سکتا ہے
(۱) اجتماعی ادارات کی معرفت
(۲) براہ راست شخصی طور پر

ح ۔ کیا غیر مسلم پر زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے ؟

ف ۔ کیا زکوٰۃ کی رقم ضرورت مندوں کو قرض بھی دی جا سکتی ہے۔

ق ۔ کیا ایک بستی، علاقہ اور ملک کی زکوٰۃ دوسری بستی، علاقے اور ملک میں صرف ہو سکتی ہے ؟

ک ۔ زکوٰۃ سے مستثنیٰ قیمتی اور نفع بخش املاک پر ٹیکس کی ضرورت
(۱) کرایے کے مکانات پر
(۲) ہیرے جواہرات پر
(۳) سامانِ آرائش اور تعیشات پر

- پاکستان میں زکوٰۃ کا سالانہ اندازہ
(اعداد و شمار کی روشنی میں)

ا ۔ کاروباری سرمائے میں سے

ب ۔ خانگی اور بنکوں میں جمع شدہ فاضلات میں سے

ج ۔ زیورات میں سے

د ۔ مواشی میں سے

ہ ۔ زرعی پیداوار میں سے

- زکوٰۃ اور پاکستانی عوام کی ضروریات

ا ۔ ہماری قومی دولت اور اس میں سے کم حصہ پانے والوں کا تناسب۔

ب ۔ بے روزگاری

ج ۔ ضرورت سے کم غذا

د ۔ ضرورت سے کم لباس

ہ ۔ قلتِ مکانات

س ۔ غرباء کے لئے حفظانِ صحت کے انتظامات کی کمی۔

ص ۔ ملک کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ

ط ۔ معذورین

ع ۔ حوادث

- صرفِ زکوٰۃ کا پنج سالہ منصوبہ

ا۔ غیر مالک زراعت پیشہ لوگوں کی امداد

(۱) زمینیں خریدنے کے لئے سرمایہ کی بہم رسانی

(۲) بنجر رقبوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے مالی امداد

ب۔ صنعت کاروں کو کارخانے کھول کے دینے کی سکیم

ج۔ تجارتی سرمایہ فراہم کرنے کی اسکیم

د۔ معذوروں اور بے روزگاروں کیلئے وظائف

ر۔ قرضوں اور تاوانوں کی ادائی کے لئے وقتی امداد

س۔ ناگہانی حوادث کے مقابلے کے لئے مالی امداد۔

ص۔ رہائشی مکانات کی فراہمی کی اسکیم

ط۔ بلامعاوضہ معالجہ کا انتظام

ع۔ عوامی تعلیم و تربیت کے لئے ضروری انتظامات

ف۔ مسافروں کی ضروریات کا انجام

- نظامِ زکوٰۃ اور کفالتِ عامہ

(شہریوں کی بنیادی ضروریات کا بیمہ)

- کیا موجودہ حکومت زکوٰۃ کے وصول و صرف کا نظم صحیح طریق پر چلانے کے قابل ہے ؟

مقالہ (۹) "قدرِ زائد" اور اس کی تقسیم

- مارکس اور نظریۂ قدرِ زائد (ضروری تشریح)

(مارکس کی فکری غلطی)

- قدرِ زائد سرمایہ و محنت کے باہمی تعامل کا قدرتی نتیجہ ہے
- قدرِ زائد کی تقسیم :-

ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں

ب۔ سوشلسٹ نظام میں

ج۔ اسلامی نظام میں

مقالہ (۱۰) تقسیمِ دولت کے اصول

- دولت کے مختلف حصہ دار
- دولت کیسے تقسیم ہوتی ہے ؟

ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں

ب۔ اشتراکی نظام میں

- تقسیمِ دولت کا عادلانہ اصول

[ہر ایک سے اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق
اور ہر ایک کو اس کی خدمات کے مطابق
لیکن ——
کم سے کم اتنا کہ اسکی بنیادی ضروریات بخوبی پوری ہو سکیں]

- عادلانہ تقسیمِ دولت کیلئے حکومت کی ذمہ داریاں

مقالہ (۱۱) اسلامی نظام اور ٹیکس

- اسلامی حکومت اور ٹیکسیشن کی بنیادی پالیسی

ا۔ ٹیکسوں کا کم سے کم یا کم سے کم مدت کے لئے

ب۔ ایک مال پر ایک ہی ٹیکس

ج۔ ٹیکس صرف مالداروں پر

- دورِ حاضر کے ٹیکسوں کی اقسام اور ان پر تبصرہ

ا۔ زرعی

ب۔ صنعتی

ج۔ تجارتی

- بین الاقوامی صنعتی و تجارتی مسابقت اور ٹیکسیشن
- اسلامی معاشرہ میں تعیشات پر بھاری ٹیکس کی ضرورت

مقالہ (۱۲) اسلام میں سرمایہ و محنت کے تعامل کی جائز صورتیں

- سرمایہ و محنت کا تعلق

(دونوں کا پیداوارِ دولت میں حصہ)

- سرمایہ و محنت کا رابطہ غیر اسلامی نظامِ معیشت میں

(اسکی مختلف صورتوں کے مفاسد کی توضیح)

- اسلام میں سرمایہ و محنت کے رابطہ کی جائز صورتیں

ا۔ تجارت

ب ۔ ملازمت
ج ۔ مشارکت
د ۔ مضاربت
ہ ۔ مزارعت
——— وغیرہ

قسم چہارم

(ضمیمے)

ضمیمہ (۱) اسلامی لٹریچر میں معاشیاتی مسائل کے مآخذ

- عربی زبان میں اہم کتابیں
- انگریزی " " "
- اُردو " " "

ضمیمہ (۲) معاشی اصطلاحات

- اسلامی لٹریچر میں
- جدید علم المعیشت میں

ضمیمہ (۳) دورِ خلافتِ راشدہ کے معاشی اعداد و شمار

- سکے اور پیمانے
- تنخواہیں اور وظائف
- خراج
- غنائم

——— وغیرہ

ضمیمہ (۴) معاشی مسائل سے متعلقہ آیاتِ قرآنی
(مع ترجمہ و توضیح)

ضمیمہ (۵) معاشی مسائل سے متعلقہ احادیث
(مع ترجمہ و توضیح)

ضمیمہ (۶) جماعت اسلامی کا معاشی منصوبہ

ضمیمہ (۷) "معاشیات نمبر" کا جنرل انڈکس

اس مخصوص خاکے کے علاوہ 'چراغِ راہ' کے اسلامی 'معاشیات نمبر' میں ایسے افسانے، ڈرامے اور منظومات بھی شریک کئے جائیں گے۔ جو اس موضوع سے نمایاں تعلق رکھتے ہوں۔ علاوہ بریں "سوچ بچار" کے عنوان سے ایک مفصّل مقدمہ درج ہوگا۔ اور دوسرے ادارتی مضامین بھی پیش کئے جائیں گے۔

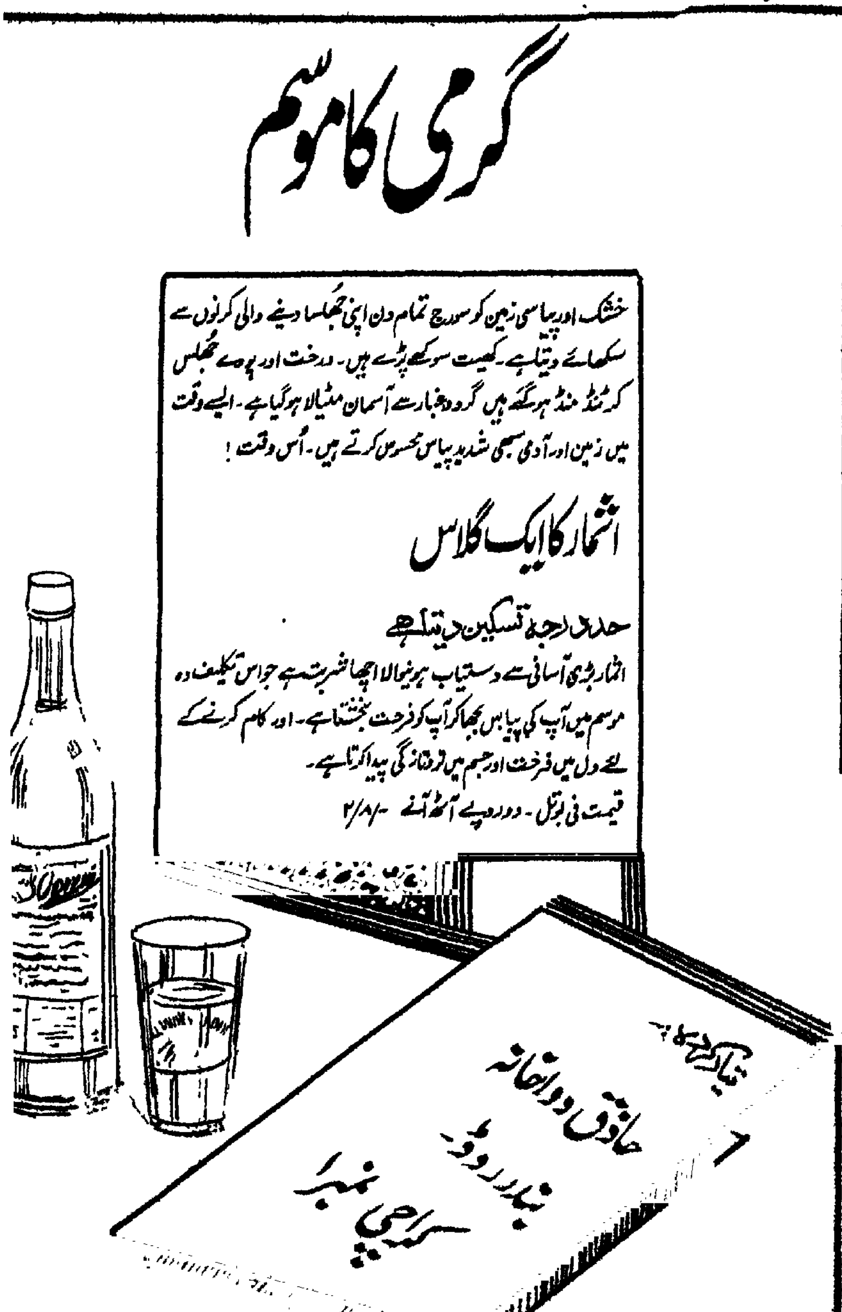
تعارفِ کتب و جرائد

ہفت روزہ "کاروانِ نو"

بہ ادارت، گوہر گیلانی و اشتیاق گیلانی۔
مقامِ اشاعت، بیت اسلام۔ مالیر برانچ آفس۔ کراچی۔ چندہ سالانہ، دس روپے۔ فی پرچہ ۱۲ ہر

"کاروانِ نو" ایک زندگی بخش ہفت روزہ ہے جس کا فکری محور اسلام ہے۔ اس نئے جریدہ کے جو چند شمارے ہماری نگاہ سے گذرے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر ہم اس کوشش کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیاسی نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے یہ جریدہ حق گوئی میں بے باک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ دوسری طرف ادبی لحاظ سے بھی اس کا معیار حوصلہ افزا ہے۔ اب تک کے شماروں میں جو افسانے اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ وہ بڑی حد تک قابلِ قدر ہیں۔

"کاروانِ نو" خاص طور پر موجودہ نظام کے معاشی پہلوؤں کی تاریکیوں کو نمایاں کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے اسلام پسند جرائد میں اس کا وجود ایک اچھا اضافہ ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ کاروانِ نو کے فروغ سے ملک کے اسلام پسند رجحانات کی قوت کار میں اضافہ ہوگا۔


گرمی کا موسم
خشک اور پیاسی زمین کو سورج تمام دن اپنی جھلسا دینے والی کرنوں سے
سکھائے دیتا ہے۔ کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ درخت اور پودے جھلس
کر ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں گرد وغبار سے آسمان مٹیالا ہو گیا ہے۔ ایسے وقت
میں زمین اور آدمی سبھی شدید پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اُس وقت!
اثمار کا ایک گلاس
حد درجہ تسکین دیتا ہے
اثمار بڑی آسانی سے دستیاب ہونیوالا اچھا شربت ہے جو اس تکلیف دہ
موسم میں آپ کی پیاس بجھا کر آپ کو فرحت بخشتا ہے۔ اور کام کرنے کے
لیے دل میں فرحت اور جسم میں ترو تازگی پیدا کرتا ہے۔
قیمت فی بوتل ۔ دو روپے آٹھ آنے -/۲/۸
حاذق دواخانہ
نیپیئر روڈ
کراچی نمبر

Only Title Printed at the Shan Electric Press, Arambaugh Road, Karachi

Printer & Publisher Ghulam Mohammed, M Chaudhri



ماہنامہ
چراغِ راہ
جلد ۳ - عدد ۷ - ۹ لوٹیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ - کراچی نمبر ۱ - ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

سوچ بچار

فکر و تحقیق

تخلیقاتِ ادب

زرِ سالانہ — پاکستان ۵ روپے | ہند — ۷ روپے آٹھ آنے | فی پرچہ — پاکستان: آٹھ آنے، ہند: دس آنے

... غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس ... کراچی سے چھپوا کر لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا

سوچ بچار

ہماری خارجہ پالیسی

ایک اہم ترین سوال آج ہمارے سامنے ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ بین الاقوامی نقطۂ نظر سے پاکستان کیا حیثیت اختیار کر رہا ہے، ہماری سیاست و معیشت کی باگ ڈور جن حضرات کے ہاتھوں میں ہے وہ اپنی ملّت کو کونسا مقام دلوا رہے ہیں؟

اس سوال کو سوچنے سمجھنے والے لوگ اول تو ہیں ہی کم، اور جو اس پر غور و فکر کرتے ہیں ان میں بہت بڑی تعداد کمزور قسم کے آدمیوں کی ہے جو اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے ان حقائقِ تلخ کو عوام کے سامنے کھول کر بیان نہیں کرسکتے ہیں جن سے اقتدار کی جبین پر بہرحال بل پڑنے چاہئیں۔ ان حالات میں ہماری قوم کا حال یہ ہے کہ اس کے لیڈر اگر اس کا باقاعدہ کہیں سودا بھی کر ڈالیں اور زرِ ثمن وصول کرکے جیب میں ڈال لیں تو بھی وہ تالیاں پیٹ کر داد دے گی اور زندہ باد کا نعرہ بلند کردیگی۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہماری خارجہ پالیسی جس نہج پر لشو و ارتقاء کر رہی ہے، وہ ہر ذی فہم کے لئے سخت تشویشناک ہے۔ سیاسی کارکن، پریس، علماء اور ادیب ماسوا استثنائے چند اس معاملے میں انتہائی فرض ناشناسی کا ثبوت دے رہے ہیں، اور عوام پر اب تک واضح نہیں ہے کہ ان کی قسمتوں کی تعمیر کس طرح کی جارہی ہے۔ اس موقعے پر اگر ہم بھی دوسروں کی طرح خاموش رہیں، حقائق سے صرفِ نظر یا کھرے کی بات کو لپیٹ لپاٹ کے کہیں تو پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارا مقصدِ وجود کیا رہ جاتا ہے؟

"چراغِ راہ" کا مقام روزِ اول سے یہ رہا ہے کہ کہنے کی جس بات کو کوئی دوسرا نہیں کرسکا، اسے چراغِ راہ نے کھل کر کہا ہے اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ اسے حق گوئی کی کیا سزا کس کی طرف سے ملے گی۔ آج بھی جو سوال ہمارے پیشِ نظر ہے، اس کا جواب اگر کسی اور سے عوام کے سامنے وضاحت کے ساتھ نہیں بیان کیا گیا تو چراغِ راہ پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کے اپنا فرض ادا کرے۔

پاکستان کے کارفرما طبقہ کی طرف سے خارجہ پالیسی کی جو تقدیرِ ملتِ پاکستان کی لوحِ جبین پر نقش کی جارہی ہے اس کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی صورتِ حال کا نقشہ سامنے رکھنا ضروری ہے۔

آج کی پوری دُنیا ایک طرح کی جاگیرداری کے نیچے جی رہی ہے۔ اس دُنیا پر چند جاگیردار مسلط ہیں جن کے دو دھڑے ہیں۔ عالمگیر جاگیرداری کا ایک دھڑا وہ ہے جو سوویٹ روس جیسے بڑے جاگیردار کے جھنڈے تلے جمع ہے اور دوسرا وہ ہے جو امریکہ کے گرد منظم ہو رہا ہے۔ دنیا کی چھوٹی حکومتیں ان جاگیرداروں کے مقابلے میں بالکل مزارعین کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ دنیا کا سیاسی نظم و نسق اور معاشی اقتدار حقیقت میں بڑے جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہے، متفرق قومیں اور حکومتیں ان کی آلہ کار ہیں۔ دونوں بڑے جاگیرداروں کے درمیان اصول کا بھی اختلاف اور مفاد کا بھی۔ یہ اختلاف اس حد تک پروان چڑھ چکا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنے لئے مستقل روگ اور جانی دشمن تصور کرتے ہیں اور اس فیصلے پر پہنچ چکے ہیں کہ ایک ہی کرۂ ارضی پر دونوں کا بیک وقت اطمینان سے جینا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ ایک مہیب اور انسان کش جنگ لڑنے کی تیاریاں دونوں طرف ہو رہی ہیں۔ ان تیاریوں کے تقاضے کے طور پر ادھر سے بھی اور اُدھر سے بھی اپنے مقصد

معاہدہ صرف یہی ہے کہ کون اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ ممالک کی حکومتوں اور عوام کو وابستہ کر لیتا ہے۔ اس مسابقت کے تحت بڑی بڑی کانفرنسیں ہو رہی ہیں، معاہدات استوار کئے جا رہے ہیں، چھوٹے ممالک کو زیرِ اثر لیا جا رہا ہے، بحری اور ہوائی اڈے قائم کئے جا رہے ہیں اور آئندہ جنگ کے لئے میدان اور محاذ تجویز کئے جا رہے ہیں نیز دونوں طاقتیں بڑی سے بڑی قیمتوں پر قوموں کو قربانی کا بکرا بنانے کے لئے خرید رہی ہیں۔

سفید اور سُرخ دھڑے سے الگ کوئی تیسرا بلاک موجود نہیں ہے جو کسی نئے اصول پر منظم ہوا ہو اور نہ کوئی ایک ملک ایسا ہے جو ان دونوں دھڑوں کی کشمکش سے الگ رہ کر آئندہ جنگ کی روک تھام یا کم سے کم اس کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی کوئی صورت اختیار کرے۔

ایک پاکستان ایسا ملک تھا جس کے عوام کی متفقہ خواہش یہ تھی اور ہے کہ وہ کسی کے گھڑے کی مچھلی نہ بنیں اور نہ کسی طاقت کے خیمہ بردارں میں شامل ہوں، بلکہ اسلام کے منشا کے مطابق کامل استقلال کا عزم لے کر نئی زندگی کی تعمیر کریں۔ لیکن بدقسمتی سے اس ملک کے اقتدار کی باگ ڈور انگریز نے جن لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کی ہے اُن کو وہ ذہنیت ارزانی ہوئی ہی نہیں جس کے ساتھ کسی آزاد ملک کی سربراہ کاری کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسے طبقے کے لوگ ہیں جو برسوں سے علمی، تہذیبی، مجلسی، سیاسی، اور معاشی ہر میدان میں اغربی آقاؤں کی غلامی کرتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے طرزِ فکر میں مغرب کی تقلید و مرعوبیت کی خصلت انتہائی حد تک رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو گھر کے اندر کی فضا کو انگریزی اثرات سے آزاد کرنے کی ہمت نہیں رکھتے، کجا کہ یہ خارجہ تعلقات میں آزادی کا مظاہرہ کر سکیں ان میں یہ استطاعت ہی نہیں ہے کہ یہ قانون، تعلیم، بنکنگ، عدلیہ، دفتری نظام، مارکیٹ سسٹم، اور معاشرت کے شعبوں میں کوئی ایسی تبدیلی کر دکھائیں جو یہ ظاہر کرے کہ فی الواقع اب انگریزی تسلط اس ملک سے ختم ہو چکا ہے اور ایک نیا نظامِ تہذیب و تمدن نشوونما پانے لگا ہے۔ بخلاف اس کے انگریز کے یہ جانشین وہ کچھ کرنے کے لئے بے چین ہیں جسے انگریز کرنا چاہتا تھا مگر "غیر" ہونے کی وجہ سے نہ کر سکا تھا۔ بقول:-

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

ان حضرات کی نفسیات کا اگر صحیح تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساحل سے رخصت ہو جانے والے غیر ملکی اقتدار کے پیچھے لپک رہے ہیں اور اسے برابر پکار پکار کر اطمینان دلا رہے ہیں کہ ہم بدستور وفادار ہیں، آخر ہم نیازمندوں سے یہ گریز کیوں؟ جو سانپ نکل گیا ہے، اس کی لکیر پیٹی نہیں جا رہی، پوجی جا رہی ہے اور بار بار لذتِ گزیدگی کا تصور حسرت بن کے سامنے آتا ہے کہ اب کون ہو گا جو ہمیں اس سرور انگیز طریق سے ڈسے گا!

ظاہر بات ہے کہ جب تک یہ ذہنیت ہم پر حکمران ہے پاکستان کس طرح اپنے لئے کوئی مستقل اور آزاد حیثیت حاصل کر سکتا ہے! یہ ذہنیت اُسے آہستہ آہستہ اینگلو امریکن بلاک کی مستقل غلامی کی طرف گھسیٹے لئے جا رہی ہے۔

سیاسیات اور معاشیات میں ہمارے اکابر کی ذہنی غلامی کیا گُل کھلا رہی ہے، اس کا جائزہ لینے سے پیشتر یہ جاننا ضروری ہے کہ ان حضرات کی فکری آزادی و غلامی کی حدود کیا ہیں؟

آج ہماری قیادت کی باگ ڈور جس طبقے کے ہاتھ میں ہے وہ میدانِ علم و فکر میں مغرب سے پوری شکست کھا چکا ہے۔ اس طبقے کے پاس سرے سے اپنے کوئی خیالات ہی نہیں ہیں، اپنا کوئی نظریہ و اصول ہی نہیں ہے، بلکہ جو کچھ ہے وہ مستعار ہے، یا الہامِ سوقہ ہے، وہ سیاست، قانون، ادب، فنون ہر پہلو سے صرف وہی کچھ سوچ سکتے ہیں جو کچھ کہ ان کے آقاؤں نے سوچ لیا ہے۔

بڑی قوموں کے انکار سے آزاد ہو کر کوئی چیز سوچتے ہوئے یہ شرماتے ہیں اور اُن سے اختلاف کرتے ہوئے انہیں خدشہ ہوتا ہے کہ ہماری بکشی نہ ہو جائے۔ حد یہ کہ، ادھر اسلامی نظام کے قیام کا دعویٰ کریں گے اور اُدھر اپنے آقایانِ نامدار کو اطمینان دلانے کیلئے دوڑیں گے کہ ہمارا اسلامی نظام اِس طرح کا نہیں ہوگا جو حضور کو ناپسند ہو!

اس فکری غلامی کا نتیجہ ہے کہ مغربی تہذیب کے سارے مکروہات و مذمومات کو یہ اپنے ہاں فروغ دینے پر مصر ہیں چونکہ وہاں شراب نوشی علامتِ تہذیب ہے' اس لئے یہاں بھی اسے حرام ٹھہرانے کی جرأت نہیں کی جاسکتی' پھر اگر وہاں رقص و سرود اور بتگری کا نام آرٹ ہے تو یہاں کی "اسلامی تہذیب" کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ان منکرات کو ترقی دینے کا اہتمام کرے' اگر وہاں بے حیائی لازمۂ ترقی ہے تو یہاں بھی ملکی استحکام کے لئے یہ بات فرضِ عین قرار پائی ہے کہ سوسائٹی کو زنا کے محرکات سے بھر دیا جائے' اگر وہاں عورت کو سڑکوں پہ گھمانا' پارکوں میں ٹہلانا اور کیمرے کے سامنے اُس سے پریڈ کرانا 'گارڈ آف آنر' کے لئے اسے استعمال کرنا اور بازیچۂ ہوس بنانا عقلیت پسندی کی معراج ہے تو یہاں بھی ہمارے اکابر کا "اسلامی نظام" اسی پر مصر ہے کہ ایسی قیامت کو ضرور برپا ہونا چاہئے۔

پھر فکری غلامی کے صدقے ہی میں یہ صورت حال نمودار ہوتی ہے کہ "اسلامی اسٹیٹ" کے قیام کا اعلان کرنے کے بعد مسلسل پسینے چھوٹ رہے ہیں کہ مہذب دنیا بدگمان ہو رہی ہے۔ راتوں کی نیند اس فکر میں اڑی جا رہی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ یہ کیسی گھٹیا قوم ہے جو آج کے روشن دور میں بھی مذہب کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے' اتنا ہی نہیں اسے نظامِ ریاست میں بھی دخیل کرنا چاہتی ہے۔ ان حضرات کو برابر یہ مسئلہ درپیش ہے کہ کیا طریقہ ہو جس سے اپنی ریاست کے لفظاً نہیں تو عملاً لادینی (SECULAR) ہونے کا ثبوت دے سکیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں کہ یہ امریکہ و برطانیہ کی جمہوریت کے نقشے میں کوئی بنیادی ترمیم ہی کر سکیں۔ ان میں اتنا بھی بل بوتہ نہیں کہ کھل کر یہ کہہ دیں کہ ہماری حکومت کے کلیدی مناصب ان لوگوں کو نہیں مل سکتے جو اسکے بنیادی اصولوں پر یقین نہ رکھتے ہوں۔

اس طرح کی زندگی گیر فکری غلامی کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس میں مبتلا ہوں وہ اپنے آپ کو آگے چلنے والی قوموں کے مقابلے میں گھٹیا اور فروتر سمجھیں اور ان کی بالاتری کو تسلیم کر کے ان کی تقلید کریں' اُن سے وابستہ ہوں' اُن سے کامیابی اور ترقی کے گُر سیکھیں' اُن سے اپنے مسائل حل کرائیں' اُن سے ہر طرح کی امداد چاہیں ——— اور پھر اُن کے آلۂ کار بنیں' اُن کی سیاسی چالوں کا شکار ہوں' اُن کو راضی رکھنے کی کوشش کریں اور ان کے لئے قربانی کے بکرے بننے کو خوشی خوشی تیار ہو جائیں۔

ٹھیک یہی رُخ ہے جس پر ہمارے رہنما گامزن ہیں اور اپنے پیچھے پوری قوم کو گھسیٹے لئے جا رہے ہیں۔ آج اینگلو امریکن بلاک سے ہمارے جو تعلقات استوار ہیں اور ہو رہے ہیں' ان کی نوعیت بالکل یہی ہے

آیئے' ذرا غور کیجئے کہ مالیاتی اور اقتصادی حیثیت سے بین الاقوامی طور پہ ہمارا مقام کیا ہے؟ ——— آزادی یا غلامی پاکستان میں ابھی تک انگریزی بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کا بول بالا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ قریب قریب ۸۰ فیصد بنکی سرمایہ غیر ملکی ہے۔ اس سرمایے پر ہر سال ایک گراں بہا رقم منافع کی پاکستان کی معاشیات سے نکل جاتی ہے اور اس سرمایے میں مزید اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔ غیر ملکی (امریکی' برطانوی وغیرہ) سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو براہ راست پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے دینے پر تیار نہیں

ہیں، کیونکہ اس طرح اُن کی صنعتی پیداروں کی کھپت میں کمی آسکتی ہے۔ بخلاف اس کے وہ بنکی سرمایہ فراہم کرکے ہماری جیبوں سے سود وصول کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کو مالیاتی اور صنعتی لحاظ سے کمزور رکھنے کی اس پالیسی کو خود ہماری قیادت ہی کی سرپرستی حاصل ہے

پھر ہمارے مُلک کی بہت سی بڑی بڑی کاروباری کمپنیوں پر بھی غیر ملکی اجارہ دار قابض ہیں۔ روئی، پٹ سن، چائے، پٹرول، جہاز رانی، اور ہائیڈرو الیکٹرک وغیرہ کاروبار ایسے ہیں کہ جن پر زیادہ تر غیر ملکی کمپنیوں کے ذریعہ پاکستان کی جیب سے لاکھوں روپیہ سالانہ برآمد کیا جارہا ہے۔

پھر برطانیہ کو پاکستان کی طرف سے خاص تجارتی ترجیحات حاصل ہیں۔ یہ ترجیحات دورِ غلامی کی افسوس ناک یادگاریں ہیں جنہیں ہماری قیادت آزادی کے بعد بھی ختم نہیں کر سکی۔ ان ترجیحات کی رُو سے برطانوی مال پر دوسرے ملکوں کے مال کے مقابلے میں ۳۰ فیصدی کم محصول عائد کیا جاتا ہے۔ اس طرح پاکستان کو برطانیہ کے لئے نفع بخش منڈی بنائے رکھنے کا خاص اہتمام جاری ہے۔

پھر پاکستان کی ریلوں اور نہروں پر جو برطانوی سرمایہ لگایا گیا تھا اس پر کروڑوں روپیہ سود ہر سال پاکستان سے برطانیہ کو منتقل ہوتا ہے۔ ۱۶۔ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۱۔ مارچ ۱۹۴۹ء تک تقریباً تین کروڑ روپیہ بطور سود ادا کیا گیا ہے۔ این، ڈبلیو آر کی مد میں سے ۵ کروڑ روپیہ سالانہ برطانوی سرمایہ داروں کو ادا ہو رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ۳۰ کروڑ روپیہ کے جملہ سرمایہ پر تقسیم سے قبل ۴۸ کروڑ روپیہ سود ادا کیا جا چکا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

بین الاقوامی مالیات کے میدان میں پاکستان کی گردن اسٹرلنگ بلاک کی دُم سے بندھی ہوئی ہے۔ ہمارے اسٹرلنگ فاضلات برطانیہ کے ذمے ہیں، ان کا ڈالر سے تبادلہ تمام تر برطانوی بنکوں کے واسطے سے ہوتا ہے اور وہ اس پر مسلسل کمیشن وصول کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مالیاتی وابستگی ہی کا یہ ایک نتیجہ تھا کہ جب برطانیہ کی پونڈ کی تقلیلِ قدر (devaluation) کا فیصلہ کیا تو ہمارے فاضلات میں از خود تینتیس ۳۳ فیصد کی کمی واقع ہوگئی۔ اس طرح تقریباً ۵۰،۶۰ کروڑ روپیہ کا نقصان ہمیں اٹھانا پڑا۔ پھر اس مالیاتی وابستگی ہی کا یہ نتیجہ بھی ہے کہ آپ صنعتی ضروریات کی خریداری میں برطانیہ کے رحم و کرم پر ہیں۔ خود اس کی اپنی پالیسی یہ ہے کہ وہ آپ کو اشیاء صرف خصوصاً تفریحات زیادہ فراہم کرے اور مشینیں کم دے ——— اور اگر آپ امریکہ سے مشینری درآمد کرنا چاہیں تو وہ اپنے ڈالر کا اقلو بکار بنا رہتے بیٹھ جاتا ہے چنانچہ اُس نے اپنی مالیاتی فوقیت کے زور سے پاکستان کو اس پر مجبور کردیا کہ وہ ڈالری حلقے سے اپنی خریداری کو کم کردے۔

یہ مالیاتی غلامی کوئی معمولی بلا نہیں ہے، بلکہ محکومی کی وہ بدترین قسم ہے جس سے نجات پانے کی کوئی شکل تلاش نہ کرسکنے کی وجہ سے ہماری قیادت بے بسی کے ساتھ بین الاقوامی سیاسیات میں اپنی ملت کو بدستور برطانوی بلاک کے آگے رہن رکھے دے رہی ہے۔

اب آیئے سیاسیات کی طرف!

سیاسی نقطۂ نظر سے اس وقت اینگلو امریکن بلاک اپنے مفاد کے لئے یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ایک تو اس کے حریف رُوس کو اقوامِ متحدہ کے ادارے میں بھی اور سیاسی جوڑ توڑ کے عام میدان میں بھی شکست دی جا سکے، دوسرے مشرقِ وسطیٰ اور ایشائی ممالک میں اسے جو سیاسی و معاشی بالا دستی اب تک حاصل رہی ہے وہ زیادہ سے زیادہ حد تک برقرار رہے اور مصنوعات کو گراں خریدنے اور اجناس خام کو سستا بیچنے والی منڈیوں کے دروازے اس پر برابر کھلے رہیں، تیسرے یہ کہ رُوس سے مستقبل قریب میں اس کی جو جنگ ہونے والی ہے اُس میں یہ ملک نہ صرف یہ کہ جنگی اڈے اور قربانی کے بکرے مہیا ہو جائیں بلکہ آلۂ کار بننے والی حکومتوں کی ایک صف کی صف روسی

امپیریلزم کا مقابلہ کرنے کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو جائے۔
ان تینوں مقاصد میں ہمارے اکابر امریکی برطانوی بلاک کے لئے بے حد کار آمد ثابت ہو رہے ہیں

اقوام متحدہ میں روسی بلاک اور امریکی بلاک میں جو کشمکش ہو رہی ہے، اس میں ہمارے نمائندوں کی تقاریر اور ان کے ووٹ ہمیشہ امریکی بلاک کے لئے ریزرو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اریٹیریا اور سومالی لینڈ کا مسئلہ جب پیش ہوا اور سومالی لینڈ کو دس سال تک کیلئے از سر نو اطالوی قبضہ میں دینے اور اریٹیریا کے معاملے کو ایک سال کے لئے معرض التوا میں رکھنے کی تجویز اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے سامنے آئی تو ہمارے نمائندے کا ووٹ اسی غلام سازی کے پروگرام کے حق میں تھا

اب تک سفید بلاک کی طرف سے جتنی سازشی کانفرنسیں منعقد کی گئی ہیں ان میں پاکستان کے نمائندوں نے شریک ہو کر طے شدہ پروگراموں میں تعاون کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ خصوصاً کامن ویلتھ کے ادارے اور اس کے مقاصد کی ہمیشہ قصیدہ گوئی کی گئی ہے اور ان کو حاصل کرنے پہ اپنی پوری خدمات پیش کی گئی ہیں۔ اسی ادارے کے فیصلے کے تحت حکومت برما کو سینتالیس لاکھ روپیہ نقد اور ۲۵ ہزار رائفل پاکستان نے فراہم کی ہے، کیونکہ موجودہ حکومت برما کا وجود ہی برطانوی کاروباریوں کے لئے برما کے تیل اور ٹنگسٹن (دھات) پر قابض رہنے کا ذریعہ ہے۔

ابھی ابھی منیلا میں جو ٹوکیو کانفرنس جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے امن اور مفاد کو بچانے کے لئے فلپائن، آسٹریلیا، انڈیا، پاکستان، تھائی لینڈ اور لنکا کے درمیان "عالم بالا" کے اشاروں کے تحت منعقد ہوئی ہے، اس میں بہت جلد "مشترکہ مفاد" کو بچانے کے لئے "متحدہ اقدام" کا ریزولیوشن پاس ہو گیا۔

اس سے زیادہ دلچسپ یہ کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ۲۵۔ مئی کو اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ ہند چینی کی جنگ میں فرانس کی کمزوری نمایاں ہے، اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اس پر ایک ممبر مسٹر جان ہوپ نے تقریر کرتے ہوئے۔ اصل مدعا کو یوں ظاہر کیا کہ:۔

"یہ واضح ہے کہ اگر ہند چینی ہاتھ سے جاتا ہے تو برطانیہ کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ملایا کو بچا سکے۔ ملایا ہی نہیں، سنگاپور، اور برما بھی جائیگا، اور اگر ایسا ہوا تو پھر سیام، انڈونیشیا اور فلپائن کی بھی خیر نہیں"

اس خطرناک صورت حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تجویز یہ سامنے آئی کہ برطانیہ، امریکہ، انڈیا اور پاکستان کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ گویا ان حضرات کے نزدیک یہ طے ہے کہ انڈیا اور پاکستان بہر حال ہمارے مفاد کے تحفظ کی ساری اسکیموں میں ہمارے زیر استعمال رہنے ہی والے ہیں۔

وہ تمام بین الاقوامی معاہدات جو اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے استوار کئے گئے ہیں ان میں سے کچھ وہ ہیں جن پر انڈیا اور پاکستان کے دستخط ثبت ہیں اور بقیہ وہ ہیں جن پر دستخط کرنے کے وجوہ نہیں تھے اور ان کے ساتھ دلی تائید بہر حال شامل حال ہے۔

اینگلو امریکن بلاک مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک میں آزادی پسند اور اسلام پسند عناصر کو خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے کچلوا کر جن "کاسہ لیس" کٹھ پتلیوں کو اقتدار کے تخت پر بٹھائے ہوئے ہے اور جن کی معرفت اس جنگی اہمیت کے علاقے کی سیاسیات

مالیات پر وہ بالواسطہ حکمراں ہے، ان کے ساتھ ہمارے برسر اقتدار طبقہ کے دوستانہ تعلقات روز بروز گہرے ہو رہے ہیں۔ ان ممالک کے عوام اور خصوصاً عوام میں سے اسلام پسند اور فرنگ دشمن عناصر سے جس طرح اینگلو امریکن بلاک چڑھتا ہے اسی طرح ہمارے اکابر کو بھی اُن سے ایک گونہ بُعد ہے۔

ان ممالک کو روس کے مقابلے میں ایک مدافعتی بلاک بنا کے کھڑا کرنے کے لئے جو سازشی طریق کار اینگلو امریکن بلاک نے اختیار کر رکھا ہے، اس میں ہمارا برسر اقتدار طبقہ پورے پورے تعاون کا ثبوت دے رہا ہے۔ اتحاد ——— اور مسلم ممالک کا اتحاد — کس مسلمان کو محبوب نہ ہوگا، لیکن یہ اتحاد حب اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کے لئے نہ ہو بلکہ دشمنانِ اسلام کے اشاروں سے ہو اور انہیں کی اغراض کے لئے ہو تو معاملہ دوسرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس پُر معنی اتحاد کو تکمیل دینے میں پاکستان کے لیڈروں نے اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ ہمارے سفارتی تعلقات، ہمارے وزرا کا مصر اور دمشق میں نزولِ اجلال، چوہدری خلیق الزمان صاحب کا اسلامستان بنانے کے لئے سفر کرنا، ہمارے وزیر داخلہ کا ج مبروز، سر آغا خاں کا پاکستان میں ورود اور شاہ ایران کے قدوم میمنت لزوم کا سرزمینِ پاکستان کو چار چاند لگانا اور پھر وہ استقبال جس کی نظیر چشم فلک نے کبھی نہ دیکھی ہوگی ——— یہ سب کچھ منصوبہ کے مطابق (According to plan) ہوا ہے اور منصوبہ بہرحال ہمارا بنایا ہوا نہیں تھا، بلکہ "عالم بالا" میں مرتب ہو کر القاء ہوا تھا۔ اس منصوبہ کا منتہا بجز اس کے کچھ نہیں کہ فلسطین، مصر، عراق، عرب، ایران اور پاکستان کو آئندہ جنگ کا میدان بنانے کے لئے سازگار کیا جائے۔

ہر ملک کے لئے دفاع کا مسئلہ شدید اہمیت رکھتا ہے، خصوصاً پاکستان جیسے نوخیز ملک کے لئے جسے اس کے حصہ کا پورا جنگی سامان بھی نہیں مل سکا اور نہ برعظیم ہند کے اسلحہ ساز کارخانوں میں سے کوئی اس کے دائرۂ قسمت میں آیا ہے، دفاعی لوازم کی فکر کرنا اشد ضروری ہے۔ لیکن ایک نوخیز غیر صنعتی اور پسماندہ ملک کے سامنے صرف ایک دفاع ہی کا مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ قومی معیشت کی تعمیر اور صنعتی استقلال کا مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ خود دفاعی قوت کی اصل بنیاد بھی قومی معیشت کی مضبوطی پر قائم ہوتی ہے۔ لیکن کچھ تو انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کی نوعیت نے اور ایک حد تک اینگلو امریکن پالیسی نے ہمارے رہنماؤں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی توجہات جنگی ضروریات کی طرف خاص طور پر منعطف کر دیں۔ اس حالت کو پیدا کرنے میں امریکہ و برطانیہ کے لئے چند در چند مخصوص فوائد ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ جنگی ذہنیت پیدا ہو جانے کے بعد کسی مشرقی ملک کے سامنے جو ضروریات آتی ہیں اُن کے سلسلہ وہ ان ممالک کا دستِ نگر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ ان ممالک کی اسلحہ ساز سرمایہ داروں کا کاروبار فروغ پاتا ہے، تیسرے یہ کہ پسماندہ ممالک میں صنعتی اور تعمیری کاموں کی ترقی رک جاتی ہے اور اس طرح امپریلسٹ طاقتوں کے لئے منڈیوں کی پہنائیاں سالہا سال تک کے لئے وسیع رہتی ہیں، چوتھے یہ کہ اس طرح زیر اثر ملکوں کی جنگی حس بیدار رہتی ہے اور اُس سے بروقت کام لیا جا سکتا ہے۔

ان مقاصد کے لئے امریکہ و برطانیہ اپنے تمام زیر اثر ممالک میں جنگی ذہنیت پیدا کر رہے ہیں، اور جہاں یہ اچھی طرح نہیں پھیلتی وہاں اٹیل پلان کے تحت ڈالری امداد دے کر یا بلاقیمت اسلحہ بھیج کر بآسانی پیدا کر لی جاتی ہے۔ دنیا کے جن ممالک میں جس حد تک یہ جنگی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے اس کا پیمانہ حکومتوں کے بجٹ ہوتے ہیں۔ ہر ملک کا بجٹ یہ بتا دیتا ہے کہ اس ملک کی قیادت کا رجحان تعمیری ہے یا جنگی۔ چنانچہ ہمارا مرکزی بجٹ دفاع کے لئے ۵۰ کروڑ روپیہ مخصوص کرتا ہے اور یہ رقم کل اندازۂ مصارف کا ۲۵٪ ہے۔

دفاع بلاشبہ ہمارے لئے اشد اہمیت رکھتا ہے اور ایک اسلامی ریاست کے وجود کو بچانا "جہاد فی سبیل اللہ" ہے جس کیلئے

ہم جو کچھ بھی قربان کریں وہ ٹھکانے لگتا ہے۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے لوازم پورے کرنے کے لئے صحیح طریقہ یہ نہیں کہ ملک کی تعمیرِ معیشت کی مدات سے رقمیں بچا کر ادھر صرف کر دی جائیں بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ عوام الناس میں اسلامی جذبات کو مستحکم بنیادوں پر قائم کر کے ان کے اندر انفاق و ایثار کا ایک عام ولولہ پیدا کر دیا جائے ——— لیکن یہ ولولہ وہ لوگ کیسے پیدا کریں گے جو اپنی بڑی بڑی تنخواہوں میں کوئی کمی کرنے اور اپنی عیاشانہ عادات میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے پر تیار نہ ہوں۔ ایسے لوگ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ تعمیرِ معیشت کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر دفاع کی ضروریات پوری کریں۔ اور یہی مطلوب ہے اینگلو امریکن بلاک کو! ان کا یہ مطلوب پورا کرنے میں ہمارے اکابر بھلا کوئی کوتاہی کیسے کر سکتے ہیں۔

مشرقی ممالک کو متحد کرنے کی اینگلو امریکن پالیسی نے انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کو درست کرنے میں بھی اپنا پورا پارٹ ادا کیا ہے۔ لوگوں کو اس پر تعجب ہوا ہوگا کہ دونوں حکومتوں کے اکابر جو ایک وقت میں گلگشت جنگی جذبات کے راستوں پر بھاگ رہے تھے، دوسرے وقت میں یکایک گلے مل گئے اور ایک دوسرے کی تعریف میں رطب اللسان نظر آنے لگا تو آخر یہ "معجزہ" کیسے رونما ہوا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ اس وقت چونکہ امریکہ و برطانیہ سمجھتے ہیں کہ اگر مشرقی ممالک اور خصوصاً انڈیا اور پاکستان میں کوئی تصادم ہو تو کمیونزم کے جراثیم کو گھس کر اپنا کام زور شور سے کرنے کا موقع مل جائیگا لہٰذا وہ اس پر تیار نہیں ہیں کہ یہاں تصادم برپا ہونے دیں چنانچہ پچھلے دنوں جب دونوں ہمسایہ حکومتوں کے مابین کھچاؤ بڑھ گیا تھا اور دونوں طرف جنگ کے امکانات پر گفتگو میں ہونے لگی تھیں ہماری قطعی رائے یہ تھی کہ جنگ کا کوئی امکان نہیں کیونکہ اس وقت "عالم بالا" اس کی اجازت نہیں دے سکتا اور وہاں سے جب تک اذنِ جنگ نہ ہو۔ کوئی بڑے سے بڑا جنگجو پروپیگنڈہ کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بعد کے واقعات نے ہماری اس رائے کا ایک واضح ثبوت بہم پہنچا دیا ہے۔

بات صرف اتنی دھمکی کافی تھی کہ اگر تم لوگوں کو باہم جنگ ہی لڑنی ہے تو یہ سمجھ لو کہ پھر نہ تمہیں ماہرین کی خدمات ہی بہم پہنچائی جائیں گی اور نہ اسلحہ اور دیگر مادی ضروریات ہی کی امداد دی جائے گی بہرحال یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ آناً فاناً گفتگو مصالحت کی سلسلہ جنبانی شروع ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے فضا کا نقشہ پلٹ گیا۔ یہ ٹھیک وہی نقشہ تھا کہ نبی صلعم پر خدا تعالےٰ کی طرف سے حرمتِ شراب کا حکم نازل ہوتے ہی جونہی منادی ہوئی شراب نوشی کا سلسلہ پورے عرب میں یک قلم منقطع ہوگیا اور جس کے ہاتھ میں صراحی تھی اُس نے صراحی پٹخ دی اور جس کے ہاتھ میں پیالہ تھا اُس نے پیالہ انڈیل دیا۔ یہاں بھی ادھر وحی آئی اور ادھر جن زبانوں سے رجز اُبل رہے تھے وہ امن کے ترانے گاتی نظر آئیں۔

دونوں ملکوں کو معاہدۂ صلح اور جنابِ صلح مبارک ہوں اور اس چیز کی بہت شدید ضرورت تھی، چنانچہ پبلک نے بڑی گرم جوشی

لے ہم نفسِ معاہدہ اور دوستانہ روابط کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اس قسم کے تعلقات کو انڈیا اور پاکستان کے درمیان نہایت ضروری سمجھتے ہیں خصوصاً اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں اسلام کے جو تقاضے ہیں ان کے پیشِ نظر ہماری رائے میں ہمیں حدودِ شرعی کے اندر اس سے بھی زیادہ حسنِ سلوک کا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جتنا کہ معاہدے کے ذریعے کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ہم اقلیتوں کے معاہدے اور تجارتی معاہدے میں استوار شدہ شرائط کے پورا کرنے کو بھی حکام اور عوام کے لئے لازم یقین کرتے ہیں۔ یہاں بحث دوسری چیز پر ہو رہی ہے۔

ہے نئے حالات کا خیر مقدم کیا۔ لیکن آپ اس پر ضرور حیران ہونگے کہ پاکستان کے لیڈروں نے معاہدۂ صلح کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے لئے وہ لوگ کبھی تیار نہیں ہو سکتے جو ملک و ملت کے مفاد کو خود اپنی عقل سے سوچتے ہوں؛ بلکہ آنکھیں بند کرکے قربانیاں صرف وہی دے سکتے ہیں جو کسی "وحی" پر ایمان رکھتے ہوں۔

آئیے ذرا اس سیاسی اور تجارتی معاہدے کے چند پہلوؤں کا جائزہ بھی لیتے چلئے جس کی رُو سے پاکستان نے اپنے مفاد کی بڑی قربانی دی ہے۔

اس معاہدے کے لئے قُرب و یگانگت کی فضا بنانے کے لئے جو گفتگو انڈیا اور پاکستان کے وزرائے اعظم کے درمیان ہوئی اُس کا ایک موضوع یہ تھا کہ آیا پاکستان موجودہ جمہوریت پہ ایمان رکھتا ہے یا وہ دینی حکومت قائم کرنے کا عزم کر چکا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ موضوع کتنی دیر زیر بحث رہا اور اس پر کیا کچھ کہا اور سنا گیا' لیکن جانبین نے جو بیانات دئے ہیں اُن سے حقیقت حال کی کچھ وضاحت ہو جاتی ہے۔ جناب لیاقت نے پاکستان کی ریاستی نوعیت کے بارے میں صرف اتنا فرمایا کہ:۔

"ان لوگوں کی طرف سے جو اسلامی ریاست کا صحیح تصور نہیں رکھتے وقتاً فوقتاً کچھ اس طرح کے خدشات ظاہر کئے جاتے رہتے ہیں کہ یہ ریاست لازماً ایک دینی ریاست ہوگی اس کی پالیسی کی بنیادیں اس میں رہنے والی اقلیتوں کے لئے شہریت' مرتبہ اور حقوق کی مساوات کے اصولوں پر نہیں ہونگی .... حالانکہ ..... ہر اس شخص پر جس نے دستور یہ پاکستان کی پاس کردہ قرار دادِ مقاصد کا مطالعہ کیا ہے' یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ اسلامی ریاست کا دارومدار آزادی' مساوات اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو قبول کرکے انہیں بلا لحاظ مذہب و ملت تمام شہریوں کے لئے عام کر دینے اور اس کے ساتھ ساتھ اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے کلچر کی حفاظت کرنے پر ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ غلط خیال کلیتہً ختم ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان ایک ایسی دینی ریاست بننے والا ہے جس میں کسی طرح کا فرق و امتیاز کیا جائیگا"

مگر پنڈت نہرو نے ان اشارات کو اور زیادہ کھول دیا ہے۔ ملاحظہ ہو وہ بیان جو معاہدۂ دہلی کے متعلق پنڈت جی نے انڈین پارلیمنٹ میں دیا ہے:——

"لوگوں کے دلوں کا یہ شبہ کہ پاکستان کسی فرقہ پرستانہ نظریئے پر قائم ہو رہا ہے اور اس وجہ سے اس میں اقلیتوں کے لئے مساویانہ حقوقِ شہریت کا کوئی امکان نہیں' اس کی تردید وزیر اعظم پاکستان نے پورے زور سے کر دی ہے' اور مجھے یقین دلایا ہے کہ ان کی حکومت (پاکستان) جدید جمہوری ریاست کے تصور پر ایمان رکھتی ہے' اور جدید حالات میں اس کے سوا ریاست کے لئے کوئی دوسرا ڈھانچہ ہو ہی نہیں سکتا۔ وزیر اعظم پاکستان نے معاہدے میں یہ حقیقت پوری طرح صاف کر دی ہے کہ ان کی ریاست بالکل جدید جمہوری نظریات پر مبنی ہے۔"

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ قرار دادِ مقاصد پر بحث ہونے کے دوران کی تقاریر کو ملاحظہ فرمائیں اور ان میں خود وزیر اعظم صاحب کی تقریر کو بھی دیکھیں۔ ان تقاریر میں مغربی جمہوریت کے ناقص ہونے کا تذکرہ بھی ہے' ان میں ایک نئے نظامِ حکومت کے قیام کا دعویٰ بھی ہے' ان میں مذہب و سیاست کے ایک ہونے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ ان میں لادینیت (SECULARISM) کی تردید بھی

کی گئی ہے' ان میں نظام اجتماعی کے لئے اسلامی اخلاق اور حدود اللہ کی اہمیت پر بھی استدلال کیا گیا ہے' ان میں مساوات' جمہوریت عدل اور آزادی کے ان تصورات کو اختیار کرنے کا اعلان بھی ہے جو اسلام ——— کتاب و سنت ——— سے ملتے ہیں۔

قرارداد مقاصد اور اس کی تائیدی تقاریر کو ایک طرف رکھ کے جب آپ اوپر کے دونوں بیانات کو غور سے دیکھیں گے تو پھر اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے وزیر اعظم نے امن پسندی اور اقلیت نوازی کے جذبۂ پاکیزہ سے سرشار ہو کر کتنی بڑی قربانی پیش کرنے کی مثال قائم کی ہے۔

پھر آپ تجارتی معاہدہ کا جائزہ لیجئے۔ اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ہمارے اکابر کی امن پسندی نے بڑے بڑے ایثار کئے ہیں۔ مثلاً ———

جیوٹ کا سودا کئی بلندیوں سے نیچے گرنے کے بعد کیا گیا ہے۔ اس کے کچھ محرکات بھی تھے۔ ایک یہ کہ برطانیہ وغیرہ کی طرف سے جیوٹ اٹھانے میں دیر کی جا رہی تھی اور اس کو کارآمد اور معیاری حالت میں فروخت کرنے کا موسم گذرتا جا رہا تھا ——— (یہ انڈیا کی بالواسطہ حمایت ہو رہی تھی) ——— علاوہ بریں اُدھر سے جیوٹ کی قیمت گرانے کا مطالبہ بھی تھا۔ پھر مغربی ممالک ہندوستانی مشینوں سے تیار کی ہوئی جیوٹ لینے کے عادی تھے' لیکن اب پاکستان انہیں خام جیوٹ دینے پر مجبور تھا' یہ صورت حالات بھی فروخت کی مقدار کو کم ور کرنے کا موجب تھی۔ اس طرح پاکستان پر جیوٹ کے معاملے میں شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ علاوہ بریں جیوٹ کی ناجائز برآمد کو روکنے کی کوششیں بھی سو فیصدی کامیاب نہیں ہو سکیں' کیونکہ مشرقی پاکستان کے طویل سرحدی خطہ کے ہر انچ پہ نگرانی قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ انڈیا کی طرف سے کامل تجارتی بائیکاٹ کا دباؤ بھی بہت شدید ہو چلا تھا۔

اپریل سال گذشتہ میں جیوٹ (درجہ اوسط) کی قیمت ۳۰ روپے فی من تھی لیکن اب یہ ۲۰ تا ۲۴ روپیہ فی من کے حساب بیچا جا رہا ہے بروئے معاہدہ انڈیا سے یہ طے ہوا ہے کہ جیوٹ کو PACK کرنے اور اسے انڈیا پہنچانے کی ذمہ داری اور مصارف" فروشندہ کے سر ہونگے نہ کہ خریدار کے ذمے! فروشندہ مال کو روانہ کرتے وقت بھی تول کے دیگا اور پھر خریدار مقام وصولی پر اسے اگر دوبارہ تلوانا چاہے تو وہاں پھر وزن پورا کر کے دینے کی ذمہ داری فروشندہ ہی پر ہوگی۔

نمبر ۲ انڈیا کے متعلق - بروئے معاہدہ یہ بھی طے پایا ہے کہ قیمتوں کا لین دین ہندوستانی سکے کے ذریعہ ہوگا۔ اس فیصلے کی رُو سے انڈیا کے سکے کو وہی فوقیت حاصل ہو گئی ہے جو امریکہ کے ڈالر کو حاصل ہے۔ امریکہ جو کچھ خریدتا ہے' ڈالر سے خریدتا ہے اور جو کچھ بیچتا ہے' ڈالر ہی سے بیچتا ہے۔ ایک ملک کے سکے کو جب اس طرح کا اقتدار حاصل ہو جائے تو اس کی تجارت بھی زیادہ کامیاب رہتی ہے اور بعض مالیاتی امور میں بھی اسے برتری حاصل رہتی ہے۔ ہمارے ماہرین مالیات نے بین الملکتی تجارت میں اپنے سکے کو "آنریری" بنا کر جو غلطی کی ہے۔ اس کے نتائج آئندہ واقعات کی روشنی میں واضح ہونگے۔

پھر اس "آزاد تجارت" میں حکومت نے ادائیگیوں اور وصولیوں کی کوئی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا ہے اور یہ بات دونوں طرف کے تاجروں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ بطور خود جو انتظام چاہیں کر لیں۔ اب تک کوئی بنک اس پر تیار نہیں ہے کہ وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لے اور سر حد پر کچھ تبادلے باہمی سمجھوتے سے ہو رہے ہیں جو ہیں سکوں کا تبادلہ من مانی شرحوں سے کیا جا رہا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کا سکہ علی الترتیب ۱۰۰ : ۱۴۳ سے لے کر ۱۰۰ : ۱۱۰ کی شرح سے تبدیل ہو رہا ہے' بلکہ بسا اوقات تعاملاً بالکل برابر برابر پر بھی ہوا ہے۔

اس معاہدے نے پاکستانی سکے کی بحالیٔ قیمت کے فیصلے کی جڑ کاٹ دی ہے۔ آپ اپنے وزرا اور اکابر کے پرزور بیانات سے دھوکا دکھائے جو برابر ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ بحالیٔ قیمت کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی۔ حقیقت حال بالکل دوسری ہے۔ فرض کیجئے' آپ انڈیا سے کپڑا خریدتے ہیں' تو انڈیا کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ پاکستانی سکے کے لحاظ سے اس کے دام کیا بیٹھیں گے' وہ تو اپنے سکے کے حساب سے قیمت محسوب کرے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر وہ پاکستان سے کوئی مال خریدتا ہے تو اس میں بھی پاکستانی سکے کی مداخلت نہیں ہوگی' بلکہ اس کی قیمت بھی وہ اپنے سکے میں چکائے گا۔ آپ کا روپیہ ہندوستان کے روپے کے مقابلے میں اس کمی قیمت کا ہوتا ہے' معاملہ تو ہندوستان کے سکے کے لحاظ سے ہوتا ہے اور اس وجہ سے تمام معاملات میں ہندوستان اپنے مارکیٹ ریٹ کو ملحوظ رکھے گا۔

سکے کی بحالیٔ قیمت کے فیصلے کی رُو سے تو لازم آتا ہے کہ جو چیز ہندوستان میں ایک سو چالیس روپے کی ہو وہ پاکستان والوں کو ایک سو روپے میں ملے اور اسی طرح جو چیز پاکستان میں سو روپے کی بکتی ہے وہ ہندوستان میں ایک سو چالیس روپے کی قرار پائے۔ لیکن تازہ معاہدہ کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ سکے کی بحالیٔ قیمت کا فیصلہ ہمیں کتنا گراں پڑا ہے۔ اس فیصلے کے لئے ہم نے حسب ذیل قربانیاں دی ہیں:

ا۔ ہمارے اسٹرلنگ فاضلات کی قیمت گر جانے کی وجہ سے ہمارے مالیات کو ۵۰ ، ۶۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوا ہے۔

ب۔ برطانیہ اور برطانیہ کے جن تابع ملکوں نے پونڈ کے ساتھ ساتھ اپنے سکوں کی قدر گرا دی تھی' ان ممالک میں ہمارے جتنے حسابات جمع تھے ان سب کی قیمت بھی گر گئی ہے۔ ہمارے تجار پر اس نقصان کی چوٹ بہت سخت پڑی ہے۔

ج۔ ہمارے شہریوں کی جو پنشنیں اور دوسرے حسابات انڈیا کے ذمے تھے ان کی قیمت بھی گر گئی ہے۔ مثلاً کل جس پنشن خوار کو انڈیا کی طرف سے ۱۴۴ ہندوستانی روپے ملتے تھے وہ ان کے بدلے میں پاکستان کے ۱۴۴ ہی روپے حاصل کرتا تھا' لیکن اب وہ ۱۴۴ کے بدلے میں ۱۰۰ پاتا ہے۔ یہی حال دوسرے حسابات کا ہے۔

د۔ سکے کی قیمت بحال رکھنے کی وجہ سے ہمیں انڈیا سے جس تجارتی بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کی وجہ سے ایک کروڑ روپیہ روزانہ کی تجارت لمبے عرصے کے لئے بند رہی ہے۔ اس طرح تاجر منافع کی ایک بیش بہا مقدار سے محروم ہوئے ہیں۔ علاوہ بریں انڈیا اور پاکستان کے تجارتی تعلقات کے انقطاع کی وجہ سے ہمیں اپنی بہت سی ضروریات دور کے ممالک سے مہنگے داموں خریدنی پڑی ہیں اور اس طرح اپنی خام اجناس دور کے ممالک کو سستی دینی پڑی ہیں (کیونکہ ان پر مصارف حمل و نقل زیادہ ہوتے) اس میں ہمارے لئے بہت بڑا خسارہ تھا۔

س۔ وہ برآمدی اجناس جن میں سکے کی قیمت گرانے والے ممالک سے ہمارا مقابلہ ہو رہا تھا' ان میں ہمارے تاجر طبقے کو قیمتیں گرانے کی وجہ سے بیش بہا نقصان ہوا ہے۔ مثلاً سیالکوٹ میں جو لوگ کھیل کے سامان کا کاروبار کرتے تھے۔ ان میں سے بہت سوں کو دیوالیہ پن سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

ص۔ انڈیا اور پاکستان میں متروکہ جائدادوں کا مسئلہ بھی سکے کی بحالیٔ قیمت سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اب اگر پاکستان آنے والے مہاجرین میں سے کوئی اپنی جائداد انڈیا میں فروخت کرے تو وہ انڈیا سے روپے کی جتنی مقدار حاصل کرے گا' پاکستانی سکے اس کے مقابلے میں اسے کم ملیں گے۔ بخلاف اس کے ہندوستان جانے والے غیر مسلم تارکین وطن۔ اپنی پاکستانی جائدادوں کو اگر فروخت کریں گے

نہیں پاکستانی روپے کے بدلے میں ہندوستانی سکّے زیادہ مقدار میں ملیں گے۔ اب اگر دونوں حکومتیں مجموعی طور پر دونوں طرف کی جائدادوں کا تبادلہ کریں یا ان کی قیمت کا لین دین کرنا چاہیں تو اس تبادلے یا سودے میں جیت ہندوستان کی ہوگی اور ہمارے سر خسارہ اتنا آئے گا کہ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

سکّے کی بحالی قدر جس کے لئے اتنا کچھ کیا گیا تھا' ہندوستان سے تجارتی معاہدہ کرتے وقت اسے بالکل درکنار کر دیا گیا ہے یہ کیوں؟ اسلئے کہ اس کے بغیر تجارتی معاہدہ ہو ہی نہیں سکتا تھا' اور تجارتی معاہدے کے بغیر سیاسی تعلقات درست ہونے ممکن نہ تھے' اور ہندوستان سے سیاسی تعلقات درست نہ ہوتے تو "عالم بالا" سے باران رحمت کا انقطاع ہو جاتا۔ یہ مجبوری در مجبوری کا ایک چکر ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔

یہ معاہدہ جب منظر عام پر آیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمارے ایک رفیق نے پیشنگوئی کی کہ یہ معاملہ "مشترکہ دفاع" (JOINT DEFENCE) پر منتج ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس کے دو چار ہی روز بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے بیان میں دفاع کا مشترکہ نظم قائم کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ "درپردہ" کیا باتیں اس موضوع پر ہوئی ہیں' لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ یہ بڑی بات ہے۔ اگر حالات اسی رخ پر ارتقا کرتے رہے جس پر رہے ہیں تو آخر کار یہی ہوگا کہ دونوں ملکوں کے دفاعی نظم و نسق کی باگ ڈور کسی ایک ہاتھ میں ہوگی ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہاتھ "اینگلو امریکن" ہاتھ نہ ہوگا لیکن اس طرح کی کوئی صورت اگر نمودار ہو بھی تو کشمیر کا مسئلہ حل ہونے کے بعد ہوگی' جب کہ دو طرفہ فضا بالکل ہموار ہو جائے۔

جہاں تک آئندہ جنگ کے لئے باقاعدہ اڈّے قائم کرنے کا تعلق ہے' اینگلو امریکن بلاک اس وقت تک حسب ذیل کاروائیاں کامیابی سے سر انجام دے چکا ہے:----

ا- مغربی یورپ کے سرمایہ دار ممالک کا ایک مشترکہ فوجی جنرل اسٹاف قائم کیا گیا ہے اور اس کا مرکز فرانس میں جم چکا ہے۔

ب- سپین میں ہوائی اور بحری اڈّے حاصل کئے جا چکے ہیں۔

ج- روس پر ایٹم بم برسانے والے ۹۰ بھاری بمبار طیارے منتخب مواقع پر مامور کر دیے گئے ہیں۔

د- ترکی اور ایران میں فوجی اور ہوائی مستقر جما دیئے گئے ہیں۔

س- فلسطین' مصر' شرق اردن' حجاز وغیرہ میں پہلے ہی اس قسم کے مراکز موجود ہیں۔

ملہ پاکستانی روپے کی بحالی قدر کے فیصلے سے قدرتی طور پر ہماری خام اجناس کی قیمتیں بڑھتی ہیں۔ چنانچہ جیوٹ کے دام بھی مضاعف ہو جانے چاہئیں' لیکن برطانیہ زور ڈال رہا ہے کہ جیوٹ کی قیمتیں گرا دی جائیں اور ہمارے ہاں فی الوقت قیمتیں گرانے کا مسئلہ زیر غور ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ طاقتیں جو جہانی مارکیٹ پر تسلط رکھتی ہیں ان کے مقابلے میں ایک کمزور ملک اپنے فیصلے مشکل ہی سے منوا سکتا ہے۔ اب تک ہمارے ملک کے عوام کو مجموعی طور پر بحالی قدر کے فیصلے سے کوئی محسوس فوائد حاصل نہیں ہوئے' البتہ نقصانات سے اچھا اثر نمایاں طور پر ڈالا ہے۔

ہیں۔ امریکہ نے گذشتہ جنگ میں جو فوجی اڈے قائم کئے ہوئے تھے ان میں ۱۲ اڈے جو سوویٹ یونین کے خلاف جنگ لڑنے میں استعمال ہو سکتے ہیں، بدستور قائم رہنے دیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہمارے حکمرانوں کی طرف سے امریکیوں تعاون کی پیشکش نہ ہوتی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کا بیان ہے کہ حکومت پاکستان نے امریکہ کو اپنے ہوائی اڈوں کو بوقت ضرورت استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ علاوہ بریں برطانیہ کو کراچی کے قریب ایک ہوائی اڈہ مستقل طور پر دیا گیا ہے اور اس کو "ریجبل پوسٹ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ حقیقت بھی مخفی نہ رہنی چاہئے کہ ہمارے فوجی نظم و نسق میں انگریزی افسر پوری طرح دخیل ہیں۔

اینگلو امریکن بلاک کی پوری کوشش یہ ہے کہ آزادی و استقلال کو پسند کرنے والے اسلام پسند عناصر مسلم ممالک پر کے اقتدار پر قابض نہ ہو سکیں، بلکہ مسلم ممالک کے نظم و نسق کی باگیں فرنگیت مآب سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کے ہاتھوں میں رہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ پورا بلاک اپنا دباؤ ڈال کر حکومتوں کو "لادین" (SECULAR) جمہوریت کا پابند رکھنے پر بضد ہے نیز اسلام، اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بلاک کی طرف سے تعاون، حمایت اور امداد کی ہر شکل کی قیمت لادینی (SECULARISM) اور افرنگ زدگی ہے ہمارے پالیسی بنانے والے دماغ سفید بلاک کے اس تقاضے کو خوب سمجھتے ہیں اور اسے پورا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں دکھا رہے۔ تمام مناصب اور اختیارات افرنگ زدہ اور اسلام سے بُعد رکھنے والے طبقے میں تقسیم کئے جا رہے ہیں اور اسلام پسند عنصر کو کچلنے کی دوسری ناپاک کوششوں کے ساتھ ساتھ سیفٹی قوانین کو برابر استعمال کیا جا رہا ہے۔

ہمارے ملک کی خارجہ پالیسی ایک افرنگ پرست قادیانی کے ہاتھ میں ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کے پے در پے مطالبات کے باوجود اس صورتِ حالات میں تبدیلی نہیں پیدا کی جا رہی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے وزیر خارجہ برطانیہ کے خاص منظورِ نظر ہیں اور برطانوی پالیسی کے سانچے میں پاکستانی پالیسی کو ڈھالنے کے لئے پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ پس کسی کی مجال نہیں کہ ان کو ان کے منصب سے ہٹا سکے

ہمارے وزیر اعظم کا حالیہ دورۂ امریکہ بھی ہماری پالیسی کے تابع ہے۔ اس دورہ کا مقصد ادھر سے تو یہ ہے کہ "نظر عنایت" کے تحت جو اور مالیاتی اور اسلحاتی امداد حاصل کی جا سکے، اور اُدھر سے یہ ہے کہ پاکستان اپنے ہاتھ میں رہے۔ دونوں کام ہو رہے ہیں۔ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی!

پاکستان کی طرف سے یہ یقین دہانی ہو رہی ہے کہ ہم اس روشن دور میں "ملائزم" کے قائل نہیں ہیں، ہمارا اسلام تو بالکل وہی ہے جس پر امریکہ میں عمل ہو رہا ہے۔ ہم یہاں سے ترقی کا سبق سیکھنے آتے ہیں کہ کن اصولوں سے بڑی قومیں وجود میں آتی ہیں۔ پھر یہ کہ پاکستان اور امریکہ کا کلچر مشترک جڑیں رکھتا ہے۔ پھر یہ کہ ہم مسلم اور غیر مسلم میں مذہب کی بنیاد پر کوئی فرق کرنے والے نہیں ہیں پھر یہ کہ ہم اپنی عورتوں کو اسی تہذیب میں رنگ رہے ہیں جس میں امریکہ کی عورتیں رنگی ہیں ——— (بیگم صاحبہ تو اس دعوے کے زندہ ثبوت کے طور پر خود اپنا نمونہ پیش کر ہی رہی ہیں) پھر یہ یقین دلایا گیا کہ ہم ہندوستان سے جنگ نہیں کرنا چاہتے، بلکہ ہمارا میلان تو ہمیشہ دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی طرف رہا ہے۔

اُدھر امریکہ کی طرف سے وہ شمعیں، ضیافتیں اور شاہانہ استقبال ——— اس خوشی میں کہ ساری غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ پھر تقریروں اور بیانات میں یہ اعتراف کہ پاکستان تین ہی سال میں دنیا کا بہت بڑا ملک بن گیا ہے اور وزیر اعظم ایک بین الاقوامی سیاسی شخصیت کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ "ایجاب" جب وہ ہو تو "قبول" ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اگر کشمیر ہماری موجودہ خارجہ پالیسی کے اثرات سے مستثنیٰ رہ گیا تو یہ صورت ہمارے لئے قابل ذکر ہوگی، لیکن اگر کشمیر کے مسئلے کو بھی اسی خارجہ پالیسی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تو پھر نہ معلوم کیا ہوگا۔ ہمارے عوام چاہتے ہیں کہ کشمیر ایک وحدت کی حیثیت سے بذریعہ آزادانہ استصواب اپنی قسمت کا فیصلہ کرے اور وہ پاکستان سے کسی حالت میں الگ نہ ہونے پائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے جملہ اکابر بھی اس فیصلے کے ساتھ متفق ہیں، جیسا کہ انکی تقاریر اور بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک امریکہ و برطانیہ کا تعلق ہے، وہ کچھ اور سوچ رہے ہیں۔ در پردہ ان کی خواہش اس کے خلاف ہے کہ کشمیر ہمہ تن پاکستان کے ساتھ آجائے اور ہندوستان بالکلیہ محروم رہ جائے۔ وہ دونوں کو راضی رکھنا چاہتے۔ چنانچہ ان کے سامنے دو اسکیمیں ہو سکتی ہیں: ———

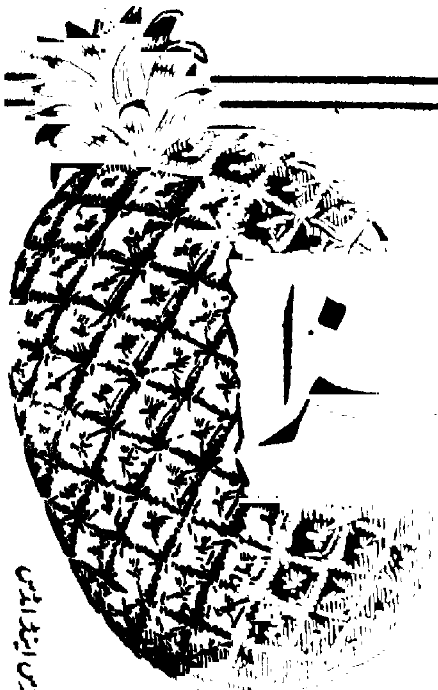
ایک یہ کہ کشمیر میں آزادانہ استصواب ہو تو سہی لیکن وہ تین صورتوں کے لئے ہو، پہلی صورت پاکستان میں شامل ہونے کی، دوسری ہندوستان سے الحاق کرنے کی اور تیسری آزاد اور منتقل ہو کے رہنے کی۔ اس قسم کے استصواب میں امریکہ و برطانیہ لازماً یہ چاہیں گے کہ کشمیر جداگانہ آزاد ریاست کی حیثیت اختیار کر لے اس پر ہندوستان اور پاکستان بھی مطمئن ہو جائیں گے اور اینگلو امریکن بلاک کو کشمیر میں اپنے مقاصد کے لئے مداخلت کرنے کے بھی وسیع تر مواقع حاصل ہونگے۔ اتفاق سے جداگانہ "آزاد کشمیر" کا نعرہ کشمیریوں میں بلند کرنے والے لوگ موجود ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں اور شاید اس طرح سے کشمیریوں کی دو تہائی قوتوں کا اتحاد بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت امریکہ و برطانیہ کے سامنے یہ ہو سکتی ہے کہ آزادانہ استصواب ہو تو ضرور لیکن کشمیر کے تین حلقوں کی رائے الگ الگ طلب کی جائے۔ ایک حلقہ جموں کا، دوسرا سرینگر کا اور تیسرا موجودہ آزاد کشمیر حکومت کا مقبوضہ علاقہ۔ اس طرح امریکہ و برطانیہ کے خیال میں جموں انڈیا سے ملحق ہونے کا فیصلہ کرے گا، پونچھ وغیرہ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہو جائیگا، اور سرینگر کا علاقہ شاید ایک آزاد ریاست قرار دیا جائے جس پر عین ممکن ہے کہ کچھ مدت کے لئے اقوام متحدہ کی نگرانی قائم کر دی جائے۔

ہمارے اکابر چونکہ عوام کے رجحانات کی شدت کو جانتے ہیں، اس لئے وہ ان دونوں صورتوں میں سے کسی کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس طرح ریڈ کلف ایوارڈ کے ذمہ دار کمیشن کو پیشگی لکھا دیا گیا تھا کہ وہ جو سرحدی خط بھی کھینچ دے گا اسے قبول کر لیا جائے گا۔ بالکل اسی طرح یہاں بھی ادارۂ اقوام متحدہ اور اس کے کمیشن اور اس کے مقرر کردہ نگران کے آئندہ فیصلوں کے بارے میں پیشگی قول دیا جا چکا ہے۔

بہرحال ہم اب جس خارجہ پالیسی کے چکر میں پھنس گئے ہیں، اس کے متعلق کوئی نہیں کہ سکتا کہ وہ کیا کیا گل کھلائے گی۔

اب اس خارجہ پالیسی کے چکر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ملک کی طرف سے نئے انتخابات جلد از جلد منعقد کرانے کا مطالبہ پوری قوت سے نمودار ہو اور پھر عوام کو ذہین اور ملت کے خیر خواہ عناصر کی طرف سے ایسی رہنمائی بہم پہنچائی جائے کہ ان کے ووٹوں سے ایسے نمائندے منتخب ہو کر اقتدار پر پہنچیں جن کے ذہن اسلام کے تابع ہوں، جن میں فکری آزادی برسر عمل ہو۔ جو ملت کو آزادی و استقلال کی راہ پر چلا سکیں اور غیر ملکی اثرات کی زنجیروں کو ایک جھٹکے سے توڑ دینے کی ہمت رکھتے ہوں۔ ورنہ ہم دنیا کی بڑی قوموں کے لئے قربانی کے بکرے بن کے رہ جائیں گے اور ہماری حیثیت وہی ہو گی جو آج عراق اور ایران جیسے ملک کی ہے۔



شربت روح افزا

کیا اس سے بھی بہتر کوئی افطاری ہو سکتی ہے؟

آپکے ہمدرد دواخانہ نے بنایا اور چالیس سال سے بنا رہا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

ابن انوار

یوپی کے ایک متوسط زمیندار گھرانے کا تصور کیجئے۔ تعلیم و تعلم سے بے بہرہ۔ زمین سے چمٹا ہوا کدال اور پھاوڑا جس کا اثاث البیت پٹواری، تحصیلدار اور تھانیدار جس کے خدایان مجازی۔ مقدمہ بازی اور جعل سازی سب کی طبقاتی خصوصیات۔ مولانا اصلاحی ضلع اعظم گڑھ کے اسی طرح کے ایک دیہاتی زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ عزت اور شہرت کے لحاظ سے اپنے علاقہ کا ایک نامور گھرانہ ——— لیکن علم و فضل سے بے گانہ۔ صرف دینی تعلیم کا کچھ چرچا۔ لیکن وہ بھی برائے نام۔ اور انتہائی بے روح۔ البتہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور قرآن سے ایک غائبانہ عشق اس خاندان کی خصوصیت ہے۔ عورت اور مرد یکساں جاہل اور آن پڑھ تھے۔ زمیندار کا یہ لڑکا جب پیدا ہوا تو اس کے دادا نے اس کے مستقبل کے متعلق اپنی جس عظیم خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ ضلع کچہری میں اس کو کوئی ملازمت مل جائے۔ لیکن بوڑھے دادا کی اس خواہش پر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ بوڑھے نے خواہش بھی کی تو اتنی معمولی۔ اور کیسے بے ذوق لوگ ہیں کہ جس کو مقام رشد و ہدایت پر فائز ہونا ہے۔ اس کو ضلع کچہری کے تیرہ و تاریک اور بوسیدہ نظام عدالت کی کرم خوردہ کرسی پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ جس پر بیٹھ کر ایک انسان اپنے ضمیر، انسانیت، شرافت اور غیرت کا سودا کرتا ہے اور ایک فاحشہ عورت کی طرح اپنے آپ کو بیچتا ہے۔

مولانا اصلاحی کا سن پیدائش غالباً ۱۹۰۶ ہے۔ ان کے والد محترم جو ماشاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں اور نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ ہیں نام مرتضیٰ احمد ہے۔ جو حافظ قرآن بھی ہیں۔ اور حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ مولانا اعظم گڑھ سے ۴ میل کے فاصلے پر دریائے ٹونس کے کنارے ایک گاؤں "بمہور" میں پیدا ہوئے۔

یہ گاؤں غدر ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا مرکز بھی رہ چکا ہے۔ اعظم گڑھ کے نواح میں انگریزی استبداد کو ختم کرنے کی جو منظم تحریک چلی تھی۔ یہ گاؤں اس تحریک کا قائد تھا۔ اور اس نے اپنی انگریز دشمنی کی روایات کو ہندوستان کی آزادی تک قائم رکھا۔ مولانا اصلاحی اس گاؤں کے سب سے بڑے زمیندار گھرانے کے ایک رکن ہیں۔ جو اب مذہبی اور تعلیمی لحاظ سے اپنے علاقہ کا سب سے با اثر گھرانہ ہے مولانا کی والدہ ایک ان پڑھ خاتون تھیں۔ انہوں نے بڑے لاڈ پیار میں اپنے اس ہونہار بچے کی تربیت کی۔ اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے کہ ان کی کوکھ میں ایک ایسے بچے نے پرورش پائی۔ جس سے آج اسلام کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ مولانا کے دو بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ جو عمر میں ان سے چھوٹے ہیں۔ جن میں شبیر احسن اصلاحی قابل ذکر ہیں۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔ ابھی وہ گاؤں کے اسکول میں زیر تعلیم ہی تھے کہ اعظم گڑھ کے ایک مشہور قصبہ سرائے میر میں مدرسۃ الاصلاح قائم ہوا۔ جس کے صدر مدرس مولانا شبلی متکلم مقرر ہوئے۔ جو مولانا کے ہم قریہ تھے۔ اور جو مولانا کے والد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے مولانا اصلاحی کے والد سے خواہش ظاہر کی کہ امین احسن نہایت ذہین بچہ ہے۔ اس کو میرے پاس مدرسۃ الاصلاح بھیج دیجئے۔ میں اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام اپنی نگرانی میں کر دوں گا۔ حافظ صاحب نے مولانا کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انہیں مدرسۃ الاصلاح میں داخل کر دیا۔ جہاں انہوں نے عربی [illegible] علوم کی تحصیل کی۔

مدرستہ الاصلاح

مولانا اصلاحی اور مدرستہ الاصلاح ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی سوانح حیات پر اس وقت تک تبصرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مدرستہ الاصلاح کے متعلق مختصر طور پر قارئین کو کچھ نہ بتایا جائے۔ مدرستہ الاصلاح کی بنیاد مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے رکھی تھی۔ علامہ مرحوم جب ندوۃ العلماء کے اصلاح احوال سے مایوس ہو گئے۔ اور انہیں یقین ہو گیا کہ رجعت پسند مولوی انکی روشن خیالی اور اصلاح نصاب کی تحریک کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ تو انہیں خیال ہوا کہ اب ایک ایسی درس گاہ قائم کرنا چاہیئے۔ جو ان کے تصورات کے عین مطابق ہو۔ چونکہ ان کو اپنے وطن سے بہت محبت تھی۔ اس لئے وہ اس درس گاہ کو ضلع اعظم گڑھ ہی میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس درس گاہ کے لئے انہوں نے "سرائے میر" کو منتخب کیا۔ اور یہیں مدرستہ الاصلاح کی بنیاد رکھی گئی۔ مولانا شبلی نعمانی اس مدرسہ کے اغراض ومقاصد کے متعلق اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ میں اس کو ضلع کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ایک مرکز کی حیثیت دینا چاہتا ہوں۔ اور میرا مقصد ایسے مبلغین کی تیاری ہے۔ جو مسلمانوں کو بتا سکیں کہ اسلام کیا ہے۔ مولانا شبلی کے فیض اور خلوص نے اثر کیا۔ اور مدرستہ الاصلاح نے وہ ترقی کہ ندوۃ العلماء اور دیوبند کے چراغ گل ہونے لگے۔ اور یہاں سے جدید وقدیم علوم کے ایسے ایسے عالم دین پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مولانا شبلی کی تمام روحانی یادگاروں میں مدرستہ الاصلاح ہی وہ واحد یادگار ہے۔ جس نے ان کے منشا کے مطابق عربی اور اعظم گڑھ کے عوام کی نہایت شاندار خدمات انجام دیں۔ ہزاروں گھروں میں خدا کے کلام اور اسلام کی تعلیمات کا چرچا کر دیا۔

مولانا اصلاحی نے اس مدرسے میں اسلامی علوم کی تحصیل کی۔ اور یہیں ان کی صلاحیتوں کو نشوونما پانے کا موقع ملا۔ اس مدرسے کا ماحول نہایت علمی اور سنجیدہ تھا۔ وقت کے روشن خیال علماء کا اجتماع تھا۔ زمین زرخیز تھی۔ صلاحیتیں وافر تھیں۔ اسی ماحول میں مولانا اصلاحی نے اپنی زندگی کے کچھ قیمتی سال بسر کئے۔ یہیں انہوں نے تحریر وتقریر کی مشق کی۔ ابھی وہ طالب علم ہی تھے کہ اخبار مدینہ ——— جو یوپی کا ایک نہایت بلند پایہ اخبار تھا ——— کی ادارت انہیں پیش کی گئی۔ اس وقت مولانا کی عمر بیس سال سے کم تھی۔ لیکن ان کی تحریر اور ان کے اسلوب میں بڑی پختگی تھی۔ وہ وقت کے مقبول انداز تحریر میں پوری طرح حاوی تھے جسے مولانا آزاد نے ایجاد کیا تھا۔ اور جس میں خطابت کا رنگ غالب ہوتا تھا۔ مولانا اصلاحی کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا یہ پہلا اعتراف تھا۔

مولانا چار سال تک مدینہ کے ایڈیٹر رہے۔ لیکن کام کی زیادتی نے ان کی صحت کا ستیاناس کر دیا۔ اور انہیں مجبوراً مدینہ کی ادارت سے استعفا دینا پڑا۔ اور وہ لکھنؤ چلے آئے۔ اور مشہور اخبار "الناظر" کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ جس میں ملک کے دو صاحب طرز ادیب پہلے سے موجود تھے یعنی مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ان دونوں بزرگوں کے ساتھ کام کرنے اور ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے مولانا کے فکر وقلم میں بڑی پختگی پیدا ہو گئی۔ تقریباً ایک سال کے بعد مولانا نے بعض وجوہ کی بنا پر "الناظر" کو بھی چھوڑ دیا اور گھر تشریف لائے۔

مولانا اصلاحی کے اساتذہ میں جن بزرگوں نے ان کی صلاحیتوں کو جلا دینے میں محنت کی۔ ان میں مولانا عبدالرحمان صاحب نگرامی ایک مشہور اور فاضل بزرگ تھے۔ جو اردو اور عربی کے ایک شگفتہ بیان ادیب اور مقرر تھے۔ مولانا اصلاحی فرمایا کرتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے میں حقیقی فائدہ انہیں مولانا نگرامی مرحوم ہی سے پہنچا۔ جو ایک شفیق اور محبت کرنے والے استاد تھے۔

الناظر کے بعد مولانا اصلاحی مشہور اہل حدیث عالم اور شارح ترمذی مولانا عبدالرحمان مبارکپوری سے حدیث کا درس لینے لگے مولانا عبدالرحمان مبارکپوری کا علم حدیث میں بڑا اونچا مرتبہ تھا۔ اپنے وقت میں ان سے بڑا کوئی محدث ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ دور دور سے شائقین حدیث نبوی ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ اور مولانا ان کے نزدیک ان کو رسول کا کلام پڑھاتے تھے۔ مولانا اصلاحی کے والد سے مولانا مبارکپوری کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ یہی تعلق مولانا اصلاحی کو مولانا کی خدمت

میں سلسلہ گیا۔ وہاں انہوں نے حدیث کی تدریس کی۔ مولانا مبارک پوری سے حدیث کی تعلیم کے دوران میں انہیں اطلاع ملی کہ مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی حیدرآباد کے مدرسۃ العلوم (حال عثمانیہ یونیورسٹی) کی پرنسپلی سے استعفا دے کر اپنے وطن مالوف پھریا واپس تشریف لے آ رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کو قرآن سے چونکہ عشق تھا۔ اس لئے وہ حدیث کا درس مکمل کئے بغیر مولانا فراہی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ اور ایسے حاضر ہوئے کہ مولانا کی وفات تک دن رات کے خادم رہے

مولانا فراہی

مولانا حمید الدین فراہی برعظیم ہند کے اسلامی اور جدید علوم کے ایک نہایت حکیم اور فاضل بزرگ گذرے ہیں۔ خاص کر قرآنی علوم میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں ان سے بڑا قرآن کا مفسر نہیں پیدا ہوا۔ وہ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی اور لاطینی زبانوں کے لکھنے پڑھنے پر ماہرانہ قادر تھے۔ مولانا فراہی مولانا شبلی نعمانی کے پھوپھی زاد بھائی اور ان کے شاگرد بھی تھے مولانا شبلی ان کی قابلیت اور لیاقت کے نہ صرف معترف بلکہ مداح تھے۔ مولانا فراہی کے اساتذہ میں مولانا شبلی، شارح حماسہ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا فاروق چریا کوٹی، جیسے فاضل بزرگ اور عالم دین شامل تھے، مولانا فراہی علی گڑھ میں زیر تعلیم ہی تھے کہ سرسید کی نگاہ مردم شناس نے تاڑ لیا کہ یہ نہایت صاحب صلاحیت انسان ہیں، چنانچہ مرحوم سرسید نے مولانا شبلی کی معرفت خواہش ظاہر کی کہ مولانا حمید الدین ان کی تفسیر کا عربی میں ترجمہ کر دیں۔ جب مولانا شبلی نے اس کا ذکر ان سے کیا تو فرمایا کہ "میں سرسید کی گمراہ کن تفسیر کا عربی میں ترجمہ کرنا تعاون علی الاثم سمجھتا ہوں۔ سرسید کو مجھ سے ایسی توقع نہ رکھنی چاہئے روایت ہے کہ سرسید کو اس جواب سے بہت صدمہ پہنچا۔ اور مرتے دم تک انہوں نے حمید الدین کو معاف نہیں کیا۔

مولانا نے قرآن کے علوم و تفسیر پر متعدد کتابیں عربی میں تصنیف فرمائی ہیں۔ کچھ سورتوں کی تفسیریں بھی لکھی ہیں۔ یہ زیادہ تر کتابیں قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں پر ہیں۔ مولانا فراہی کو قدرت نے کلام الٰہی کے اسرار و رموز تک پہنچنے کا جو خاص ملکہ ودیعت فرمایا تھا۔ اس کا اعتراف اس عہد کے تمام سنجیدہ بزرگ کرتے ہیں۔ مولانا اصلاحی انہیں مولانا فراہی کے خاص الخاص شاگرد ہیں۔

مولانا اصلاحی نے مولانا فراہی کی بیشتر عربی تفسیروں کو اردو میں منتقل کیا۔ اور ان کی عربی تصانیف کو ایڈٹ کیا مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا فراہی کی وفات پر معارف میں جو اشارات لکھے ہیں۔ ان میں فرماتے ہیں کہ مولانا حمید الدین نے علم و فضل اور قرآن حکیم کے جواہر و اسرار چھوڑے ہیں۔ ان کے حامل ان کے دو شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی ہیں۔

مولانا فراہی کے انتقال کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی مستقل طور پر مدرسۃ الاصلاح میں قیام کرنے لگے اور منتہی طلبا کو قرآن حکیم کا درس دیتے۔ اور بقیہ اوقات میں مولانا فراہی کے مسودات کی تبییض اور ان کو ایڈٹ کرتے۔ نیز ان کی شائع شدہ عربی مطبوعات کو اردو کا جامہ پہناتے۔ مولانا فراہی کی تصانیف کو جس حزم و احتیاط کے ساتھ مولانا اصلاحی نے اپنے رفیق کار مولانا اختر احسن کی امداد سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ وہ ان کا شاندار تفسیری کارنامہ ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کتابوں نے قرآن پر غور و فکر کے طریقے بدل دیئے۔ اور ہزاروں تشنگان قرآن نے ان تفسیری کتابچوں (   ) سے قرآن فہمی کے اصول اور راستے سیکھے۔

مدرسۃ الاصلاح پہلا تعلیمی ادارہ تھا۔ جو صرف عربی علوم کی تحصیل کے لئے نہیں قائم کیا گیا تھا اس کے پیش نظر یہ عظیم مقصد تھا کہ برعظیم ہند میں ایک ایسا اسلامی انقلاب برپا ہو جو اس ملک کی حالت بدل دے۔ چنانچہ عربی مدارس میں یہ پہلا مدرسہ تھا جس نے قرآن کو زندگی کے ایک منظم پروگرام کی حیثیت میں پیش کیا۔ اور دنیا کو بتایا کہ عربی علوم کی تحصیل کا مقصد مسجدوں کے لئے امام تیار نہیں کرنا ہے۔ بلکہ ایسے افراد کی تربیت کرنا ہے۔ جو اسلامی انقلاب کی قیادت کر سکیں۔ اس عظیم مقصد کے پیش نظر مروجہ تعلیمی اور تدریسی نظام میں تبدیلیاں پیدا کی گئیں۔ اور اس جمود و دستور سازی کو ختم کیا گیا جو کئی سو سالوں سے عربی مدارس کی خصوصیات میں داخل تھیں۔ مدرسۃ الاصلاح کے طلباء کے سامنے قرآن

امر کی شکل میں پیش کیا گیا کہ وہ اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لئے اس سے پروگرام حاصل کریں۔ انہیں معلوم ہو کہ قرآن انسانی زندگی کی تبدیلیوں کا تقاضا کن اصولوں پر کرتا ہے وہ تمدن اور سیاست کی گاڑی کس طرح چلانے کا حکم دیتا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کا پیغام تھا کہ مسلمانان ہند اپنی اپنی زندگی پر نظر ثانی کریں۔ اور اس انقلاب کو برپا کریں جو اس ملک کی اجتماعی زندگی میں اسلام کے نقوش کو اجاگر کر دے۔ مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی یہی خواہش تھی۔ اور وہ اپنے دل کی اس مقدس آرزو کو لے کر اپنے خدا کے پاس پہنچ گئے گو ان کی اس خواہش نے ان کے زمانے میں عملی صورت نہیں اختیار کی۔ لیکن چونکہ خدا کو اپنے اس نیک بندے کی خواہش منظور تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں تحریک اسلامی کا قیام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی لیڈرشپ میں عمل آیا۔ اور "اصلاحیوں" نے اس منظم اسلامی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور آج خدا کے فضل سے پورا مدرسۃ الاصلاح تحریک اسلامی ہند کے ڈسپوزل پر ہے۔ اور یہ واضح رہے کہ حضرت مولانا مودودی بھی مولانا فراہی کے شاگرد ہیں انہوں نے حیدر آباد میں مولانا سے عربی کے اسباق پڑھے ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح مولانا اصلاحی کی رہنمائی میں ایک مدت تک قرآن اور اسلام کی خدمت کرتا رہا یہاں تک مولانا ۱۹۴۲ء میں تحریک اسلامی کے مرکز دار الاسلام پٹھان کوٹ منتقل ہو گئے۔ اور جب تحریک اسلامی تقسیم ملک کے بعد دو جداگانہ حصوں میں تقسیم ہو گئی تو مولانا پاکستان کے حصے میں آگئے۔ اور آج تک پاکستان میں ہیں۔

الاصلاح

مولانا اصلاحی نے اسلامی افکار و نظریات اور مولانا فراہی کی قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ۱۹۳۶ء میں "الاصلاح" نام کا ایک ماہوار رسالہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے نکالا۔ جو ۱۹۳۹ء تک نکلتا رہا۔ یہ رسالہ اپنے وقت کے موقر رسالوں میں تھا اور اسلامی فکر کی اشاعت میں اس نے بہت نمایاں حصہ ادا کیا ہے۔ یہی دور تھا جب حیدر آباد سے مولانا مودودی ایدہ اللہ بنصرہ اپنے رسالہ ترجمان القرآن کے ذریعہ برعظیم ہند سے اس تاریکی کو دور کرنے کی جدوجہد فرما رہے تھے۔ جو مختلف سیاسی تحریکوں، مذہبی گروہوں اور مغربی تہذیب و تمدن کے علمبرداروں نے مسلمانوں پر مسلط کر دی تھی۔ مولانا مودودی بیک وقت ان تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی فتنوں سے نبرد آزما تھے۔ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیات کو کفر اور لادینی کے ذریعہ پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ وقت بڑا نازک تھا۔ کانگریس کی متحدہ قومیت مسلمان نوجوانوں کو کفر کی طرف دھکیل رہی تھی۔ وطن کے نام پر اسلام کو قربان کیا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے علماء اسلام کی قربانی میں ہندو قوم پرستی کے ممد و معاون تھے دوسری طرف عقلیت اور سوشلزم کی نام نہاد تحریک مسلمانوں کو بے دین بنانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اور مسلمانوں کو تعلیم دے رہی تھی کہ اسلام آج کی متمدن زندگی کا مذہب نہیں ہو سکتا۔ سائنس نے مذہب کے بطلان کو ثابت کر دیا ہے۔ تیسری طرف مسلم معاشرت میں تبدیلیوں کے خواہش مسلمان عورتوں کو بتا رہے تھے کہ وہ پردہ اور حجاب کی "لعنت" ترک کر دیں۔ اور یورپی عورتوں کی طرح آزادانہ زندگی بسر کریں۔ چوتھی طرف اسلام کے دشمن دین کی راہ سے مسلمانوں کو تعلیم دے رہے تھے کہ وہ حدیث کا انکار کر دیں۔ کیونکہ رسول کی زندگی اور اس کے اقوال سند نہیں ہیں۔ حدیث کا موجودہ ذخیرہ محض گھڑت ہے۔ مولانا مودودی بیک وقت ان تمام فتنوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ دوران مفاسد کے استیصال میں مولانا اصلاحی کا الاصلاح ان کا معاون تھا۔ ترجمان القرآن نے الحاد اور لادینیت کے سیلاب پر جس پامردی اور اسلامی بصیرت سے بند باندھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ اس کی اتنی بڑی اسلامی خدمت ہے کہ پوری ملت اسلامیہ اس کی مشکور ہے۔ ہزاروں نوجوانوں کو گمراہ ہونے سے بچانے کا سہرا ترجمان القرآن کے سر ہے۔ اور اسلامی ہند کی جب دینی تاریخ لکھی جائیگی تو ایک مستقل باب ترجمان القرآن کے لئے مخصوص ہوگا۔ اور آج "اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے" کی جو آواز ہم کو ہر گلی کوچے میں بلند ہوتی نظر آ رہی ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو ۱۹۳۳ء میں مولانا مودودی نے لگائی تھی اور اس وقت محض چند انسان تھے جو اس آواز کے متفق تھے۔ مولانا اصلاحی انہیں لوگوں میں ہیں۔

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کا اختلاف

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ایک زمانہ میں ایک بڑا نزاعی مسئلہ رہا ہے

اختلافات ختم ہوگیا تھا اور یہ اختلاف ایک غلط فہمی پر مبنی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ جب سیاسی کشمکش اور مسلمانانِ ہند لکھ رہے تھے۔ اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس کے معاشی سیاسی اور عمرانی نظریات پر سخت نکتہ چینی کر رہے تھے۔ تو مولانا اصلاحی کو شبہ پیدا ہوا کہ مولانا مودودی وطنی نیشلزم اور متحدہ قومیت کے تو مخالف ہیں۔ لیکن مسلم قوم پرستی کے حامی ہیں۔ اور وہ مسلمانوں کا کیس اصولی نقطہ نظر سے نہیں بلکہ قومی یا لادینی کے پیش نظر لڑ رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا کہنا یہ تھا کہ جس طرح وطنی نیشلزم مردود ہے۔ بعینہٖ اسی طرح مسلم قوم پرستی بھی ایک غیر اسلامی نقطہ نظر ہے۔ اس لئے ہمیں صرف اس اصولی قومیت کی حمایت کرنا چاہئے۔ جس پر ہماری ملت کی شیرازہ بندی کا دارومدار ہے۔ مولانا اصلاحی کا خیال تھا کہ جس طرح ایک وطن کو ہم بُت نہیں بنا سکتے۔ اس طرح اس قومیت کو بھی بُت نہیں بنا سکتے کہ ہر مسلمان گھر میں پیدا ہونے والا مسلمان ہے۔ چاہے اس کے سیاسی معاشی اور عمرانی عقائد اعلانیہ اسلام کے مخالف ہوں۔ مولانا مودودی فرما رہے تھے کہ میں ایک ترتیب سے چل رہا ہوں اور یکے بعد دیگرے حسب مراتب تمام جاہلیتوں کو زیر بحث لاؤں گا۔ چنانچہ مولانا نے اسی ترتیب سے مسلمان اور سیاسی کشمکش کے تینوں حصے لکھے۔ پہلے حصے میں جمعیۃ علماء پر دوسرے حصے میں کانگریس پر تیسرے حصے میں مسلم لیگ پر تنقید کی گئی۔ اور جب اصلاحی صاحب کو یقین ہوگیا کہ مودودی صاحب مسلم قوم پرستی کے حامی نہیں ہیں تو ان کے مابین اختلافات ختم ہوگئے۔ اور ایک وقت آیا کہ جب مولانا مودودی نے تحریک اسلامی کے لئے اپنے دوستوں کو پکارا تو مولانا اصلاحی السابقون الاولون میں تھے۔ اور آج تک اس تحریک کے ساتھ ہیں۔

مولانا کے نظریات

مولانا اصلاحی تحریک اسلامی کے قیام سے پہلے بھی اسلام ہی کے ذریعہ مسلمانوں کی سربلندی چاہتے تھے۔ اور وہ انگریز کے اخراج کے لئے ہندو مسلم تعاون کے قائل تھے۔ لیکن اس مقصد کے لئے خود اسلام کی قربانی دینا انہیں کبھی گوارا نہیں تھا۔ انہیں ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کے افکار و نظریات سے ہمیشہ اختلاف رہا۔ وہ متحدہ قومیت کے کبھی حامی نہیں رہے۔ اور نہ انہیں مسلم قوم پرستی نے کبھی اپیل کیا۔ وہ مسلمانوں کو صرف اس معنیٰ میں ایک قوم کہتے تھے کہ جو شخص اسلام کو بحیثیت نظریہ زندگی کے تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کا ایک رکن ہے۔ وہ اسلامی اصولوں میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ صوبہ بہار کے ایک مشہور و معروف قصبہ میں حضور نبی کریم کی سیرت کا ایک جلسہ تھا۔ اور جس کی صدارت بھارت کے موجودہ صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد فرما رہے تھے اور اس جلسے میں تقریر کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے بڑے بڑے لیڈر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں کانگریس کے نظریہ متحدہ قومیت کی تبلیغ شروع کردی۔ اور قرآن سے ثابت کرنے لگے کہ اسلام پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ ہر مذہب سچا ہے۔ کسی ایک نبی پر ایمان لانا کافی ہے۔ مولانا اصلاحی نے اس بھرے مجمع میں ڈاکٹر صاحب کی تردید کردی۔ اور نہایت سخت الفاظ میں فرمایا کہ اسلام کے نزدیک وہ کافر اور مشرک ہیں۔ جو اسلام پر اور خدا کے آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ پر ایمان نہیں لاتے۔ اور ان کو ہم ایک جداگانہ قوم سمجھتے ہیں۔ جو عقائد اور نظریات میں اسلامی اصولوں کو نہیں تسلیم کرتے۔

موجودہ وقت میں تمام مذاہب کی سچائی کا فتنہ درحقیقت مولانا آزاد کا پیدا کردہ ہے۔ جنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اشتراک کی خاطر قرآن کے ایک بنیادی اصول میں تحریف کی۔ . . . ہم مولانا آزاد کی علمی اور ذہنی برتری کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود اسے ایک کھلی ہوئی گمراہی تصور کرتے ہیں۔ اور ان کی اس جسارت کو تحریف دین گردانتے ہیں۔

اس طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے کہ جس زمانے میں بھارت کے سابق گورنر جنرل راج گوپال اچاریہ کانگریس کے جنرل سکریٹری تھے انہوں نے اپنے ایک بیان میں کہہ دیا کہ جو لوگ گاندھی جی کے مابعد الطبیعاتی سیاسی اور معاشرتی نظریات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ذہنی

کانگریسی ہیں اور نہ ان کے لئے کانگریس میں کوئی جگہ ہے۔ اس بیان کے خلاف سب سے پہلی آواز مولانا اصلاحی نے بلند کی۔ مولانا نے ان تمام مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی جو کانگریس میں اس لئے شامل تھے کہ انگریزی استبداد کو ہندوستان سے نکال باہر کریں۔ انہوں نے علماء کو للکارا کہ جنرل سیکرٹری کے اس بیان کے بعد ان کی پوزیشن کیا ہے۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ راج گوپال اچاریہ کو اپنا بیان واپس لینا پڑا۔ اور کانگریس ہائی کمان نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کا گاندھی جی پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔

مولانا اصلاحی کا فکر ہمیشہ سے سلجھا ہوا تھا۔ اور صحتِ فکر کی یہ نعمت انہیں مولانا فراہی سے حاصل ہوئی۔ مولانا فراہی ان علمائے دین میں تھے۔ جو مسلمانوں کی اجتماعی تنظیم اسلامی اصولوں کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے انہوں نے مولانا محمد علی، مولانا آزاد اور حکیم اجمل خاں مرحوم — یہ تینوں مولانا حمید الدین کے بڑے مداح اور معتقد تھے۔ کو متعدد مرتبہ دعوت دی کہ یہ لوگ مسلمانوں کو خالص اسلامی اصولوں پر منظم کریں۔ لیکن روایت ہے کہ ان تینوں لیڈروں نے راہ کی مشکلات کا رونا رو کر مولانا فراہی کی بات ٹال دی اور حسبِ دستور مسلمانوں کو وطنی اور قومی تحریکوں میں گھسیٹے رکھا۔ مولانا محمد علی اپنے آخری ایام میں اس بات پر آمادہ ہوگئے تھے۔ لیکن موت نے ان کے رشتۂ حیات کا خاتمہ کر دیا۔ اور وہ بھی یہ خواہش لے کر جوارِ رحمت میں پہنچ گئے

مطالعہ اور طرزِ تحریر

مولانا اصلاحی جدید و قدیم علوم کے مجمع البحرین ہیں۔ ان کا مطالعہ اور ان کی تحقیقات نہایت ٹھوس ہیں مولانا اُردو کے ایک انشاء پرداز اور شگفتہ بیان ادیب اور مقرر ہیں۔ ان کی تحریروں میں رس، زندگی، بانکپن اور تشبیہات کا بڑا اچھوتا امتزاج ملتا ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی تحریروں میں خطابت کا رنگ غالب ہے۔ وہ بائبل کے انداز میں بھی خوب لکھتے ہیں۔ مولانا اصلاحی نے ۱۸ برس کی عمر سے باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔ راقم الحروف نے ان کے بچپن کی بعض تحریریں دیکھی ہیں۔ جن میں ادب اور انشاء کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ ادب پر بھی بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے میں اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اتنا ضرور مانتا ہوں کہ پختگی ادب، عمر کی پختگی کا ردِ عمل ہے۔ لیکن انشاء اور شادابی ہر دور میں ادیب کے ساتھ ہوتی ہے۔ مولانا اصلاحی گو تحریک کے تقاضوں کے مطابق لکھتے ہیں۔ اور ان کے ادب کا مزاج پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن پھر بھی ان کی تحریر کی جو خصوصیت پہلے دن تھی۔ وہ آج بھی باقی ہے۔ یعنی پختگی اور شادابی۔ انشاء اور ادب لطیف کا امتزاج۔ چونکہ اس وقت میرے سامنے وہ تحریریں نہیں ہیں۔ اس لئے میں انہیں نقل نہیں کر سکتا۔ انشاءاللہ پھر کبھی انہیں پیش کیا جائیگا۔

مولانا زندگی کے ہر معاملہ میں جس طرح انتہائی ستھرے انسان ہیں۔ اس طرح مطالعہ میں بھی وہ اول درجے سے نیچے نہیں اُترتے۔ وہ مطالعہ کے بہت شوقین ہیں۔ لیکن منتخب کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ مصنفین میں علامہ ابن تیمیہؒ حافظ ابن قیمؒ حضرت شاہ ولی اللہؒ مولانا حمید الدین فراہی اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ قابلِ ذکر ہیں۔ یوں تو تاریخ اسلام کے اکثر و بیشتر فلاسفہ، متکلمین، مورخین اور ادیبوں کو مولانا نے اچھی طرح کھنگالا ہے۔ لیکن مذکورہ بالا متکلمین اسلام سے ان کی دلچسپی اس لئے زیادہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے بحیثیت ایک نظامِ حیات کے پیش کیا۔ اور یونانی اور ایرانی افکار سے آزاد ہو کر اسلام پر سوچا۔ مغربی مفکرین میں انہیں بیج جی ویلز، جوڈ، برٹرینڈ رسل، ٹالسٹائی، جلنجل اور ہیگل بہت پسند ہیں۔

مولانا کے تراجم اور تصانیف

مولانا کی سب سے پہلی کتاب ایک عربی ناول کا ترجمہ "ہندوستانی جاسوس" ہے۔ جس میں ایک ہندوستانی جاسوس کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ جو مرحوم مصطفےٰ کمال پاشا کو قتل کرنے کی غرض سے ترکیہ گیا تھا۔ اس ناول کا ترجمہ نہایت سلیس اور زبان نہایت شگفتہ ہے۔ اخبار مدینہ بجنور کے کتبہ سے اب تک یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ محی الدین نحیاط کی تاریخ اسلام کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو تین جلدوں پر مشتمل ہے یہ

کتاب بھی مدینہ سے شائع ہو رہی ہے۔ مولانا اصلاحی نے مولانا فراہی کی اکثر عربی تفاسیر کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جو تعداد میں دس بارہ ہیں۔ مولانا نے علمی اور تحقیقی مضامین بہت کثرت سے لکھے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ شائع نہیں ہو سکے ہیں۔ ان کی اور مجمل تصانیف میں حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، نماز کی حقیقت، اور اسلامی ریاست ہیں۔ اس کے علاوہ حقیقت تبلیغ پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے۔

حقیقت شرک

حقیقت شرک مولانا کی پہلی تصنیف ہے۔ جس میں شرک کا فلسفہ، اس کے اقسام، تمدن پر اس کے اثرات، شرک کی تباہ کاریاں، شرک خفی و جلی، جدید نظریات زندگی میں شرک کا ظہور، غرضیکہ شرک کے موضوع پر یہ ایک جامع کتاب ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ شرک صرف ایک اعتقادی فساد کا نام نہیں ہے۔ اور نہ صرف بت پرستی شرک ہے، بلکہ ہر وہ نظام زندگی مشرکانہ ہے جس میں خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور عقیدہ آخرت کے اصول تسلیم نہ کئے گئے ہوں۔ تمدن میں، سیاست میں۔ معیشت میں اور معاشرت میں آج بگاڑ اور فساد کی جو قوتیں ظہور کر رہی ہیں۔ ان کا سرچشمہ درحقیقت یہ عقیدہ ہے کہ تمدنی نظام میں انسان کو خود ضابطہ اور قانون بنانے کا حق ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو غیر الٰہی نظام سیاست و تمدن کی اطاعت پر راضی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انہیں اس عقیدے کے باوجود شرک میں دھکیل رہے ہیں کہ خدا ہی ہمارا معبود حاکم اور قانون ساز ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں ان صوفیانہ گمراہیوں کو بھی شرک قرار دیا ہے۔ جو وحدۃ الوجود۔ اشراقیت، رواقیت اور تصور شیخ کے مختلف ناموں سے مسلمانوں کے اندر پائے جاتے ہیں۔

حقیقت توحید

مولانا کی دوسری تصنیف توحید ہے، جس میں الٰہی نظام تمدن کے اصول بتائے گئے ہیں۔ جو خدا کی حاکمیت پر قائم ہوتا ہے۔ مولانا نے بتایا ہے کہ عقیدۂ توحید مجرد عقیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اثر پورے نظام تمدن پر پڑتا ہے۔ افراد کو ایک خدا کا تصور اس دنیا میں جواب دہی اور پابندی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے اندر یہ خوف پیدا کرتا ہے کہ اسے اپنے اعمال کا بدلہ خدا کے یہاں سخت عذاب کی صورت میں ملے گا۔ اور بھلے افعال پر وہ انعام کا مستحق ٹھہرایا جائے گا اسی طرح ایک سوسائٹی میں خدا پرستی کا جذبہ ہی اسے انصاف اور عدل کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تمدن میں عقیدہ توحید ہی جفا کاری، بدحیائی، فساد انگیزی، ظلم و جور اور چیرہ دستی کو ختم کر کے تعاون، نیکی، خدمت، خدا پرستی، نیک چلنی، انصاف کے داعیات پیدا کرتا ہے۔ اور انسانی سوسائٹی انسانوں کی حاکمیت سے نجات پا کر خدا کی حاکمیت اور صالح بندوں کی قیادت میں اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرتی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر خوب ہے۔

حقیقتِ تقویٰ۔ تقویٰ کا مفہوم کیا ہے؟ لمبی لمبی نمازیں، متعدد قسم کے اوراد و وظائف، اور اس کے ساتھ ساتھ طاغوت اور کفر کی خدمت؟ مولانا نے بتایا ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ ایک انسان اور سوسائٹی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کے حکم اور رسول کے اسوۂ حسنہ پر چلے۔ ہر وہ انسان متقی ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی اطاعت کا پابند ہو۔ یہ تقویٰ نہیں ہے کہ لمبی لمبی نمازوں کے ساتھ سود کا کاروبار بھی جاری ہے۔ وظائف کے ساتھ انگریزی کی نوکری بھی کی جا رہی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ لمبی لمبی نمازیں اور اشراق کے ورد کرنے والا متقی نہیں ہے۔ بلکہ متقی وہ ہے جس کی پوری زندگی خدا کی اطاعت کی مظہر ہو۔

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کیا ہے؟ اس کے اصول و مبادی، اس کے اندر شہریوں کے حقوق و فرائض، اس کے مالی وسائل، اس میں ذمیوں کا مقام، عورتوں کے حقوق، غرضیکہ ایک ریاست کے تمام اجتماعی مسائل پر بحث کی گئی ہے اس کتاب کے بارہ ابواب ہیں۔ جن میں سے تین اب تک شائع ہوئے ہیں، یہ کتاب نہایت مدلل اور تحقیقی ہے۔ جس میں اسلامی فکر

کے رسوخ اور تاریخ اسلام کے استفادہ کا نچوڑ موجود ہے۔ مولانا کی یہ کتاب اسلامی نظام سیاست پر اب تک شائع شدہ سارے مواد پر بھاری ہے۔ اس کتاب کی مکمل اشاعت کے بعد ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اور عالم اسلام کا ذہین عنصر اسلامی ریاست کے ایک منظم اور مکمل نظام سیاست و تمدن ہونے کی حیثیت میں پوری طرح مطمئن ہو جائیگا۔ یہ کتاب موجودہ حالات میں ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے اور آئندہ پاکستان جب صحیح اسلامی ریاست بنے گا تو یہ کتاب اس کی رہنمائی کرے گی۔ بلکہ اس کا اساسی دستور ثابت ہوگی۔

اوصاف وعادات

مولانا اصلاحی کے قدموں میں راقم الحروف کو کچھ دن رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میرے سامنے ان کی ظاہر اور باہر کی پوری زندگی ہے۔ ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے اشتہار کو وہ بھی ناپسند کریں گے۔ اور مجھے خود یہ بات پسند نہیں ہے۔ اور یوں بھی اس کا تعلق عوام سے نہیں بلکہ خدا سے ہے، لیکن ان کی بعض خوبیاں ایسی ہیں۔ جن کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اوصاف پر بہرحال مجھے کچھ لکھنا ہے۔ مولانا فطرتاً ایک قناعت پسند انسان ہیں۔ ان کے استغنا کا یہ عالم ہے کہ دُنیا ان کے پیچھے پھرتی ہے۔ لیکن وہ کبھی اس کے پیچھے نہیں پھرے۔ اور نہ دنیا انہیں کبھی باطل کے ساتھ مصالحت پر راضی کر سکی۔ ان کی زندگی میں شدید عسرت آئی۔ لیکن یہ عسرت انہیں سیم وزر کا بندہ نہیں بنا سکی۔ وہ بھی چاہتے تو طاغوت کی خدمت کر سکتے تھے۔ اور اس سے آخرت میں آگ اور دنیا میں آرام فراہم کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی پوری زندگی میں کہیں کوئی ایک واقعہ بھی اس قسم کا نہیں ملتا کہ انہوں نے باطل کی خدمت کر کے اپنے لئے ایک وقت کا نوالہ بھی حاصل کیا ہو۔ میرے خیال میں ایک انسان کی خدا پرستی کا اصلی امتحان اس وقت ہوتا ہے۔ جب وہ مصیبتوں میں خدا کی اطاعت پر قائم رہے۔ مولانا اصلاحی کی تاریخ اس معاملہ میں بے داغ ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت حق گوئی ہے۔ وہ کھری بات کہنے میں مشہور ہیں۔ اور لپیٹ کر بات کرنی انہیں نہیں آتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض کم فہم لوگ انہیں غیر خوش مزاج کہتے ہیں۔ حالانکہ ایک سچے مسلمان کی خوبی یہ ہے کہ وہ جو بات کہے۔ وہ سچی ہو۔ مولانا اس معاملہ میں کسی کی پروا نہیں کرتے۔ انہیں ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو گھما پھرا کر بات کہنے کے عادی ہیں۔

مولانا ایک محبت کرنے والے انسان ہیں۔ گو وہ فطرتاً کم آمیز ہیں۔ لیکن جب کسی کو دوست بناتے ہیں تو آخری دم تک نباہتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے انتہائی مخلص اور اپنے دشمنوں کے لئے کم مضر ہیں۔ وہ اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کی قدر بھی کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا مودودی سے جب ان کے اختلافات چل رہے تھے تو اس وقت بھی وہ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ اور لوگوں کو تلقین کرتے تھے کہ ان کی تصانیف کا مطالعہ کرو۔ کیونکہ اسلام پر ان سے بہتر لٹریچر ابھی تک کسی نے نہیں لکھا ہے۔ راقم الحروف سے انہوں نے خود ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ اگر اسلام کو سمجھنا چاہتے ہو تو مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ کرو۔ اگر دین ومذہب کی کچھ قلمی خدمت کرنا چاہتے ہو تو ان کے داعیانہ طرز تحریر کو اپناؤ۔

احباب کے انتخاب میں مولانا نہایت محتاط انسان ہیں۔ ان کے دوستوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ احباب کے انتخاب میں وہ دو باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ صاحب علم اور صاحب ذوق ہو۔ دوسرے زندگی کے مسائل میں ان کا ہم مسلک اور ہم نظریہ ہو۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ تحریک اسلامی میں شرکت کرنے سے پہلے وہ شبلی اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے عزیز ترین دوستوں میں تھے۔ یہ دونوں بزرگ بھی انہیں بالکل اپنے عزیزوں کی طرح چاہتے تھے۔ لیکن جماعت اسلامی کے تعلق کے بعد جب ان کے دونوں بزرگوں نے تحریک کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا تو مولانا اصلاحی نے ان تمام تعلقات کو یک قلم ختم کر دیا۔ یہ برسہا برس سے ان دونوں بزرگوں کے ساتھ قائم تھے۔ کیونکہ فرض کا تقاضا تھا کہ ان تمام جذباتی رشتوں کو ختم کر دیا

اشتراکیت اور مذہب و اخلاق

(۴)

ادب اور لٹریچر

نذیر محمد خالد

روس کی نوخیز نسلوں کی نظر میں قدیم ادبی ذخیرے بورژوا نظام کے جراثیم سے لبریز ہیں۔ مرگے پشکن ایسے نامور ادیب کو لٹریچر کے عام طالب علم بورژوائی مصنف کا لقب دیتے ہیں اور پرانے روسی ادب کے ہر نقیب کو اِسی طرح بلاتخصیص تنقید و کرغت تنقیدوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مسکوف۔ تالستائی۔ کورلینگو اور چیخوف وغیرہ کی ادبی شہرت پوری اشتراکی دنیا میں زوال پذیر ہے تالستائی کے متعلق لینن کا فیصلہ ہے کہ وہ بلاخوف تردید تخیلی (Idealist) اور رجعتی ہے (Lenin on Art & Literature — page 32) وہ رجعتی اور تخیلی کیوں ہے؟ اس لئے کہ اُس کے ہاں دین و مذہب کا تصور ملتا ہے اور وہ اپنی زندگی میں وہ اخلاق انسانی کا بہت بڑا داعی اور مبلغ رہا ہے۔ لینن اپنی بیان کردہ رائے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا کہ "تالستائی انسان کے داخلی اخلاق پر یقین رکھتا ہے۔ مذہب کی دائمی سچائیوں کو مانتا ہے ——— اور بغیر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ یہ سب پُرانے مردہ فکر کی نشانیاں ہیں" (ایضاً۔ ص: ۳۲) اِسی جگہ آگے چل کر لینن لکھتا ہے کہ "ایک طرف تو وہ ناقابلِ بیان ذہانت کا ادیب ہے اور دوسری جانب ایک ایسا زمیندار ہے جو مسیح کے نام میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے..... ایک جانب تو وہ ایک حقیقت نگار فن کار ہے۔ جو وقت کے چہرے سے مکروفریب کے سارے پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے اور دوسری جانب اِس دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت و ملامت شئے "مذہب" کا وہ داعی اور موئید ہے۔ اور کلیسا پر سرکار پرست پادریوں کے بجائے حق پرست پادریوں کو برسرِ اقتدار لانا چاہتا ہے (ایضاً: ص۔ ۳۳)

تالستائی اور اُس کے ہم عصر ادیبوں کا یہی سب سے بڑا قصور تھا۔ جس کی نشان دہی لینن نے اِن الفاظ میں کردی ہے اس جرم پر ان سب ادیبوں کو اشتراکی ادب کے دائرے سے خارج کردیا گیا اور جو جدید ادب ان کی جگہ لینے کے لئے اٹھا وہ اپنی ہر تفصیل میں لینن اور اسٹالین سے ہم آواز تھا۔ انسانی زندگی کا سر رشتہ تو معاش اور ذرائع معاش پر قبضہ کرکے پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لیا جا چکا تھا۔ اب اشاعتِ کتب اور چھاپہ خانوں پر بھی حکومت کی اجارہ داری قائم کردی گئی۔ دنیا کی ہر انقلابی دعوت کے لئے خواہ وہ نظام باطل کی دعوت ہو یا نظامِ حق کی بہرحال ادب اور لٹریچر ایک ایسا کارگر حربہ ہے جسے وہ عوام کی مرضی اور منشا پر آزاد نہیں چھوڑ سکتی۔ خصوصاً۔ اشتراکی روس میں جہاں اشتراکیوں کو عوام الناس پر ایک بالکل اَن جانا اَن دیکھا نظام عقیدہ اور معیار اخلاق و معاشرت مسلط کرنا تھا اور وہ بھی ایک ارتقائی تدریج سے نہیں بلکہ جبر و اکراہ سے ——— ایسی حالت میں بالشویک لوگ کیونکر ادب اور لٹریچر کے مورچہ کو خالی چھوڑ سکتے تھے" اپنے اقتدار کے پہلے دن ہی سوویٹ سرکار نے ملک بھر کے تمام پریسوں۔ اخباروں۔ رسالوں۔ اشاعت گھروں اور کتب خانوں کو

اپنی تحویل میں لے لیا" (ص ۱۱: F. Yudin : Soviet Culture) اور ایک لٹریری کنٹرول (RAPP) قائم کر دیا گیا۔ جس کے استبداد کی شہرت چند مہینوں میں ہی سارے ملک میں پھیل گئی اور اپنے متشددانہ طرز عمل کی وجہ سے ملک بھر میں "ریپ ڈکٹیٹر شپ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موریس ہنڈس اپنی کتاب (Great Offensive) میں لکھتا ہے کہ "اگر یہ محکمہ (RAPP) اپنے دائرۂ عمل کو کسانوں مزدوروں میں نئے لکھنے والوں کی نشو و نما تک محدود رکھتا تو وہ ملک کی شایانِ شان خدمت انجام دے سکتا تھا۔ مگر اُس نے اپنے دائرۂ کار کو غیر ضروری طور پر بہت وسیع کر لیا اور مجموعی طور پر ملک کے ادب و لٹریچر کو اپنے اجارہ میں لے کر اسے اُس متعین سیاسی سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا۔ تصویر۔ ادب۔ ڈرامہ موسیقی سب اس ٹھوس سیاسی مقصد کے لئے استعمال ہونے پر مجبور ہو گئے" (ص: ۲۶۴) ۱۹۳۲ء میں اس ادبی آمریت کو ملک پر قائم ہوئے پورے سولہ سال بیت چکے تھے۔ اس طویل مدت میں متشددانہ مساعی سے اُس نے روسی ادب اور آرٹ کی پوری روح کو کچل دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اور اُس کی مرضی و منشا کے عین مطابق ایک ایسا ادب عالم وجود میں آ گیا تھا جس میں پرانے اخلاقی معیارات کی بو تک باقی نہیں بچی تھی اور جو قدیم ادبی روایات کی ایک الٹی تصویر تھا۔ موریس ہنڈس اپنی محولہ صدر کتاب میں اس دور کے افسانہ اور ناول کی کردار نگاری پر ایک مختصر تنقید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ان کے بناوٹی اور جھوٹے کردار خود کمیونسٹوں کے ادبی مذاق پر بوجھ ہو گئے ہیں۔ یہ کردار یا تو بالکل فوق البشر ہوتے ہیں اور یا پورے پاجی اور مکمل بدمعاش مشکل سے ان میں کوئی جیتا جاگتا انسان دکھائی دیتا ہے۔ سب کٹھ پتلیاں سی معلوم ہوتی ہیں جو وقت کے سیاسی دباؤ کے تحت ناچنے لگی ہوں" (ص ۲۶۷-۲۶۸) مذہب کے خلاف ریپ ڈکٹیٹر شپ نے جس زور کا مخالفانہ پروپگنڈہ کرایا۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ ماسکو میں میکسم گورکی کا ڈرامہ (Yegor Bulitchev) فلمایا گیا اور جب سکرین پر وہ سین آیا جہاں زمانہ ماقبل انقلاب کا ایک شہری قریب المرگ دکھایا گیا تھا۔ اور اُس کی آخری خواہش کی تکمیل کی خاطر پادری صاحب مرنے والے کو آخری آشیرباد دینے کے لئے بلائے گئے تو سینما ہال میں بیٹھا ہوا ہجوم پادری کے اسٹیج پر آتے ہی قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ اور چاروں جانب سے آوازے کسے جانے لگے (ص: ۲۴۹) لیکن اس آمرانہ حکمت عملی سے صرف مذہب کو ہی نقصان نہیں پہنچا بلکہ خود روسی ادب کا ارتقا بالکل رک کر رہ گیا۔ اچھے اچھے لکھنے والوں نے سرے سے لکھنا ہی چھوڑ دیا الکسے تالستائی ایسے پایہ کے ادیبوں کو افسانہ نگاری سے کنارا کر کے اپنی تصنیفی صلاحیتیں تاریخ نگاری کی طرف منتقل کر لینا پڑیں۔ جبل جس کے خانہ جنگی کے عہد کے افسانے اُس کی شہرت دوام کا باعث ہوئے تھے۔ بالکل خاموش ہو گیا۔ سیفولینا (Seifulina) جو ایک نہایت ذہین و فطین ناولسٹ تھی نے جدید طرز پر کچھ لکھنا چاہا مگر شدید طور پر ناکام رہی۔ پلنیاک جس کا ناول (Naked Year) ایک عظیم ادبی کارنامہ شمار ہوتا ہے پروپگنڈہ ناول لکھتے لکھتے بار بار ناکامی سے دوچار ہوا۔ لیونوف (Leonov) روس کے افسانوی ادب میں ایک مشہور شخصیت تھا اُس نے ایک جدید کارخانہ کی تعمیر کے موضوع کو لے کر ایک طویل کہانی تخلیق کرنا چاہی مگر اپنی ادبی صلاحیتوں کے باوجود ایک پست اور مفلس قسم کی کتاب لکھ کر رہ گیا۔

روس کے ادبی مطلع پر آج تک میکسم گورکی سب سے زیادہ چمکنے والا ستارا ہے۔ جدید اشتراکی ادب کے علمبرداروں میں میکسم گورکی ایک ایسے مینار کی طرح کھڑا ہے کہ دوسرے ادیب اُس کے سامنے بالشتئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس برتری کے باوجود میکسم گورکی ان ادیبوں کا سرپرست تو رہا مگر ان کی رہبری کرنے کا اُسے کسی وقت حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ لینن۔ اسٹالین اور ان کے

ہم یا جیوں سے ہمیشہ خائف رہا۔ لینن ایک مرتبہ کیپری کے جزیرے پر میکسم گورکی کو اُس کی سیاسی غلطیوں پر متنبہ کرنے گیا تھا گورکی نے بلا چون و چراں لینن کی سرزنش سُنیں اور شکست خوردگی اور پژمردگی کے عالم میں جواب دیا "میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک ناقص العلم مارکسی ہوں اور پھر ہم آرٹسٹ لوگ بہر صورت غیر ذمہ دار ہوتے ہیں" لینن گورکی کے متعلق ایک خط میں لکھتا ہے کہ "آخر گورکی سیاسیات میں دخل ہی کیوں دیتا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ گورکی کا یہ (متنازعہ فیہ) خط بورژوائی تعصبات کا ایک کریہہ مرقع ہے۔ حالانکہ ہماری پارٹی کی تمام تر مساعی اِنہی تعصبات کی بیخ کنی میں صرف ہونی چاہیں (Collected Works

(Lenin : Vol-20: p: 41

بیسویں صدی کے اوائل ہی سے جب وہ نیا نیا انقلابی بنا اُسے آدمی کی حیثیت سے ایک دنیا میں اور ادیب کی حیثیت سے دوسری دنیا میں رہنا پڑا اور اِن دونو کے درمیان اتنی بڑی خلیج حائل رہی کہ مرتے دم تک گورکی سے پٹ نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورکی نہ اِس دنیا کا رہا نہ اُس دنیا کا اور آخر میں اُس نے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ انقلاب کے بعد کی زندگی کا رنگ ایسا تھا کہ کا غذ پھیکا ہی رہ گیا تھا۔ اُسے یہ جھجک لاحق رہی کہ کہیں قلم اور تلوار کے درمیان لڑائی نہ ہو جائے۔ سیاست اور ادب کا باہم اختلاف نہ ہو جائے اگر تصویر کا رنگ انقلابی تعلیم سے میل نہ کھاتا اور بات بے موقع ہوتی تو بلاشبہ انشا پردازی کی کھلی رسوائی تھی کہ وہ بالشویک سیاست کے رکاب در رکاب نہ چل سکی۔ روس کے اس ادبی دیو کے آخری ایام اسی اُدھیڑ بُن میں بیت گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے فن کی ساری شوخی انقلاب سے پہلے ہی کھو چکا تھا۔

اِس عہد میں کسی رفیق نے لینن کو مشورہ دیا کہ وہ ایک لٹریری ادارہ فکشن ڈیپارٹمنٹ کے نام سے کھول کر گورکی کی تحویل میں دے دے مگر لینن ایسا ہوشیار آدمی جو گورکی کے متعلق خوب جانتا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہے اِس مطالبہ سے اپنا پہلو نہایت چالاکی سے بچا گیا اُس نے کہا "یہ مشورہ سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے مگر گورکی ایسی فطین ادبی شخصیت کو جرنلزم کے جھاڑ میں پھنسا کر میں عالمگیر ادب پر ظلم نہیں کرنا چاہتا"۔ (Lenin on Art & Literature: page 67)

درحقیقت لینن گورکی کو انقلاب کے کسی مصرف کا نہیں سمجھتا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ گورکی پر اُس کی ناقدانہ تعزیر بہت سخت تھی۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اِس آوارہ ادیب کی شخصیت بالشویک انقلاب سے اتنی بے جوڑ تھی تو بالشویکوں نے اُسے دوسرے ہم عصروں کے مقابلہ میں اتنی عظیم شہرت کیوں دے دی اور اشتراکیت کے ادبی مطلع پر اُسے اس قدر کیوں چمکا دیا کہ تالستائی چیخوف اور پشکن وغیرہ اُس کے سامنے مدھم پڑ گئے؟ اس کی وجہ صرف اتنی سی بات تھی کہ اپنے ہم عصروں میں صرف ایک میکسم گورکی ہی تھا جس نے اشتراکیت کے غیر اخلاقی اور الحادی نظریہ کو بطیب خاطر قبول کر لیا تھا۔ اشتراکیت کی غیر اخلاقی قدروں کو تو اُس نے اس قدر اپنا لیا تھا کہ وہ امریکہ کی سیر کو آیا (۱۹۰۵ء) اور ہر جگہ اس کا بہت دھوم دھام سے استقبال ہوا لیکن جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ عورت جو گورکی اپنے ازدواج میں ساتھ لئے پھرتا ہے اُس کی بیوی نہیں ہے بلکہ خالی دوست ہے۔ تو سب لوگ اس سے خفا ہو گئے۔ گورکی کو یہ واقعہ قدامت پسندی پر موقوف معلوم دی اور اتنی ناگوار گذری کہ اہل امریکہ کے خلاف اُس نے ایک زہرناک کتاب لکھ ماری۔

گورکی کی مشہور تصانیف میں اُس کے دو مشہور ناول "بچپن" اور "غیروں میں" انقلاب سے بہت پہلے لکھے گئے تھے۔ ان دونو ناولوں میں اُس نے اپنی زندگی کے اُن ایام کا نقشہ کھینچا ہے جو انتہائی غربت و افلاس میں کٹے تھے" چلکاش" "میرا ہم سفر" اور "مالوا" اُس کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان افسانوں میں ایک مفلس و نادار آدمی کے دکھ درد کی داستان کو کچھ اس طرح سنایا گیا ہے کہ ماحول پر

ایک اخلاقی اور معاشرتی جنس خارجی ہو جاتا ہے۔ فلسفہ۔ مذہب۔ انسانیت سب سے جی اکتا اُٹھتا ہے اور مندگی سے کہیں دور بھاگ جانے کو دل چاہتا ہے۔ مگر باہر نکلنے کو کوئی راستہ نہیں ملتا۔ گورکی خود اِس منجدھار سے نکلنے کا کوئی راستہ پانے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ دوسری کتاب "غیروں میں" وہ ایک اَن پڑھ فلسفی کے بھیس میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت فلسفی کے اُسے سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے جہاں کہیں اپنے مخصوص موضوع "آوارگی" سے ہٹ کر کچھ لکھا ہے اُس کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں انقلاب کے موضوع پر اُس کا ناول "ماں" اِس بات کی روشن دلیل ہے۔ یہ ناول ان سطور کے لکھنے والے نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں انگریزی زبان میں پڑھا تھا اور اپنے اِن کے اشتراکیوں میں اُس کے اِس ادبی شاہکار کا غلغلہ سنا تھا۔ پورا ناول (Discriptive) انداز میں لکھا گیا ہے عوام کے مذہبی معتقدات۔ اور اہلِ کلیسا کا خاکہ اڑایا گیا ہو اگرچہ یہ واحد ناول ہے جو گورکی نے انقلاب کے موضوع پر انقلاب کی خاطر لکھا تھا مگر نتائج کے اعتبار سے اپنے مقصد میں بالکل ناکام ثابت ہوا ہے۔ اور جس وقت روس میں اشتراکی انقلاب عملاً رونما ہوا تو مصنف کی تخلی شوکریں سب پر واضح ہو گئیں "میری تعلیم گاہیں" اور "میرا روزنامچہ" یہ دونوں انقلاب کے بعد کی چیزیں ہیں۔ ان میں جابجا۔ اخلاق۔ مذہب شادی وغیرہ کی تضحیک کی گئی ہے اور کہیں دہریت کی عملی تبلیغ۔ گورکی لکھتا ہے "ہم دونوں کے لئے دہریت پر اعتقاد رکھنا بہتر ہوگا کیونکہ زندگی میں ہمیں صرف اپنی ذات پر اعتماد ہونا چاہیئے۔ آخر خوف کس بات کا۔ اپنی ذات کے سوا کسی اور کا خوف دل میں نہ ہونا چاہئے" پھر روس کی جنسی انارکی کا نقشہ اپنے روزنامچہ میں کھینچتا ہے۔ ایک محفل عیش و نشاط کا ذکر ہے جہاں روس کے نوجوان مرد و زن داد عیش دے رہے ہیں۔ لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر لیا ہے اور لڑکوں کو دوسری قطار میں۔ پھر حکم ہوتا ہے "لڑکیوں سے ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔ بس دو قدم اور پیچھے۔ سامنے جھک جاؤ۔ لڑکیاں اپنی مرضی سے اپنا رفیق چن لیں گی۔ کسی کو دباؤ کا اختیار نہیں" (دہریت شادی۔ رقص)

میکسم گورکی کے معاصرین کی نوخیز نسل جو ریپ ڈکٹیٹر شپ (RAPP) نے پیدا کی ہے وہ اِس لحاظ سے اپنے پیش رو سے بھی آگے معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں اُن کا مطمحِ نظر وہی آزاد اخلاق اور آزاد محبت کا اصول تھا جو فرانس کی مشہور ادیبہ جارج ساں (۱۸۳۳ء) کی پیش گوئی میں درج ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ نکاح کی غیر منصفانہ ازدواجی رسم بہت جلد موقوف ہو جائے گی۔ انسانی نسلوں نے اگر عدل و انصاف کی راہ پر پیش قدمی جاری رکھی تو جنسی ملاپ کا طریقہ مہذب ہو کر رہے گا۔ اور وقت آئے گا جب مرد اپنے عہد کی عورتوں پر کوئی ازدواجی پابندی باقی نہیں چھوڑیں گے" چنانچہ اشتراکی روس کی جدید ادبی کاوشوں پر ایک اوسط نظر اس بات کے بین ثبوت بہم پہنچا دیتی ہے کہ فرانس کی اس مشہور ادیبہ کی پیشگوئی سر زمینِ روس میں حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔ اور یہاں کی اس نوخیز نسل کے جن ادبی شاہکاروں کے تراجم انگریزی زبان اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں ہو چکے ہیں وہ اُن ادبی اور اخلاقی قدروں کا مکمل نمونہ ہیں جو اشتراکیت عملی زندگی میں اپنے پاس پاس رکھتی ہے۔ ان ناولوں میں سے چار مشہور ناول انگریزی زبان میں منتقل ہوئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا تو مشہور مصنف رومونف کا ہے "تین جوڑا ریشمی جرابیں" (Three pairs of Silk Stockings) اور "پھولوں کے بغیر" (Without Flowers) ہیں تیسرا "عشق مثالی" (Squaring the Circle) اور چوتھا (Dogs Love) ہے۔ یہ سب ناول روسی ادب کی موجودہ نقش نگاری کی ایک نہایت کریہہ تصویر ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں موریس ہنڈس اس آخری ناول کے متعلق تحریر کرتا ہے کہ "یہ ناول جس کی فلم ماسکو میں حیرت ناک کامیابی کے ساتھ دکھائی جا رہی ہے اِس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ روس میں جنسی شائستگی کا دیوالیہ نکل چکا ہے"

Great Opinion — p. 198.

(ص ۔ ۱۹۸ ۔ Great Offensive) متذکرہ صدر ناولوں میں سے ایک ناول " پھولوں کے بغیر" میں مصنف لکھتا ہے " ہم لوگوں میں محبت مفقود ہو چکی ہے ۔ اور اس کی جگہ آزاد جنسی ملاپ نے لے لی ہے ۔ جو لوگ محبت میں عضویات (فزیالوجی) سے کچھ زیادہ معنی کے متلاشی ہوتے ہیں ہمارے ہاں وہ نیم پاگل لوگ ہیں " (بحوالہ مدر رشیا : مورس ہنڈس ۔ ص : ۲۲۸) ایک دوسرا اشتراکی ناول نویس ارسٹے بینشوف اپنے ناول (Famine) میں رقم طراز ہے کہ " شراب خوری اور زنا کوئی قابل شرم چیزیں نہیں ہیں ۔ گناہ کوئی چیز نہیں ۔ محبت کرنا ۔ محبوب بنانا ۔ اور عورت کا تعاقب کرنا خاصۂ مردانگی ہے جو ایک فطری جذبہ ہے وہ گناہ کیسے ہو سکتی ہے (بحوالہ ص : ۱۹۴ ؛ Religion under the Soviet) مورس ہنڈس کی کتابوں کے چند اقتباسات پہلے دیئے جا چکے ہیں کہ موجودہ روسی ادب میں سوسائٹی کے ان تین اداروں مذہب ، کاروبار شخصی اور خاندان کو مسخرے پن سے بہتر کوئی نام نہیں دیا جاتا ۔ یہ تینوں چیزیں وہی ہیں جن پر قدیم بہترین لکھنے والوں نے اپنا زورِ قلم صرف کیا ہے اور انہی تینوں چیزوں کا اب روسی ادب منہ چڑاتا ہے ۔

اِن سطور میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ روسی ادب کی فحش نگاری پر کوئی طویل بحث شروع کی جائے پڑھنے والا اگر اس سلسلہ میں مزید تفصیل دیکھنا چاہتا ہے تو ہم سہولت کے لئے تین چار کتابوں کے نام لکھ دیتے ہیں ۔ جن کے تراجم انگریزی زبان میں بھی ہو چکے ہیں اور اچھے کتب فروشوں کے ذریعہ باہر سے منگوائے بھی جا سکتے ہیں ۔ راقم الحروف کے پاس یہ کتابیں موجود نہیں ہیں اس لئے کسی ذمہ داری سے اِن پر لکھا نہیں جا سکتا ہے اِن ناولوں میں سے ایک (Alexandra Kollontai) کا ناول " مزدور لڑکی کی محبت " ہے جس کا انگریزی ترجمہ (Free Love) " آزاد محبت " کے نام سے ہو چکا ہے پھر رومانوف (P. Romanov) کا ناول " پھولوں کے بغیر " ہے جس کا انگریزی ایڈیشن (Without Cherry Blossoms) کے نام سے چھپا ہے اس کے بعد شولوخوف (M. Sholokhov) کا (The Soil Upturned) بھی دیکھا جا سکتا ہے

اشتراکی ادب کے اس مختصر سے جائزے میں اگر سوویٹ وسط ایشیا کی مسلمان مملکتوں کی جدید ادبی روایات پر بھی ایک نگاہ روشنی ڈال لی جائے تو نامناسب نہ ہوگا ۔

یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے جب امیر سعید عالم خان بخارا چھوڑ کر افغانستان چلا گیا تھا ۔ اور یہی سال وہ آخری سال ہے جب وسط ایشیا کے مسلمان مجاہدین اشتراکیت کی سرخ یلغار سے شکست کھا کر منتشر ہو گئے ۔ یہ وسط ایشیا کی مملکتیں تنظیمی لحاظ سے جتنی گری ہوئی تھیں اس سے زیادہ علمی لحاظ سے کوری تھیں ۔ بعض ایسی قومیں بھی موجود تھیں جو اپنے پہاڑی و دشوار گزار راستوں کی وجہ سے تہذیبی لحاظ سے بالکل پس ماندہ رہ گئی تھیں اسلام اپنے پرجوش داعیوں اور مبلغوں کے ذریعہ اُن تک کسی زمانے میں ضرور پہنچ گیا تھا مگر امتدادِ وقت سے اس پر بھی اتنی گرد جم گئی تھی کہ صورت پہچاننا مشکل تھا ۔ علمی زبان فارسی ہی تھی ۔ مگر اشتراکی اقتدار نے اپنے مفادات کے لئے مناسب سمجھا کہ ہر قوم اور قبیلہ اپنی مادری زبان پڑھے اور لکھے ۔ چنانچہ ایسی کئی قومیتیں ہیں جن کی بولیاں صرف بولی جاتی تھیں اور ماضی میں آج تک کبھی لکھی نہیں گئی تھیں اور جو اپنے پاس حروف ابجد بھی نہیں رکھتی تھیں ۔ ایسی سب بولیوں کو اشتراکی حضرات نے از سرِ نو مرتب کیا اُن کی ابجد تیار کی اور اُن میں لٹریچر کے ذخیرے پیدا کئے ۔ بعض قومیں تو ایسی چار ہی ایسی بھی ہیں جو اب تک سوائے گڈریوں کے دو ہیروں کے اپنے پاس اور کوئی ذخیرۂ ادب نہیں رکھتی تھیں ۔ اشتراکی لوگوں نے اب انہی قدیم گڈریا شاعروں کی مردہ شخصیتوں کو مبالغہ و رنگ آمیزی کے ساتھ ابھارا ہے کہ یہ اچھے خاصے " فردوسی " بن گئے ہیں ۔ اِن نوزائیدہ زبانوں کی بقیہ کسر روسی زبان کے اشتراکی مصنفوں کی کتابوں کے کثیر تراجم سے پوری کر دی گئی ہے ۔ یہاں ہمیں وسط ایشیا

کے صرف الحادی ادب سے بحث کرنا ہے۔ اس لئے ہم جوشا کنٹنر کی کتاب صبح سمرقند Dawn over Samarkand کو سامنے رکھ کر قارئین کے سامنے ایک مختصر خاکہ پیش کریں گے۔

۱۹۲۰ء سے پہلے صدر الدین آئینی بخارا کا مشہور اشتراکی شاعر مسلمان تھا۔ خدائے عالم کو خطاب کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ:—

"اے خدائے بزرگ و برتر۔
تو کیا زندگی کی شاہ رگ نہیں ہے؟
تو سب طاقت وروں سے قوی ہے۔
اور سب جابروں پر غالب ہے۔
یا خدا! ان بلند محلوں کی عالی چھتوں کو۔
خانوں اور امیروں کے تاجدار سروں پر ڈھا دے۔
اے خدائے جہاں ہمیں ان کی قید مصیبت سے نجات دلا۔
اور یہ خان اور امیر کانپتے ہوئے اپنے غلاموں پر سرنگوں ہو جائیں۔

لیکن انقلاب کے دو ہی سال بعد جس طرح سارے وسطی ایشیا کی کایا پلٹ ہو گئی۔ اسی طرح صدر الدین آئینی بھی بدل گیا۔ اُس کے متعلق صبح سمرقند کا مصنف لکھتا ہے۔ "بلند محلات کی چھت پر غرور تاجداروں کے سروں پر ڈھا دئے گئے اور لرزاں شہزادے غلاموں کے قدموں پر دو زانو ہو گئے۔ مگر اس انقلاب میں اللہ یا خدائے جہاں کا بھی کوئی ہاتھ تھا؟ صدر الدین آئینی اب یہ نہیں مانتا تاکہ عوام کا یہ محبوب شاعر کسی دوسرے مقام پر اس حقیقت کو صاف ستھرے طرزِ استدلال سے یوں واشگاف کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ اور اس کے نبیوں کی برکت سے نہیں ہوا بلکہ یہ سب کچھ تاجکستان کے بالشویک غازیوں کے دست و بازو کے مرہونِ منت تھا"

انقلاب کے فوراً بعد سوویٹ ایشیا کے ادب کو جاگیر دار، سرمایہ دار، ملا اور مذہب کے خلاف کھڑا کر دیا گیا اور بالشویزم کے ان چاروں دشمنوں پر ہر پہلو سے حملہ کر دیا گیا۔ ترکمان شاعر کار مولا لکھتا ہے۔

جاگیر دار، سرمایہ دار، ملا اور امیر۔
انسانیت کو چاٹنے والے چار کیڑے۔
خانوں اور امیروں سمیت پیوندِ زمین ہو گئے۔
تم نے قبائل کی دشمنیوں کے دستے ہوئے لشکر کو مار بھگایا۔
تری فتح کا میٹھا پھل سب غریب مل کر کھائیں گے۔
مرحبا! اے بالشویک مرحبا!

اسلام، قرآن اور پیغمبر اگرچہ اشتراکی اقتدار کے نافذ اور مسلط ہو جانے کے بعد بھی بہت سے مسلمانوں کے لئے قابلِ عزت و احترام رہے مگر بالشویکوں کی الحادی ادبی تحریک خدا، رسول اور قرآن و حدیث کے خلاف انتہائی ذلیل پروپگنڈے سے لبریز ہو گئی۔ تاجکستان کا ایک دیہاتی شاعر صور شو دینی ایک نظم میں کہتا ہے۔

اے ستارہ مکرم!

تم نے کہا کہ تاج ان سروں سے نہ اتر سکیں گے۔
لیکن یہ اُتار لئے گئے۔
تم نے کہا تھا کہ تخت زمین بوس نہیں ہوگا۔
لیکن یہ پیوند خاک ہوگیا۔
تم کہتے تھے کہ قرآن کے الفاظ دائمی ہیں۔
اور وادی کی پری چہرہ دوشیزائیں۔
نقاب الٹ نہیں سکیں گی۔
انہوں نے الٹ دیئے۔
تم نے کہا تھا کہ مسجدیں کبھی خالی نہ ہوں گی۔
اور اسلام ہمیشہ حکومت کرے گا ———— لو وہ مٹ گیا۔
تم نے کہا تھا کہ حکمران کا خون مقدس ہے۔
دیکھو میری تلوار کیا اُن کے خون سے رنگین نہیں!
تم نے کہا تھا کہ قاضی اور شریعت ملک بدر نہیں ہوں گے۔
دیکھو لو وہ سب نکل بھاگے۔
مُلا! کہاں ہیں وہ پیش گوئیاں۔
مُلا! تمہارے تصور سے مجھے تھکن ہوتی ہے،

وہ سادہ لوگ جن کی زندگیاں کبھی خدا کی حمد و ثنا کی شیدائی ہوتی تھیں وہ پہاڑی چوٹیاں جو کبھی آیات قرآنی کی دلدوز تلاوت سے گونجا کرتی تھیں وہ سینے جو کبھی احادیث رسول کے خزانے ہوتے تھے۔ وہ بخارا جو کبھی امام بخاری کو جنم دیتا تھا اب یہاں لینن و استالن کی اشاد حمد ہوتی ہے اور خدا و رسول کی ہجو۔

پامیر کی بلندیاں زمین کے ساتھ ہموار ہو جائیں۔
اور سمندر خشکیوں پر چڑھ آئیں
صدیاں اپنے ارتقا کی آہنی دیواریں پھاند جائیں۔
لوگ اپنے اب و جد کا نام و پتہ فراموش کر دیں۔
اور ملک اپنی زبانیں بھول جائیں۔
لیکن لینن کبھی بھولنے نہ پائے گا۔

ان سوفی صد مسلم آبادیوں میں جہاں کوچے کوچے آذانوں کی آواز آتی تھی۔ اب وہاں پروپیگنڈا کے مشہور عوامی دو ہر سے الاپے جاتے ہیں۔ جن سے خدا اور مذہب کی اعلانیہ تضحیک ہوتی ہے۔ بحوام امیر حسین کی پوسٹر۔ مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے خلاف عوام میں بالشویکوں کے پر دردہ بغض و عناد کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ "ملا! تم اب واپس نہ آؤ۔ واپس آنے سے پہلے ہمارے سلسلہ بائے کوہ سے پر چھو! تمہارے سر کو کچلنے کے لئے اپنی چوٹی پر بیسب گلیشر اُٹھائے کھڑے ہیں۔ اب ہم تمہارا نام نہیں سننا چاہتے۔ سینکڑوں برس ہم نے اپنے وطن میں خدا کے

قانونِ شریعت کی اندھا دھند تقلید کی ہے۔ ہمارا کچھ نہیں بنا اور نہ اب بنے گا۔ مُلّا تم اب واپس نہ آؤ۔ اگر تم آئے تو یاد رکھنا ہم اپنی معاشی بھیڑوں کو تمہاری تبلیغ سے بچائیں گے" تاجکستان کے ایک دوسرے شاعر جی لاھوتی کی نظم سن لیجئے۔

Today we have a Muslim Holiday,	آج ہمارا ایک اسلامی تہوار ہے۔
Ruza, we call it here,	جسے ہم روزہ کہتے ہیں۔
And what a Holiday it was in past,	زمانہ ماضی میں یہ تہوار کیا تھا
Deserted the homes, deserted the fields,	گھر خالی اور کھیت سنسان ہو جاتے تھے
Crowds kneeling all day in the mosques,	اور لوگوں کی بھیڑ سارا دن مسجدوں میں سر بسجود رہتی تھی۔
But now who has time to think of Ruza	اور اب اس روزہ پر تضیع وقت کون کرتا ہے
Who has time for the nonsense slavish past	اس بیوقوفانہ عہدِ غلامی کی یادگار کو منانے کا وقت اب کس کے پاس ہے۔
Our Unions call for Brigades.	ہماری حکومت ہمیں جنگ پر بلا رہی ہے

سوویٹ ایشیا کے لٹریچر میں موجودہ بدلتے ہوئے رجحانات اُس زبردست انقلاب کی نشاندہی کرتے ہیں جو تیس سال کے عرصہ میں وہاں کی تمدنی معاشرتی اور تعلیمی زندگی میں وارد ہو چکا ہے۔ اس انقلاب کے پس پشت وہ معاشی اسباب اور تقاضے بھی ہیں جو بالشویکوں نے ملک میں پیدا کر دیئے۔ ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ ایک ایک دانۂ گندم جو وسطی ایشیائی مسلم آبادیوں کے حلق سے گزرتا ہے وہ سوویٹ حکومت کے راشننگ ڈپو سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس طرح سوویٹ حکومت نے ہر شہری اور دیہاتی کی رگ جان کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اُس کے نظامِ استبداد سے ذرا کسی نے شکایت نہیں کی کہ اُس کی روزی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور رگ زندگی کٹ گئی۔ ان بے چارے مسلمانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار باقی ہی نہ تھا کہ یا تو وہ سوویٹ سرکار کی نمک خواری کا دم بھریں۔ اور یا پھر اپنے وطن سے نکل جائیں۔ کثیر آبادیوں نے آخری راستہ اختیار کیا۔ باقی باشندے اشتراکی خداؤں کی بندگی پر رضامند ہو گئے۔ معاش کیساتھ ادب و شعر کے میدان میں بھی یہی ہوا۔ چنانچہ ایک ایسے ادیب کے لئے جو اشتراکی اسٹیٹ کے زاویۂ نگاہ سے اتفاق نہیں رکھتا تھا۔ اُس کے لئے اشاعت اور پریس کی ساری سہولتیں مفقود ہو جاتیں۔ اب اُس کی کوئی نظم کوئی مضمون ملک کے کسی اخبار یا رسالہ میں چھپ نہیں سکتی تھی اور نہ ہی دوسری پابندیوں کے سبب یہ کسی کو ایسی نظمیں یا تحریریں سنا ہی سکتا تھا۔ دوسری طرف اشتراکی اعمال و ظروف پر مہر تصدیق ثبت کرنے والے ہر ادیب کے لئے اشاعت اور پریس کی ساری سہولتیں کھلی تھیں اُس کی معاشی ضروریات کا نہایت معقول انتظام موجود تھا۔ وظائف اور رائیلٹی کی گرانقدر رقوم حکومت سے ملتی تھیں۔ اسٹالین سے فخر و افتخار کی ہزاروں سندیں اور تحفے ملتے تھے۔ ان حالات و اسباب کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ادب عوام سے کٹ کر حکومت کی منشا و راستے پر موقوف ہو گیا۔ وہ غیر اشتراکی ادب اپنی جگہ پر سوکھ کر سڑ کر نابود ہو گیا۔

(باقی آئندہ)

اِنتباہ

—— ارشد کاظمی

مظالم و ستم و جور کے گھٹا ٹوپ تو
بتاؤ گردشِ تقدیر کون روکے گا

ہر اک طرف سے اٹھیں گے عذاب کے بادل
جسارتِ فلکِ پیر کون روکے گا

فریب کارِ سیاست کو مٹتے دیکھا ہے
ہمارے خواب کی تعبیر کون روکے گا

ابھی تو خیر بہت نرم خیز ہیں لہریں
مگر بتاؤ کہ سیلاب کون روکے گا

تمہارے بس میں ہے خاموش کر دو سازوں کو
فرازِ نغمۂ بیتاب کون روکے گا

ستارے ماند پڑے ہیں تو ماند رہنے دو
شعاعِ مہرِ جہاں تاب کون روکے گا

بجا ہے میرے تخیل کو روک سکتے ہو
ہمارے کھولتے جذبات کون روکے گا

زمانہ ساز حکایت کے چھیڑنے والو
زمانہ سوز روایات کون روکے گا

نئے نظام کی آمد ہے لازمی اب تو
بدل رہے ہیں جو حالات کون روکے گا

شاکر کی نئی نظمیں

ادارہ

ہمارے پنجابی زبان میں اسلامی انقلاب کی دعوت دینے والے شاعر ——— عبداللہ شاکر ——— سے قارئین چراغِ راہ متعارف ہو چکے ہیں۔ یہ بے پناہ لکھنے والا شاعر چند دن میں انتہائی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی نظموں کے ۵۰،۰ ہزار کے ایڈیشن بالعموم پندرہ روز میں ختم ہو جاتے ہیں پنجاب کے دیہاتی ان نظموں کے ذریعے اسلام کو بھی اور ملک کی سیاست کو بھی بڑی خوبی سے سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا اصل پاکستان جو دیہات میں رہتا ہے' اسے شاکر کی نظموں کے ذریعے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا ہے کہ یہاں قرآن کے اسلام اور برسرِ اقتدار طبقہ کے فرنگی اسلام میں کشمکش بپا ہے اور اس کشمکش میں اُن کو بھی کوئی پارٹ ادا کرنا ہے۔

عبداللہ شاکر کی نظموں کے چار نئے پمفلٹ حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ قارئین چراغِ راہ کی ضیافت کے لئے ان نظموں کے کچھ اقتباسات مع اردو ترجمہ درج کئے جا رہے ہیں تاکہ پنجابی جاننے والے بھی اور نہ جاننے والے بھی اس شاعر کی عظمتِ فکر سے لذت اندوز ہو سکیں۔ (مرتب)

"نورانی صبح" :———

اسلامی قانون خدا دے بندے جدوں چلاون گے
رحمت دیاں ہواواں والے بُلّے ناز دکھاون گے
فضلاں والے بدل برکت بھریا مینہ وساون گے
سکے کھیت تے خشک بغیچے ہرے بھرے ہو جاون گے
ٹہکن مہکن' ٹھکن والے پھیر سمیں دکھلاون گے
پاکستان رہوے گا باقی ظالم ختم ہو جاون گے
ٹھنڈی وا رسول اللہ نوں آئی پاکستان وچوں
چُنیا گیا ایہ خطہ حکم الٰہی لئی جہان وچوں
ہک ہک نقش تیار ہوسے گا اس دا خاص قرآن وچوں
شاں رہیں جاون گے کھیاں مارسے پیا شیطان وچوں

جب خدا کے بندے اسلام کا قانون جاری کریں گے
تو رحمت کی ہواؤں کے جھونکے خرام ناز دکھائیں گے
خدا کے کرم کے بادل برکتوں بھرے مینہ برسائیں گے
ویران کھیت اور خشک باغیچے ہرے بھرے ہو جائیں گے
اور پھر دہنے لہکنے اور چہکنے کے مناظر سامنے آئیں گے
پاکستان تو باقی رہے گا البتہ ظالم ختم ہو جائیں گے
رسول اللہ صلعم کو پاکستان ہی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا پہنچی تھی[1]
یہ خطہ سارے جہان میں سے خاص طور پر احکامِ الٰہی کو جاری کرنے کیلئے چُنا گیا ہے
اب اس کا ایک ایک نقش قرآن میں سے تیار ہو گا
چاہے شیطان بیچ میں کتنے ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہے

---

[1] اشارہ ہے اسی ارشادِ نبوی کی طرف جسے علامہ اقبال مرحوم نے بھی ذکر کیا ہے کہ "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے"

حکم خدا دے جاری ہو کے اپنا رنگ وکھاون گے
پاکستان رہوے گا باقی ظالم ختم ہو جاون گے
جھولی چک انگریزاں والی بے شک چال وکھالن پئے
اسلامی پردے دے اوہلے بے دینی نوں پالن پئے
انگریزی سانچے دے اندر ملک تے قوم نوں ڈھالن پئے
ہج دکان دہی تے دُودھ دی بھنگ شراب اُچھالن پئے
دانگ مداری نرا تماشہ کد تک پئے وکھاون گے
پاکستان رہوے گا باقی' ظالم ختم ہو جاون گے

کعبے دا جو راہ نہ جانے اوہنے راہ وکھانا کی؟
لندن ول منہ ہووے جس دا کعبے نوں اُس جانا کی؟
منزل ولے کنڈ ہے جس دی منزل اس پچانا کی؟
آپ پیا جو غوطے کھاوے اُس نے پار لنگھانا کی؟
ایہہ ملاں لندن جانے جس دم قوم ہٹا دے گی
اودوں پاکستانیاں تائیں سکھ دی نیندر آوے گی

مسکیناں' محتاجاں والے حق دباون والیاں توں'
ملک دی دولت جشناں دے وچہ نت اڈاون والیاں توں
بے گناہاں تائیں ایویں جیلیں پاون والیاں توں
نال گھر دی قانوناں دے رعب جماون والیاں توں
قوم اساڈی گردن اپنی جدوں آزاد کراوے گی
اودوں پاکستانیاں تائیں سکھ دی نیندر آوے گی

بے ایمانی سیفٹی ایکٹ اپنا نام رکھایا اے
ظلم ہوراں نے قانوناں دا متھے تلک لگایا اے
نامردی نے چوراں وانگوں لُک لُک تیر چلایا اے
بزدل بے دلیلا ہو کے دا لگاون آیا اے
غیر شرعی قانوناں تائیں جد تک موت نہ کھاوے گی
تد تک ساڈے تائیں تائیں سکھ دے نیندر آوے گی

سیفٹی ایکٹ دیمک کھادیاں کندھاں بیٹھاں تھمی ایں
ڈگدے محل کھلارن والی کوشش ایہہ نکمی ایں
کوڑی مدحت کھلوتا رہسی جیہڑا ایں دی کمی ایں

اللہ کے احکام جاری ہو کر اپنا رنگ ضرور دکھائیں گے
پاکستان تو باقی رہے گا' البتہ ظالم ختم ہو جائیں گے
تو کلمت منافقت رکھنے والے لوگ انگریزوں کی چال چلتے ہیں تو چل لیں
اسلام کے پردے کے پیچھے بیٹھ کر بے دینی کو پرورش دے لیں
انگریزی سانچے میں قوم اور ملک کو ڈھالنے کی کوشش کر لیں'
دودھ دہی کی دکان میں بھنگ اور شراب کو فروغ دے لیں
آخر مداریوں کی طرح محض تماشا گری سے کب تک کام چلے گا!
پاکستان باقی رہے گا اور ظالم ضرور ختم ہو جائیں گے۔

جو کعبے کا راہ جانتا ہی نہ ہو' وہ راہ دکھائے گا کیسے؟
جس کا منہ ہی لندن کی طرف ہو' وہ کعبے جائے گا کیا؟
جو پشت بر منزل ہو کے چلے' وہ دوسروں کو منزل تک کیا پہنچائے گا
جو خود ہی ڈبکیاں کھا رہا ہو' وہ اوروں کو کیسے پار اتارے گا؟
ان لندن جانے والے ناخداؤں کو جس وقت قوم برطرف کر دے گی
اُس وقت پاکستانیوں کے لئے چین کی نیند سونا ممکن ہو گا

مسکینوں اور محتاجوں کے حق مارنے والوں سے'
ملک کی دولت کو مسلسل جشنوں میں اڑانے والوں سے'
بے گناہوں کو یونہی جیل میں ڈالنے والوں سے
خانہ ساز قوانین کے بل پر رعب جمانے والوں سے
جب ہماری قوم اپنی گردن آزاد کرا لے گی
تو اس وقت پاکستانیوں کے لئے چین کی نیند سونا ممکن ہو گا

بے ایمانی نے اپنا نام سیفٹی ایکٹ رکھا ہے
یہ جناب ظلم ہیں جنہوں نے اپنی پیشانی پر قانون کا قشقہ لگا رکھا ہے
نامردی چوروں کی طرح آڑ لے لے کر تیر چلاتی ہے
بزدل اقتدار دلائل ختم ہونے پر داؤں سے کام لینے کیلئے بیٹھا ہے
اس قسم کے غیر شرعی قوانین کو جب تک موت ختم نہ بنا لے
اس وقت تک ہم لوگوں کو سکھ کی نیند نہیں آ سکتی۔

سیفٹی ایکٹ اقتدار کی دیمک خوردہ دیوار کے لئے سہارا ہے
گرتے ہوئے محلوں کو استوار رکھنے کی یہ کوشش بالکل بیکار ہے
وہ مدحت کیسے کھڑا رہے گا جس کی جڑ مستحکم نہیں ہو سکی۔

ڈاڈا سفر کریسی کڈاں، چیڈا منزل لمی ایں
جدوں مکندی وزارت والی ڈِنگ کے دندی کھلو گی
اودوں پاکستانیاں تائیں سکھ دی نیندر آوے گی

منزل دور اور راہ دشوار ہے تو آخر لنگڑا اسے کیسے طے کریگا
جس دن وزارت کی دیوانگی کر مذہبیوں کے دانت ٹوٹیں گے،
اس وقت پاکستانیوں کو چین کی نیند آ سکے گی۔

"شیطانی وحی":——

فتنے دی ڈور پچھوں بہ کے ہلائی جاؤ
پورے پارسا بن کے لوکاں نوں ستائی جاؤ
سدی جاؤ آپ نالے جگ نوں رُوائی جاؤ
کھائی جاؤ کھائی جاؤ تے اُتوں رولا پائی جاؤ

پیچھے بیٹھ کے فتنے کی ڈور کو ہلاتے رہو
پوری طرح پارسا بن کے عوام کو خوب ستاؤ
قوم کا رونا خود بھی روتے رہو اور ساری دنیا کو بھی رلاتے جاؤ
بس کھاتے جاؤ اور اوپر اوپر سے شور بھی مچاتے رہو!

کرے جو مطالبہ نظام اسلام دا
بنے دلدار جیہڑا اللہ والے نام دا
فتوے غدار والا اوس تے لگائی جاؤ
کھائی جاؤ کھائی جاؤ تے اُتوں رولا پائی جاؤ

جو کوئی بھی اسلامی نظام کا مطالبہ کرے
اور اللہ کے نام کا شیدائی بن جائے
اس پر غداری کا فتوے لگاتے جاؤ
بس کھاتے جاؤ اور اوپر اوپر سے شور بھی مچاتے رہو۔

عمل دے میدان وچ قدم بھاویں دھرو نہ
ایہہ ودعے کرن لگے ڈھل ذرا کرو نہ
سبز باغاں والے خواب لوکاں نوں وکھائی جاؤ
کھائی جاؤ ——————

عمل کے میدان میں چاہے آپ قدم نہ دھریں،
لیکن وعدے کرنے میں کوئی دیر اور کوتاہی نہ کریں،
بس عوام کو سبز باغوں کے خواب دکھاتے جائیے،
اور پھر کھاتے جائیے ——————

اندر بہ کے گھڑو پاکستان دے قانون نوں
کسے نوں وکھاؤ نا ایں اوہدے مضمون نوں
عمل ویلے دھکو دھکی سراں تے چڑھائی جاؤ
کھائی جاؤ ——————

در پردہ بیٹھ کر پاکستان کا دستور بناتے جائیے،
اور کسی کو اس کے نفس مضمون سے واقف نہ کیجئے
جب عمل کا وقت آئیگا تو جبرو تشدد سے اسے عوام پر ٹھونس دیں گے۔
بس کھاتے جائیے ——————

آگیا اے ہُن نواں دور دنیا تے نواں ایں
جناں اسلام تیاں جناں ہند جمال ایں
اپنے کرتے نُوں مولوی چلائی جاؤ
کھائی جاؤ ——————

اب دنیا میں ایک نیا دور نمودار ہو رہا ہے
اب بغیر اسلام کے آپ کی بات نہ بنے گی
بس کرتے پر اپنے مولویوں کو خوب استعمال کیجئے
اور کھاتے جائیے —— ——————

پھیر اُدہنوں کریئے کی؟ ـــــــــ

ڈھگا جو ہل چلاندا نہیں
کھوہ دے وی نیڑے جاندا نہیں
پٹھے وی ماڑے کھاندا نہیں
پر کم ول پھیرا پاندا نہیں
سمجھاؤ ساکوں جی!
پھیر ادہنوں کریئے کی؟
کئی بنگلیاں وچ رہندے نے
تنخواہ ہزاراں لیندے نے
اوہ کردے نہیں جو کہندے نے
پر آگو بن بہی بہندے نے
روہڑن پئے دوھڑ تگھی
اونہاں نوں کریئے کی!

جو بیل ہل نہ کھینچتا ہو،
جو رہٹ کی طرف بھی منہ نہ کرے،
چارہ بھی گھٹیا کھانے پر تیار نہ ہو،
لیکن کام کے قریب بھی نہ پھٹکے
ہمیں یہ سمجھایئے تو جناب!
کہ پھر ہم اسے کریں کیا؟
کئی بڑے لوگ جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں،
ہزاروں روپے تنخواہ لیتے ہیں،
جو کچھ دعوے کرتے ہیں، ان پر عمل نہیں کرتے،
لیکن ہر حال میں آگے ہی آگے ہو کے بیٹھتے ہیں۔
وہ دھڑ گھی مسلسل لنڈھا رہے ہیں۔
آخر ہم ان کو کیا کریں؟

"سکھ جو پچاوے ناں اوہ بھلا سرکار کی؟": ـــــــــ

پھل نہ کھڑاوے جو دسّو اوہ بہار کی
سکھ نہ پچاوے جو اوہ بھلا سرکار کی؟
دکھ نہ گنواوے جو وید اتنا کار کی؟
غم نہ ونڈاوے جو یار غم خوار کی؟
ساکوں اوہدے نال پھیر دسو سروکار کی؟
سکھ جو پچاوے نہ اوہ بھلا سرکار کی؟
چارے کوٹاں دیکھ لو سکھ اے نہ چین اے
وڈی اماں اج کل بنی ہوئی ڈین اے
دکھاں وچہ دنیا ہو گئی سودین اے
ٹھنڈے ہوکے بھر بھر لنگھ جاندی رین اے
رو دن بناں ساڈا ہو دن ڈون نوں ہارکی؟
سکھ جو پچاوے نہ اوہ بھلا سرکار کی

جو پھول کھلا نہ سکے، وہ آخر بہار کیا ہوئی، بتاؤ تو سہی!
جو حکومت سکھ نہ دے سکے وہ حکومت کس کام کی؟
جس کی مہارت مرض نہ دور کر سکے وہ ماہر حکیم کیسے ہوگا؟
جو شریکِ غم نہ ہو، وہ یارِ غم خوار کیسے بن گیا؟
بتاؤ پھر اس کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ؟
جو حکومت سکھ نہ دے سکے وہ حکومت کس کام کی؟
چاروں طرف دیکھ لو کہیں سکھ اور چین نہیں ہے۔
آج کل بڑی اماں بالکل ڈائن بن کے رہ گئی ہیں۔
دکھوں کی ماری دنیا دیوانی بن گئی ہے۔
رات ٹھنڈی آہیں بھرتے بھرتے گزر جاتی ہے۔
اور دن کو رونے کے سوا ہمارا اور کوئی مشغلہ نہیں رہا۔
جو حکومت آرام نہ پہنچا سکے، وہ حکومت کس کام کی؟

پھیر بہاراں آن گیاں :—

انگریزاں دی بوٹی پرانی باگوں جدوں پٹیجے گی
اپھل کھیتی بجھ نکمی کھیتوں باہر سٹیجے گی
پھیر نہ کدی گڈ بیجے گی
راہیں، گلیں، رلیجے گی
پھلاں پھلاں خوشبوآں والیاں شاخاں تازہ وکھالیاں
پھیر بہاراں آن گیاں

انگریزوں کی لگائی ہوئی پود جب ملت کے باغ میں سے اکھیڑ دی جائے گی
اپھل فصل کھیتوں سے باہر پھینک دی جائے گی
اور پھر اس کو کبھی نہ بویا جائیگا،
یہ راستوں اور گلیوں میں پامال ہو جائے گی۔
تو پھر پھلوں پھولوں والی خوشبودار شاخیں اپنے ناز دکھائیں گی۔
گئی ہوئی بہار پھر آئیں گی!

"دیہو جواب"!:—

کس نے خانہ شرع محمدی والا کیتا آن خراب؟
بے دینی بدکاری والے لکھاں کس نے کھولے باب؟
پردیسی بے وطن نمانے کیتے کس نے بھن کباب؟
اس گل دا کجھ دیہو جواب!

شریعت محمدی کو کس نے خانہ خراب کیا ہے؟
بے دینی اور بدکاری کے لاکھوں باب کھولنے والا کون ہے؟
کس کے ہاتھوں بے وطن اور بے سہارا لوگوں کے کباب ہو گئے ہیں؟
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

کنجریں بدکاری دے کون لیسنس عطا کریندا اے؟
ناچ سنے راگ سکھاون والے کون سکول کھولیندا اے؟
توئی، طبلہ، بھنگڑا پاوے کس دا پاکے اذن جناب؟
اس گل دا کجھ دیہو جواب

وہ کون ہے جو بے ہاتھوں۔ طوائفوں کو بدکاری کے لائسنس عطا کرتا ہے؟
پھر وہ کون ہے جو ناچ گانے سکھانے کے لئے سکول کھولتا ہے۔
پھر طبلہ اور شہنائی کس کی اجازت سے ہنگامہ مچاتے ہیں؟
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

قومی لڑکیاں تائیں ایتھے میماں کون بناندا اے؟
ہرنیاں وانگوں چھالاں مارن کیہڑا سبق پڑھاندا اے؟
غیرت تائیں انھا کیتا، پیلکے دھوکے دی شراب
اس گل دا کجھ دیہو جواب

قوم کی بچیوں کو کون ہے جو میمیں (لیڈیاں) بنا رہا ہے؟
یہ جو ہرنیوں کی طرح کلیلیں بھرتی پھرتی ہیں، آخر ان کو یہ سبق کس نے پڑھایا ہے؟
یہ کون ہے جس نے دھوکے کی شراب پلا کر غیرت کو اندھا کر دیا ہے؟
اس بات کا کوئی جواب دیجئے

اک لکھ پچی ہزار روپے دا صاحب بہادر لیندا اے
دیہاڑی دیہاڑی عاماں لوکاں تائیں مشکل پیندا اے
اسلامی ہمدردی والا رہیا نہ باقی ادب آداب
اس گل دا کجھ دیہو جواب

صاحب بہادر یعنی گورنر جنرل ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ سالانہ تنخواہ لیتے ہیں
عام لوگوں کے حصے میں دو وقت کی روزانہ بھی مشکل سے پہنچتی ہے۔
اسلامی اخوت کا طور طریق ختم ہو گیا!
اس بات کا کوئی جواب دیجئے!

جائے۔ جو بعض اوقات انسان کو صحیح راستہ پر چلنے میں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔

مولانا اصلاحی زندگی کو ایک آرٹ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سلیقہ، شائستگی اور نفاست سے زندگی میں حسن پیدا کیا جا سکتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوری زندگی نفاست سے بھرپور ہے۔ وہ عمدہ غذا کے شائق ہیں۔ وہ صاف ستھرا لباس استعمال کرتے ہیں اچھے قلم سے لکھتے ہیں۔ عمدہ اور منتخب کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ اپنے استعمال کی چیزوں میں شرکت گوارہ نہیں کرتے۔ گھر میں ان کی ایک جداگانہ مملکت ہوتی ہے۔ جس میں بیوی بچوں کو پر مارنے کی بھی مجال نہیں ہے۔ مشترک استعمال کی چیزوں میں بھی وہ توحید کے اصولوں کے قائل ہیں بچوں اور امور خانہ داری سے سخت گھبراتے ہیں۔ حالانکہ ماشاء اللہ پانچ بچوں کے باپ ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے مقامات پر رہے جہاں بدقسمتی سے وہ بیوی بچوں کو ساتھ نہیں رکھ سکے۔ دوسری وجہ ان کی کم آمیزی ہے۔ وہ زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے طبیعت ذرا تیز واقع ہوئی ہے۔ بعض اوقات ناگوار باتوں پر سختی سے جھڑک بھی دیتے ہیں۔ گندے اور بدسلیقہ آدمی سے انہیں بڑی نفرت ہے۔

چراغِ راہ کا "اسلامی معاشیات نمبر"

— (خاکہ مضامین مطلوبہ) —

اخبارات و جرائد کی مستقل روایات میں یہ چیز داخل ہو چکی ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً خاص نمبر نکالے جائیں، یہ خاص نمبر مالکان جرائد کے لئے بھی ذریعۂ منفعت ہوتے ہیں۔ اور پبلک کے لئے بھی ذہنی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لیکن "خاص نمبروں" کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اکثر خاص نمبر بہت ہی عامیانہ سے ہوتے ہیں۔ اور ایسے خاص نمبروں کی تعداد بہت ہی کم نظر آتی ہے جنہیں ہر لحاظ سے قابلِ قدر سمجھا جا سکے۔ بہ حیثیت مجموعی ہمارے خاص نمبروں کا معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا ہونا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے خاص نمبروں کا محور کوئی عالی قدر مقصدیت نہیں ہوتی۔ بلکہ بالعموم ان سے جرائد کی مقبولیت مطلوب ہوتی ہے۔ اور پھر جن حضرات کے سامنے علم و ادب کی خدمت کا مقصد بھی ہوتا ہے۔ وہ بھی خاص نمبروں کی ایک خاص بنی بنائی ڈگر پر چلنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے خاص نمبروں کے کچھ ادبی موضوعات تو بالکل اٹل قسم کے بن گئے ہیں۔ مثلاً "افسانہ نمبر" "ڈرامہ نمبر" "اقبال نمبر" وغیرہ۔ یہی حال "نوروز نمبر" "سالگرہ نمبر" اور "سالنامہ" کے موضوعات کا ہے۔ پھر "آزادی نمبر" "استقلال نمبر" وغیرہ سیاسی موضوعات بھی اپنی مستقل جگہ بنا چکے ہیں۔ پھر بعض جرائد وقتاً فوقتاً بعض خاص شخصیتوں کے نام پر خاص نمبر نکالتے رہتے ہیں۔ مثلاً "قائد اعظم نمبر" اس طرح خاص نمبروں کی تاریخ ایک کولہو کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے۔ اس تاریخ کو بعض جرائد نے گزشتہ دو سال میں نئے راستے بھی دکھائے ہیں۔ مثلاً لاہور کے ایک روزنامے نے دستور نمبر نکال کر اپج کا مظاہرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں سہ روزہ کوثر لاہور نے "قرار دادِ مقاصد نمبر" نکال کر جدت کی ایک نئی شاہراہ کھول دکھائی ہے۔ پھر "حیاتِ نو" دکن نے "اشتراکیت نمبر" پیش کر کے ذوقِ جدت کا اچھا مظاہرہ کیا اسی طرح "چراغِ راہ" کو خدا نے یہ توفیق عطا فرمائی کہ اس نے "قیادت نمبر" شائع کر کے ایک نیا مقام پیدا کیا۔ اس خاص نمبر کی انتہائی مقبولیت کے پیشِ نظر یہ خیال دل میں پرورش پاتا رہا ہے کہ اب اس سے زیادہ بلند موضوع پر اور زیادہ اونچے معیار کا کوئی خاص نمبر ملک و ملت کے سامنے پیش کیا جائے جس میں قیادت نمبر سے بھی بڑھ چڑھ کر مقصدیت موجود ہو۔

چنانچہ برابر غور و فکر کرنے کے بعد ذہن ایک نئے موضوع پر مرتکز ہو گیا۔ وہ موضوع تھا "اسلامی معاشیات نمبر" کا۔ اس موضوع سے ہمارے تین مقاصد وابستہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس سوال کا ایک ٹھوس اور حتمی جواب دیا جا سکے کہ کیا اسلام کا کوئی معاشی نظام ہے؟ اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ یہ واضح کیا جا سکے۔ کہ فی الواقع اسلام کے معاشی اصول اس قابل ہیں کہ وہ موجودہ دور کے پیچ در پیچ معاشی مسائل کو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مقابلے میں زیادہ کامیاب اور بہتر طریق سے حل کر سکتے ہیں۔ اور جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی معاشیات کے فلسفہ و نظام کو ایک سائنس کی شکل میں مرتب کر کے پیش کیا جا سکتا ہے تیسرے یہ کہ پاکستان کی زیرِ تشکیل اسلامی ریاست کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں پر استوار کرنے اور تقسیمِ دولت کے طریقہ کو

کتاب وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لئے ... ایک جامع اسکیم ... کا ... ضروری مواد یکجا ہو جائے۔ ضمناً اس نمبر سے ایک فائدہ یہ بھی مدنظر ہے کہ جدید علم معیشت (Economics) کے ماہرین اور طلباء کو معاشی مسائل کے متعلق اسلام کی روشنی بہم پہنچ جائے۔ اور دوسری طرف ہمارے علماء دین کو جدید علم معیشت کے ضروری پہلوؤں کا تعارف حاصل ہو جائے نیز فریقین کو دو طرفہ علمی مآخذ اور اصطلاحات کے بارے میں خاص معلومات مل جائیں۔ تاکہ دونوں اسلامی علم معیشت کی تدوین اور اسلامی نظام معاشی کے تعمیر میں تعاون کرنے کی صلاحیت کو نشوونما دے سکیں۔

ان مقاصد کے ساتھ جب موضوع کی اہمیت پر غور کیا۔ تو بہت مشکل سے یہ حوصلہ پیدا ہو سکا کہ اس موضوع پر خاص نمبر نکالنے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود مرتب چراغ راہ کو اپنی علمی بے بضاعتی کا پورا احساس ہے۔ خصوصاً اس موضوع کے متعلق جو پیش نظر ہے۔ علاوہ بریں گوناگوں مصروفیات کا ہجوم اتنا ہے۔ کہ اتنی بڑی ذمہ داری سر لیتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے لیکن مقصد کی محبت بہرحال میں آگے لپکنے پر مجبور کرتی ہے ؎

یہ میری پروانے کی سی فطرت اُڑائے جاتی ہے آگے آگے
کہیں اُفق کے قریب شاید کہ شمع کوئی جھلک رہی ہے

دوسری طرف یہ سوال بھی قابل غور تھا کہ اپنے قلمی رفقاء جو ایک طرف اپنی روزی کمانے سے فرصت نہیں پاتے اور دوسری طرف جن کو اپنے آرام کے لمحات میں سے بڑا حصہ تحریک اسلامی کی سرگرمیوں میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ آخر مخصوص موضوعات پر لکھنے کے لئے مطالعہ و فکر کرنا چاہیں بھی تو وقت اور قوت کہاں سے لائیں گے۔ پھر ان میں معاشیات سے براہ راست دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد بھی کم ہے۔

تیسری طرف یہ مسئلہ بھی زیر تو جہ تھا کہ اگر اپنے حلقے کے رفقاء اسلامی معاشیات نمبر میں اپنا حصہ ادا کر کے کا حق پوری طرح ادا کر بھی دیں تو بھی موضوع ایسا ہے کہ باہر کے اسلام پسند ماہرین معاشیات سے مضامین حاصل کئے بغیر "نمبر" کبھی مکمل نہ ہوگا۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ باہر کے بڑے بڑے اہل قلم سے کوئی کام لینے کے لئے محض خدمت اسلام کا جذبہ کافی محرک ثابت ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ اور پھر کیا معلوم کتنے ہی حضرات کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی فکری اختلاف اور کوئی سیاسی مصلحت حائل ہو کر ہماری اسکیم کو تکمیل سے محروم کر دے گی۔

ہماری چوتھی مشکل سرمایہ کی مشکل ہے۔ ایک اہم اور وسیع علمی موضوع پر ایک ضخیم اور معیاری نمبر شائع کرنے کے لئے صرف زر کثیر ناگزیر ہے۔ اور یہاں ہر لحظہ یہ کیفیت کہ "زر می طلبی سخن دریں است"۔ ہمارے پاس اگر کوئی سرمایہ ہے تو صرف ایمان، جذبۂ صادق اور محبت مقصد کا ہے۔ بحمد اللہ اس سرمائے کے ہوتے ہوئے ہمارا کوئی کام کبھی مادی سرمائے کی کمی کی وجہ سے نہیں اٹکا۔ اور چراغ راہ کے اسلامی معاشیات نمبر کی اشاعت بھی انشاء اللہ محض روپے کی کمی کی وجہ سے نہ رکے گی۔ روپے کی کمی کو ہمارے رفقائے حلقہ کا احساس ذمہ داری اور جذبۂ تعاون پورا کرے جائے گا۔

ان ساری مشکلات کا جائزہ لینے کے بعد بہت بڑی حد تک توکلاً علی اللہ ایک ایسے خاص نمبر کا اعلان کیا جا رہا ہے جسے اگر ہم بتائید ایزدی اپنے سوچے ہوئے نقشے اور معیار پر نکال سکے تو خاص نمبروں کی تاریخ میں ہمارا یہ نمبر ایک سنگ میل بن کر نصب ہو جائے گا، اور اس کے ذریعے ہمارے ملک کے جرائد کو خاص نمبروں کے لئے ایک نئے میدان کی طرف رہنمائی مل جائے گی۔

اسلامی معاشیات نمبر کے بارے میں مضمون نگار حضرات کے لئے حسبِ ذیل گزارشات قابلِ لحاظ ہیں:۔

(۱) یہ نمبر اگر ممکن ہو تو ہم یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ حتی الوسع ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء تک مقالات مرتب کے پاس جمع ہو جانے چاہئیں۔ بعض اصحاب اگر ناگزیر وجوہ کے تحت تاخیر پر مجبور ہو جائیں۔ تو ان کے لئے زیادہ سے زیادہ یکم اکتوبر تک کی مہلت ہوگی۔ لیکن یکم اکتوبر یا اس کے بعد آنے والے مضامین کو پورے مجموعے میں مناسب جگہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اور ترتیب معیاری نہ رہے گی۔

(۲) مقالات بہرحال ضروری مطالعہ کے بعد ہی لکھے جائیں۔ اور محض قلم برداشتہ قسم کے مضامین کو کم سے کم اس خاص نمبر میں شریک نہ کیا جاسکے گا: کیونکہ اسلامی معاشیات کے موضوع پر اگر سرسری قسم کی تحریریں ہم نے پیش کیں۔ تو اس سے چراغِ راہ ہی کی شہرت خراب نہ ہوگی۔ بلکہ خود اسلام اور اسلام کے معاشی فلسفے و نظام کی ہیٹی بھی ہو سکتی ہے۔ پس اس نمبر کے مقالہ نگاروں کو وقت دینا ہوگا۔ اور عرق ریزیاں کرنی ہوں گی۔

(۳) مقالہ نگاری میں حتی الوسع اجمال بھی ملحوظ رہے۔ لیکن نہ اس حد تک کہ بحث ادھوری اور تشنہ رہ جائے۔ بلکہ موضوع کا حق ادا کیا جائے۔ اور اس پر کہنے کے لئے آپ کے پاس جو کچھ ہو اتنا لازماً کہہ دیا جائے۔ ہم موضوع کی ضروریات کے مطابق ضخامت کو بڑھا سکتے ہیں۔

(۴) مقالہ نگاروں پر یہ پابندی نہیں ہے کہ وہ کس زبان میں اپنا مقالہ قلم بند فرمائیں۔ اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں سے جس میں لکھنے والے کو اظہارِ خیال کی زیادہ قدرت ہو وہ اس میں مقالہ لکھیں۔ چراغِ راہ کے پڑھنے والوں میں تینوں زبانوں سے دلچسپی لینے والے اصحاب شامل ہیں۔

(۵) جملہ مقالہ نگار حضرات اپنے مقالوں میں جتنی اصطلاحات کو استعمال فرمائیں۔ چاہے وہ جدید علم المعیشت سے متعلق ہوں یا اسلامی معاشی فقہ سے متعلق، سب کا ایک انڈکس (حروفِ تہجی کی ترتیب کے ساتھ) مرتب کرکے شامل کر دیں۔ جس میں ہر اصطلاح کی ضروری وضاحت درج ہو۔ اس طرح پورے نمبر میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کا ایک مکمل انڈکس مرتب ہو کر شریکِ اشاعت ہو جائے گا۔ یہ چیز بہت بڑی افادیت کی حامل ہوگی۔ علاوہ بریں انگریزی قاعدے کے مطابق جتنے مخففات (Abbreviations) استعمال کئے جائیں ان کی توضیح کے لئے بھی انڈکس شامل کر دیا جائے۔ نیز دنیا کے مختلف سکوں (coins) یا اوزان کے جن پیمانوں کا تذکرہ آئے، وہ چاہے حال کے ہوں یا ماضی کے ان کی قیمتیں اور وزن وغیرہ بھی انڈکس میں واضح کر دینے ضروری ہیں۔ اس سے قارئین کو بہت ہی سہولت ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس جن کتابوں سے مقالہ نگاری میں مدد لی گئی ہو یا جن کا حاصل مطالعہ مضمون کے پس منظر میں کام کر رہا ہو۔ ان کی فہرست بھی بھیجی جائے۔ جس میں ہر کتاب کے مباحث کا چند سطری تعارف شامل ہو۔ اس سے قارئین کو ماخذ کا پورا پورا تعارف ہو جائے گا۔

(۶) مقالات کے لئے جو خاکے بطور مشورہ پیش کئے جا رہے ہیں ان کا مقصد صرف ایک آئیڈیا دینا ہے۔ ورنہ مقالہ نگار کے لئے ضروری نہیں کہ وہ شوشہ بہ شوشہ ان کی پابندی کرے۔ اصل مطلوب یہ ہے کہ مضامین کی روح صالح اور ان کی بحث کی سمت صحیح اور ان کا استدلال جامع ہو۔ خاص طور پر یہ اہتمام رہے کہ:۔

(۱) مروجہ نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ اشتراکی کے طرزِ فکر سے بالکل الگ ہو کر ایک آزاد اسلامی ذہنیت کے

ساتھ سوچا جائے تاکہ پڑھنے والا یہ محسوس کرے کہ میں کسی نئے طرزِ فکر کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

(ب) ہمارے ذہنی ماحول میں جو غیر اسلامی تصورات جڑیں چھوڑے ہوئے ہیں ان کا تجزیہ کرکے نشترِ تنقید کو حرکت میں لایا جائے۔

(ج) آجکل بالعموم جو سوالات اسلامی معیشت کے بارے میں پائے جاتے ہیں ان کو ساتھ کے ساتھ صاف کر دیا جائے۔

(د) حتی الوسع اس کا لحاظ رکھا جائے کہ علم معیشت کے طلباء مضامین سے پورا پورا استفادہ کر سکیں۔

(۷) مقررہ موضوعات سے آزاد ہو کر اپنے پسندیدہ موضوعات پر اگر کچھ اصحاب اپنے فکر و تحقیق کے نتائج پیش کرنا چاہیں تو ہماری طرف سے آزادی ہے۔ اس آزادی کی انتہا یہ ہے کہ ہم اسلام کے صحیح طرزِ فکر سے ہٹ کر تیم اسلامی یا غیر اسلامی نقطۂ نظر سے معاشیات پر قلم اٹھانے والوں کو بھی موقع دینا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اپنے نتائج افکار سامنے لا سکیں ــــــ البتہ اس قسم کے مضامین کو ایک جداگانہ شعبے میں درج کیا جائے گا۔

(۸) انگریزی مضامین ٹائپ کئے ہوئے ہوں تو بہتر ہو گا۔ اور اردو مقالات اچھے کاغذ کے صرف ایک طرف کھلا حاشیہ چھوڑ کر خوش خط لکھے جائیں۔ نیز عنوان بندی، علاماتِ وقف اور پیراگراف کے آغاز کو نمایاں کرنے کا خاص اہتمام کیا جائے

(۹) اس خاص نمبر کے لئے جتنے مقالات ہمیں موصول ہوں گے۔ ان کا حق تالیف (Royalty) مقالہ نگاری کو حاصل رہے گا۔ البتہ ہر مقالہ جو ہمیں موصول ہو اس کے متعلق مولف کی جانب سے ہم اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھیں گے کہ اسلامی معاشیات نمبر کے کتابی ایڈیشن میں بھی اسے شائع کرتے رہیں

(۱۰) جن اصحاب کے مضامین اس نمبر میں شریکِ اشاعت ہوں گے۔ ان کی خدمت میں اس کی دو دو کاپیاں ہدیۃً پیش کی جائیں گی۔

(۱۱) ذیل میں مضامین کے عنوانات کی فہرست مختصر خاکوں کے ساتھ درج کی جا رہی ہے۔ ان عنوانات میں سے اہلِ قلم حضرات اپنی اپنی دلچسپیوں کے مطابق ایک یا ایک سے زائد کو منتخب فرما سکتے ہیں۔ لیکن بعض عنوانات ایسے بھی ہیں جن پر لکھنے کی صلاحیت ہماری نگاہ میں بعض خاص اصحاب ہی کو حاصل ہے۔ اور ان سے بہتر دوسرے لوگ ہمارے سامنے نہیں ہیں لہذا ایسے عنوانات کے بارے میں خود ہم جن حضرات سے درخواست کریں وہ اگر ہماری درخواست کو قبول فرما لیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔

فہرست مقالات مطلوبہ (مع خاکہ ہائے مباحث)

قسم اوّل

اسلامی فلسفہ معاشیات (Muslim Ideology Of Economics)

مقالہ (۱) دنیا کے معاشی تصورات کی تاریخ ارتقاء (اسلامی نقطۂ نظر)

- معاشی فلسفوں اور عقیدوں کی تاریخ کے مختلف دور
- اُن پر تبصرہ اور تنقید
- اسلام کے معاشی نظریے کا تعارف دوسرے نظریوں سے مقابلہ کرتے ہوئے وجوہ اختلاف کو واضح کرتے ہوئے۔

مقالہ (۲) معاشیات کے اسلامی اصول

(مولانا مودودی کی تشریحی تقریر کے ساتھ تشریحی نوٹ لکھ کر پیش کرنے کی ضرورت ہے)

مقالہ (۳) عقیدہ، اخلاق اور معاش۔

- پیدائش دولت کے دوگونہ عوامل (Factors)

ا۔ مادی ــــ سرمایہ، ذرائع و وسائل، آلات، انسانی جسمانی قوی وغیرہ

ب۔ غیر مادی۔ علم، تجربہ، تنظیم، اصول و ضوابط خیالات، جذبات، اخلاق۔

- بنیادی عقائد کے دور رس اثرات فلسفہ و نظام معاشیات پر
- معاشیات میں اخلاق کی مداخلت
- اخلاقیات کی دو نوعیتیں اور ان دونوں کے معاشی اثرات کا جائزہ

ا۔ وہ اخلاقیات جو احترام حقوق پر مبنی ہوں

ب۔ وہ اخلاقیات جو مفاد پرستی (Utilitarianism) پر مبنی ہوں۔

(اول الذکر پیداوار دولت کو بڑھانے اور تقسیم دولت کی صحت کا وسیلہ ہیں ثانی الذکر پیداوار اور دولت کو گھٹانے اور تقسیم دولت کے فساد کا وسیلہ ہیں۔

مقالہ (۴) مسلمانوں کے نظریات معاشی اور نظام معیشت کی تاریخ

- عرب سوسائٹی اسلام سے قبل (معاشی نقطۂ نگاہ سے)

ا۔ اس کے اچھے پہلو۔

ب۔ اس کے برے پہلو۔

- اسلام کا با اخلاق اور پرامن معاشی انقلاب (ان تبدیلیوں کا جائزہ جو اسلامی انقلاب کے تحت روایات اخلاق، قانون اور خاندانی و معاشرتی زندگی میں رونما ہوئیں اور جن کی وجہ سے معاشی ناہمواریوں کے وجوہ و اسباب کا خاتمہ ہوگیا)

- دور نبوت کی مسلم سوسائٹی کا معاشی طرز فکر
- مسلم سوسائٹی میں معاشی ردعمل کی پہلی حرکت (فتنۂ مانعین زکوٰۃ کی وضاحت)
- دورِ خلافت راشدہ میں اسلامی معاشی نظام کی تکمیل۔

ا۔ عوام کی معاشی حالت کا تحقیقی جائزہ

ب۔ خلفاء راشدین کی معاشی پالیسی (تنخواہیں، وظائف، تقسیم غنائم، جاگیروں کے بارے میں طرز عمل۔ زراعت اور رفاہ عامہ وغیرہ)

- دور عثمانی میں حضرت ابوذر کے نظریۂ کفاف کا ظہور

ا۔ حضرت عثمان کی پالیسی کے معاشی پہلو

ب۔ حضرت ابوذر کا نقطۂ نظر اور اس سے صحابہ کا اختلاف

ج۔ فریقین کے نقطۂ نگاہ پر تبصرہ

- خلافت راشدہ میں بیت المال کا مقصد اور اس میں تصرف کے اصول۔
- خلافت راشدہ کے بعد اسلامی نظام معیشت میں چند دور رس تبدیلیاں

ا۔ مظاہرہ شان و شوکت

ب۔ مخصوص شاہی حقوق کا ظہور

ج۔ بیت المال میں بے باکانہ تصرفات کا آغاز

د۔ نمائش، تکلفات اور اسرافیات کا سوسائٹی میں فروغ

- حضرت عمر بن عبدالعزیز کی معاشی اصلاحات (اور ان کے فوری نتائج کا جائزہ)

● قرونِ مابعد میں معاشی مفسدات کا مزید ارتقاء
ا۔ ملوکیت اور اس کی پیدا کردہ ناہمواریاں
ب۔ جاگیرداری کا ظہور اور اس کا ارتقاء
ج۔ عوام سے حکومتوں کے مالی مطالبات
اور ان کی مختلف صورتیں
د۔ ہندوستان میں مسلم سلطنت (معاشی نقطۂ نظر سے)

● ائمہ فقہا کا معاشی مسائل میں طرزِ فکر (Approach)
ا۔ ابنِ خلدون اور معاشی مسائل
(ب) حنفی اسکول
ج۔ امام ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم۔ ابنِ حزم ظاہری
د۔ شاہ ولی اللہ دہلوی
ہ۔ مالیات و معاشیات پر اسلامی لٹریچر
(کتاب الخراج۔ کتاب الاموال۔
کنز العمال وغیرہ پر تبصرہ)
و۔ مختلف ادوار میں معاشی مسائل میں اجتہاد

● مغربی سرمایہ داری کا نفوذ مسلم ممالک میں (دورِ حاضر)
● مسلم ممالک میں معاشی پستی اور معاشی ناہمواریوں کا نقشہ
● کمیونزم کا ظہور اور مسلمانوں کے ذہین طبقوں پر اس کے
مختلف اثرات:۔
ا۔ جدید طبقے پر۔ علماء پر
ب۔ لٹریچر اور صحافت کی فضا میں فکری کشمکش
ج۔ کمیونزم کی مدافعت میں سرگرم عناصر کا
اول۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت، اسلامی پیرایہ میں
دوم۔ خالص مسلم ذہنیت
سوم۔ کمیونزم سے مرعوب اور شکست خوردہ
ذہنیت

قسمِ دوم:۔

اسلامی علمِ معیشت کی تدوین کیلئے ضروری مواد

مقالہ (۱) اسلامی علمِ معیشت

● تمہیدی امور:۔
ا۔ اسلامی علمِ معیشت کی تدوین کی ضرورت
اور اب تک کے علمی کام کا جائزہ
ب۔ اسلامی علمِ معیشت کے بحیثیت سائنس
ارتقاء نہ کرنے کی اصل وجہ (نظامِ اسلامی
کا سقوط)
ج۔ سرمایہ داری اور کمیونزم کے مقابلے میں اسلامی
معاشیات کی مخصوص اور مستقل حیثیت
د۔ بنیادی اصول اور اجتہاد کا میدان
ہ۔ علمِ معیشت کا تعلق دوسرے علوم کے ساتھ
(معاش کا مقام زندگی میں)

● تعارفِ مسئلہ:۔
ا۔ علمِ معیشت کا اصل منشاء
ب۔ معاشیاتِ انسانی میں قوانینِ فطرت کا دخل
ج۔ مختلف معاشیاتی مدارسِ فکر کے مقابلے میں
اسلامی مکتبِ فکر کا مقام۔

1. Liberal School.
2. Socialist School.
3. State Socialism School.
4. Christian Social Reform School.
5. The Solidarity School.
6. Others.

● پیدائشِ دولت:۔
ا۔ عواملِ پیدائش:۔ (اسلامی احکام و
حدود کی روشنی میں)
(۱) عطیاتِ فطرت
(۲) محنت

(۳) سرمایہ۔

ب۔ پیدائش دولت کے لئے تنظیم بندی۔

(۱) پیدائش دولت میں انضباط (Regulation)

(۲) تقسیم کار (Division of Labour)

(۳) پیدائش دولت کا ارتکاز (concentration)

(۴) پیدائش دولت کیلئے اتحادکار (Association)

—— اہل سرمایہ میں

—— اہل محنت میں

(۵) پیدائش دولت بذریعہ "ریاست"

● گردش دولت۔

ا۔ تبادلہ کے اصول اور اس کی تاریخ (اسلامی اصولوں کی وضاحت)

(۱) بارٹر سسٹم

(۲) خرید و فروخت کا طریقہ

(۳) قیمت بہ حیثیت ذریعہ تبادلہ

(۴) طلب و رسد کا قانون وغیرہ

ب۔ وسائل و رسائل

ج۔ تجارت اور تجارت (اسلامی ضابطہ تجارت اور اس کا عملی مسائل پر انطباق)

د۔ زر (آلی سکے اور نقدی کا نظام (ضمناً زر کاغذی پر بحث)

س۔ بین الاقوامی تبادلہ (اس کے مفاسد اور مطلوبہ اصلاحات)

(۱) اس کی صورتیں

(۲) توازن تجارت کا مفہوم

(۳) توازن حسابات

ص۔ تجارتی پالیسی (تنقیدی جائزہ و اصلاحات)

(۱) مروجہ بین الاقوامی تجارت میں مختلف ممالک کی پالیسی پر تبصرہ

(۲) بین الاقوامی تجارت میں تحفظاتی مسلک

(۳) آزاد تجارت کا مسلک

(۴) تجارتی معاہدات

(۵) محصولات۔

ص۔ گردش دولت اور تبادلہ تجارت میں بنکنگ کا مقام۔

(۱) موجودہ بنکنگ کی تھیوری اور اس کی بین الاقوامی تاریخ۔

(۲) اس پر مسلمان کی نگاہ سے تبصرہ و تنقید

(۳) اسلامی بنکنگ سسٹم کے لئے بنیادیں۔

● تقسیم دولت۔

ا۔ تقسیم دولت کے مختلف اصول (سرمایہ دارانہ اور اشتراکی)

ب۔ ان اصولوں پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید۔

ج۔ اسلام کا اصول تقسیم۔ (ہر ایک سے اس کی قوت و صلاحیت کے مطابق، ہر ایک کو اس کی خدمت کے مطابق —— لیکن کم از کم اتنا جو پانچ بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے)

● دولت کے مختلف حصہ دار (موجودہ نظام میں —— اور اسلامی نظام میں)

ا۔ زمیندار (زمین، مزارعت، لگان، جاگیرداری وغیرہ پر بحث)

ب۔ سرمایہ دار بحیثیت مہاجن (سود پر بحث)

ج۔ مزدور (۱۔ صنعتی مزدور ۲۔ زرعی مزدور ۳۔ ملازم)

د۔ متاجر بحیثیت تقسیم کنندۂ دولت۔

(Enterpreneur) (منافع اور نقصان تقسیم منافع پر گفتگو)

س۔ ریاست (تقسیم دولت میں ریاست کا دخل اور ٹیکسیشن وغیرہ)

● صرفِ دولت

ا۔ مصارف (جائز و ناجائز) اسلام کے قوانین۔ (صارفین Consumers کی تشکیلیں اور اس کے مقاصد)

ب۔ مصارف کی ترجیحات۔

(۱) ضروریاتِ زندگی { غذا ۔ لباس ۔ مکان / صحت ۔ تعلیم ۔ تفریح

(۲) تعیشات اور ان کی مختلف صورتیں

(۳) انفاق فی سبیل اللہ (افراد اولاد اور بیت کیلئے)

(۴) مصارف کی تحدید میں ریاست کا طریق کار

(۵) اجتماعی مصارف۔

ج۔ بچت ۔ اس کی مختلف صورتیں اور اس کے اوقات۔

● پوری بحث کا ماحصل

ا۔ اسلامی معاشیات اور غیر اسلامی معاشیات میں بنیادی اختلافات کی نشاندہی

ب۔ اسلامی معاشیات کے اصلح تر ہونے کے دلائل و وجوہ

ج۔ موجودہ مسائل معاشی اور اسلامی اصولِ معیشت۔

مقالہ (۲) مسلم معاشیات

● ابتدائی مباحث (مقالہ (۱) کے مطابق)

● کمائی (اور آمدنی)

ا۔ بذریعہ سرمایہ { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں

ب۔ بذریعہ محنت { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں

ج۔ سرمایہ و محنت دونوں کے مشترکہ استعمال { زراعت میں / تجارت میں / صنعت میں

(کتاب و سنت کی تصریحات کے مطابق کمائی میں حلال و حرام

(حلال کا تعین)

● مصارف (جائز و ناجائز صورتیں)

ا۔ ذاتی مصارف (اشیاء اور خدمات کی خریداری)

ب۔ دوسروں کے حقوق (زیرِ کفالت افراد کے حقوق، قرابت داری، حق الجار کی ادائی، امداد حاجتمندوں)

ج۔ ریاست اور سوسائٹی کے اجتماعی مطالبات (صدقات ٹیکس، چندے ۔ دماغی و جسمانی خدمات)

● بچتیں

ا۔ بچتیں بطور کنز

ب۔ بچتوں کا استعمال مزید کمائی کے لئے۔

ج۔ بچتوں میں دوسروں کے حقوق

د۔ بچتیں اور حق ملکیت۔

ہ۔ قانونِ وراثت۔

قسم سوم:۔

(مخصوص جامع مباحث)

مقالہ (۱) اسلامی نظام میں مالیاتِ ریاست

● خلافتِ راشدہ کے مالیاتی نظام پر ایک نظر

● اسلامی ریاست کی مدات آمد

ا۔ عشر و زکوٰۃ

ب اوقاف

ج چندے

د ٹیکس

ہ۔ غنائم

س۔ فے (قدرتی دفائن و خزائن کی آمدنیاں)

ص۔ جزیہ ٹیکس

ط۔ خراج

ع۔ دیگر آمدنیاں

- اسلامی ریاست میں مدّاتِ صرف
  - ا۔ دفاع
  - ب۔ ایڈمنسٹریشن
  - ج۔ رفاہِ عام
    - (۱) ذرائع رسل و رسائل
    - (۲) ذرائع حمل و نقل
    - (۳) انہار، جنگلات، وغیرہ
    - (۴) تعلیم
    - (۵) صحت
    - (۶) شہریوں کو بارروزگار بنانا۔
    - (۷) ضرورتمند شہریوں کی براہ راست کفالت،
    - (۸) تعمیر معیشت کے مختلف منصوبوں کو عمل میں لانا
- دورِ حاضر کا بجٹ سسٹم اور اسلامی ریاست
- دفاعی اور تعمیری ضروریات کے لئے پبلک سرمایہ کا استعمال
- اسلامی ریاست اور غیر ملکی قرضے۔
- بین الاقوامی مالی تعلقات اور ان کی پیچیدگیاں۔
- موجودہ بنکنگ سسٹم میں انقلاب لانے کی ضرورت۔

مقالہ (۲) سود اور بنکنگ بلا سود

- سُود (...) کی ماہیت اور اسکے معاشی اثرات
  - ا۔ جدید معاشیئین کے نظریات
  - ب۔ اسلامی نقطۂ نظر
- موجودہ بنکنگ پر ایک جامع تبصرہ
  - ا۔ بنکوں کی مفید خدمات
  - ب۔ اخلاقی اور معاشی خرابیاں۔
  - ج۔ موجودہ بنکنگ سسٹم اور نظام سرمایہ داری۔
- اسلامی بنکنگ سسٹم کے لئے مضاربت (حصہ داری نفع و نقصان) کا اصول (اس کی تشریح و توضیح)
- مطلوبہ بنکنگ سسٹم کے لئے ایک جامع اسکیم
- تبدیلی کیسے لائی جاسکتی ہے۔
- بین الاقوامی مالیاتی تعلقات اور مجوزہ بنکنگ سسٹم

مقالہ (۳) اسلامی ضابطۂ تجارت اور موجودہ مارکیٹنگ سسٹم

- تاجر کا مقام مسلم سوسائٹی میں (اور اس کی ذمہ داریاں)
- اسلامی ضابطۂ تجارت (اصول اور ائمہ فقہا کے استنباطات)
  - ا۔ کاروبار کے جائز پہلو
  - ب۔ " " ناجائز پہلو
- اسلامی ضابطۂ تجارت کا انطباق موجودہ نظامِ تجارت پہ
  - ا۔ اندرونِ ملک
  - ب۔ بین الاقوامی طور پہ
- چند متعلقہ مسائل ۔
  - ا۔ تجارت اور ٹیکس
  - ب۔ راشن بندی اور قیمتوں پر کنٹرول
  - ج۔ مارکیٹ کی مستقل نگرانی
  - د۔ بین الاقوامی مقابلہ اور تحفظات

مقالہ (۴) زمین اور اُس سے تعلق رکھنے والے مسائل

- ملکیت زمین کا مسئلہ
- مزارعت اور اس کی جائز و ناجائز صورتیں
  (مزارعین کے حقوق از روئے اسلام)
- اسلام کے زرعی نظام میں مفاسد کا داخلہ اور ان کا ازالہ
- موجودہ جاگیرداریوں پہ تبصرہ
- موجودہ زمینداریوں پہ تبصرہ
- زرعی نظام اور اشتراکیت
- زرعی نظام کے مفاسد کی اصلاح کا اسلامی نقشہ
  - ا۔ ناجائز ملکیتوں کا خاتمہ
  - ب۔ غصب کردہ حقوق کی واپسی
  - ج۔ اسلامی قانونِ وراثت کا نفاذ
- د۔ اجتماعی کاشت (Collective farming)

کا اسلامی طریقہ

- پاکستان کے زرعی اعداد و شمار

مقالہ (۵) محنت کار کی معاشی اہمیت اور اسکے مخصوص مسائل

- پیدائشِ دولت میں محنت کا مقام
- محنت کار بہ مقابلہ سرمایہ دار
(موجودہ پیداواری نظام کا تجزیہ)
- محنت کار کے مخصوص مسائل
  - الف۔ اُجرتیں
  - ب۔ اوقاتِ کار
  - ج۔ صحت، اعضا اور جانوں کے نقصانات کا مسئلہ
  - د۔ مظالم کی مدافعت کا مسئلہ
  - س۔ رہن سہن کا معیار
- ان مسائل کو حل کرنے کے طریقے
  - الف۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت
  - ب۔ اشتراکی نظام کے تحت
- اسلامی نظام کے تحت محنت کار کے مسائل کا حل
  - الف۔ محنت کار کے کم سے کم حقوق
  - ب۔ سرمایہ دار کی ذمہ داریاں
  - ج۔ حکومت اور بیت المال کی ذمہ داریاں
- محنت کاروں کی تنظیمیں اور ان کے طریقہ ہائے کار
- اسلامی اصولوں پر نئی تنظیم حقوق طلبی کی جدوجہد کا صحیح طریقہ

مقالہ (۶) اسلامی قانونِ وراثت اور اس کا معاشیاتی عمل

- اسلامی قانونِ وراثت کی مخصوص نوعیت
(دوسرے قوانینِ وراثت کے مقابلے میں)
- اس کے اصول
- اسلامی قانونِ وراثت کی تفصیلات نئی ریاضی کی روشنی میں
- اسلامی قانونِ وراثت کا معاشیاتی عمل
  - الف۔ موجودہ زمینی و کاروباری املاک میں فوری طور پر

ب۔ ملک کی مجموعی معاشیات میں ۲۰ سال کی مدت میں

مقالہ (۷) تنخواہوں اور اُجرتوں کی شرح بندی کیلئے اسلامی

- اسلام کا اصولِ کفالت اور اس کی توضیح
- دورِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں تنخواہوں کا نظام
اس کی خصوصیات:
  - (۱) ضروریات پوری کرنے کی ضمانت
  - (۲) افرادِ کنبہ کا لحاظ
  - (۳) کم سے کم تفاوت
  - (۴) بڑے عہدیداروں کیلئے مقام
- پاکستان میں معاوضہ بندی اور تنخواہ کے سرکاری اسکیل
اس کے مقاصد:
  - (۱) بڑوں کو ضروریات سے بہت زیادہ
  - (۲) چھوٹوں کو ضروریات سے بہت کم
  - (۳) افرادِ کنبہ کا کوئی لحاظ نہیں۔
- پے کمیشن
- اصلاح کی اسکیم
  - الف۔ ذہنیت کو بدلنے کا اہتمام
  - ب۔ معاوضوں کے تفاوت کو کم کرنے کیلئے تدریجی کوشش
  - ج۔ اسلامی اصولوں پر تنخواہوں کے نئے اسکیل۔
  - د۔ مشکلات اور ان کا حل
- معاوضہ بندی کے اسلامی سسٹم کے دوررس اثرات۔
  - الف۔ معاشی ناہمواریوں میں یک گونہ کمی۔
  - ب۔ افسروں اور ماتحتوں میں بُعد کا خاتمہ
  - ج۔ سرکاری ملازمین اور پبلک کے ربط میں اضافہ
  - د۔ رشوت ستانی میں کمی۔
  - س۔ معاوضوں کے "مارکیٹ ریٹ" میں انقلاب

مقالہ (۸) اسلامی نظامِ معیشت اور زکوٰۃ

- ابتدائی مباحث
  - الف۔ سوشلزم، سرمایہ داری اور زکوٰۃ کا معاشیاتی تقابلی مطالعہ

ب۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں فرق

ج۔ زکوٰۃ بیک وقت حق اللہ بھی ہے۔ اور حق العباد بھی

- ضابطۂ زکوٰۃ :-

ا۔ زکوٰۃ کس پر واجب ہے؟

ب۔ کن اموال پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟

(اور کونسے اموال مستثنیٰ ہیں)

ج۔ کسی مال پر زکوٰۃ کب واجب الادا ہوتی ہے؟

د۔ اموال زکوٰۃ کا نصاب

ہ۔ شرح زکوٰۃ

س۔ زکوٰۃ کے مستحقین اور اس کے مصارف

- چند خاص مسائل :-

ا۔ زکوٰۃ کا انتظام وصول و صرف

(۱) اسلامی حکومت کے ذریعے

(۲) اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو۔ تو صالح نظام جماعت کے ذریعے

(۳) اگر صالح جماعت موجود نہ ہو۔ تو انفرادی طور پر

(۴) براہ راست شخصی طور پر

ب۔ کیا اجتماعی اداروں اور رفاہِ عام کی مدات میں زکوٰۃ صرف ہو سکتی ہے؟

(شرطِ تملیک وغیرہ کی بحث)

ج۔ اسلامی حکومت کا بجٹ اور زکوٰۃ

(کیا زکوٰۃ کے آمد و صرف کا حساب جداگانہ ہوگا)

د۔ صنعتی سرمایہ سے اخذ زکوٰۃ

(کیا مشینری میں لگے ہوئے سرمایہ پر بھی زکوٰۃ ملے گا؟)

ہ۔ کاروباری سرمایہ کی زکوٰۃ کی محسوب کرنے کا موزوں طریقہ۔

س۔ زکوٰۃ اور قرض

ص۔ نابالغ بچوں کی املاک کی زکوٰۃ

ط۔ کیا "صاحبِ نصاب" زکوٰۃ سے استفادہ کر سکتا ہے؟

(۱) اجتماعی ادارت کی صورت

ح۔ کیا غیر مسلم پر زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے؟

ف۔ کیا زکوٰۃ کی رقم ضرورت مندوں کو قرض بھی دی جا سکتی ہے۔

ق۔ کیا ایک بستی، علاقہ اور ملک کی زکوٰۃ دوسری بستی، علاقے اور ملک میں صرف ہو سکتی ہے؟

ک۔ زکوٰۃ سے مستثنیٰ قیمتی اور نفع بخش املاک پر ٹیکس کی ضرورت

(۱) کرایہ کے مکانات پر

(۲) ہیرے جواہرات پر

(۳) سامانِ آرائش اور تعیشات پر

- پاکستان میں زکوٰۃ کا سالانہ اندازہ

(اعداد و شمار کی روشنی میں)

ا۔ کاروباری سرمایہ میں سے

ب۔ خانگی اور بنکوں میں جمع شدہ فاضلات میں سے

ج۔ زیورات میں سے

د۔ مواشی میں سے

ہ۔ زرعی پیداوار میں سے

- زکوٰۃ اور پاکستانی عوام کی ضروریات

ا۔ ہماری قومی دولت اور اس میں سے کم حصہ پانے والوں کا تناسب۔

ب۔ بے روزگاری

ج۔ ضرورت سے کم غذا

د۔ ضرورت سے کم لباس

ہ۔ قلتِ مکانات

س۔ عوام کے لئے حفظانِ صحت کے انتظامات کی کمی

ص۔ ملک کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ

ط۔ معذورین

ع۔ حوادث

- مصرفِ زکوٰۃ کا صحیح بنیادی اسلامی منصوبہ
  ا۔ غیر مالک زراعت پیشہ لوگوں کی امداد
  (۱) زمینیں خریدنے کے لئے سرمایہ کی بہم رسانی
  (۲) بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنانے کے لئے مالی امداد
  ب۔ صنعت کاروں کو کارخانے کھولنے کے لئے دینے کی سکیم
  ج۔ تجارتی سرمایہ فراہم کرنے کی اسکیم
  د۔ معذوروں اور بے روزگاروں کیلئے وظائف
  ر۔ قرضوں اور تاوانوں کی ادائی کے لئے وقتی امداد
  س۔ ناگہانی حوادث کے مقابلے کے لئے مالی امداد۔
  ص۔ رہائشی مکانات کی فراہمی کی اسکیم
  ط۔ بلا معاوضہ معالجہ کا انتظام
  ع۔ عوامی تعلیم و تربیت کے لئے ضروری انتظامات
  ف۔ مسافروں کی ضروریات کا انجام
- نظامِ زکوٰۃ اور کفالتِ عامہ
  (شہریوں کی بنیادی ضروریات کا بیمہ)
- کیا موجودہ حکومت زکوٰۃ کے وصول و صرف کا نظم صحیح طریق پر چلانے کے قابل ہے؟

مقالہ (۹) "قدرِ زائد" اور اس کی تقسیم

- مارکس اور نظریۂ قدرِ زائد (ضروری تشریح)
  (مارکس کی فکری غلطی)
- قدرِ زائد سرمایہ و محنت کے باہمی تعامل کا قدرتی نتیجہ ہے
- قدرِ زائد کی تقسیم:-
  ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں
  ب۔ سوشلسٹ نظام میں
  ج۔ اسلامی نظام میں

مقالہ (۱۰) تقسیمِ دولت کے اصول

- دولت کے مختلف حصہ دار
- دولت کیسے تقسیم ہوتی ہے؟
  ا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں
  ب۔ اشتراکی نظام میں
- تقسیمِ دولت کا عادلانہ اصول
  ہر ایک سے اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق
  اور ہر ایک کو اس کی خدمات کے مطابق
  لیکن ——
  کم سے کم اتنا کہ اسکی بنیادی ضروریات بخوبی پوری ہوں
- عادلانہ تقسیمِ دولت کیلئے حکومت کی ذمہ داریاں

مقالہ (۱۱) اسلامی نظام اور ٹیکس

- اسلامی حکومت اور ٹیکسیشن کی بنیادی پالیسی
  ا۔ ٹیکسوں کا کم سے کم یا کم سے کم مدت کے لئے
  ب۔ ایک مال پر ایک ہی ٹیکس
  ج۔ ٹیکس صرف مالداروں پر
- دورِ حاضر کے ٹیکسوں کی اقسام اور ان پر تبصرہ
  ا۔ زرعی
  ب۔ صنعتی
  ج۔ تجارتی
- بین الاقوامی صنعتی و تجارتی مسابقت اور ٹیکسیشن
- اسلامی معاشرہ میں تعیشات پر بھاری ٹیکس کی ضرورت

مقالہ (۱۲) اسلام میں سرمایہ و محنت کے تعامل کی جائز صورتیں

- سرمایہ و محنت کا تعلق
  (دونوں کا پیداوارِ دولت میں حصہ)
- سرمایہ و محنت کا ربط غیر اسلامی نظامِ معیشت
  (اسکی مختلف صورتوں کے مفاسد)
- اسلام میں سرمایہ و محنت کے ربط کی جائز صورتیں

ب ۔ ملازمت

ج ۔ شراکت

د ۔ مضاربت

ہ ۔ مزارعت

——— وغیرہ

قسمِ چہارم

(ضمیمے)

ضمیمہ (۱) اسلامی لٹریچر میں معاشیاتی مسائل کے مآخذ

- عربی زبان میں اہم کتابیں
- انگریزی 〃 〃 〃
- اُردو 〃 〃 〃

ضمیمہ (۲) معاشی اصطلاحات

- اسلامی لٹریچر میں
- جدید علم المعیشت میں

ضمیمہ (۳) دورِ خلافت راشدہ کے معاشی اعداد و شمار

- سکّے اور پیمانے
- تنخواہیں اور وظائف
- خراج
- غنائم

——— وغیرہ

ضمیمہ (۴) معاشی مسائل سے متعلقہ آیاتِ قرآنی

(مع ترجمہ و تشریح)

ضمیمہ (۵) معاشی مسائل سے متعلقہ احادیث

(مع ترجمہ و تشریح)

ضمیمہ (۶) جماعت اسلامی کا معاشی منصوبہ

ضمیمہ (۷) "معاشیات نمبر" کا جنرل انڈکس

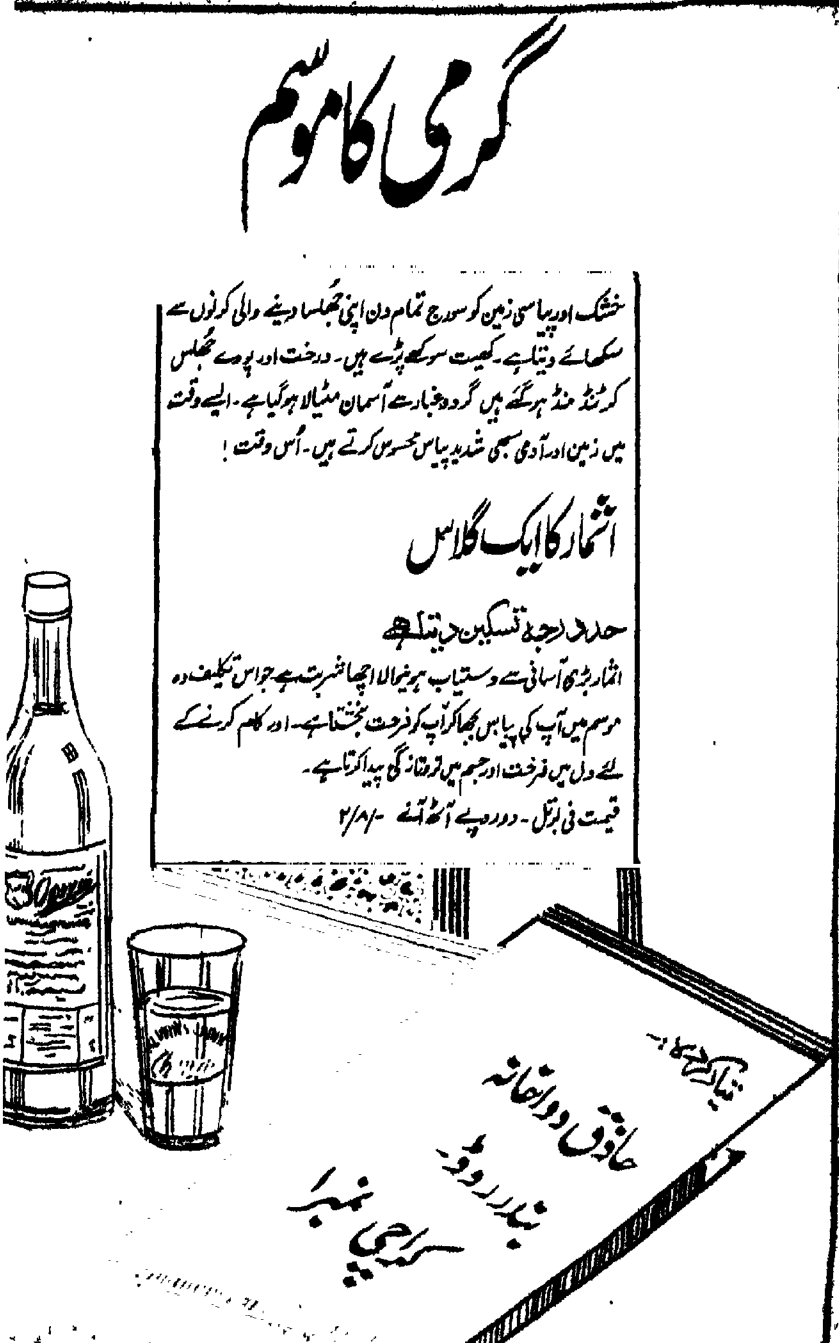
اس مخصوص خاکے کے علاوہ 'چراغ راہ' کے اسلامی 'معاشیات نمبر' میں ایسے افسانے، ڈرامے اور منظومات بھی شریک کئے جائیں گے۔ جو اس موضوع سے نمایاں تعلق رکھتے ہوں۔ علاوہ بریں "سوچ بچار" کے عنوان سے ایک مفصل مقدمہ درج ہوگا۔ اور دوسرے اطلاقی مضامین بھی پیش کئے جائیں گے

تعارفِ کتب و جرائد

ہفت روزہ "کاروانِ نو" | بہ ادارت، گوہر گیلانی و اشتیاق گیلانی۔
مقامِ اشاعت، بیت اسلام، ملیر برانچ آفس، کراچی۔ چندہ سالانہ، دس روپے۔ فی پرچہ ۴ آنے۔

"کاروانِ نو" ایک زندگی بخش ہفت روزہ ہے جس کا فکری محور اسلام ہے۔ اس نئے جریدہ کے جو چند شمارے ہماری نگاہ سے گذرے ہیں، ان کے پیشِ نظر ہم اس کوشش کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سیاسی نقطہ نگاہ کے لحاظ سے یہ جریدہ حق گوئی میں بے باک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ دوسری طرف ادبی لحاظ سے بھی اس کا معیار حوصلہ افزا ہے۔ اب تک کے شماروں میں جو افسانے اور نظمیں شائع ہوئی ہیں، وہ بڑی حد تک قابلِ قدر ہیں۔

"کاروانِ نو" خاص طور پر موجودہ نظام کے معاشی پہلوؤں کی تاریکیوں کو نمایاں کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے۔ اور اس لحاظ سے اسلام پسند جرائد میں اس کا وجود ایک اچھا اضافہ ہے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ کاروانِ نو کے فروغ سے ملک کے اسلام پسند رجحانات کی قوت کار میں اضافہ ہوگا۔


گرمی کا موسم
خشک اور پیاسی زمین کو سورج تمام دن اپنی جھلسا دینے والی کرنوں سے سکھائے دیتا ہے۔ کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ درخت اور پودے جھلس کر ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں گرد و غبار سے آسمان مٹیالا ہو گیا ہے۔ ایسے وقت میں زمین اور آدمی سبھی شدید پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اُس وقت!
اثمار کا ایک گلاس
حد درجہ تسکین دیتا ہے
اثمار بڑی آسانی سے دستیاب ہونے والا اچھا شربت ہے جو اس تکلیف دہ موسم میں آپ کی پیاس بجھا کر آپ کو فرحت بخشتا ہے۔ اور کام کرنے کے لئے دل میں فرحت اور جسم میں تر و تازگی پیدا کرتا ہے۔
قیمت فی بوتل۔ دو روپے آٹھ آنے -/۸/۲
حاذق دواخانہ
بندر روڈ
کراچی نمبر ۲

I CHOSE F[illegible]EEDOM

by

VICTOR K[illegible]CHENKO

In this [illegible] Russia [illegible] his [illegible] Party and his [illegible] important story.

When [illegible] April [illegible] with the Soviet Purchasing [illegible] United States [illegible] Russian [illegible]

It is the story [illegible] Soviet Russia [illegible]

Abridged edition [illegible] *1 12 0*

Maktaba CHIRA[illegible]H-E-RAH Karachi

[illegible]

B. [illegible] B.

[illegible] کمپنی [illegible]

[illegible]

Only Title Printed at the Shan [illegible] Press, Arambagh Road, Karachi
Printer & Publisher [illegible] Mohammed, M. Chaudhry

ماہنامہ

چراغِ راہ

جلد ۲، عدد ۶ — ۹۔ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی نمبر ۱ — ماہ جون ۱۹۵۰ء

چندہ سالانہ :- پاکستان ۵ روپے ‖ ہند :- ۶ روپے ۸ آنے ‖ فی پرچہ :- پاکستان :- آٹھ آنے، ہند :- دس آنے

طابع ناشر و ایڈیٹر نے ... پریس میکلوڈ روڈ سے چھپوا کر ۹۔ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی سے شائع کیا۔

سوچ بچار

مقتدر کٹھ پتلیاں

اپنی منقاروں سے حلقے کس رہے ہیں جال کے
طائروں پر سحر ہیں صیاد کے اقبال کے

کٹھ پتلی دیکھنے میں آزاد ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں غلام! ظاہر اختیار، اور باطن اضطرار، اوپر سے "فعال لما یرید" اور اندر زنجیری جبریت!

کٹھ پتلیوں کا تماشا اگر آپ دیکھیں، تو آپ کو معلوم یہ ہوگا۔ کہ کچھ وجود ہیں جو دوڑتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں۔ لڑتے اور صلح کرتے ہیں ہیں اور تعمیل کرتے ہیں۔ تاج پہنتے ہیں اور تخت جماتے ہیں۔ دربار لگاتے ہیں اور حکومت چلاتے ہیں۔ لیکن درحقیقت نہ ان کی باتیں ہیں نہ حرکات سوچتا کوئی اور ہے اور حرکت بھی کوئی اور کراتا ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ
خود بر سر بازار خریدار برآمد
—————— بشکست و رواں شد

کٹھ پتلیاں فلسفۂ "ہمہ اوست" اور "ہمہ از دست" کا بہترین مظہر ہوتی ہیں وہ "انا الحق" تک کا نعرہ بلند کرتی ہیں لیکن یہ نعرہ ادھار کا ہے وہ کوس "لمن الملک الیوم" بجاتی ہیں، لیکن اس کا محرک نگاہوں سے دور رہتا ہے کٹھ پتلیاں اپنے کانوں سے نہیں سنتیں، آنکھوں سے نہیں دیکھتیں، اپنے منہ سے نہیں بولتیں۔ اپنے پاؤں سے نہیں چلتیں۔ اپنے ہاتھوں سے کام نہیں کرتیں اپنے دماغ سے نہیں سوچتیں، اور خودی کا کوئی رتی نہیں رکھتیں۔ وہ ہمیشہ دوسرے کی خودی کی مزدور ہوتی ہیں۔ دوسرے کے آرٹ کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ دوسرے کے لئے مہرے بنے ہوئے یہ استعمال ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جب وہ اسٹیج پہ حرکت کرتی ہیں، تو نگاہیں انہیں پہ مرکوز ہوتی ہیں تماشائیوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

ہیں "ستارے" کچھ، نظر آتے ہیں کچھ!
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا!

یہ کٹھ پتلیاں جب زندہ انسان بن کر تاریخ کے اسٹیج پہ کام کرتی ہیں تو اور ہی غضب ڈھاتی ہیں۔ قوموں کی قوموں پر نظر بندی عالم لاہوت طاری ہو جاتا ہے کہ کٹھ پتلیاں ہمہ تن اعتبار محسوس ہوتی ہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں کہ چند نفوس ہیں جو لیڈری کر رہے ہیں، چلا رہے ہیں۔ قوم کی پالیسی مرتب کرتے ہیں۔ صلح و جنگ کے معاملات کو طے کرتے ہیں۔ اور ان ساری کارروائیوں میں وہ آزادی و اختیار کے آثار و علائم کو ساتھ لئے ہوئے اترتے ہیں۔ لیکن بیچ میں ایک "پردۂ مبہم" ایسا حائل ہوتا ہے کہ وہ اگر اٹھ جائے تو پھر دنیا کو معلوم ہو کہ کرشمہ ہائے قدرت کس ہستی نہاں کے ہیں۔

مقتدر کٹھ پتلیاں بہت خطرناک ہوتی ہیں۔ ان کی معرفت ان کی پیروی میں چلنے والی قومیں از خود کٹھ پتلی بن جاتی ہیں۔ ا

ظاہر کے اسٹیج پر آزادی کے جشن مناتی ہیں۔ اپنی شانِ استقلال پر تقریریں فرماتی ہیں۔ اپنے جذبۂ بے نیازی کی تشریح کے لئے پریس کو بیانات دیتی ہیں۔ اپنی قوم کو یقین دلاتی ہیں۔ کہ ہم کسی کے جال میں اُلجھنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہیں۔ پھر یہ اپنے آقایانِ حقیقی کو برابری کے ساتھ خطاب کرتی ہیں۔ اور اُن کو متنبہ کرتی ہیں۔ کہ ہم پر جادو چلانے کی کوشش کبھی کامیاب نہ ہو گی۔ اس طرح کی نمائشی خودداری سے جب اپنے پیچھے کے تاروں کو یہ تماشائیوں کی نگاہوں سے اوجھل کر کے کوئی ڈرامہ کھیلتی ہیں تو کھیل مقبولیت حاصل کرتا ہے اور تماشائی تالیاں پیٹتے اور زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔

جو کٹھ پتلی اپنے آقاؤں کی باطنی اطاعت و وفاداری کو اپنے مظاہرۂ آزادی و اختیار کے ذریعہ جتنا صفائی سے اوجھل رکھ سکے۔ وہ اتنی ہی زیادہ کامیاب نکلتی ہے۔ ایسی کٹھ پتلیوں پر آقاؤں کی خاص نگاہِ کرم ہوتی ہیں۔ تمام ہم عصر کٹھ پتلیاں ان کا احترام کرتی ہیں۔ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان کے استقبال کے لئے ٹھاٹھ باٹھ کے سامان کرتی ہیں۔ ان کو بڑے بڑے القاب اور خطابات سے نوازتی ہیں۔ ان کی سیاسی مہارت اور ان کی بصیرت و عظمت کا ڈھنڈورہ پیٹتی ہیں۔

پھر ان کٹھ پتلیوں میں باہم رقابت بھی چلتی ہے ایک سے ایک اندرونی وفاداری میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک نے اگر آقا کی مرضی کو لفظوں سے اخذ کیا تھا۔ تو دوسری اشارۂ ابرو سے اخذ کرتی ہے۔ اور تیسری لفظ و اشارہ دونوں سے بے نیاز ہو کر محض اجتہاد سے "حکمِ حضور" کو پالیتی ہے۔ اور قبل از وقت تعمیل کر دکھاتی ہے۔

"عالمِ بالا" کا ذرا سا اشارہ ہوتا ہے کہ دو کٹھ پتلیاں باہم تن جاتی ہیں۔ گالم گلوچ اور تھکا فضیحتی کرتی ہیں۔ دھمکیاں دیتی ہیں۔ ہاتھا پائی پر اُتر آتی ہیں۔ دھول دھپا کا شیوہ اختیار کر لیتی ہیں ۔۔۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ازل سے بیر تھا۔ لیکن جونہی پردۂ زرنگاری کے پیچھے بیٹھا ہوا معشوق دوسرا تار ہلاتا ہے تو غصے کا پارہ دونوں طرف سے اترنے لگتا ہے۔ پھولی ہوئی سانس قابو میں آنے لگتی ہے چتون کے سارے بل تحلیل ہو جاتے ہیں۔ شرارے برساتی ہوئی آنکھیں مسکراہٹوں کا سرچشمہ بن جاتی ہیں۔ اور دونوں طرف سے "گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط" کی دعوت دی جاتی ہے۔ پھر معاہدۂ صلح ہوتا ہے پھر ہاتھ ملائے جاتے ہیں۔ پھر بغل گیری ہوتی ہے۔ پھر اعلان ہوتا ہے کہ ہم تو ہمیشہ سے بھائی بھائی تھے۔ یہ بیچ میں کچھ غلط فہمیاں تھیں۔ جو بروقت دور ہو گئیں۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان دونوں کے درمیان سے پانی نہیں گذرتا۔ ابھی برق و رعد کا طوفان آ رہا تھا۔ اور ابھی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ ابھی جون کی گرمی تھی اور ابھی دسمبر کے جاڑے آ گئے۔ ابھی سمندر طوفانی تھا۔ اور ابھی گرداب آنکھیں موند کے گہری نیند سو گئے۔

کل جو پتلیاں ایک دوسرے پر جنگ جُو ہونے کا الزام دے رہی تھیں۔ آج دہی ہیں کہ ایک دوسرے کو انتہائی صلح پسند ہونے پر داد دے رہی ہیں۔ کل ایک دوسرے پر بد اثر ہونے کی پھبتی کسی جا رہی تھی اور آج اعتراف اثر کا دور ہے۔ کل سیاسی مہارت میں کیڑے ڈالے جا رہے تھے۔ اور آج سٹیٹس مین شپ کا احترام کیا جا رہا ہے۔ کل ہجو گوئی تھی۔ آج قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ کل ایک دوسرے کے قریب جانا گوارا نہیں تھا۔ اور آج بلا بلا کر سلامیوں کا اہتمام کرایا جا رہا ہے۔ بس وہی منظر کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری !

عقیدت کیش پتلیوں کی ان ڈرامائی حرکات کو ان کی رعیتیں چونکہ ظاہر کی حد تک دیکھ سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ یوں ہوں تو بھی ان کا کام یہ ہے۔ کہ داہ واہ کا شور بلند کریں۔ اور دونوں طرف سے توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ یہ "زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگا دیں۔ تماشائی ... کٹھ پتلی نے کمال کیا۔ اور تماشا گر اپنی جگہ مطمئن کہ ہمارے آلۂ کار نے کمالِ فن کا اچھا مظاہرہ کیا۔

اس وقت دنیا میں دو تماشا گر ہیں ایک نظام اشتراکی دوسرے نظام سرمایہ داری۔ اس طرف سرخ تشدد ہے، اُس طرف سفید تماشا گاہ ایک طرف روسی بلاک کا کیمپ ہے اور دوسری طرف اینگلو امریکن بلاک کا کیمپ۔ ساری دنیا کے متقدر عناصر۔ تمام بادشاہ، تمام ڈکٹیٹر، تمام پارلیمنٹیں اور تمام قیادتیں ان دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ کچھ اس کیمپ کی کٹھ پتلیاں ہیں کچھ اس کیمپ کی ——— ایسا کوئی نہیں جو دونوں طرف سے آزاد ہو۔ آزادی ہے تو صرف دو تماشا گروں کے لئے۔ باقی ساری دنیا کی زبان پر اگر آزادی کے نعرے ہیں تو محض اس لئے کہ ان کی بندگی و بے چارگی پر کچھ نہ کچھ پردہ پڑا رہے۔

اب دونوں کیمپوں میں ساری سرگرمیوں کا محور آنے والی جنگ ہے۔ دونوں طرف کٹھ پتلیاں بھرتی کرنے کی تحریک زوروں پر ہے جو بھرتی ہو چکی ہیں ان کو منظم و مرتب کیا جا رہا ہے۔ دنیا کی ہر کٹھ پتلی غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر جنگ کے لئے تیاری کر رہی ہے جو لڑنا چاہتی ہے وہ بھی اور جو نہیں لڑنا چاہتی وہ بھی ——— اس لڑائی سے کٹھ پتلیوں کا اپنا کوئی مقصد وابستہ نہیں۔ مقصد کچھ ہے تو اصل تماشا گروں کا ہے۔ لیکن بلا مقصد بھی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسلحہ جمع کئے جا رہے ہیں۔ فوجی بجٹ انتہائی مسرفانہ حد تک بڑھ گئے ہیں۔ تعمیری منصوبوں کو پیچھے ڈالا جا رہا ہے۔ ساز باز کا سلسلہ جاری ہے۔ بین الاقوامی معاملات ہو رہے ہیں ——— کٹھ پتلیاں ہانپتے چڑھاتے ہوئے اِدھر سے اُدھر بھاگم بھاگ سرگرم کار ہیں۔ جیسے ساری دنیا کی ذمہ داری انہی کے سر ہو۔ کوئی ایک بھی باغی ایسا نہیں، جو تماشا گروں کے پروگرام کو تسلیم کرنے سے اور اس کے مطابق جدوجہد کرنے سے انکار کر دے۔ کوئی ایک بھی نہیں جو دو کیمپوں سے الگ رہنے پر قادر ہو سکے۔ جو دونوں کے جالوں سے بچ کے نکل جائے۔

پرانی تجارت۔ پرانی صنعت۔ پرانی مشین۔ پرانے ڈالر۔ پرانا اسلحہ۔ پرانی بولیاں۔ پرانے نعرے۔ پرانی پالیسی۔ پرانے اصول پرانے ضابطے۔ پرانے پروگرام ——— ہر کٹھ پتلی کی پیٹھ پر لدے ہیں۔ اور یہ بے چاری قسمت کی ماری آزادی کے ترانے گاتی ہوئی کی منازل طے کر رہی ہے

پاکستان یہ دعوے لے کے اُٹھا تھا کہ وہ ایک تیسری راہ ——— راہِ نجات ——— دنیا کے لئے کھولنے والا ہے اور دنیا کی نظریں اس پر جم چکی تھیں۔ لیکن افسوس کہ اس کی "غلامی زدہ" قیادت . . . . !

آسمانی ادب

(آیاتِ الٰہی کے ادبی جمال کا انعکاس)

آگ پانی میں میل کیا![1]

۔۔۔۔۔۔ ۰ آغاز اللہ کے نام سے، جو رحمٰن ہے، رحیم ہے ۰ ۔۔۔۔۔۔

تمہارا قبلہ الگ، اُن کا الگ!

عوام میں سے کم فہم تو اب یہ کہتے نظر آئیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ہوا کیا کہ یہ اپنے پرانے مرکز سے مُنہ موڑ گئے جس سے وابستہ تھے!

۔۔۔ (اور دوسرا مرکز اختیار کر لیا ہے)۔۔۔

(اے نبی!)

(ان سے) کہہ دیجیئے کہ مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی!

وہ جسے چاہے راہِ راست کی طرف رہ نمائی کر دے!

اور اس طرح ۔۔۔ (تمہارے مرکز کو بدل کر اور تم کو ایک امتیازی حیثیت دے کر) ۔۔۔ ہم نے تم کو (دنیا بھر کے لئے) مرکزی جماعت بنایا ہے۔ تاکہ تم بنی نوعِ انسان کے سامنے (دینِ حق کی) شہادت دینے والے بن کے اٹھو۔ اور رسول (صلعم) تمہارے سامنے (دینِ حق کی) شہادت دینے والے ہوں۔

اور ۔۔۔

---

[1] اس مرتبہ آسمانی ادب کے جو اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں ان سب میں مسلمانوں سے دو مطالبات کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے مسلمان ہونے کی امتیازی حیثیت کو نمایاں رکھو اور اپنے دین پر سختی سے جمے رہو۔ دوسرے یہ کہ اسلام کے دشمنوں سے یارانہ نہ گانٹھو۔ ان سے ہمیشہ چوکنے رہو۔ کیونکہ وہ تم کو راہِ حق سے بہکانے میں کبھی کوتاہی نہیں کریں گے۔

یہ بجا ہے کہ غیر مسلموں سے حسنِ سلوک کرنا یا کسی معاملات استوار کر لینا یا ان سے تجارتی رابطہ قائم کرنا ممنوع نہیں۔ لیکن اسلام اس بات کی بہرحال اجازت نہیں دیتا، کہ آپ ایک کافر حکومت کے تاج کے تابع ہوں، آپ کفار کے ساتھ مل کر "دولت مشترکہ" میں شامل ہوں، آپ باغیانِ اسلام کے دفتروں میں بھرتی ہوں۔ آپ غیر اسلامی حکومتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے درپے ہوں۔ آپ کسی غیر سلطنت سے وفاداریاں پیش کریں۔ آپ ملحدوں کے سامنے کلچر کے مشترک ہونے کے بیانات دیں۔ آپ خدا کے باغیوں سے بڑی قوم بننے کا [illegible] تعلقات اسلام کو مطلوب نہیں ہیں۔

[illegible]

(اے نبیؐ!) جس مرکز سے آپ پہلے وابستہ تھے۔ اسے ہم نے اگر مقرر کیا تھا (اور پھر اب اگر اسے نئے مرکز سے بدل دیا ہے) تو اس لئے کہ کون (پوری وفاداری سے) رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے اور کون الٹے قدموں لوٹ جاتا ہے ۔۔۔ اور (فی الواقع) یہ (تغیر) بہت گراں گذرنے والا تھا۔ بجز ان لوگوں کے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔

اور اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمانوں (کی جمع شدہ پونجی) کی قدر گنوا دے۔ بلاشبہ اللہ لوگوں کے لئے بہت ہی شفیق مہربان ہے۔

...... — —............................ .. ..

....

اور اگر (اے نبیؐ!) آپ اہلِ کتاب کے سامنے سارے ہی دلائل لا رکھیں۔ تو بھی وہ آپ کے "مرکز" سے تعلق جوڑنے کے نہیں۔ آپ بھی ان کے مرکز سے وابستگی برقرار رکھنے والے ہیں ۔۔۔ (اب تو ان کا "مرکز" الگ ہے اور آپ کا الگ!)
(اس دو ٹوک فیصلے کے بعد ہی) ۔۔۔ علمِ حق کے آجانے کے بعد اب اگر تم ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو پھر تمہارا مقام کرنے والوں کی صف میں ہو گا۔ (پ۲ - ع)

یہ رفاقت کے پیام کیسے؟

اے اہلِ ایمان!
میرے اور اپنے دشمنوں کو رفیق نہ بناؤ!
تم ان سے رفاقت کے لئے نامہ و پیام کرتے ہو؟ ۔۔۔ درآنحالیکہ جو دینِ حق تم تک پہنچا ہے۔ یہ اس سے انکار کر چکے ہیں یہ لوگ رسول (صلعم) کو اور خود تم کو نکال باہر کریں محض اس قصور میں کہ تم ایمان لاتے ہو۔ اللہ اپنے رب پر ۔۔۔ (! تمہارے یہ تعلقاتِ محبت) ۔۔۔ ؟
(سنو!) ۔۔۔ اگر تم نکلے ہو میرے راستے میں جہاد کرنے کو اور میری خوشنودی حاصل کرنے کو ۔۔۔ (تو پھر اس کے کیا معنی کہ ان (دشمنوں) کی طرف رفاقت کے خفیہ پیغام بھیجتے ہو! ۔۔۔ حالانکہ جو کچھ تم چھپاتے ہو۔ اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو۔ میں اس کو خوب جانتا ہوں۔
تم میں سے جس کسی نے بھی ایسا کیا ہے۔ تو وہ راہِ راست[1] سے دور جا پڑا۔
(یہ تمہارے ایسے دشمن ہیں کہ) ۔۔۔!
اگر یہ تم کو (اپنے بس میں) پائیں تو دشمن ہو کے ہی پیش آئیں اور تم پر ہاتھ[2] اور زبان[3] دراز کریں بری نیتوں کے ساتھ اور ۔۔۔ اور کوشش کریں کہ تم بھی انہیں کی طرح (کسی صورت سے) دینِ حق[4] سے برگشتہ ہو جاؤ۔
(یاد رکھو!) ۔۔۔!

---

[1] غیر مسلموں سے دلی رفاقت کا تعلق معمولی جرم نہیں۔ [2] ہاتھ سے حملہ سے مراد باقاعدہ جنگ کرنا ہے۔ [3] زبان سے مراد مخالفانہ پروپیگنڈہ کی صورت میں cold war بپا کرنا ہے۔ [4] غیر مسلم قومیں اور حکومتیں ہمیشہ اس کوشش میں رہتی ہیں کہ مسلمان اسلام پر چلنے نہ پائیں اور وہ سمجھتی ہیں کہ اسلام ان کے لئے بڑا خطرہ ہے۔

قیامت کے دن تمہارے رشتہ و پیوند اور تمہاری اولادیں تمہارے کسی کام نہ آسکیں گی۔ اس دن تو اللہ (تمہارے کارناموں کے بارے میں) بے لاگ فیصلہ دے گا۔

اور (یہ نہ بھولو کہ) اللہ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔!

تمہارے لئے تو ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی زندگی میں صحیح طرزِ عمل کی ایک مثال قائم ہو چکی ہے ــــ اس وقت جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ہم تم سے اور تمہارے اُن (معبودوں سے) جن کو تم خدا کے علاوہ پوجتے ہو، کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ ہم نے تمہاری روش کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ اور (اب سے) ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے نفرت و عداوت کی بنا پڑ گئی ــــ یہاں تک کہ تم خدائے یکتا پر ایمان لے آؤ ! . . . .

. . . .

ان لوگوں کا طرزِ عمل ایک پاکیزہ نمونہ ہے تمہارے لئے ــــ تم میں سے ان کے لئے جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر بھروسہ رکھتے ہیں! (پ۲۸ ع۷)

لگی لپٹی نہ رکھو !

(اے نبی! صلعم) ــــ کہو کہ اے اہلِ کتاب[1] آؤ۔ (اگر اتحاد چاہتے ہو تو) ہمارے ساتھ اُس کلمہ پر جمع ہو جاؤ۔ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے ــــ وہ یہ کہ :

اوّلاً : ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت و طاعت نہ کریں۔

ثانیاً : ہم اُس کے ساتھ کسی چیز کو ہمسر نہ ٹھہرائیں۔

ثالثاً : ہم میں سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں کو اپنے رب نہ بنائیں (اس دعوتِ اتحاد کے جواب میں) ــــ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو (تمہارا کام یہ ہے کہ) تم (لگی لپٹی رکھے بغیر) ــــ اعلان کر دو۔ کہ ہم "مسلم"[3] ہیں۔!

ــــ (اور کفر سے اسلام کا کوئی سمجھوتہ نہیں!)

. . . .

. . . .

---

۱ کجا یہ روش کہ اسلام کے دشمنوں کے سامنے جا کے صفائی دی جائے۔ کہ حضور ہم کوئی ایسی روش اختیار کرنے والے نہیں ہیں۔ جو آپ کو ناپسند ہو۔ آپ اور ہم تو تہذیبی لحاظ سے بہت سے وجوہ اشتراک رکھتے ہیں۔ اور پھر یہ چاپلوسیاں کہ حضور والا سے ہمیں ترقی کے گر سیکھنے ہیں۔ اور آپ کے نظامِ حکومت کا چربہ اتارنا ہے۔

۲ یہ ہدایت اہلِ کتاب ہی کے لئے خاص نہیں، ہر غیر مسلم طاقت سے تعلقاتِ محبت و مودّت کی استواری کی بنیاد ڈھا دی گئی ہے۔ جہاں یہ بنیاد نہ ہو۔ وہاں رسمی تعلقات ہو سکتے ہیں۔ لیکن محبت و مودّت کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

۳ مسلم افراد، مسلم اقوام اور مسلم حکومتوں کا بنیادی فریضہ یہی ہے کہ وہ اپنے قول و فعل سے اپنے "مسلم" ہونے کی مخصوص حیثیت کو غیر مسلموں پہ واضح رکھیں۔ اور ان سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم کو اسلام پہ چلنا ہے اور اسلام کے کسی جز کو ہم تمہاری خوشنودی کے لئے اور تمہارے ساتھ دوستانہ معاملات کرنے کے لئے ترک نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ حال کہ لوگوں کو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے کفار کے سامنے شرم آتی ہے اور انہیں یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ سرکار عالی! ہم اتنے وحشی نہیں ہیں کہ اسلام کے اصولوں پہ ایک نظامِ تمدن و سیاست چلانے پہ اتر آئیں۔

اہل کتاب میں سے ایک ٹولی اس کوشش میں لگی ہے کہ تمہیں (راہ حق سے) بھٹکائے جائے۔ حالانکہ (تم جب اپنے ہدایت پر قائم ہو تو) یہ لوگ اپنے ہی نفس کو بھٹکاتے ہیں ـــــ! اور یہ امر واقعہ کا شعور نہیں رکھتے۔ پ۳ ۔ ع۷

بُت کافر کی "شرطِ رضا"

(اے نبی صلعم) ـــــ!

یہ یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم ان کے مشربؓ کی پیروی پہ اتر نہ آؤ!

(لیکن تمہارے لئے یہ ممکن کہاں) ـــ (پس) ان سے (صاف صاف) کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی ایک ہدایت ہے ـــــ دوسرا مسلک راستی کا مسلک نہیں ہو سکتا)!

اور اگر اپنے تک علم حق کے پہنچ جانے کے بعد اب تم ان کی خواہشات کے پیچھے لگ جاؤ۔ تو پھر (یہ سمجھ لو کہ) اللہ کی طرف تمہارے لئے کوئی حامی و رفیق نہ ہوگا! پ۱ ۔ ع۱۴

ہمیں اپنے اعمال سے غرض، تمہیں اپنے اعمال سے!

اللہ نے تمہارے لئے نظام زندگی مرتب کر دیا ہے ـــ وہ جس کی تلقین اس نے نوح (علیہ السلام) کو کی تھی اور جسے اب تم پر وحی کیا ہے اور وہی جس کے لئے ہم نے ابراہیمؑ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی۔ کہ اس نظام زندگی کو عملاً برپا اور اس کل کے اجزا کو پریشان نہ ہونے دو۔

خوگران شرک کے لئے بہت ناگوار ہے یہ (مطالبہ) جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو ـــ (اب ناگوار ہے تو ہو!) ـــ اللہ (دین کی خدمت کے لئے) جسے چاہتا ہے چھانٹ لیتا ہے، اور (اس کا دستور یہ ہے کہ) وہ اپنی طرف ایسے ہی لوگوں کے لئے کھولتا ہے جو خود اس کی جانب مائل ہوں۔ ان لوگوں کے اندر ("نظام زندگی" کے بارے میں) جتنا اختلاف بھی پیدا ہوا ہے ـــ علم حق ان تک پہنچ چکنے کے بعد ہی ہوا ہے محض باہم کی قدم ضدا سے!

اور اگر پہلے سے (مہلت دینے کا) قانون ایک خاص مدت معینہ کے لئے نافذ نہ ہو چکا ہوتا۔ تو (کل میں) ان کا جھگڑا چکا دیا (اب یہ لوگ قانون مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں) ـــــ اور (دوسری طرف) وہ لوگ جو (مذکورہ انبیاء کے بعد "الکتاب" کے امانت دار ٹھہرائے گئے تھے (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ اپنی جگہ نظام زندگی کے متعلق شبہات پڑ کر مضطرب ہیں۔

ؓ پرانے زمانے کا یہودی و نصرانی "مذہبی" تھا۔ اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اس کے عقائد اور اس کی فقہ کو قبول کیا جائے لیکن آج کا یہودی و نصرانی "سیاسی" بن چکا ہے اور اب اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جس طرز سیاست جس نظام ریاست اور جس فلسفۂ معیشت کو اس نے اختیار کیا ہے مسلمان بھی اسی پر عمل پیرا رہے۔ جہاں مسلمانوں نے ان کی پیروی سے انکار کیا تو فوراً اس کے خلاف "تعصب گری" "فرقہ پرستی" "ملا ازم" وغیرہ الزامات کے ساتھ پروپیگنڈا شروع ہو جائے گا۔ چنانچہ جو مسلمان اللہ کا نام یہود و نصاریٰ کی خوشنودی حاصل کئے بغیر ختم نہیں ہو سکتا وہ "یتبع ملتھم" پر تقریباً اسی دھن سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔

روس کی خارجہ پالیسی کے دو متضاد پہلو

قوم پرستی اور اشتراکیت

بشیر احمد ارشد

فلسفۂ اضداد کی تاریخ کے نظریے کے مطابق تمام انسانی ترقی دو مخالف اور متحارب قوتوں یا نظاموں کے شدید تصادم اور کشمکش کا نتیجہ ہے اور ہر کمیونسٹ اس نظریہ پر ایمان رکھتا ہے۔ مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ تصادم طبقاتی جنگ کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ اور جب کسی ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کے بجائے اشتراکی نظام قائم ہو جاتا ہے تو یہ تصادم بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس طرح نئی قائم شدہ سوشلسٹ ریاست اور ان ممالک میں جہاں نظام سرمایہ داری کارفرما ہوتا ہے ایک ہمہ گیر کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تصادم فلسفۂ اضداد کی تاریخ کا تقاضا ہے۔ اور اس سے کسی حالت میں بھی جائے فرار باقی نہیں رہتی۔

روس کی خارجہ حکمت عملی کے پس منظر کو سمجھنے کے لئے ہمیں لینن کے اس نظریہ کا علم ہونا چاہئے کہ یہ بین الاقوامی تصادم ہمیشہ حالات کے مطابق جاری رہے گا۔ یہ ایک بنیادی نقطہ ہے۔ لیکن اس سے تصویر کے سارے پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی نہیں پڑتی۔ کیونکہ روس کی خارجہ حکمت عملی ہر پہلو سے اشتراکی نظریات کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں روسی قومیت کے عنصر بھی شامل ہیں۔ سوویٹ خارجہ پالیسی پر روسی قومیت کے نہایت گہرے اور دور رس اثرات پڑتے ہیں۔ انیسویں صدی کے روسی انقلاب پسندوں کے نظریات نے روسی خارجہ پالیسی میں سامراجیت (Imperialism) کا نہایت شدید اثر چھوڑا ہے۔

سوویٹ نظام کی ابتدا میں حالات اس کے برعکس تھے کیونکہ اس وقت قومیت کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن چند سالوں کے بعد قومیت کے اثرات نہایت سرعت کے ساتھ نشو ونما پانے لگے۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک تو دوسرے سرمایہ دار ممالک سے علیحدگی اور دوسرے اسٹالین کی یہ پالیسی کہ سوشلزم کو پہلے روس میں قائم کر لیا جائے۔ اسٹالین کی اس پالیسی کا بین الاقوامی عزائم پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ اس کے علاوہ روس میں اشتراکی نظام کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لئے سوویٹ روس سے وفاداری کے جذبات کو ابھارا گیا اور اس طرح سوویٹ روس عالمگیر اشتراکی انقلاب کے لئے ایک [illegible] بننے کے بجائے اپنی جگہ منزل مقصود قرار دے دیا گیا۔ اور "سوویٹ طاقت" اور روسی طاقت قریب قریب ہم معنی اور مترادف ہو گئے۔ اور اس طرح روس میں قومیت اور اشتراکیت کے ادغام سے قومی اشتراکیت کا وجود ظہور پذیر ہوا۔ اور اس پالیسی کے نتیجہ میں ماضی کے مشہور زار پیٹر اعظم اور بے رحم آئیون وغیرہ روس کے قومی ہیرو تسلیم کئے گئے۔ اور روس کی ادبی [illegible] اور تاریخی کتابوں میں ماضی کے مشہور جرنیلوں مثلاً سواروف اور کٹوسوف وغیرہ کو بہت اہمیت دی گئی۔

[illegible] جاپان پر فتح یاب ہونے کے موقعے پر جو تقریر نشر کی تھی۔ اس میں قدیم روایات اور

جدید پالیسی ——— سلطنت زار اور سوویت یونین ——— کا پر تو نہایت نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ سٹالن نے اس موقع پر کہا تھا:۔

"۱۹۰۴ء کی روسی افواج کی شکست عظیم نے ہمارے عوام کے ذہنوں پر نہایت المناک نقش باقی چھوڑا تھا۔ ہمارے عوام کے اندر ایک بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ انہیں یقین تھا اور اس دن کے منتظر تھے۔ کہ کب جاپان کو میدان جنگ میں شکست فاش دی جائے اور بدنامی اور بے عزتی کا یہ مستقل داغ مٹایا جا سکے۔ ہم لوگ جن کا تعلق پرانی نسل سے ہے اس دن کا مسلسل چالیس سال سے انتظار کر رہے تھے۔ اور اب یہ موقع آ گیا ہے۔"

یہ تقریر خالصتاً روسی قومیت کی عکاسی کرتی ہے ۱۹۱۸ء میں لینن، سٹالن یا کوئی دوسرا بالشویک لیڈر اس قسم کی تقریر ہرگز نہیں کر سکتا۔ لیکن حالات جس رخ پر جا رہے تھے ۱۹۴۵ء میں سٹالن کی یہ تقریر غیر متوقع نہیں تھی۔ اسوقت فکر و نظر کے دونوں رخ ——— اشتراکی اور قومی ——— آپس میں مل چکے تھے لیکن اشتراکیت اور قومیت کے اس ادغام کے باوجود روس نے مغربی جمہوریتوں کے متعلق جو پالیسی اختیار کر رکھی اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ روسی قوم پرستی کے جذبہ میں ابتداء ہی سے مغربی یورپ کے ممالک کے خلاف نفرت کا عنصر کارفرما رہا ہے۔ حتی کہ مغربی تمدن، نظریہ تعلیم وغیرہ سے بھی دشمنی کی حد تک نفرت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ جذبہ علیحدگی اور مشرق و مغرب میں یہ بُعد اور کشمکش ابتدا ہی سے چلی آ رہی ہے۔ روسی تمدن و تہذیب اپنے ارتقا میں مغرب سے اتنی متاثر نہیں ہوئی جتنی کہ مشرق کی بازنطینی تہذیب سے۔ مغرب میں علوم کی نشاۃ ثانیہ، اصلاحات، اور لادینیت سے جو ہمہ گیر انقلاب آیا۔ روسی زندگی اس سے بہت کم متاثر ہوئی تھی۔ سولھویں صدی تک روس اور مغربی یورپ کے درمیان تمدنی تعلقات کالعدم تھے۔ اور اگر کسی قسم کے تعلقات تھے بھی تو وہ صرف جنگی نوعیت کے تھے۔ اور بعد میں جب تعلقات قائم ہوئے۔ تو ان کی نوعیت بھی متضاد تھی۔ روسی مغربی یورپ کی معاشرتی زندگی اور نظریہ فکر کے مداح ضرور تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مغرب سے نفرت اور دشمنی کا جذبہ نہایت شدت سے موجود تھا۔ المختصر روسی معاشرت و تہذیب اور تمدن یورپ سے بالکل مختلف تھے۔ اور ان کے ہاں یہ تصور ابتدا سے موجود تھا کہ یورپ دو گروہوں میں منقسم ہے ایک روسی گروہ اور دوسرا غیر روسی۔ روسی تاریخ اور روسی ادب میں اس کی پوری شہادت ملتی ہے۔ اس طرح روسی قومیت اور اشتراکیت ایک دوسرے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح سوویٹ لیڈروں کے ذہنوں میں روسی اور غیر روسی جذبہ نہایت شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ اور اپنی اس دشمنی کی تائید میں وہ مغربی جمہوریتوں کی سامراجیت کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اب اس دشمنی کی بنیاد سوشلسٹ سوسائٹی اور سرمایہ دارانہ سماج کے درمیان کشمکش کو قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بڑی حد تک مغرب و مشرق کی قدیم کشمکش کا تصور بھی موجود ہے۔

لیکن اس تفصیل کا یہ مطلب نہیں ہے۔ روس کی خارجہ پالیسی کلی طور پر ان دونوں عناصر ——— اشتراکیت اور روسی قومیت ——— کے امتزاج پر مبنی ہے۔ سوویٹ یونین کی خارجہ پالیسی کی تشکیل میں حالات زمانہ کے تقاضوں نے بہت اہم حصہ لیا ہے۔ انقلاب کی ابتدا میں بالشویک لیڈروں کے سامنے ان کا نصب العین بہت واضح تھا۔ مارکس نے اس موقع پر کہا تھا:۔

"اس انقلاب سے ایک نیا زمانہ جنم لے رہا ہے۔ ... [illegible]"

"اس انقلاب نے عالمگیر انقلاب کے لئے مضبوط اور معین بنیادیں قائم کر دی ہیں"

تمام بالشویک لیڈر اس امید کو صاف صاف ظاہر کرتے تھے۔ کہ دو تین سال کے اندر ہی تمام یورپ سوویٹ ری پبلک کا حصہ بن جائے گا۔ اور اس وقت کی بین الاقوامی اشتراکیت کے چیئرمین زینوفیت نے مجلس ہذا کے ایک کھلے اجلاس میں ان عزائم کا اعلان کیا تھا۔ سوویٹ یونین اس عالمگیر انقلاب کو بروئے کار لانے کے لئے چند اقدامات بھی کئے تھے نئی تشکیل شدہ سوویٹ گورنمنٹ نے اپنے اولین مینی فیسٹو (منشور) میں یہ اس بات کی پوری وضاحت کر دی تھی کہ :—

"سوویٹ گورنمنٹ تمام ممالک کے مزدوروں کی سرمایہ داری کے خلاف جنگ میں پوری امداد مہیا کرے گی اور حکومت پر قابض ہونے میں پوری طرح سے تعاون و اشتراک کرے گی"

لیکن پیشتر اس کے کہ سوویٹ حکومت ایشیا اور یورپ میں انقلاب برپا کرنے کے لئے کچھ عملی اقدامات کرتی۔ مغربی یورپ کی اتحادی طاقتوں نے خود روس کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔ اس مداخلت کے ردِ عمل کے طور پر روس میں عالمگیر انقلاب کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی۔ وہ قابلِ غور ہے۔ اور اس مداخلت سے سوویٹ یونین کے لیڈروں پر یہ حقیقت واضح کر دی۔ کہ سرمایہ داری نظام اور سوویٹ نظام کے درمیان تصادم ناگزیر ہے۔ جہاں تک نظریات کا تعلق ہے۔ اس حقیقت سے اشتراکی عزائم کی تائید ہوتی تھی۔ لیکن سوویٹ لیڈروں کے ذہنوں پر یہ اثرات مستقل طور پر نقش ہو گئے کہ اگر سرمایہ دار حکومتوں کو قوت حاصل ہو گئی۔ تو وہ متحدہ طور پر سوویٹ یونین کو کچلنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گی ۱۹۱۸ء سے ہی سوویٹ یونین کے سربراہ کاروں کو یقین ہو گیا ہے۔ کہ وہ مستقل طور پر خطرے میں ہیں۔ لیکن اس مداخلت کا ایک اور فوری اثر بھی ہوا۔

روس کی سرزمین میں جب پہلی بار اشتراکیوں کو قدم جمانے کا موقع ملا۔ تو ملک اقتصادی لحاظ سے بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ اور تمام ملک میں بدامنی اور تاراج کا دور دورہ تھا۔ اس لئے اس وقت بالشویک لیڈروں کے سامنے سب سے اہم اور فوری کام یہ تھا۔ کہ اشتراکی نظام کو زندہ کیسے رکھا جائے۔ اور اقتصادی بدحالی کو کیسے ختم کیا جائے۔ ان امور کے لئے طویل عرصہ ایک داخلی اور خارجی امن کی ضرورت تھی۔ اس امن کے حصول کے لئے ناگزیر تھا۔ کہ سرمایہ دار دنیا سے مزعومہ کشمکش کو کچھ مدت کیلئے ملتوی کر دیا جائے۔ اقتصادی بحالی کے لئے سرمایہ دار ممالک سے تجارتی تعلقات ناگزیر تھے۔ ملک کی تعمیرِ نو کے لئے خارجی امداد — سرمایہ دار ممالک سے — کی شدید ضرورت تھی۔ تجارتی تعلقات اور خارجی امداد کے لئے سب سے پہلے خوشگوار تعلقات کی ضرورت تھی۔ یعنی سوویٹ یونین اور دوسرے ممالک کے درمیان اقتصادی، سیاسی اور فوجی تعلقات نہایت اہم تھے نظریہ کو فوری کشمکش پر اصرار تھا۔ لیکن عریاں حقائق اور فوری مصالح تعاون و اشتراک پر مجبور کر رہے تھے۔

لینن نے سب سے پہلے اس چیز کو محسوس کیا۔ اور اس نے ابتدا میں ہی کوشش کر کے پرجوش اور جنونی عناصر پر یہ چیز واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ اشتراکی انقلاب کی جدوجہد مستقل طور پر جاری نہیں رہ سکتی۔ لینن نے پوری طرح یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی۔

عالمگیر انقلاب کے لئے اور پوشیدہ طاقت کے لئے ہمیں وسعت اور دور اندیشی کے ساتھ اپنی حکمت عملی مرتب کرنی چاہئے۔ اپنی مخلوط کے وسیع الفریب میں اپنے ازلی بد ادشمنوں سے وقتی طور پر صلح بھی کرنی پڑے گی۔ ہمیں بعض حالتوں میں ان کی پیش کردہ شرائط بھی تسلیم کرنی پڑیں گی۔ عالمگیر انقلاب کی طویل کشمکش کے لئے ہمیں وقتاً فوقتاً عارضی طور پر اپنے دشمنوں

سے تعاون و اشتراک کرنا پڑے گا"

جب بالشویک مختلف بین الاقوامی اداروں میں شریک ہونے لگے۔ تو لینن نے اس کی یہ توجیہہ پیش کی :-

"موجودہ نازک حالات میں بیرونی ممالک سے عارضی صلح کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم عنقریب تمام دُنیا کو فتح کر لیں گے

جب بالشویک روس کے نمائندے جمعیت الاقوام جنیوا کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ تو لینن نے اعلان کیا :-

"ہم اس انجمن میں بحیثیت بالشویک شریک نہیں ہوتے۔ بلکہ ہم کاروباری تاجروں کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں"

سوویٹ یونین نے اس کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کئے۔ انہوں نے سرمایہ دار ممالک اپنی نو زائیدہ مملکت کو تسلیم کرنے کی خواہش کی۔ اور اس طرح سرمایہ دار ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کئے۔ روسی نمائندے باقاعدگی سے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہونے لگے۔ سوویٹ روس نے اپنے ہمسایہ سرمایہ دار ممالک سے صلح کے کئے۔ اور بعد میں سوویٹ روس جمعیت الاقوام کا باقاعدہ رکن بن گیا۔ دونوں عالمگیر جنگوں کے درمیان مختلف ممالک میں حالات حد تک تغیر پذیر رہے ہیں۔ اور بعض اوقات جنگی حالات بھی پیدا ہو گئے۔ سوویٹ روس کے بھی متعدد سرمایہ دار ممالک سے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی بالکل متعین اور واضح تھی کہ دوسرے ممالک سے تعلقات برقرار رکھے جائیں اور روس کی اقتصادی اور فوجی حالت کو مستحکم کیا جائے۔ تاکہ ایک ملک میں سوشلزم مضبوط بنیادوں پر ہو جائے۔

سوویٹ روس اور سرمایہ دار ممالک کے بالآخر تصادم کے نظریہ کو نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا بار بار اعلان کیا جاتا تھا۔ حالات کے تقاضوں کے مطابق اس نظریے کے ساتھ ساتھ یہ روش اختیار کی گئی کہ مخصوص مصلحتوں کی وجہ سے اپنے دشمنو عارضی طور پر تعاون کرنا چاہئے۔ لینن نے ابتدا میں اعلان کیا تھا :-

"یہ کسی طرح ممکن نہیں۔ کہ زیادہ طویل عرصے کے لئے سوویٹ روس اور سامراجی ریاستیں ساتھ ساتھ زندہ رہ سکیں ان میں کسی ایک کو بہرحال ختم ہونا پڑے گا"

سٹالن نے اپنے پیشرو کی تردید کرنے کے بغیر اس چیز پر زور دیا :-

"ان دو متضاد اور مخالف کیمپوں کے درمیان اتحاد و اتفاق اور تعاون و اشتراک ناممکن نہیں۔ تنازع کی کچھ حدود ہوتی ہیں۔ ان مختلف نظریہ ہائے حیات کے اندر توافق کے بھی کچھ پہلو ہیں۔ اور توافق کی ان حدود کے اندر ہم ایک دوسرے سے تعاون و اشتراک کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی عین ممکن ہے۔ کہ اتحاد و اتفاق کے عہدنامے طویل عرصے کے لئے ہوں۔ ہمیں ان عہدناموں کو زیادہ مضبوط اور دیرپا بنیادوں پر قائم کرنا چاہئے"

لیکن سنہ ۱۹۳۸ء میں سٹالن کو اپنے پیشرو (لینن) کے محولہ بالا الفاظ یاد آگئے۔ مختلف ممالک سے سوویٹ روس نے جو [illegible] کئے۔ ان کی نوعیت تقریباً یکساں تھی۔ ان عہدناموں کی منظوری میں عالمگیر اشتراکی انقلاب کے نصب العین کے محرکات مدِ ثابت نہ ہو سکے۔ اور سٹالن نے اعلان کیا :-

"اصل متنازع فیہ مسئلہ فسطائیت نہیں ہے۔ بلکہ سوویٹ یونین کا مفاد اور استحکام ہے"

اور یہی وجہ ہے۔ کہ سنہ ۱۹۲[illegible]ء اور سنہ ۱۹۳[illegible]ء میں روس نے جب جاپان [illegible] سے عہدنامے کئے۔ تو اس میں ان کے لئے کوئی [illegible] [illegible] [illegible] تھی۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پوری وضاحت سے تسلیم کیا تھا۔

"ہم دیگر ممالک میں اپنے ہمدردوں کی تکالیف اور مصائب سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ لیکن ہم مارکسسٹ (اشتراکی) آخری لوگ ہیں۔ جو جذبات سے مغلوب ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت سے پوری دنیا واقف ہے کہ فسطائی اور سرمایہ دار ممالک سے ہمارے تعلقات نہایت دوستانہ اور خوشگوار ہیں۔ اور ہم ان دوستانہ اور خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھ سکتے ہیں"

یہ ۱۹۳۳ء کی بات تھی۔ ۱۹۳۹ء میں بھی سوویٹ خارجہ پالیسی میں یہی جذبات کشی کا رجحان کارفرما تھا۔ اور ذاتی مفاد کے لئے فسطائیت اور نازیت سے اتحاد کیا جا سکتا تھا (اور کیا گیا) مالوٹوف اور ربن ٹراپ میں جو عہد نامہ ہوا۔ وہ چند توقعات پر مبنی تھا۔ اگرچہ وہ توقعات تجربات کی روشنی میں غلط ثابت ہوئیں۔ اس عہد نامہ سے روس کو یہ توقع تھی۔ کہ آئندہ جنگ میں روس ایک کنارے پر رہ سکے گا۔ اور جب سرمایہ دار ممالک آپس میں لڑنے کے بعد ختم یا کمزور ہو جائیں گے۔ تو سوویٹ روس کی حیثیت سرمایہ دار اور سامراجی ممالک کے مقابلے میں بہت مضبوط اور مستحکم ہو گی۔

ہٹلر کے ساتھ ۱۹۳۹ء میں سوویٹ روس نے جو معاہدہ کیا۔ اس سے پہلی بار سوویٹ روس کی علاقائی توسیع کی خواہش کا انکشاف ہوا۔ روس نے سلطنت زار کے سابقہ مقبوضہ علاقہ کا مطالبہ کیا۔ اور اپنے مطالبہ کے حصول میں کامیابی حاصل کی بحیرۂ بالٹک کی ریاستیں سوویٹ روس میں مدغم ہو گئیں۔ مشرقی پولینڈ اور صوبہ بسریبیا پر قبضہ کر لیا گیا۔ جنگی ضروریات کے پیش نظر فن لینڈ کے کچھ علاقہ کو حاصل کیا گیا۔ اور سوویٹ روس نے زار شاہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مشرقی یورپ اور ایشیا میں اپنا حلقۂ اثر پیدا کیا۔ سوویٹ روس نے جرمنی کے ساتھ جو عہد نامہ کیا۔ اس کا اولین مقصد یہ تھا۔ کہ دونوں حکومتیں ایک دوسرے کے حلقۂ اثر کو باقاعدہ تسلیم کریں۔ جنگ عالمگیر کے خاتمہ پر بھی روس نے یہی روش جاری رکھی (یالٹا، پوٹسڈم وغیرہ میں روس اور مغربی اتحادیوں کے درمیان جو کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان میں روس نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ مشرقی یورپ میں روس کی فوقیت تسلیم کی جائے۔ اور روسی سرحد سے ملحقہ ممالک میں روسی اقتدار کی برتری تسلیم کی جائے۔

ابتدا میں سوویٹ روس کا خیال تھا۔ کہ مغربی طاقتیں اس کے حلقہ اثر میں مداخلت نہیں کریں گی۔ لیکن بعد میں حالات نے جو رخ اختیار کیا۔ اس سے بخوبی واضح ہو گیا۔ کہ مغربی طاقتیں اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور وہ پولینڈ، رومانیہ اور باقی ممالک کی مکمل آزادی کی خواہاں ہیں۔ روس نے ترکی سے جو علاقائی مطالبہ کیا۔ اس کی بھی مخالفت کی گئی۔ درہ دانیال میں فوجی اڈوں کے لئے روس نے جو مطالبہ کیا۔ مغربی طاقتوں نے متفقہ طور پر روس کی مخالفت کی۔ اس طرح روس اور مغربی طاقتوں کے درمیان زمانۂ جنگ میں جو رشتۂ اتحاد قائم ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بالکل ختم ہو گیا۔ اور مغربی طاقتیں اور روس دو مخالف بلکہ متحارب گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ حفاظتی کونسل اور دوسری کانفرنسوں میں جو چپقلش ظہور پذیر ہوئی۔ وہ دراصل اس تصادم کا پرتو تھی۔ اور اس طرح روسی خارجہ پالیسی کے دو قدیم پہلو پھر ایک بار نمایاں ہونے لگے۔ ایک طرف تو سامراجی طاقتوں سے تصادم اور ان کو شکست و نابود کرنا کی تلقین کی جانے لگی، اور دوسری طرف ضرورت کے مطابق انہی دشمن طاقتوں سے تجارتی اور سیاسی عہد نامے کئے جانے لگے۔

دوسری جنگ عالمگیر کے بعد ایک اور الجھن پیدا ہو گئی تھی جس طرح پہلی عالمگیر جنگ کے بعد ماسکو میں یہ توقع عام تھی کہ سامراجی طاقتیں زمانۂ بعد جنگ کے حالات و مقتضیات کا مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائیں گی، بالکل دوسری عالمگیر جنگ کے بعد بھی ماسکو میں یہی خواب دیکھا جانے لگا۔ اور انقلاب کے ایک نئے منظر کا تصور کیا جانے لگا۔ ایسے انقلاب کے رونما ہونے پر تمام ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں سے توقع کی جانے لگی کہ جو بھی انقلاب کے آثار پیدا ہوں۔ وہ حصول اقتدار کے لئے لینن کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل پیرا

ہوں۔ لیکن فوری انقلاب کی امیدوں کے ضمن میں اب شکوک و شبہات نے خیالات کو گھیرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ شکوک و شبہات
کہ آیا مغربی یورپ میں انقلاب کے امکانات واقعی اتنے روشن ہیں جتنے کر دکھائی دیتے تھے یا کیا مغربی یورپ فراج کا
یا آج سے تیس برس پہلے کی طرح پھر سے مرنے سے سنبھل سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت مغربی یورپ کے متعلق سوویٹ
کی پالیسی معمہ بنی ہوئی ہے اور اس کی تاویل آسان کام نہیں۔ کہ اس وقت سوویٹ روس کے سیاست دان کیوں ایک
کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو وہ سمجھتے ہیں۔ کہ تصادم ناگزیر ہے اور موجودہ حالات جارحانہ سیاسی اقدام کے لئے خوشگوار ہیں۔
طرف وہ ان ممالک سے سیاسی، تجارتی تعلقات بھی قائم کرنے کے حق میں ہیں۔ کیونکہ سوویٹ روس کا مفاد اسی میں ہے۔
میں اس مسئلہ کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکا۔ فیصلے کی نوعیت کیا ہو گی۔ اس کے متعلق کچھ پیش گوئی کرنا آسان نہیں۔ اس ساری
کا حاصل یہ ہے۔ کہ سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کے دونوں رخوں روسی قوم پرستی اور روسی اشتراکیت
کے امتیاز کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ سوویٹ روس کی خارجہ پالیسی ان دونوں کے امتزاج کا مظہر ہے، اور گذشتہ تیس برس
وہ انہی لائنوں پر کارفرما ہے۔

(بقیہ از صفحہ ۵۱)

"کچھ نہیں! ابھی بنا ہو گا پاگل۔ یہ سب جان بچانے کے ڈھنگ ہیں"
اور جانے وقوعہ پر اُلٹی ہوئی گاڑیوں سامان کے پھیلے ہوئے پرخچوں اور اکھڑی ہوئی لائنوں کے درمیان اب
اکیلا سگنل کھڑا تھا۔ سب سے الگ۔ جیسے اب کوئی اس سے ملنے کو تیار نہ ہو۔ چاروں سگنلوں میں سے ایک اکھڑا پڑا تھا
اور دو ٹوٹ گئے تھے۔ ٹوٹے طلسم کی طرح۔
لیکن وہ اکیلا سگنل مہادیو کی تیسری پرغضب آنکھ ماتھے پر لگائے اب تک کھڑا تھا۔ مہادیو کی آنکھ بجھ چکی تھی معلوم
نہیں ہمیشہ کے لئے یا کسی اور تباہی کے انتظار میں۔ دوبارہ کھلنے کے لئے۔
صبح کی پھیلتی ہوئی ہلکی ہلکی سفید روشنی خاموشی سے بھلی ہی بات کا اعلان کر رہی تھی۔

(حلقۂ ادب اسلامی لکھنؤ میں پڑھا گیا)

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حادثات اور تباہیاں اپنی تہہ میں کیا وجوہات لئے ہوئے ہوتی ہیں۔ ممکن ہے کہ
کسی بربادی کا سبب کسی دہشت پسند کی انسانیت سوز حرکت قرار دی جائے یا دا قفیت کا پردہ اُٹھ
جانے پر وہ کسی دشمن حکم کے تخلیق کئے ہوئے ایک قابل رحم مریض کے جنون کا نتیجہ نظر آئے۔

ہمارا مرکزی بجٹ

از انور سعید

"چراغِ راہ" میں پاکستان کے بجٹ پر بحث کرنا ضروری تھا، لیکن بعض وجوہ سے اس فرض کو ہم ملتوی کرتے رہے۔ اس نمبر میں اپنی کوتاہی کے لئے انور سعید صاحب کا مضمون پیش کرتے ہیں۔"

ادارہ

اس مرتبہ پھر ہمارے فاضل وزیر خزانہ مسٹر غلام محمد نے ظاہرا بچت کا بجٹ پیش کیا ہے، حالانکہ پچھلی روایات کے مطابق حقیقت میں اس سال کے بجٹ میں بھی تقریبا دو کروڑ روپیہ کا خسارہ تھا۔ جس کو مزید نئے ٹیکس اور پرانے ٹیکسوں کی شرح بڑھا کر پورا کیا گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ماہران مالیات کو اس کا اچھی طرح سے احساس ہے کہ ملک کی اکثریت بجٹ کے صحیح خدوخال کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے اس لئے وہ ان کی نظر فریبی کے لئے کسی نہ کسی طرح سے بچت کا بجٹ پیش کرکے سستی اور خواہ مخواہ کی تحسین حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی کامیاب کوشش کرتے ہیں کہ بجٹ کے بدنما داغ اس شاعرانہ داد و تحسین کے نعروں میں مست ہونے والے عوام کی نگاہ سے اوجھل بھی ہو جائیں۔

جن حضرات کو حکومت کے مالیات سے تھوڑا سا بھی مس ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ بچت کا بجٹ کوئی بھی خوبی کی چیز نہیں۔ کبھی کبھی بلکہ اکثر خسارہ کا بجٹ اپنے نتائج اور پیداواری صلاحیت کے لحاظ سے زیادہ اچھا اور مفید ہوتا ہے لیکن وہ بچت جو تعمیری کاموں سے روپیہ بچا کر حاصل کی گئی ہو، اس کی کوئی بھی قدر و قیمت نہیں۔ حکومت کے بجٹ بنانے اور افراد کے بجٹ بنانے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ افراد اپنا بجٹ اس اصول کے ماتحت بناتے ہیں کہ "جتنی چادر ہو اتنا ہی پیر پھیلایا جائے"، اس لئے کہ آمدنی ان کے بس میں نہیں ہوتی ہے، مجبورا وہ اپنے خرچ کو آمدنی کے لحاظ سے رکھتے ہیں اور کامیاب خانگی منتظم وہی ہوتا ہے جو ضروری خرچ کے بعد کچھ بچا لے۔

اس کے برخلاف ریاست کے بجٹ بنانے والوں کے سامنے پہلے ریاست کی مختلف ضروریات ہوتی ہیں اور پھر ضروریات یا خواہشات کا تخمینہ لگایا جاتا ہے اور اس کے بعد ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے آمدنی کے ذرائع کو تلاش کیا جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی کبھی یہ اخراجات آمدنی سے بڑھ جائیں۔ اس لحاظ سے ریاست کے بجٹ بنانے والے پہلے اپنے پیر کو ناپتے ہیں اور پھر اس کی پیمائش کے مطابق چادر بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس طرح سے بجٹ بنانے کا اصول بالکل بدل جاتا ہے۔

اس اصول کو سمجھنے کے بعد ہمارے ناظرین آسانی سے سمجھ لیں گے کہ بجٹ کے حسن و قبح کو سمجھنے کے لئے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں کہ بجٹ میں خسارہ ہے یا بچت، اس سے کم علم اور سادہ لوگوں کو تو بہلایا جا سکتا ہے لیکن سمجھنے والے تو بجٹ کو اس نگاہ سے دیکھیں گے کہ کن ضروریات کا اس میں کس حد تک لحاظ رکھا گیا، کسی اہم اور مستقل ضرورت سے غفلت اور عدم توجہی تو نہیں برتی گئی اور کسی خاص غیر ضروری کو زیادہ اہمیت اور دوسری ضرورت کو کم اہمیت تو نہیں دی گئی۔ نیز یہ مال کی توجہ کسی مخصوص طبقہ کی ضروریات کی طرف زیادہ تو نہیں اور یہ کہ عوام کی ضروریات کا کس حد تک لحاظ رکھا گیا اس کے علاوہ ملک کی عام خوشحالی پر یہ

[illegible]
کے شعور کو کتنا ابھارا گیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی دیکھنا چاہئے کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جہاں تک ہمارا خیال ہے دفاع کی ذمہ داری عوام اور حکومت دونوں پر ہے ۔ دفاع پر اخراجات کی مقدار بھی منحصر اس چیز پر ہے کہ عوام اور حکومت میں باہمی اعتماد و تعاون کتنا ہے۔ وہ حکومتیں جنہیں اپنے عوام پر اعتماد ہوتا ہے اور انہیں عوام کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے وہ باقاعدہ اور ہمہ وقت ملازم افواج بہت کم رکھتی ہیں۔ وہ اپنے عوام کو لازمی فوجی ترتیب دیتی ہیں اور ان کی فوج میں اسطرح قوم و ملک کا ہر فرد شامل ہوتا ہے کہ بوقت ضرورت فوج میں ہر شخص بھرتی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے اس کا ہر فرد اس کی فوج کا سپاہی یا آفیسر ہوتا ہے' شہری دفاع غیر فوجی آبادی کے ہی ذمہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شہری آبادی اپنی ذاتی ضروریات کا فوجی سامان خریدنے کا بوجھ حکومت پر کم سے کم ڈالتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات فوجی تربیت کے اخراجات کا بھی بوجھ حکومت پر ڈالا نہیں جاتا ہے۔ عوام کے اس تعاون کی وجہ سے حکومت کو بس اتنی تھوڑی اور کم از کم باقاعدہ اور ہمہ وقتی ملازم افواج رکھنا پڑتی ہیں۔ جن کی ملک میں امن و امان برقرار رکھنے اور سرحد کی نگرانی کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس طرح دفاع پر ان کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس جہاں عوام پر اعتماد اور اس کا تعاون حاصل نہیں ہوتا ہے۔ وہاں اس کو زیادہ سے زیادہ باقاعدہ افواج پر اعتماد کرنا پڑتا ہے اور اس طرح دفاع کے اخراجات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت نے ابھی تک ہمہ گیر فوجی تربیت کا پروگرام سوائے خوشنما بیانات کے نہیں بنایا ہے۔ گارڈن پارٹیوں۔ ڈنرز' ڈانس۔ مینا بازاروں اور تماشوں کی تو ہمت افزائی کی جاری ہے' لیکن اس کی طرف نہ ارباب حکومت متوجہ ہیں اور نہ لیڈران کرام۔ حالانکہ اس نازک وقت میں قوم کے حوصلے بلند رکھنے کے لئے اس کی بہت سخت ضرورت ہے لیکن حکومت اس بجائے بہت اطمینان سے ۶۶ فیصدی آمدنی دفاع پر خرچ کر رہی ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ اس نے اپنا حق ادا کر دیا۔

اگرچہ ہمارے پاس اعداد و شمار صحیح تو موجود نہیں ہیں لیکن ہماری معلومات جہاں تک ہیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آفیسروں اور خصوصاً برٹش آفیسروں کی تنخواہوں اور الاؤنس پر جو مشکل سے دس فیصدی ہیں۔ کل تنخواہ اور الاؤنس میں سے ۴۶ فیصدی خرچ کیا جارہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آفیسروں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ملکی دفاع کا فریضہ ان پر دینی حیثیت سے ہے اور یہ ان کا دینی کام ہے اس لئے وہ اسکو حصول ثواب دارین کا ذریعہ سمجھیں نہ کہ بڑی بڑی تنخواہوں اور بڑے بڑے الاؤنس کا ذریعہ اور یہ کہ جب ملکی دفاع کی خاطر عوام بھوکے رکھے جاسکتے ہیں تو انہیں بھی معقول تنخواہوں پر قناعت کرنا چاہئے۔ تو کم از کم دس کروڑ روپیہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور دلچسپ چیز یہ بھی ہے کہ اگر واقعی ملک کو خطرہ لاحق ہے تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بجٹ میں کیوں چھوٹ دی گئی۔ عوام کی ضروریات سے تو ملکی دفاع کی آڑ لیکر بےرحمانہ غفلت برتی گئی ہے' لیکن آخر کیا ملکی دفاع کی ذمہ داریاں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں پر بالکل نہیں آتیں۔ آخر ان پر کیوں نہیں مزید ٹیکس لگایا گیا اور زائد دفاع کے اخراجات ان سے کیوں نہیں وصول کئے گئے

ملکی دفاع پر پچاس کروڑ خرچ کرنے کے بعد صرف ۲۰ کروڑ روپیہ رہ جاتا ہے' اس میں سے ملک کی عام خوشحالی۔ تعلیم صحت عامہ' تجارت' زراعت اور صنعت کی ترقی اور استحکام کے لئے تقریباً صرف ۵ کروڑ صرف کئے جائیں گے۔ یعنی کل آمدنی کا ۷ فی صدی' بس اس کو چاہے اوڑھا جائے۔ چاہے بچھایا جائے ۔ جملہ اخراجات کو اس طرح تقسیم کیا گیا۔

دفاع ۹۳ فیصدی

مفادِ عامہ ۵ فیصدی
انتظامِ مملکت ۹۵ فیصدی

کل ۱۰۰ فی صدی

اخراجات کی نوعیت صاف بتا رہی ہے کہ حکومت کے سامنے اپنے دفتری نظام حکومت کو چلانے کے سوا کوئی بڑا مقصد
عوام کی خوشحالی کی فکر ہے، نہ ان کی تعلیم و تربیت کی، نہ ان کی صحت اور جسمانی قوت کی ترقی کی اور نہ ہی کچھ صنعت، تجارت
کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ حکومت کی آمدنی صرف آفیسروں کے وفادار اور مرغ باد نما جیسے طبقہ کو خوش کرنے کے لئے
ہو رہی ہے۔ حکومت پوری تندہی سے عوام کے پیٹوں پر لات مار کر ان کی عیاشیوں کے سامان فراہم کر رہی ہے۔
ملک کے عوام پوچھتے ہیں کہ جب ملک کو خطرہ ہے اور ان کی ضروریات کے لئے حکومت کا خزانہ خالی ہے تو آفیسروں
بڑی تنخواہیں کیوں دی جا رہی ہیں بڑے بڑے الاؤنس، در سفری اخراجات کیوں دیئے جا رہے ہیں وزراء کی کوٹھیوں پر اور
کے استقبال پر ہزاروں روپیہ کیوں زیبائش آرائش پر صرف کیا جا رہا ہے، گارڈن پارٹیز، ڈنرز، آفیسروں کے لئے دارا
کراچی میں عیاشیوں کے اڈے (Luxuary Quarters) کیوں قائم کئے جا رہے ہیں۔ ہوٹل و کلب
آباد ہیں، شراب و کباب کی محفلیں کیوں گرم ہیں، بیرونی ممالک میں جانے والے وفود کیوں، اتنا زیادہ روپیہ صرف کر رہے ہیں
ان لوگوں پر ملکی دفاع کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کیا وزیر اعظم کو ان سے یہ کہنے کی جرأت ہے کہ تمہیں بھوکا رکھا جا سکتا ہے
ملک کی دفاع کی طرف غفلت نہ کی جائیگی یہ سارے واعظ ہمارے ہی لئے ہیں۔
حقیقت یہ ہے کہ مسلم عوام نے پاکستان کے لئے ہمیشہ قربانیاں دی ہیں، لیکن اب ہم اپنے رہنماؤں آفیسروں اور
کرسی پر بیٹھنے والے بڑوں سے بھی قربانی کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر پاکستان سے محبت ہے تو ملکی دفاع کے
رہ کر دکھاؤ۔ حضرت عمر فاروق کی مثال قائم کرو۔
نہیں تمہیں خوشنما بنگلہ بھی چاہیئے، مرغن کھانے، اور زرق برق لباس اور نئے فیشن کا فرنیچر بھی چاہیئے، اپنی صحت
اچھے اور مستند ڈاکٹر بھی چاہیئے، اپنی اولاد کے لئے اعلیٰ تعلیم بھی چاہیئے۔ بیرون ممالک میں بھیجنے کے لئے اپنے فرزندوں
لئے حکومت کے وظائف بھی چاہیئے۔ تمہیں سب کچھ چاہیئے۔ اس کے بعد بھی تمہارا پاکستان پر احسان ہے، اور تمہارے حسا
کو گنانے کے لئے اور تمہاری نام نہاد تکالیف کو بیان فرمانے کے لئے، مسلم لیگ کے بعض عوامی لیڈر پارلیمنٹ کو سر پر اٹھا لیتے
لیکن خدارا ہمیں یہ تو بتاؤ کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے ہمیں کیا ملا، ہم نے پاکستان کے لئے خون بہایا۔ زمین و جائداد دو
پیسہ لٹایا، آبروئیں اور عزتیں گنوائیں، در در کی ٹھوکریں کھائیں۔ ہمارے پاس نہ سر چھپانے کو جگہ ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا،
جب اپنے قلیل معاوضوں کو بڑھانے کے لئے کہتے ہیں تو انتشار اور پاکستان دشمنی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اپنی تکالیف بیان کرنے
تو پاکستان کا ہوا ہمارے سامنے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے معاشرتی انصاف اور نام نہاد اسلامی مساوات
کے نظام میں فرض ہمارے ذمہ ہیں اور حقوق سرمایہ داروں جاگیرداروں اور کرسی نشین عہدہ داروں اور آفیسروں
عنایت کئے گئے ہیں۔
آیئے اب ذرا اس کو بھی دیکھ لیجئے کہ ان ضروریات کو پورا کس قسم کی آمدنی سے کیا گیا ہے۔ ٹیکس کس نوعیت کے ہیں اور ان

بارکن پر پڑتا ہے۔

انکم ٹیکس سے وصولیابی صرف ۱۲½ فیصدی ہوگی اور ۲۰ فیصدی حصہ درآمد برآمد پر ٹیکس سے وصول کیا جائیگا اور اسی طرح تقریباً ۲۵ فیصدی، سنٹرل اکسائز، نمک اور بکری ٹیکس سے جبکہ دیگر مدات سے ۲۲½ فیصدی وصول ہوگا۔

اس سے یہ چیز صاف ظاہر ہوگئی کہ تقریباً ۶۰ فیصدی ٹیکسوں کا بوجھ عوام اور متوسط طبقوں کے کاندھوں پر ہے اور یہ اندازہ کم ازکم ہے۔ اگرچہ ظاہراً یہ ٹیکس تاجروں اور صنعت کاروں سے وصول ہوگا۔ لیکن لامحالہ اس کا بوجھ بھی اشیا کی گرانی کی شکل میں عوام پر ہی پڑے گا۔

اس میں یہ چیز بھی قابل توجہ ہے کہ درآمد اور برآمد کے ٹیکس کی آمدنی سب سے زائد ہے اور یہی سب سے بڑا ذریعہ آمدنی ہے لیکن یہ ذریعہ بھی دولت مشترکہ کی شمولیت کے جرم میں ابھی تک خراج دے رہا ہے۔ اٹاوہ پیکٹ کے ماتحت شاہی ترجیحات کا جو اصول غلام ہندوستان پر ٹھونسا گیا تھا اور جس کی بنا پر دولت مشترکہ کے مال پر کم ٹیکس لگانا پڑتا ہے، ہماری موجودہ قیادت کی انگریز مرعوبیت کی وجہ سے اب تک برقرار ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس مد پر پاکستان کو ہرسال ۱۰ کروڑ کا نقصان ہورہا ہے اس دس کروڑ روپیہ سے کم ازکم ۲ بڑی فیکٹریاں ہرسال قائم کی جاسکتی ہیں اور ۵۰ ہزار آدمیوں کو ہرسال کام پر لگایا جاسکتا ہے۔

سب سے بڑی خوبی کی چیز یہ ہے کہ دو کروڑ کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے وزیر مال کے سامنے خستہ و بدحال عوام اور متوسط طبقہ ہی رہ گیا تھا اور اس ہی کو کمزور اور بے زبان سمجھ کر مزید ٹیکسوں سے لاد دیا گیا۔ مٹی کا تیل۔ چائے، سگریٹ، ہوزری، بسکٹ اور اور اس ہی قسم کی تمام ایسی چیزیں ہیں جنکا بوجھ متوسط طبقہ اور عوام پر پڑے گا۔

یہاں بھی سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ کو چھوٹ دیدی گئی۔ سوائے فوقی ٹیکس کے جس سے آمدنی صرف ۲۰ لاکھ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیر خزانہ یہ سمجھتے نہیں کہ بچارا سرمایہ دار اور جاگیردار طبقہ پہلے ہی ٹیکس ادا کرتے کرتے قلاش ہوگیا ہے اور فاقہ مستی اور پریشان حالی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ان پر مزید ٹیکسوں کا بار ڈالنا ان کے نزدیک انصاف سے بعید ہے۔ ہاں متوسط اور غریب طبقہ ضرور مزے کر رہا ہے اور انکی خوشحالی اتنی زیادہ ہے کہ مزید ٹیکسوں کا ان پر کچھ بھی بار نہ ہوگا۔ اسکے علاوہ سرمایہ دار جاگیردار طبقہ پر مزید مہربانیاں یہ کی گئی ہیں کہ سرمایہ کے منافعوں پر ٹیکس یکسر منسوخ کردیا گیا ہے سوپر ٹیکس کی شرح ۱½ آنے سے ۹ آنے کردی گئی اور اس کی کم از کم حد ڈیڑھ لاکھ سے ڈھائی لاکھ کردی گئی اور اس کے لئے بہانہ یہ تراشا گیا ہے۔ کہ سرمایہ داروں کو چھوٹ اس لئے دی گئی ہے کہ وہ ملک کی صنعت کی طرف متوجہ ہو سکے حالانکہ چاہئے اور بھی ٹیکس کے بوجھ سے ان کے کاندھوں کو ہلکا کردیجئے وہ برابر اپنا سرمایہ درآمد برآمد کی تجارت، بلیک مارکیٹ اور ناجائز ترسیل میں لگاتے رہیں گے۔ جب حکومت کی لائیسنس دینے کی پالیسی کی وجہ سے چار آنہ میں درآمد کی ہوئی چیز کو وہ دو روپیہ میں بیچ کر سات سو فیصدی کا نفع کما سکتے ہیں تو انہیں خواہ مخواہ کیا مصیبت پڑی ہے۔ ملک کی صنعتوں میں اپنا روپیہ پھنسائیں۔

ابھی ذرا صبر کیجئے۔ سرمایہ داروں پر موجودہ حکومت کی مہربانیاں بھی سن لیجئے۔ خود ہمارے وزیر خزانہ کے اعلان کے مطابق حکومت کے خزانہ میں اس سال کے آخر میں ۶۵ کروڑ نقد ہوگا اور آئندہ سال تمام اخراجات ادا کرکے ۳ کروڑ، اس اعلان سے صاف ظاہر ہے کہ گذشتہ سال بھی حکومت کو روپیہ کی چنداں ضرورت نہیں تھی لیکن پھر بھی دس کروڑ کے قرضجات صرف اس لئے جاری کئے گئے کہ ملک کے بڑے سرمایہ لگانے والوں کا سرمایہ فاضل پڑا تھا اور ان کے سرمایہ لگانے کا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا، اس طرح تقریباً پبلک کو ۴۰ لاکھ روپیہ سود ان حضرات کو بطور فائدہ دینے پر مجبور کیا گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت

یا عوام کو اس ۔ اکروڑ کے ترضجات سے کیا فائدہ ہوا ۔ آخر حکومت کو سرمایہ داروں کی جیبیں بھرنے کی اتنی بے قراری کیوں ہے حکومت خوشنما اعلانات تو کرتی رہتی ہے کہ تاجر و سرمایہ دار صنعتوں میں روپیہ لگائیں لیکن پھر کیوں ان سرمایہ داروں کی سرپرستی کرتی ہے جو اپنے فاضل روپیہ صنعتوں کو بھوکا مار کر حکومت سے سود حاصل کرنا چاہتے ہیں

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حکومت کے خزانوں میں اتنا فاضل روپیہ موجود ہے تو وہ اس روپیہ کو صنعتوں پر کیوں نہیں لگاتی کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس روپیہ سے کم از کم بیس سوتی و اونی کپڑے کے کارخانے اور دس جوٹ کی ملیں کھل سکتی ہیں اور ان میں کم از کم ڈھائی لاکھ آدمی کام پر لگائے جا سکتے ہیں ۔ اگر حکومت یہ بھی نہیں کر سکتی تو ان قرضوں کو جو حکومت نے جاری کئے ہیں اور جن کا کروڑوں کا سود ہمیں ہر سال ادا کرنا پڑ رہا ہے کم از کم ان ہی کو چکا دیا جائے تاکہ سود کا بوجھ عوام کے کاندھوں سے کم ہو جائے ۔

ہماری موجودہ قیادت کے مزید کارنامے بھی سن لیجئے گا پونڈ کی کم قدری کے مقابلہ میں پاکستانی سکہ کی بحالی کے فیصلہ پر موجودہ قیادت داد و تحسین حاصل کر چکی ہے ۔ لیکن اس فیصلہ سے جیسا کہ اس کا فطری نتیجہ تھا ۔ عوام کو کچھ بھی فائدہ نہ ہوا اور چیزوں کی قیمت کچھ کم نہ ہوئی ۔ تمام فائدے ملک کا سرمایہ دار طبقہ لے اڑا ۔ کم قدری کی وجہ سے تاجروں نے کم قیمت پر مال تو خرید لیا لیکن ان کے دام کم قدری کے پہلے ہی کے رکھے اور پھر لائسنس ... دینے میں جو بد احتیاطیاں کی گئیں ان سے اور سونے پر سہاگہ ہوا اور بعض اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں ۔ لیکن موجودہ حکومت صرف کمیٹیاں بنانے کے سوا اور کچھ بھی نہ کر سکی اور اس طرح سرمایہ داروں کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ عوام کو لوٹ کر اپنے بینک بیلنس بڑھاتے رہیں ۔

کم قدری کی وجہ سے اور ہمارے سکے کے پونڈ سے منسلک ہونے کی وجہ سے اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا اپنے اسٹرلنگ اور ہندوستانی روپیہ کے محفوظات اور فاضلات پر ۴۲ کروڑ روپیہ کا نقصان بھی حکومت کو بھرنا پڑا ۔ یہ دولت مشترکہ میں شامل رہنے کا انعام ہے اور پاکستانی سکہ کا اسٹرلنگ سے منسلک رہنے کا تحفہ ہے ۔ معلوم نہیں ہماری موجودہ قیادت کی انگریز دوستی ہمیں کتنے اور انعامات دلواتی رہے گی ۔ آج کیا پاکستان کی دستوریہ میں ایک بھی ایسا رکن نہیں ہے جو دولت مشترکہ کی شمولیت کے خلاف آواز اٹھا سکے تاکہ ہماری موجودہ قیادت کے دعووں کی صداقت معلوم ہو سکے جبکہ یہ پوری جماعت و بے باکی سے اعلان کر رہی ہے کہ جب تک پاک دستوریہ فیصلہ نہیں کرتی ہم دولت مشترکہ میں شامل رہیں گے چاہے ہمیں کتنے ہی نقصانات ہوتے رہیں ۔ نہ معلوم موجودہ قیادت خود کیوں نہیں یہ ریزولیشن پاک دستوریہ میں لاتی ہے ۔

اوپر کی بحث سے یہ چیز تقریباً واضح ہو چکی ہے کہ موجودہ لیگی قیادت نے عوام سے جتنے بھی وعدے کئے تھے ان کو وہ پورا نہیں کر سکی ۔ عوامی خوشحالی، تعلیم وصحت عامہ اور دیگر مفادات عامہ پر بالکل توجہ نہیں کی گئی ہے ملک کی ہمہ گیر تعلیم و تربیت اور فوجی ٹریننگ کا کوئی بھی پروگرام نہیں بنایا گیا ہے ملک کی صنعت، تجارت اور زراعت کی ترقی اور استحکام کی کوئی فکر نہیں کی گئی ہے ۔

عوام سے دور ہونے کے بعد موجودہ قیادت اپنے دفتری نظام کو مضبوط کر رہی ہے اور اپنے آفیسروں اور حکومت کے عہدہ داروں کو خوش کرنا چاہتی ہے ۔ تاکہ دفتری حکومت کے بل پر اپنی قیادت قائم رکھ سکے ۔ جس طرح سے انگریز اپنی دفتری حکومت کو مضبوط بنانے میں کوشاں رہتا تھا اور عوامی فلاح و بہبود اور ملک کی صنعتی و زراعتی ترقی سے غفلت برتتا تھا بالکل اسی طرح موجودہ قیادت بھی ان ہی اصولوں پر چل کر اپنی قوت برقرار رکھنا چاہتی ہے ۔

اس کام کے علاوہ وہ ملک کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے سازباز کرچکی ہے اور ان کو ہر موقع پر چھوٹ دے رہی ہے تاکہ ان کے سرمایہ اور روپیہ پیسہ کی قوت کے بل پر اپنے اقتدار کو اور مضبوط بنایا جا سکے، وہ اپنے چاروں طرف مفاد پرست نفع اندوز طبقہ کو پیدا کر رہی ہے تاکہ ملک کے عوام، متوسط اور ذہین طبقہ کو غلام بنائے رکھنے میں ان کا پورا تعاون حاصل کیا جاسکے۔ یہ طبقہ حکومت کا وفادار اور کیسہ بردار ہے اور حکومت انکے مفاد کی نگران، اور اس کے بعد اس ناپاک اتحاد پر اسلام کا خوشنما لیبل لگانے کی جسارت کی جاری ہے۔

چنانچہ اسلام دوستی کا یقین دلانے کے لئے زکوٰۃ کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا گیا ہے آخر عوام کی گردن پر اس بری طرح تیشے چلانے کے بعد انہیں افیون کی کوئی نہ کوئی گولی تو دینا ضروری ہے تاکہ عوام اسلام زندہ باد اور پاکستان پائندہ باد کے نعروں میں مست ہوکر ان تیشوں کی ضربوں کو صبر و سکون سے سہتے رہیں۔

اس زکوٰۃ کمیٹی کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی ساتھ سب سے پہلے یہ جسارت کی گئی ہے کہ قرآن و اسلام نے جس ٹیکس کو لازمی اور اس کی جبری وصولیابی کو حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ اس کو اختیاری کر دیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ قیادت نہ تو زکوٰۃ کی حکمت اور اس کے معاشی فائدوں اور دوررس نتائج سے واقف ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہے کہ خلیفہ اول نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا یا جان بوجھ کر اس کی طرف سے غفلت برت رہی ہے۔ اور یہاں بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو زکوٰۃ سے بچنے کا موقع دے رہی ہے۔

موجودہ بجٹ نے خوب اچھی طرح سے موجودہ قیادت کے چہرے سے نقاب اٹھادی ہے۔ یہ چیز صاف ہوچکی ہے کہ مغربی سرمایہ داری کی سرپرستی اسلام کے نام ہی کی جارہی ہے۔ آج سب سے بڑا خطرہ پاکستان کو اسی طبقہ سے ہے جو اسلام کے نام پر جوا کھیل رہا ہے جو اسلام کے معاشی اسکیم کو نافذ کرنے سے جی چراتا ہے۔ جو ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں سے سازباز کرچکا ہے جو مغربی سرمایہ داری کو اسلام کی اصطلاحات کے ساتھ نافذ کرنا چاہتا ہے جو نفع خوروں اور ظالم طبقوں کے ہاتھ مضبوط کرکے اشتراکی انقلاب کے لئے زمین تیار کر رہا ہے اس طبقہ سے پاکستان کو بچانا پاکستان کی سب سے بڑی خدمت ہے اور اسی خدمت کی طرف ہم پاکستان کے ہر سمجھدار شہری کو دعوت دیتے ہیں۔

اسلامی اُدب کا نیا افسانوی سرمایۂ

ابن اسلام

[ایک تبصرہ]

جیسے دبیز اندھیروں کے کپکپاتے سینے پر اُبھرتے ہوئے سورج کی پہلی زرتار کرن'
جیسے پرہول خلاؤں کی سنسناہٹوں میں کسی مدھر نغمے کی پہلی تان'
جیسے وسیع شورزار میں کسی نورس کلی کی پہلی چٹک'
جیسے تعفن کے بھباکوں سے لبریز فضاؤں میں کسی جاں فزا خوشبو کا پہلا جھونکا!

———— یہ ہے' ہفت روزہ "جہان نو" کراچی کا افسانہ نمبر[1] جو اپنے دلکشا دامن میں پندرہ افسانوں اور خاکوں کو سمیٹے حال ہی میں شائع ہوا ہے'

اس افسانہ نمبر کی اشاعت سے پہلے ہمارے ہاں اسلامی ادب کا جو افسانوی سرمایہ موجود تھا' میری صدق دلانہ رائے ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر اسے فنی اعتبار سے کسی اچھے پائے کا مواد نہیں کہا جا سکتا' تاہم یہ بھی میری صدق دلانہ رائے ہے کہ "جہان نو" کے افسانہ نمبر نے جو ادب پیش کیا ہے' وہ اپنے اسلوب' فن' تکنیک' جدتِ تخیل اور ندرتِ بیان کے لحاظ سے اس قدر کامیاب اور جان دار ادب ہے' کہ اسلامی تحریک کے داعی اس نمبر کے افسانوں کو بلا جھجک کسی دوسرے ترقی یافتہ ادب کے سامنے پیش کر سکتے ہیں!

اس افسانہ نمبر میں ہمارے ادیبوں اور فن کاروں کی تخلیقات مقابلتاً خوب نک سک سے درست نظر آتی ہیں' اور یہ محسوس کر کے دل کو ایک گونہ مسرت ہوتی ہے' کہ ہمارے لکھنے والوں کے جذبات و احساسات میں پہلے کی نسبت ایک دلکشا نکھار' ان کے طریق اظہار میں ایک دل آویز حسن اور ان کی بندش میں ایک نئی نفاست پیدا ہو چکی ہے' یعنی مختصراً ہمارے قلم کاروں کے پیکرِ تخیل میں بحمد اللہ! ایک توانا روح پیدا ہو چکی ہے' اور اب "لکھنا محض لکھنے کے واسطے" یا "لکھنا محض پروپاگنڈہ کے واسطے" کے نعروں سے لبریز تحریروں کی بجائے' وہ سچے معنوں میں ایسی ادبی نگارشات پیش کرنے لگے ہیں' جن کو فی الحقیقت ان کی طویل سوچوں کا نشرہ اُن کے ذاتی واردات کا آئینہ' اور اس کے ساتھ ساتھ ادب کی اسلامی اقدار کا واضح عکس کہا جا سکتا ہے —— ایسا عکس' جس کے اندر پروپاگنڈہ سے زیادہ ہمارے فن کاروں کے ذاتی جذبات و احساسات کا پرتو جھلکتا نظر آتا ہے ——— اور میرے خیال میں کسی فن کار کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے' کہ وہ اپنی پسندیدہ اقدار کو ذاتی جذبات و احساسات میں جذب کر چکا

[1] قیمت ڈیڑھ روپیہ' ملنے کا پتہ —— دفتر ہفت روزہ "جہان نو" یعقوب خاں روڈ' کراچی ۔

گھلا کر ایک یک جان آمیزے کی صورت میں پیش کرے‘ اور پھر اس کی یہ پیشکش اتنی حسین اور دلآویز ہو کہ قاری کا ذہن‘ زندگی کے ٹھوس بے رس اور خشک حقائق کو بھی شیریں گھونٹ جان کر پی جائے!

اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حلاوت اور لطافت ”جہانِ نو“ کے افسانہ نمبر کے بیشتر افسانوں میں موجود ہے‘ اور الحمدللہ کہ آنکھیں اس حلاوت اور لطافت میں مزید اضافوں کے امکانات بھی دیکھ رہی ہیں ——— آئیے آپ کو بھی یہ سب کچھ دکھلائیں:-

اس نمبر کا سب سے پہلا افسانہ‘ اسعد گیلانی کا کلاسیکل ”ایک عورت‘ دو ملک“ ہے‘ اسعد گیلانی کو قدرت کی طرف سے فنی چابکدستی کا جو بہرۂ خاص حاصل ہے‘ وہ اس افسانے میں ایک بھرپور انداز کے ساتھ موجود ہے‘ جہاں تک پلاٹ کے پھیلاؤ اور افسانے کی نشوونما [DEVOLPMENT] کا تعلق ہے‘ یہ ماننا پڑے گا کہ اسعد نے افسانے کا تار و پود بننے میں نہایت عمدہ فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے‘

یہ افسانہ مغربیت کی اس روحانی موت کی عبرتناک داستان ہے‘ جو ہمارے وطن کے ایک بعید ہمسایہ ملک میں واقع ہو چکی ہے‘ اور ہمارے اپنے ملک کے اندر واقع ہو رہی ہے ——— اُس مغربیت کی داستانِ مرگ‘ جو سب سے پہلے نسوانیت کے ذرّے ذرّے میں حلول کرتی ہے‘ اور پھر عفّت و حیا کے پردے چاک کر کے مخلوط درس گاہوں میں تیتری کی طرح اُڑتی‘ کلب گھروں میں آتشیں بگولہ بن کر گھومتی‘ رقص گاہوں میں بھنور بن کر ناچتی‘ اور بالآخر ”بے کار مردوں کے غولوں میں اضافوں کے ساتھ ساتھ نوجوان لڑکیوں کی معاش کا مسئلہ حل کرتی ہے[1]‘ تا آنکہ ہلاکت کا گڑھا اس کے لئے اپنی آغوش کھول دیتا ہے‘ اور بربادی کی قبر اس کی متعفن نعش کے لئے پاٹ دی جاتی ہے“!

اسعد بتلاتا ہے‘ کہ ”منچوریا کے زرد میدانوں میں“ پچھلے دنوں‘ ”ڈالروں کی گود میں پلی بڑھی روحِ مغرب کی بیٹی“ مر کر ایک ایسی ہی قبر کی اندھی کھائی میں دھکیلی جا چکی ہے‘ اور ”سرخ بادِ شمال کے تیز و تند جھونکوں نے اُس کی قبر کا نشان تک مٹا دیا ہے“! ——— وہ بتلاتا ہے۔ کہ جب روحِ سرمایہ نے بھوکے مشرق کی گود میں ایک نئی بیٹی کو جنم دیا‘ اور وہ مشرق کے ایک روائتی عاشق مزاج شہزادے کی ساتھی بن گئی‘ اور اپنے جہیز میں ڈالروں کے ڈھیر اور سونے کے انباروں کے ساتھ ساتھ غلام سازی کے تمام اجزائے ترکیبی بھی لے آئی‘ اور اس نے مغرب کی ہوس کار تہذیب کے تمام لوازمات کو بھوکے مشرق پر عملاً نافذ کر دیا‘ تو مشرق کی پاکیزگیوں کے تمام آبگینے کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے“ ”انسانوں اور ملکوں کی تجارت کرنے والوں نے اپنی سونے کی نلکیوں کے ذریعے غریب مشرق کا سارا خون چوس لیا“ اور جب ڈالر ایک گروہ میں اور بھوک دوسرے گروہ میں بٹ گئی‘ اور انسانی ہمدردی اور اخلاق کی جڑ کو زرد زمین کے سینے سے اکھاڑ پھینکا گیا! تو نتیجتاً شمال سے ایک سُرخ آندھی اٹھی‘ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سرزمین آندھی کے لہروں سے آگ اور خون کا لاوا ابلنے لگا“ مشرق کے بھوکے بیٹوں نے اپنی ہی قوم کی گویا خودکشی کرا دی‘ اور اپنی ہزار سالہ تہذیب کا کفن پھاڑ کر انہوں نے اس کے چیتھڑوں سے قطب شمالی کے ریچھ کی عظمتوں کے سُرخ جھنڈے بنا لیئے“ تب ”مغرب کے پالے غلام ساز بھاگ کھڑے ہوئے‘ اور ان کی جگہ شمال کے نئے غلام ساز اپنی مردم خور درانتیوں اور ہتھوڑوں کے ساتھ زرد زمین کے سینے پر دندنانے لگے ——— ایسے عالم میں روحِ مغرب کی جوانیت پسند بیٹی‘ جسے یہ معلوم نہ تھا کہ انسان بن کر بھی زندہ رہا جا سکتا ہے“ مر گئی! اور اپنے پیچھے دیکھنے والی آنکھوں کے لئے عبرت و موعظت کی

---

[1] واوین کی عبارت اصل افسانے سے لی گئی ہے۔ (ابن اسلام)

ایک دُنیا چھوڑ گئی! ــــــــ یہ استعدؔ کے افسانے کا پہلا حصّہ ہے، جس کا عنوان ہے "زردہ زمین" جہاں وہ مر چکی ہے! دُوسرا حصّہ ہے "پاک زمین" جہاں وہ مر رہی ہے!" اور تاثیر و معنویت کے لحاظ سے یہ حصّہ پہلے حصّے سے بھی کہیں بلند بلکہ درحقیقت افسانے کے پارۂ عروج (CLIMAX) کا حکم رکھتا ہے، ــــــــ اس حصہ میں استعدؔ نے اپنے بے رحم جرّاحی کے تیز تیز نشتر چلاتے ہوئے ایسے ایسے گھاؤ اُبھار دئے ہیں، کہ مجھے ڈر ہے کہ قہرمانِ اقتدار اس نشتر زنی کی تاب نہ لا سکے گا، ــــــــ "پاک قوم کے مال دار لیڈرز" اور اس کے "پیرِ تسمہ پا یعنی راجاؤں کے دیس کی ناری" کی ہوس کاریاں اور پھر اس کی خوفناک ہلاکت خیزیاں استعدؔ نے ایسی زبردست فنّی چابکدستی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر ابھاری ہیں، کہ زبان سے بے اختیار تحسین و آفرین نکل جاتی ہے، اور پھر اُس کے طرزِ بیان میں ایک ایسی گمبھیر سنجیدگی ایک ایسا ٹھہراؤ، اور ایک ایسا رچاؤ ہے، کہ کسی جگہ بھی نہ تو وہ خود مشتعل ہوتا ہے، اور نہ کسی کو مشتعل کرنے کی کوشش کرتا ہے، تیز سے تیز بات اور شدید سے شدید تلخ حقیقت کو وہ اپنی مرصّع تحریر کے چوکھٹے میں اس دلپذیر حسن و خوبی کے ساتھ فٹ کرتا چلا جاتا ہے، کہ یہ تیز باتیں اور یہ تلخ حقیقتیں قاری کے ذہن کا کابوس بننے کی بجائے اس کی گہری گہری سوچوں کی غذائیں بن جاتی ہیں! ــــــــ اور میرے خیال میں تحریر کی یہ صنعت فن کا پورا اوج کہلانے کی مستحق ہے۔

استعدؔ کے اس افسانے میں افسانہ نویسی کی ایک اور صفت (SYMBOLISM) علامیت[1] (یعنی مناسب ترین علامات کے فن کارانہ ذکر کے ساتھ قاری کے ذہن میں اصل عظیم حقائق کا انعکاس پیدا کرنا) کا استعمال بڑے باکمال انداز کے ساتھ کیا گیا ہے، اس کی تحریر کی نفیس و دلآویز صنعت کاری پڑھنے والے کی نگاہ کو ہر ہر سطر میں ایک محدّب شیشے کی مانند سمیٹتی اور اپنے اندر مرکوز کرتی چلی جاتی ہے، اور اس کے تخیّلات کی بوقلمونی قدم قدم پر قاری کے ذہن میں معانی کی نئی نئی وادیاں استوار کرتی جاتی ــــــــ اور جب اس علامیت کے پہلو بہ پہلو استعدؔ کے طنز کا تیز تیز دشنہ بھی اپنا کام کرتا نظر آتا ہے، تو قاری کو یوں محسوس ہونے لگتا ــ جیسے حقائق کے دھول میں لپٹے چہرے پر کوئی شفاف پانی کی پھواریں برسا رہا ہو، ــــــــ اس طنز اور علامیت کی مثالیں آپ افسانے کے پہلے حصّے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، اب چند مثالیں حصّہ دوم سے بھی دیکھ لیجئے:-

(۱)

"راجاؤں کے دیس کی ناری نے مستقل طور پر ایک بزعمِ قوم کے مالدار لیڈر کے گھر کو اپنا مسکن بنا لیا الف لیلیٰ کے روایتی جزیرے میں ایک خوفناک پیرِ تسمہ پا کو ایک سندباد جہازی مل گیا"

ایک جگہ پر اسی مالدار لیڈر اور راجاؤں کے دیس کی ناری کی گفتگو ملاحظہ ہو،

(۲)

"کیمپ بھوکوں (؟) سے بھر گئے ہیں، اور کثرتِ اموات نے پاک زمین کی آبادی کے یقین و استقلال کو متزلزل کر دیا ہے، .... اسے گل پوش وادی میں خطرے والی پری! بتلائیں اب کیا کروں؟" لیڈر نے کہا۔

"کاغذات میں درج شدہ طویل طویل اعداد و شمار آبادکاری سے اخباروں کا دامن بھر دے، اور آنچل مانگنے والیوں کو تصویروں میں کپڑوں کی تقسیم کر کے پوسٹروں سے ملک کی دیواروں کو لیپ دے۔ اور پھر

[1] میں نے استعاریت کا لفظ جان بوجھ کر استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ فنّی لحاظ سے یہ چیزے دیگر ہے [ابن اسلام]

گنگھیانے والوں کو پاک زمین کی وسعتوں پر کھلا چھوڑ دے' تاکہ وہ موسموں کا تغیر و تبدل دیکھیں! —
اے بھولے شہزادے تیری یہ فکرمندی' قومی زندگی کا روگ بن جائے گی' ہیرے کو پتھروں کے لئے
کڑھتا دیکھ کر میں تیری بوالعجبی پر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرتی ہوں!"

(۳)

"وہ راجاؤں کے دیس کی اس ناری کے ساتھ ہواؤں کے دوش پر پاک زمین میں پہنچا' تاکہ اپنی پُرشفقت رہبری کی کامیابی پر چراغاں کر سکے' تیل کی کمی نے اگرچہ چراغاں میں بھی کمی پیدا کر دی تھی' تاہم پورب دیس میں مرنے والوں کا خون' چراغاں کی مسرت کو سُرخی کا تحفہ پیش کر رہا تھا' —— اس طرح مغرب کی بیٹی کے مشورے کے مطابق' مشرق کے اس مالدار لیڈر نے پاک قوم کی قیادت کو گم راہ راستوں میں جانے سے بچا لیا!"

(۴)

"عورتوں کے بازار منظّم طور پر لگنے لگے' اور مسکراہٹیں اور عصمت لُٹانیاں بڑے بھاری داموں پر فروخت ہونے لگیں"

(۵)

"پاک قوم نے کہا:— اے پاک زمین کے مالدار لیڈرو! تو نے ہم سے جو عہد کئے تھے' وہ جبلِ کشمیر کی گل پوش وادیوں میں راجاؤں کے دیس کی ناری کے ساتھ کھلونے بنا کر توڑ دیئے گئے"

اور یہ سوال پیدا کرنے کے بعد' اسعد گیلانی ایک پروقار انداز کے ساتھ اپنے افسانے کا رُخ موڑتا ہے —— اسلام کی طرف! اور جب قاری اس موڑ پر پہنچتا ہے' تو معًا اس کی نگاہوں کے سامنے نئی وادیاں کھل جاتی ہیں' —— وادیاں' جن کے اندر "اُسے روحِ اسلام کے غلام' کفن سروں پر باندھے' ایک نئے معرکۂ بدر کے لئے صف آرا" نظر آتے ہیں' "جن کی تنظیم کی دہشت سے قصرِ استبداد لرزتا ہوا نظر آتا ہے" تب "روحِ اسلام کی آمد کا سہرا غبارِ فضا میں چمکنے لگتا ہے" "مغرب کی بیٹی کا پھیلایا ہوا اسرار طلسم دھواں بن کر اُڑ جاتا ہے۔" اور پھر بالآخر نغمۂ موت کی جاں گسل لہریں' اس کے قصرِ چلیپا کی کھڑکیوں پر دستک دے دیتی ہیں! —— اور یوں' اپنے قاری کے ذہن میں تاثر کا ایک وسیع و بے پایاں سمندر موجزن کرنے کے بعد' اسعد کا یہ افسانہ ایک بڑے ہی معنی خیز انداز میں ختم ہو جاتا ہے' اور اس کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی قاری کے ذہن میں زیرِ نظر افسانہ نمبر کی پیشانی والا یہ شعر پورے زور و شور کے ساتھ ابھر آتا ہے' کہ:—

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا' وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

میرے خیال میں اسعد کا یہ افسانہ اُردو کے بہترین افسانوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے' اور ویسے بھی اسلامی ادب کا یہ پہلا افسانہ ہے' جو پورے کا پورا کلاسیکل زبان اور کلاسیکل طرزِ ادا کے ساتھ لکھا گیا ہے' اور اس لحاظ سے یہ ایک منفرد اور یگانہ حیثیت کا مالک ہے۔

اس افسانے کے بعد' اسعد اپنا ایک اور تاثر پیش کرتا ہے' جس کا عنوان ہے' ایک بھرا اشتراکی! —— اس تاثر میں بھی

اسعد نے اپنی خصوصیات کو قائم رکھا ہے، تاہم اُس شدت والتزام کے ساتھ نہیں، جو اس کے پیشرو افسانے کے اندر جاری وساری ہے۔ بہرکیف اس میں شک نہیں، کہ زیرِ نظر افسانے کا ڈھانچہ استوار کرنے میں بھی اسعد نے کافی غور وخوض سے کام لیا ہے، اور اگرچہ اس افسانے میں اس نے نہ تو کوئی خاص پلاٹ پیش کیا ہے، اور نہ ہی کردار نویسی پہ کوئی خاص توجہ صرف کی ہے، اور طنز کے دشنۂ پنہاں کی بجائے وانکشاف بیانی کو پیشِ نظر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے، کہ افسانے کی عام تشکیلی ہیئت میں کہیں کوئی جھول موجود نہیں ہے، اور اسعد کی مخصوص صنعتوں کے (   ) بھی اس میں بھی جابجا نظر آتے ہیں!

تمام افسانے کے دوران میں ایک بے اُصولے اڈیٹر، اور ایک ترقی پسند تُم اشتراکی افسانہ نویس کی گم شدہ ذہنی شخصیت کو ہلکے ہلکے اجاگر کرنے کے بعد، جب اسعد اپنے افسانے کے اخیر میں ایک بھرپور وار کا پنچ (   ) دے کر قاری کے ذہن کو یکایک ایک شدید جھٹکے سے دوچار کرتا ہے، تو ماننا ہی پڑتا ہے، کہ یہ سادہ سا واقعاتی افسانہ ایک ہوشیار فن کار کی پُرکار نویسی کا رہینِ منت ہے!

اِس کے بعد منظر حسین کا ایک طویل سا مطالعہ ہے ———— "آنکھوں سے دور"

منظر حسین کا صرف ایک ہی ادب پارہ اس سے قبل میری نظروں سے گذرا تھا، اور سچ پوچھئے تو میں نے اس کا کوئی خاص تاثر محسوس نہیں کیا تھا لیکن اس کا موجودہ افسانہ یہ ظاہر کرتا ہے، کہ منظر حسین کے سیدھے سادے ادبی اطوار میں ایک جری افسانہ نویس کی شخصیت اُبھر رہی ہے، جس محنت سے اس نے اپنے افسانے کا مواد تیار کیا ہے، اور پھر جس خوش اسلوبی کے ساتھ اُس نے اسے نبھایا ہے، الحمدللہ کہ وہ بہت خوش آئند ہے،

ذاتی کمزوریوں کی بناء پر بگڑی ہوئی شخصیتیں، جب اشتراکیت کی زہریلی وادیوں میں ایک فکری پناہ آن لیتی ہیں، اور اس کے بعد جب اِن وادیوں کی زہرناک فضائیں خود اپنے پناہ گزینوں کے وجودوں کے اندر بھی بہیمت فشانی اور کمینے پن کی صفتیں پیدا کر دیتی ہیں، تو جو کچھ ظہور میں آتا ہے، اُسے منظر حسین نے اپنے افسانے میں بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے، ادھر افسانے کے تمام بیان کے پہلو بہ پہلو ایک مخلص اور حساس انسان کے ذہنی ردِّ عمل کو بھی ہلکے ہلکے لیکن دل نشین اشاروں سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، افسانے کے آخر میں جب اس ردِّ عمل کا بھاری ریلا قاری کے ذہن کو اسلام کے دامن میں بہا لاتا ہے، تو افسانہ نگار کی مہارت کی داد دینا ہی پڑتی ہے،

اپنے افسانے کے اندر منظر نے اگرچہ بڑی سادہ زبان استعمال کی ہے، تاہم اس سادگی میں بھی بعض جگہ فنی پرکاریوں کے شواہد موجود ہیں، اِس افسانے کی سب سے زیادہ قابلِ داد چیز اس کے عمدہ مکالمے ہیں، جو نہایت سادہ لیکن بے ساختہ و بے تکلف واقع ہوئے ہیں، اور ان کی بے ساختگی کی وجہ سے منظر کے کردار کسی افسانوی دیومالا کے بے جان اصنام کی بجائے قاری کے اپنے ذہن میں جیتے جاگتے انسانوں کی مانند چلتے پھرتے اور بولتے چالتے نظر آتے ہیں،

منظر کے افسانے میں البتہ ایک چیز محلِ نظر ہے، اور وہ یہ کہ، کہ اس افسانے کے عنوان کی رمز بظاہر سمجھ میں نہیں آتی،

اس سے آگے، "م ۔ ن" اور ظفر اسحٰق انصاری کا ایک مشترکہ لکھا ہوا نفسیاتی تجزیہ آتا ہے، جس کا عنوان ہے "اسی کشمکش میں گذری" ———— اور جہاں تک اس کے فنی نک سک سے درست (WELL-KNITTED) ہونے کا تعلق ہے، میرے خیال میں اسعد کے "ایک عورت، دو ملک" کے بعد یہ افسانہ اس مجموعے کا دوسرا شہپارہ ہے،

اس افسانے کے پہلے حصّہ "فرار" میں مس۔ ن نے ایک ایسے شخص کی ذہنیت کا خاکہ پیش کیا ہے، جو اپنی ناقص طور پر نشو ونما پائی ہوئی شخصیت کے سبب زندگی کے چیلنج یا ناخوشگوار حقائق سے دو چار ہونے کی ہمت نہیں رکھتا' اور اُس مشہور بزدل کبوتر کی مانند جو سامنے سے لپکتی ہوئی بلّی سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں موند لیا کرتا ہے' یہ فراری ذہنیت کا مالک شخص اپنی ہوس کے لٹ کھٹ پرندکو کبھی حسن کے سایہ زاروں میں بٹھلاتا ہے' اور کبھی سرمایہ آمیز زہد کی متعفن گپھاؤں میں' لیکن اسے کہیں آسودگی میسر نہیں آتی' کہیں اطمینان حاصل نہیں ہوتا' اور کہیں پناہ نہیں ملتی! ——— ایسی ہی ایک فراری ذہنیت کی واردات و کیفیات کا خاکہ مس۔ ن نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے' اور اس پیشکش میں اُس کا انداز نہ تو تحقیرآمیز ہے' اور نہ ملتفانہ' بلکہ اس کی بجائے بڑا ہی ہمدردانہ ہے' غیر افادی طنز و تعریض کے نشتر چلانے کی بجائے' وہ بڑے پُر محبت انداز میں اپنے ہیرو کے ذہن کی ایک ایک جِس بھری گانٹھ کو کھولتا ہے۔ اور اس کے آوارہ و بے عنان رہوار کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی لغزش کو پوری غیر جانب داری کے ساتھ واضح کرتا ہے' اور کہیں یہ محسوس نہیں ہونے دیتا کہ وہ ایک فراری ذہنیت کا خاکہ محض خانہ پُری یا تحقیر کے نقطۂ نظر سے تیار کر رہا ہے' بلکہ اس کی بجائے وہ ایسے لوگوں کی صحیح ترین نمائندگی کرتے ہوئے قاری کے سامنے ان کی ذہنیت کی ہرگونہ مکمل تشکیل کر کے دکھلاتا ہے۔

"مس۔ ن" کے بعد ظفر اسحٰق انصاری اس افسانے کا دوسرا حصّہ" سحر ہونے تک" کے عنوان کے ساتھ پیش کرتا ہے اور حکیمانہ تجزیہ کا جو ROLE'' اسے سونپا گیا تھا' حق یہ ہے' کہ وہ نہایت ہی قابل رشک کامیابی کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوتا ہے'

اس تجزیے میں جس قدر عمدہ فن کارانہ صلاحیت پیش کی گئی ہے' وہ اس امر کی امید دلاتی ہے' کہ ظفر اسحٰق مستقبل قریب میں تحریک اسلامی کے بہترین افسانہ نگاروں میں جگہ پائے گا' پختہ فکری' سلاستِ زبان' دقّتِ مشاہدہ' اور ژرف نگاہی قدم قدم پر قاری کا دامن پکڑتی ہے' اور بزبانِ حال کہتی ہے کہ:— "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است!" ——— الفاظ کے موزوں اور برمحل استعمال' تاثرات کی ایک حکیمانہ ترتیب' نفسیاتی نکات کی ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی [جی ہاں' منصوبہ بندی!] ظفر کو افسانہ نگاری کی بہترین صلاحیتوں کا مالک ثابت کرتی ہے'

ایک حد سے زیادہ بگڑی ہوئی لذّت پرست ذہنیت' جو ایک عرصہ تک فکری انارکی کا صیدِ زبوں بھی رہ چکی ہو' اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی عقل و فہانت کو قطعاً بے لگام چھوڑ کر بغیر کسی بنیاد و اساس کے اندھا دھند بدفکری کے نت نئے لار دے بھی تیار کرتی جاتی ہو' اور پھر یہ ذہنیت خود کو ایک ULTRA - INTELLECTUAL GENIUS سمجھنے کا بھی زعم رکھتی ہو' لیکن ادھر یہ بھی حقیقت ہو' کہ وہ اپنی ژولیدہ خیالی' اور بدفکری کے فلیتوں کے پے بہ پے استعمال سے روحانی پریشانی و اضطراب کا شکار ہو کے دوزخ میں بھی جل بھن رہی ہو ——— ایسی ذہنیت کو' ایک نئے فکری ارتقا کے ماتحت' اور ایک عظیم پیاس کا احساس دلا کر کشاں کشاں دینِ فطرت کی ٹھنڈی' جاں فزا جنّت میں لے آنا ——— یہ ہے ظفر اسحٰق کے اس تجزیاتی پارے کا موضوع!

اب آپ خود ہی دیکھ لیجئے' کہ موضوع کس قدر سنگلاخ اور دشوار گزار گھاٹیوں سے اٹا پڑا ہے' لیکن اسے ظفر اسحٰق کی خدا داد صلاحیتوں کا کمال سمجھئے' کہ اس نے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ راستے کی دشواریوں کو صاف کر کے اپنی منزل کو جا لیا ہے اور درمیان میں کسی ایک مقام پر بھی' نا اہلی' نادانی یا کمزور صلاحیت کا ثبوت نہیں دیا'

جب قانونِ فطرت کا ایک ذرا سا دھچکا، اسحٰق کے ہیرو کے خوابوں کے فلک بوس محلوں کو آن کی آن میں چکنا چور کر دیتا ہے، اور وہ ایک خوفناک بے بسی کے عالم میں اپنی ذہانت کے بڑے بڑے پشتاروں کے علی الرغم، خود کو عظیم و جلیل کائنات کی وسیع پہنائیوں میں ایک حقیر تنکے کی طرح محسوس کرنے لگتا ہے، تو یکایک اس پر حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، لذت کے الٰہ کی بجائے اپنے خالق پر ایمان لانے کے خلاف اس کی بے لگام عقل نے جو دلائل دیئے تھے، اسے خود ہی وہ بے حد پھیکے اور بھدے نظر آنے لگتے ہیں، اور پھر وہ خدا، انسان، اور کائنات کے بارے میں گہری گہری سوچوں میں غرق ہو جاتا ہے، اور ان سوچوں کے سمندر کی تمام چٹانوں، بھنوروں، اور خردس سامانیوں سے بخیریت نکال کر، ظفر اسحٰق جس ہنرمندانہ ملاحی (navigation) کے ساتھ اسے ساحلِ مراد پہ لے آتا، اُس پر بے اختیار زبان سے جزاک اللہ نکل جاتا ہے،

اللہ تعالےٰ ظفر کو عظیم سعادتوں سے ہم کنار کرے، اور اُس کے اشہبِ قلم کو اپنی راہ میں زیادہ سے زیادہ جولانیاں دکھلانے کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین،

اس کے بعد محمود فاروقی کا ایک مختصر سا مطالعہ "ننھے ذرے نے کہا" پیش کیا گیا ہے، اس مطالعہ کا مرکزی نقطہ، ذراتی طاقت کی قربانیوں پر ایک لطیف تبصرہ ہے، جو آج ایٹم بم کی شکل میں انسانیت کے سینہ پر ایک ہولناک کابوس بن کر سوار ہے، اور آج سے ہزاروں سال قبل اس کائنات کے حاکمِ حقیقی نے اپنے گھر کو ڈھا دینے کا ارادہ رکھنے والوں پر حجارۃ من سجیل کی شکل میں برسائی تھی، اور جس کی ہولناک ضرب کاری سے اس وقت بھی بڑے بڑے جبّاروں کی ٹھکی اور بڑے بڑے سرکش انسان آن کی آن میں بھوسے کی طرح بے حقیقت بن کر رہ گئے تھے!

محمود فاروقی کی یہ کوشش اس کی پہلی تحریروں کی بہ نسبت کامیاب ترین کہی جا سکتی ہے اور اگرچہ افسانے کا PERIOD بہت مختصر سا ہے، تاہم جس محنت کے ساتھ اُس نے افسانے کی عظیم و جلیل حقیقت بیان کرنے کے لئے افسانے کا ماحول تیار کیا ہے، اس کی افادیت میں کلام نہیں، ــــــــ افسانے کی نرم و لطیف انداز کے ساتھ اٹھان، ہلکے ہلکے کنایوں کی دل پذیر اشاریت، سبک و ملائم انداز کے ساتھ گہری گہری باتیں، پر تمکنت اظہارِ بیان، اور عمیق فکر، یہ ہے محمود فاروقی کے اس افسانے کا ٹیکنیکی حسن، اللہ اسے زیادہ تابناک کرے!

اور اب لیجئے، دو مختصر سے تاثر پارے ــــــــ پہلا رشتہ احمد کا "ردِّ عمل"، اور دوسرا محترمہ حمیدہ بیگم کا "ریڈ ماسٹرز" (Red Masters) ــــــــ رشید احمد نے نعیم کے افسانے "دو مائیں" کی جنس میں اپنا افسانہ پیش کیا ہے، لیکن میرے خیال میں یہ افسانہ فنی لحاظ سے نعیم کے افسانے سے زیادہ کامیاب ہے،

منزل کی معاشرت کے حیوانی بچاک کا شکار ایک نوجوان لڑکی، جو بے چاری شروع میں اپنے انسان ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا ہوتی ہے، اسے نسلی پیدا وار کو قومی ملکیت بنا دینے والے مجسٹریٹ ایک دن انسان کی ماں یا بہن کے مقام سے ہٹا کر ایک مادہ حیوان بنا دیتے ہیں، چنانچہ وہ انسان کہلانے والے مویشیوں کے گلوں میں عمر بھر چرتی، ان کے ہمراہ کھیت جوتتی، اور بچے جنتی رہتی ہے تا آنکہ موت کا اٹل قلادہ آکر اس کی زلیست کا گلا دبوچ لیتا ہے اور موت اور زندگی کی مہیب کشاکش میں مبتلا ہو کر اسکی نسوانیت بلکہ انسانیت جب جاگتی ہے، تو وہ خود کو یوں محسوس کرنے لگتی ہے، جیسے وہ ایک حقیر کتیا تھی، جسے اندھی اجتماعیت کے موٹر کا ذوقی پہیہ بے رحمی کے ساتھ کچل کر نکل گیا ــــــــ یہ ہے اس مختصر سے افسانے کی تھیم، جو فی الحقیقت بڑی پُر تاثیر ہے، اے کاش رشید احمد اسے ذرا سا اور پھیلا کر دیکھتا!

اور

محترمہ حمیدہ بیگم ہلکے پھلکے اصلاحی فیچر لکھنے کے سلسلے میں کافی اچھی چیزیں پیش کرچکی ہیں، "ریڈی میڈ مائنڈ" بھی اُن کا ایک ایسا ہی فیچر ہے، جو بہت کامیاب ہے، ہمارے ہراُن ذہنی بلندیوں پر اُڑنے والے ذہانت زدہ اشخاص نے جو یہ غلط مفروضہ قائم کر رکھا ہے، کہ جہالت کی تاریکیوں میں رہنمائی کا چراغ صرف ماہرینِ علوم انسانوں کے ہاتھ میں ہے، اس کے کھوکھلے پن کو بڑی خوبی کے ساتھ اس فیچر میں بےنقاب کیا ہے، اور محترمہ حمیدہ بیگم نے ایک ایسے ہی کھوکھلی ذہانت کے ڈسے ہوئے نوجوان کی ماہیت قلبی کو ایک مختصر مگر ہر لحاظ سے سنچے تلے مکالمے میں بڑے لطیف انداز کے ساتھ سمو دیا ہے!

اور اب لیجئے، عاصی ضیائی کی ایک پیروڈی "سیر پانچویں درویش کی" ——————

عاصی ضیائی مدتوں سے پیروڈی کا میدان اپنے لئے منتخب کرچکا ہے، اور حق یہ ہے، کہ وہ اس کا بہترین اہل بھی ہے اس بظاہر آسان لیکن فی الواقعہ بیحد مشکل میدان کی صعوبتوں کو جس آسانی کے ساتھ عاصی نے برداشت کیا ہے، اور جس خوبی کے ساتھ وہ ان سے عہدہ برآ ہوتا ہے، وہ قابل ستائش ہے، فنی نقطۂ نظر سے اس کی پیروڈی "البیان فی فرائض جمہور" کو ہر لحاظ سے ایک عمدہ ادبی پیش کش کہا جاسکتا ہے، لیکن میری رائے میں (جو ممکن ہے غلط ہو) عاصی کی زیرِ نظر تخلیق اس لحاظ سے مایوس کن ہے، کہ ہم عاصی سے ایک خوب تر پیش کش کی توقع رکھتے تھے،

وہ نٹ کھٹ طرزِ تحریر، اور بات بات میں طنز کے دشنہ ہائے پنہاں اور وہ بیان کا کرارا پن، جو عاصی کا طرۂ امتیاز ہے، اس پیشکش میں اس حد تک نہیں ملتا، جس حد تک اسے ہونا چاہئے تھا، عاصی نے اپنی پیروڈی کے لئے جس اور یجنل original کو منتخب کیا ہے، اس کی زمین کافی زرخیز تھی، لیکن نہ جانے اس کے باوجود عاصی نے اپنی کشت کاری کی بہترین صلاحیتوں کو کیوں استعمال نہیں کیا؟

افسانے کا افتتاح (OPENING) جس قدر دلکش ہے، اس کا تکملہ اسی قدر مایوس کن ہے، بلکہ نہیں تو یہ کہونگا کہ اس افسانے کا تکملہ سرے سے ہے ہی نہیں! —— ادھر افسانے کے دوران میں بھی، عاصی بین السطور میں پھلجھڑیاں بکھیرنے کی بجائے اجلاف صاف الفاظ اور آوازوں کے ساتھ ٹیاسے چھوڑنے پر اُتر آیا ہے، جس نے پیروڈی کا حسن گہنا سا دیا ہے! —— اس کے باوجود عاصی کی ٹھیٹھ اور بامحاورہ زبان کہیں کہیں بڑے پیارے انداز میں قاری کے ذہن کو سہلاتی ہے، —— "ڈڈھیال قلندر" - "آواز کی غنغناہٹ" "پیپڑا ساتھی" "اچکے لوگ"، "سمندر کی تلی" اور "سفید ہتاق جھوٹ" اس ضمن کی عمدہ مثالیں ہیں،

اس سے آگے تحریکِ اسلامی کے ایک بن کھلے مرجھا جانے والے غنچے، مرحوم ابوالعرفان کا افسانوی زبان میں ایک حقیقت پلمہ —— "داورِ حبیب میں" —— پیش کیا گیا ہے، جس میں عرفان مرحوم نے شہدائے بالاکوٹ کے ایک روحانی وارث، مولانا احمد اللہ صاحب رئیس عظیم آباد، پٹنہ کی محیر العقول عزیمت کی روئداد رقم کی ہے، میں اس پارۂ ادب پر کوئی رائے پیش نہیں کرنا چاہتا، سوائے عمق قلب سے نکلتی ہوئی اس دعا کے، کہ اے خدائے حیّ و قیوم، تو ایسی عقوبت مدح تحریر ہی کے صدقے میں اپنے ایک مرحوم ادیب بندے کی روح کو بہتر سے بہتر سعادتوں سے نواز، اور اسے اچھے اچھے مقامات پر سرفراز فرما، آمین!

اس کے بعد اصغر علی عابدی - مانولاگ (خود کلامی) کی شکل میں ایک نفسیاتی مطالعہ "میں بھی آدمی ہوں" پیش کرتا ہے اصغر کا یہ مطالعہ یا خاکہ اسی نمبر کے ایک پیش رو افسانے "اسی کشمکش میں گذری" کی جنس ہی سے تعلق رکھتا ہے،

اصغرؔ تحریکِ اسلامی کا ایک پرانا فن کار ہے، اور اس کا فن روزمرہ کے الفاظ میں عظیم حقائق کا اظہار، اور باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ جانے کی قدرت پر مبنی ہے، اس کی تحریر کی بے ساختگی اور پھر اس کی جامعیت اور مقصدیت اسے ٹیکنیکی اعتبار سے ایک بہت بلند مقام بخشتی ہے تاہم اس کے اندر ایک خامی بھی ہے، جو اس کے افسانوں میں بالعموم موجود ہوتی ہے اور وہ یہ ہے، کہ اصغرؔ بعض اوقات اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر غیر ضروری تفصیلات میں اتر جاتا ہے، اور یوں اپنے افسانے کے ماحول کی تعمیر کو نقصان پہنچا دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی تخلیقات میں ایک جھول سا رہ جاتا ہے، یہ چیز زیرِ نظر افسانے میں بھی موجود ہے، افسانے کا آغاز بڑا عمدہ ہے، اور اسی طرح اس کا انجام بھی خاصا تاثر سے لبریز ہے، لیکن درمیان میں آ کر افسانے کے کساؤ میں فرق آگیا ہے، اس کے علاوہ افسانے میں کچھ جملے ایسے بھی ہیں، جن کے لئے صحیح محل و مقام (Fitting) پیدا نہیں کیا جا سکا، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اصغرؔ کو اللہ تعالیٰ نے واقعی تخلیقی قوت سے بہرہ ور کیا ہے!

اس کے بعد محترمہ نسیم آرا کا ایک افسانہ "سہارا" سامنے آتا ہے، جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، محترمہ ادبِ اسلامی کے قافلہ میں نو وارد ہیں، اور یہ شاید اُن کی پہلی پیش کش ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو پھر یہ حقیقت کس قدر دل خوش کُن ہے، کہ تحریکِ اسلامی کو اب خواتین کے حلقے سے بھی عمدہ تخلیقی صلاحیتوں کی مالک بہنیں مل رہی ہیں، محترمہ نسیم آرا نے اپنے افسانے کا خاکہ جس محنت کے ساتھ تیار کیا ہے، وہ ان کی آئندہ کامیابیوں کے لئے ایک نہایت نیک فال ہے، اور پھر افسانے کے تکملہ والے پلٹے کو جس عمدہ طریق سے انہوں نے نبھایا ہے، وہ بہت خوب ہے، افسانے کا دوران بھی منظر کشی کی کامیاب کوششوں، ماحول سازی کی بہترین صلاحیتوں اور قدرتِ بیان کے عمدہ نمونوں نیز دلچسپ اور بے ساختہ مکالموں سے لبریز ہے۔ اور یہ سب کچھ ثابت کرتا ہے، کہ محترمہ نسیم آرا فنی لوازمات سے بھی کافی حد تک مسلح ہیں،

ہمارے ہاں کے افسانوی میدان کو جاہلی ادب کی علم بردار خواتین نے جس بُری طرح ناپاک اور متعفن کر رکھا ہے، خدا کرے، کہ محترمہ نسیم آرا اور محترمہ حمیدہ بیگم جیسی ہستیاں، اپنی پاک و شفاف نگارشات کے ذریعے اس میدان میں تطہیر و صفائی کی نمو کا سامان کریں، اور خواتین کے جاہلی ادب کے قلعوں کو حقانی ادب کے واسطے مغلوب کرنے کے لئے ہراول دستہ ثابت ہوں۔ آمین!

اس کے بعد فضل من اللہ کا ایک افسانہ ہے "تین انقلاب"، جس میں اس نے ایک سیدھے سادے مسلمان کی گونہ ماہیتِ قلبی کی تصویر کھینچی ہے، ذہن کے پہلے انقلاب کے ماتحت وہ قوم پرست بنا، دوسرے انقلاب کے ماتحت کمیونسٹ اور تیسرے انقلاب کے ماتحت، اسلامی انقلاب کا ایک سپاہی! ———

فضل من اللہ نے ان انقلابات کی نمود کے لئے جو ذہن منتخب کیا، وہ اگرچہ نفسیاتی اعتبار سے کافی بنجر ہوا کرتا ہے، یعنی ایک پولیس مین کا سنگین ذہن، جس میں لچک پیدا کرنے کے لئے، ایک فن کار کو کافی دقتیں اٹھانا پڑتی ہیں، لیکن اس مشہور سنگلاخ زمین میں بھی بار آور کھیتیاں لہلہا دینے میں فضل من اللہ نے کافی عمدہ صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، اور اپنے ہیرو کی ذہنی خصوصیت میں کافی مہارت سے انقلابات کا راستہ ہموار کیا ہے،

البتہ پلاٹ کی ترتیب اور زبان کی سلاست کا پایہ اس افسانے میں اتنا اونچا نہیں ہے، جتنا اونچا اسے ہونا چاہئے، امید کہ فضل من اللہ بہت جلد اسی خامی پر بھی عبور پا لے گا، ——— انشاء اللہ!

پھر "حرفِ آخر" کے طور پر محمد شوق کا ایک افسانہ "بادلوں کے پیچھے" آتا ہے، جو اپنے فنی حسن اور ٹیکنیکی خوبیوں کے اعتبار سے

میرے خیال میں مصنف کی اب تک نگارشات میں بہترین چیز ہے'

یہ افسانہ' جو اسعد گیلانی کے مشہور افسانے "لہروں کے نیچے" کی صنف سے ہے' اشتراکیوں کے اس خوفناک گسٹاپو نظام کی منہ بولتی تصویر ہے' جس کے ذریعے شرفِ انسانیت کے یہ سب سے بڑے دشمن اپنے مخالفین کو ان کے گناہ و بے گناہی کی پاداش میں اپنے سبوتاژ اور غارت گری کا نشانہ بناتے ہیں'

ہمارے نئے فن کار نے اس نظام کی کراہیت کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح کیا ہے' افسانے کے آخیر میں پہنچکر قاری فی الواقع ایسے مکروہ نظام کے خلاف اپنے دل میں گھن سی محسوس کرتا ہے' اور غالباً یہی فن کار کا مقصود ہے'

اس افسانے کی نشوونما اور پلاٹ کی ترتیب بہت خوب ہے۔ البتہ زبان و بیان کی خامیاں جا بجا ضرور ملتی ہیں' جو غالباً نو مشقی کا نتیجہ ہیں' اور انشاء اللہ ان پر بڑی آسانی کے ساتھ قابو پایا جا سکتا ہے'

اس افسانے میں منظر حسین کے "آنکھوں سے دور" کی طرح مجھے یہ چیز بھی کھٹکتی ہے' کہ عنوان کی مناسبت کو اجاگر کرنے کے لئے اندر کوئی تلمیح نہیں دی گئی۔

اب سب کے آخیر میں' ایک لقمۂ تر لیجئے' یہ تحریکِ اسلامی کی مشہور فاضل شخصیت' حضرت مولانا مسعود عالم ندوی مدظلہ کا ایک مختصر سا تاثر پارہ ہے' جو ان کی زیرِ طبع ڈائری کے دو اوراق پر مشتمل ہے' اور موصوف کے سفرِ طائف کی عظیم و جلیل کیفیات کا ادراک یہ حباب اندر! ...... مجھ سا ہیچمدان' اور اس تاثر پارے کی افادیت پر کوئی تبصرہ کرے ؟ حاشا:-

یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے!
اور پھر' اسکا عظیم الشان موضوع! اللہ اکبر!
ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

یہاں پہنچکر افسانے ختم ہو جاتے ہیں۔ اِن افسانوں کے علاوہ اس مجموعے میں تین تنقیدی مقالے بھی دیئے گئے ہیں' لیکن اِنکی مقالاتی حیثیت میں کلام ہے' کیوں کہ سوائے اسعد گیلانی کے مقالے کے نہ تو ان مقالات میں کوئی محققانہ اسلوب مدنظر رکھا گیا ہے' اور نہ ہی اپنے موضوع پر مقالہ نگار حضرات نے کوئی سیر حاصل بحث کی' معلوم ہوتا ہے' کہ یہ تحریریں عجلت کے عالم میں لکھی گئی ہیں' تاہم یہ بھی واقعہ ہے' کہ ان حضرات کی صلاحیتوں میں کوئی شک وارد نہیں کیا جا سکتا' اور ہمیں امید رکھنی چاہئے' کہ یہ حضرات ــــ کم از کم ڈاکٹر عماد الحق صاحب جیسی فاضل شخصیت ــــ بہت جلد اسلامی ادب کے تنقیدی سرمائے میں اپنی قیمتی تحقیق کے بہتر ثمرات کا اضافہ فرمائیں گے' آمین!

میرا یہ جائزہ خاصا طویل ہو گیا ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں' کہ اگر زیرِ نظر نمبر کی ترتیب اور دوسری ادارتی کاوشوں کا تذکرہ نہ کیا گیا تو یہ ایک ظلم ہوگا'

چونکہ ہمارے اکثر پرچوں کے مدیر حضرات' فنِ ترتیب کے لوازم سے بے خبر ہیں' اس لئے باذوق حضرات کو عموماً اس کوتاہی کا شکوہ رہتا ہے' ویسے بھی میرے خیال میں اُردو کے بہت کم پرچوں کے مدیر حضرات فنِ ترتیب کے ماہر ہیں۔ لیکن مجھے اس امر کے اظہار سے ایک گونہ مسرت ہوتی ہے' کہ "جہانِ نو" کا افسانہ نمبر فنِ ترتیب کے لحاظ سے بھی ایک کامیاب مثال ہے' یہ نمبر مرتب کرتے وقت مرتبین نے مختلف کاوشوں سے ملو نگارشات کی پیش کش میں ایک حسن اور ایک متوازن آہنگ پیدا کرنے کی خوب

کوشش کی ہے، پرچے کے شروع میں ایک دعوتی آغازیہ اور اس کے آخر میں ایک معنی خیز "چہ گلے" کا تکملہ ایسی کوششیں ہیں جو دعوت اسلامی کی روح کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کرتی ہیں، اور پھر سب کے آخر میں جس دل پذیر انداز اور حسین پیرایۂ بیان کے ساتھ تحریک اسلامی کے مختلف علم بردار جرائد، صحیفوں، اور اداروں کا تعارف کرایا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے،

لیکن اسی ضمن میں ایک خامی بھی توجہ طلب ہے، اور وہ یہ کہ، کہ جیسا کہ ادارہ نے شروع میں بیان کیا ہے کہ اس نمبر کے افسانے تین موضوعوں سے تعلق رکھتے ہیں، ایک فسادات، دوسرا اشتراکیت اور تیسرا انقلابِ قیادت، اگر اسی طرح مناسبتِ موضوع کے اعتبار سے تمام افسانوں کو تین ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا، اور پھر ہر باب پر ایک شگفتہ سا عنوان بھی جما دیا جاتا، تو ترتیب کا حسن دوبالا ہو جاتا،

اسی طرح اگرچہ ادارہ نے خود ہی قارئین سے اس نمبر کے سائز اور کتابت کی غیر تسلی بخش صورت سے صرف نظر کر لینے کی فرمائش کی ہے، تاہم جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اتنے اعلیٰ مندرجات کو ایسی کوتاہیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، تو اس سے صرف نظر کر لینے پر طبیعت رضامند نہیں ہوتی،

اس کے باوجود خوش ذوق ادارہ کی ذاتی اُپج [initiative] سے انکار نہیں کیا جا سکتا،

—— لیجئے، یہ ہے، ہمارے اسلامی افسانوی ادب کا نیا سرمایہ، جسے چند نو آموز، ان گڑھ، لیکن شدتِ خلوص اور شدتِ احساس سے ایک بھرپور انداز سے بہرہ ور، فن کاروں نے فی الواقعہ کافی کاوشوں اور جگر کاویوں کے بعد فراہم کیا ہے اب یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر منحصر ہے کہ یہ افسانے لوگوں کی نظروں میں درخورِ اعتنا ٹھہرتے ہیں، یا نہ، ——

لیکن یہ حقیقت ہے، کہ یہ وہ افسانے ہیں، جن کے اندر نہ تو محض کھوکھلی جذباتی باتوں، یا لذت پرستی کے خوفناک اشاروں یا محض تخریبی چٹکلوں سے قاری کے ذہن میں انارکی مچانے کی کوشش کی گئی ہے، نہ قاری کے ذہن کو لاشعوری کرشمے دکھلانے کا تماشہ دے کر، اسے ہوس کار حیوانیت کی دھاندلی کی آماجگاہ بنانے کی سعی کی گئی ہے، اور نہ ہی اس کے دل و دماغ میں سوسائٹی کے کسی طبقے کے خلاف خونیں انتقام یا وحشت و بربریت سے لبریز کشمکش کی طرح ڈالی گئی ہے، ——

بلکہ اس سب کچھ کے برعکس، کوشش اگر کی گئی ہے، تو اس امر کی، کہ قاری کو بڑی محبت، دل سوزی، اور عمیق ترین جذبۂ ہمدردی کے ساتھ، مفاسد کے ان خوفناک سرچشموں کا پتہ بتلا دیا جائے، جنہوں نے انسانیت کے مقدس شہر کو ایک متعفن بندو بنا رکھا ہے —— اور انسان کو اس بیش یا افتادہ حقیقت کا احساس دلایا جائے، کہ وہ درحقیقت خدا کا بندہ ہے، اور خدا ہی کی اطاعت میں اس کی تمام فوز و فلاح کا راز مضمر ہے!

نعیم صدیقی کے الفاظ میں "ادب برائے زندگی، اور زندگی برائے عبودیت الٰہی"! —— یہ ہے ایک اسلامی فن کار کا ماٹو!

اسلامی ادیب، موجودہ کافرانہ اور ظالمانہ اقدارِ حیات، اور نظامِ معاشرت کا سب سے بڑا دشمن ہے، اور وہ ان کو جلد تحس نحس کر دینا چاہتا ہے، لیکن اس تحس نحس، اور اس تخریب کے سارے عمل میں، اس کا نقطۂ نظر، خدا ناترس اور غیر مقصدی فن کاروں کے برعکس، بڑا ہی صحت مندانہ اور ہمدردانہ ہے، وہ نرا تخریب پسند نہیں، بلکہ سب سے پہلے تعمیر پسند ہے وہ محض قنوطی نہیں۔ بلکہ سب سے پہلے رجائیت کا علم بردار بن کر ابھرتا ہے، اور ان حقیقتوں کی جھلکیاں "جہانِ نو" کے افسانہ نمبر کے ایک ایک افسانے کے پس منظر پر تاباں و درخشاں ہیں! —— الحمد للہ!

(بقیہ بر صفحہ ۴۷)

تحریکِ اسلامی دورِ ابتلاء میں

شیخ حسن البناء مرحوم ترجمہ از "ن" "ک"

ذیل میں ان تاریخی الفاظ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ جو شیخ حسن البناء شہید بانی تحریک اخوان المسلمون مصر نے ۱۹۳۰ء میں کارکنان تحریک سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمائے تھے۔ اس مختصر سی تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ مرحوم اسلامی تحریک، اس کے مزاج اور اس کے طریق کار کے بارے میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ مصر میں گذشتہ سال "اخوان" کو قید و بند کی جو لرزہ خیز صعوبتیں دی گئیں۔ ان کے بارے میں شیخ مرحوم کی نگاہ مومنانہ دس سال قبل ایک اندازہ قائم کر چکی تھی۔ جب کبھی لا الٰہ کا آوازہ دل کی گہرائیوں سے بلند ہوتا ہے۔ اور طاغوت کو اپنے گرد دعوتِ حق کے سایے گھیرا ڈالتے نظر آتے ہیں تو وہ اس آواز کو دبا دینے کے لئے حق کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے۔

حق کی راہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ اس راہ میں قدم قدم پر دردناک عذاب دینے والے کوڑے متحرک ہیں۔ پھانسیوں کے پھندے آراستہ ہیں۔ مخالفت کی بھڑکتی ہوئی نمرودی آگ ہے اور آلام و مصائب کی بارشیں ہیں چنانچہ مصر کی تحریک اسلامی بھی گذشتہ سال ابتلاء کی اس وادیٔ پُرخار سے گزری۔ وہاں کے ارباب اقتدار نے ظلم اور سنگ دلی کے تمام گزشتہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش کی۔ کتنے ہی اخوان ہیں جن کی ننگی پیٹھوں پر ہزاروں کوڑے لگائے گئے۔ خود وزیر اعظم مصر ہر رات جیل میں جا کر اس روح فرسا عذاب کا منظر دیکھ کر اپنی روح کو تسکین دیتے رہے۔

شیخ مرحوم کی یہ تقریر ہمارے لئے اس وجہ سے اور بھی سودمند ہے کہ ہم بھی ابتلاؤ آزمائش کے مرحلے میں سے گذر رہے ہیں۔

اور یہ تقریر اس مرحلے میں جس طرح اخوان کے لئے قندیلِ ہدایت تھی۔ اسی طرح ہمارے لئے بھی دلیلِ سفر ہے۔ (مترجم)

ایہا الاخوان! یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دعوت اسلامی کے مراحل کا ذکر تم سے صاف صاف کر دوں۔ تم جس دعوت کو لے کر اٹھے ہو۔ بہت سے لوگ اس کی حقیقت سے باخبر نہیں۔ جس دن لوگ اس کی حقیقت کو سمجھ لیں گے اور اس کے مدعا اور منتہا سے باخبر ہو جائیں گے۔ تم دیکھو گے کہ عناد مخالفت اور عداوت و شقاوت کے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے۔ تمہارے سامنے مصائب کی دیواریں کھڑی ہو جائیں گی۔ مزاحمتوں کے پہاڑ سامنے آجائیں گے۔ تمہارے لئے سچے داعی کی حیثیت سے کام شروع کرنے کی وہ پہلی منزل ہو گی۔ اب تک تو تم صرف دین حق کی خاطر اس جدوجہد اور ایثار کی تیاری ہی کے مرحلہ پر ہو۔ لیکن جب لوگ تمہاری دعوت کی حقیقت سمجھ لیں گے۔ تو تم دیکھو گے کہ عوام کی جہالت تمہاری راہ میں حائل ہو گی۔ بہت سے نام نہاد علماء اسلام کے متعلق تمہارے تصورات اور تمہاری جدوجہد کو عجیب و غریب اور نامانوس بتائیں گے۔ بڑے بڑے زعماء و رؤساء بڑے بڑے صاحب جاہ و اقتدار تمہارے درپئے آزار ہوں گے۔ حکومتیں تمہاری دشمنی پر اتر آئیں گی۔ ہر حکومت چاہے گی کہ تمہاری سرگرمیوں کو روک دے اور تمہارے لئے آگے بڑھنا زیادہ سے زیادہ دشوار بنا دے۔ اہل استعمار چاہیں گے کہ تمہارا چراغ گل کر دیں۔ وہ ہمارا کمزور حکومتوں کو استعمال کریں گے۔ لوگوں کی سیرت و کردار کی کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ جو ہاتھ شہنشاہیت کے دریا میں جھیک کے لئے بڑھتے ہیں وہ ظلم و تعدی کے لئے تم پر بڑھ آئیں گے۔ لوگ تمہاری دعوت کے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں گے۔ تم پر بہتان باندھیں گے۔ وہ تمہاری دعوت و مقصد کی نہایت بھیانک تصویر کھینچیں گے اور زیادہ سے زیادہ بھیانک انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کریں گے اپنی دولت و ثروت اور اپنے منصب و اقتدار سے کام لیں گے۔ اور یہ وہ وقت ہو گا۔ کہ تم ابتلاؤ آزمائش اور آلام و مصائب کی منزل میں قدم

رکھو گے۔ تمہیں جیلوں میں بند کیا جائے گا۔ تمہیں جلاوطن کیا جائے گا۔ تمہارے اموال و املاک ضبط کئے جائیں گے۔ تمہاری خانہ تلاشیاں لی جائیں گی۔ ہوسکتا ہے کہ مصائب و آلام کا یہ دور خاصہ طویل ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون؟

کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ کہ انہیں صرف اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں امتحان و آزمائش کی بھٹی میں نہ ڈالا جائے گا؟

لیکن اللہ پاک نے یہ بھی وعدہ فرمایا ہے۔ کہ وہ مجاہدوں اور نکوکاروں کو بامراد اور کامگار فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

یا ایھا الذین آمنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم ۝ تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ۝ یغفر لکم ذنوبکم ویدخلکم جنت تجری من تحتھا الانھار ومساکن طیبۃ فی جنت عدن ذلک الفوز العظیم ۝ واخری تحبونھا نصر من اللہ وفتح قریب وبشر المومنین ۝ یا ایھا الذین آمنوا کونوا انصار اللہ، کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ۔ قال الحواریون نحن انصار اللہ۔ فآمنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ فایدنا الذین آمنوا علی عدوھم فاصبحوا ظاھرین !

ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایسی تجارت کا پتہ دوں۔ جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے نجات دے۔ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ اللہ کی راہ میں پوری دل سوزی کے ساتھ جان و مال سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے۔ اگر تم جان لو۔ وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور تمہیں ایسی جنت میں داخل کرے گا۔ جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور جہاں خوبصورت قصور و محلات ہوں گے حقیقتاً یہی سب سے بڑی کامرانی ہے۔ اللہ اس کے علاوہ بھی ایسے انعام و اکرام سے نوازے گا جو تم کو مرغوب ہے یعنی اللہ کی جانب سے مدد اور قریبی فتح۔ بس ایمان والوں کو خوش خبری سنا دیجئے !

اے ایمان والو۔ تم اللہ کی راہ میں مددگار بنو۔ جیسے مسیح ابن مریمؑ نے اپنے حواریوں سے کہا تھا۔ اللہ کی راہ میں کون میری مدد کرے گا تو حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کی راہ میں مدد کرنے والے ہیں۔ بنی اسرائیل میں سے بعض ایمان لائے اور بعض نے انکار کیا۔ لیکن ہم نے ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ایمان والوں کی مدد کی اور وہی غالب رہے"!

ان تمام دشواریوں کے مقابلہ میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ہمیں بھی اپنی قوتوں کا جائزہ لینا چاہیئے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم اس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں جو دنیا کی بہترین دعوت ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیم کی طرف لوگوں کو مدعو کر رہے ہیں۔ اس نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ جو اساسی طور پر بہترین نظام ہے۔ یعنی نظامِ اسلام۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ آج دنیا اس دعوت کے لئے تشنگی محسوس کر رہی ہے۔ دنیا کے حالات اس کا تقاضا کر رہے ہیں۔ صرف تقاضا ہی نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ یہ حالات اس دعوت کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے۔ کہ ہم ذاتی مفادات سے بہت دور ہیں۔ ہمارے کوئی شخصی مفاد نہیں ہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف رضائے الٰہی ہے۔ اور اس کے کلمہ کی سربلندی ہے۔ جس کا حامی اللہ ہو۔ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ ہماری دعوت کی صداقت وحقانیت، دنیا کو اس کی ضرورت۔ ہماری نیتوں کا اخلاص اور سب سے بڑھ کر نصرتِ الٰہی، وہ چیزیں ہیں جن کے سامنے بڑی سے بڑی مزاحمت بھی نہیں ٹھہر سکتی۔

اخوان المسلمون! سنو! میں نے جو کچھ کہا اس سے میرا مقصد صرف یہ تھا کہ جس دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو۔ اس کے تقاضوں

(باقی صفحہ ۱۲۴ پر)

میں ہوں مناظر اسلام

از نعیم صدیقی

میں نے کتنی ہی دماغی کشتیاں جیتی ہیں، سیکڑوں مذہبی پالے مارے ہیں، ہزاروں کلامی پہلوانوں کو چت کیا ہے ـــــ اور بس یوں سمجھیے کہ میں دنیائے مناظرہ کا گاما پہلوان ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ پیٹ کا دھندہ چلانا ہی پڑتا ہے۔ ہمارے پلے دین کے سوا اور کوئی ہنر تھا نہیں۔ ہم نے اسی کو منڈی میں لا رکھا ہے مناظرہ بازی دینی علوم کی خوانچہ فروشی کا دوسرا نام ہے۔ آپ سے کیا چھپانا۔ اب اگر کچھ کمائی رہ گئی ہے۔ تو اسی پھیری کے کام میں رہ گئی ہے ـــــ ورنہ جہاں تک اونچی دکانوں کا تعلق ہے، پکوان پھیکے پڑ چکے ہیں۔

اللہ کا ہزار ہزار احسان ہے۔ دور دور سے لوگ چل کے آتے ہیں۔ سفر خرچ جس میں مہینے بھر کا خرچ المضاعف ہوتا ہے، پیشگی نذر کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاسی اور مذہبی فتنوں کے سرخیل آکے منت کش ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے نعرے لگتے ہیں۔ استقبال ہوتے ہیں، پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے جاتے ہیں۔ دعوتیں ہوتی ہیں۔ لوگ گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ آنکھیں فرش راہ کرتے ہیں۔ قبا کو چومتے ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا حماقتیں کرتے ہیں۔ اپنا طرۂ افتخار بہرحال آسمان کو جا چھوتا ہے۔

ہم جب کسی مناظرہ کو نکلتے ہیں۔ تو نہا دھو کر، غسل کر کے، بالوں میں چنبیلی کا تیل ڈالتے ہیں۔ سینے پر عطر ملتے ہیں۔ آنکھوں میں سرمے کی سلائیاں پھیرتے ہیں۔ ڈاڑھی کو کنگھی کرتے ہیں۔ عصا ہاتھ میں لیتے ہیں۔ قبا کو کندھے پر لٹکاتے ہیں۔ اور چل کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں جو دیکھتا ہے۔ وہ ہم تن نگاہ بن کر داد دیتا ہے کہ دیکھنا اللہ کا شیر جا رہا ہے۔

جلسہ گاہ میں پہنچے۔ نعرۂ تکبیر گونجا۔ لوگ زندہ باد پکارتے ہوئے اٹھ کے استقبال کرتے ہیں۔ پھر تعارف ہوتا ہے تو لمبے لمبے القاب دم چھلے نام کے ساتھ لگتے ہیں۔ مثلاً "خالد میدان مناظرہ"، "حامی دین مبین"، "محی الاسلام"، "مجدد ایمان"، "کاسر بدعات" وغیرہ۔ پھر جناب والا ہم لحن۔ اردو میں سے تلاوت کلام پاک کرتے ہیں۔ پھر نعت شریف کی قوالی کرتے ہیں۔ پھر لطیفے سناتے ہیں۔ پھر حریفوں کی شان میں مغلظات کی بارش کرتے ہیں۔ چہرہ نقیبیں اتارتے ہیں۔ پھر منہ چڑاتے ہیں۔ پھر ناچتے ہیں۔ تقریر کرتے ہیں اور اس طرح اسلام کی دھاک بٹھا دیتے ہیں۔

جس کی حمایت کرنی ہو، اس کے لئے یہ ثابت کر دیتے ہیں۔ کہ سارا دفتر قرآن اس کی حمایت ہی کے لئے اترا ہے اور جس کی مخالفت کرنا مقدر ہو چکا ہو، اس کے لئے یہ منوا کے چھوڑتے ہیں کہ پورا ذخیرۂ حدیث اسی کی ہجو میں ناطق ہے۔ یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کہ اپنے منہ سے مداری پن کے زور سے اگر چاہیں تو ایسے شخص کو اپنی صدی کا مجدد ثابت کر دیں۔ جس میں ایمان و اسلام کی شرائط سو میں سے دس بھی نہ پائی جاتی ہوں۔ اور دوسری طرف چاہیں۔ تو مومن کامل پر کفر و نفاق کا فتویٰ چسپاں کر کے چھوڑیں۔

کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے جہاں وعظ کیا۔ وہاں دنگا ہو گیا۔ مسلمان کے جذبۂ ایمانی کو اکسا دینے کا فن مجھے اچھی طرح از بر ہے۔ منٹوں میں مسلمانوں کے درمیان "جہاد فی سبیل اللہ" بپا کر لیتا ہوں۔ ان کو بڑے بڑے مقاصد پر کبھی جھڑنے نہیں دیا۔ بلکہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پہ انہیں لڑا تا رہا ہوں۔ تاکہ جذبۂ ایمانی سرد نہ پڑ جائے۔

میرے خاص موضوعات وہی ہیں جن کا ذکر علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا ہے۔ میرے نزدیک وقت کے اہم ترین مسئلے یہ ہیں کہ حضرت

عیسیٰ زندہ ہیں یا وفات پا گئے اور آج کل وہ کس حال میں ہیں؟ حضرت مہدی کب تشریف لائیں گے۔ اور ان کی علامات کیا ہوں گی؟ مُردوں کو ختم قرآن کے ثواب کا منی آرڈر پہنچتا ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلعم کو علم غیب کس حد تک تھا؟ "یا رسول اللہ" پکارنا کتنا ضروری ہے؟ رسول اللہ بشر تھے یا کچھ اور؟ آپؐ کا سایہ تھا یا نہیں تھا؟ آپؐ کا پیشاب پاک ہوتا تھا یا ناپاک؟ نماز میں رفع یدین کرنا اور آمین بالجہر کہنا کس درجے کا گناہ ہے؟ قبروں پر سجدہ کرنا موجب ثواب ہے یا نہیں؟ داڑھی کتنے انگل لمبی ہونی چاہیئے؟۔۔۔ وغیرہ!

میں ان مسائل میں پوری قوم کو مصروف رکھتا ہوں۔ اس طرح عوام الناس بڑے بڑے مسائل میں مداخلت کرنے سے بچ رہتے ہیں ۔۔۔ مجھے یہ گوارا ہے کہ ملک پر نظام کفر مسلط ہو جائے لیکن یہ گوارا نہیں کہ میرے اپنے فرقہ ناجیہ کے سوا مسلمانوں کے اور کسی فرقہ کے خیالات کا کوئی اثر سوسائٹی پر غالب ہو جائے۔ میں الحاد کی قیادت کے آگے سر تسلیم خم کر سکتا ہوں لیکن اپنے فرقے سے باہر کے فرقے سے تعلق رکھنے والے کسی دیندار آدمی کی لیڈری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ میں دین کے بنیادی اصولوں کے دشمنوں سے تعاون کر سکتا ہوں لیکن فروعات میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ میرا کوئی بھائی چارہ نہیں ہو سکتا۔ ایک تارک نماز مجھے اس نمازی سے زیادہ عزیز ہے جو میری تحقیق کے مطابق نماز نہیں ادا کرتا۔ یہ ہے میرا بنیادی طرز فکر جس کی وجہ سے میں دین کی بنیادی صداقتوں کے لئے کوئی مثبت کام کرنے کے بجائے فرقہ دارانہ بحثوں کے ذریعے منفی کام میں سرگرم رہتا ہوں۔

میرا طریق کار کیا ہے؟ ۔۔۔ یہ ایک فنی راز ہے جسے فاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ راز تو صرف میں اپنے ان شاگردانِ خاص کو بتا سکتا ہوں، جو سالوں میرے چرنوں میں بیٹھیں یہ وہ چیزیں ہیں جو سینہ بسینہ بزرگوں سے چلی آ رہی ہیں۔ اور اسی طرح آگے منتقل ہوتی رہیں گی۔ تاہم بطور اشارات کچھ کہہ دینا ضروری ہے۔ میرا ایک خاص اصول تو یہ ہے کہ سامعین کے شعور کو کوئی تکلیف نہ دی جائے بلکہ ہمیشہ جذبات کو مخاطب کیا جائے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ ان معاملات کو بحث میں لایا جائے جن کے بارے میں عوام غیر معمولی طور پر حساس بن چکے ہوں۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ مخالف کی باتوں میں سے اپنے مطلب کے ٹکڑے الگ کر لئے جائیں اور یہ نہ دیکھا جائے کہ پورا سلسلۂ کلام کیا معنی دیتا ہے اور اس کے اندر اس ٹکڑے کی حیثیت کیا ہے۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ بحث ہمیشہ لفظوں کی چیر پھاڑ تک محدود رہے۔ معانی چاہے کچھ ہوں۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ طنز، تحقیر اور تمسخر وغیرہ کے ذریعے حریف اور اس کے حامیوں کی اتنی تذلیل کی جائے کہ ان کے لئے سنجیدگی سے بات کرنا ممکن نہ رہے بلکہ ان میں اشتعال پیدا ہو جائے۔ چھٹا اصول یہ ہے کہ جس کی مخالفت کرنی ہو اسے کسی بدنام فرقہ کے ساتھ منسوب کر کے پھر اسے لپیٹ میں لیا جائے۔ تاکہ عوام کے اندر تعصب کی لہر اٹھنے لگے۔ ساتواں اصول یہ ہے کہ اپنی طرف سے جو بڑے سے بڑا جھوٹ بھی بولا جائے۔ پورے وثوق سے بولا جائے۔ اور مخالف کی کسی بات کو چاہے وہ کتنی ہی سچی کیوں نہ ہو۔ بہرحال پر زور تردید کا مستحق سمجھا جائے۔

میرا فن ایسا ہے کہ اس میں چت بھی اپنی ہوتی ہے۔ پٹ بھی اپنی۔ اگر حریف شرافت پر قائم رہے تو میری پھکڑ بازی بہرحال اس کے منہ پر مہر لگا دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجلس میں تالی پٹ جاتی ہے۔ اگر وہ کچھ سنجیدہ قسم کی باتیں کہنا شروع کرے تو رنگ محفل اس کا متحمل نہیں ہوتا۔ چنانچہ لوگ شور مچا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ بھی مجبور ہو کر پھکڑ پن پر اتر آئے۔ تو یہ اور بھی اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس طرح اپنا کاروبار اور زیادہ چلنے لگتا ہے۔ جہاں برابر کا ایک حریف پیدا ہو گیا۔ یوں سمجھیئے کہ کاروبار مناظرہ بازی کے فروغ کا بیمہ ہو گیا۔ پھر نت جلسے اور نت مناظرے ہوتے ہی رہیں گے۔ آج اس شہر میں کل اس گاؤں میں۔ کبھی ہم فاتح کبھی حریف کامیاب۔

آج کل حالات امید افزا ہیں۔ الیکشن سر پہ آ رہا ہے۔ اپنی جنس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ بڑے بڑے الیکشن باز ہماری قابلیت کو کرائے پہ لینا چاہتے ہیں۔ اور کئی کئی مرتبہ سودا کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ الیکشن میں مولوی کے فتوے کی بڑی قیمت ہوتی ہے اور ایک ایک

وعظ بہت کچھ ہو چکا ہے. اب کی تو اور مزے ہیں. لوگ "صالح نمائندے" کی رٹ لگائے ہیں. یہ ثابت کرنا تو ہمارے ہی بس میں ہے کہ صالح کون ہے. غیر صالح کون؟ بڑے سے بڑا متشرع آئے گا اور جب ہم نیس سے کر اسٹیج پر آئیں گے تو اس کی ساری قلعی کھول کے رکھدیں گے. بس کسی کے متعلق اتنا ثابت کر دیا. کہ یہ "یا رسول اللہ" نہیں کہتا یا یہ نمازمیں آمین بالجہر پکارتا ہے تو سارا تقوی و تقدس دھرے کا دھرا رہ جائے گا. دوسری طرف اگر شرابی اور زانی بھی ہوگا اور وہ اپنا نذرانہ پورا کر دے گا. تو ہمارا اللہ کر یہ ثابت کر دینا اس کی کامیابی کے لئے کافی ہوگا. کہ اس نے مسجد بنواتے وقت بیس روپے چندہ دیا تھا. یا جہادِ کشمیر فنڈ میں کمبلوں کی ایک گانٹھ دی تھی۔

اس مرتبہ دین واخلاق کے میدان میں آنے کا امکان ہے اور دین واخلاق کو شکست دینے کے لئے فساق و فجار کو ہماری خدمات حاصل کئے بغیر کبھی کامیابی نہ ہوگی. چنانچہ ہم بستر جمائے بیٹھے ہیں. موکل چلے آرہے ہیں. دیکھئے کس سے معاملہ چکتا ہے ؛

(بقیہ از صفحہ ۳۲)

(بقیہ از صفحہ ۳۲)

ہو سکتا ہے، کہ ان افسانوں میں تکنیکی نقائص باقی ہوں' ہو سکتا ہے' کہ ابھی ہمارے افسانہ نگاروں کو وہ فنی معراج حاصل نہ ہوئی ہو' جو دُنیا کے اعلےٰ افسانہ نگاروں کو مجرّد فنی نقطۂ نظر سے حاصل ہے' لیکن آپ ان لوگوں کے جذبۂ خلوص اور ان کی تخلیقات کی عظیم و جلیل مقصدیت سے منکر نہیں ہو سکتے'

رہ گئی ان فن کاروں کے فن کی دُنیا کے اعلیٰ ادب کے مقابلے میں کہتری' سو اس کے متعلق تو میں نے شروع ہی میں عرض کر دیا تھا کہ یہ افسانہ نمبر ابھرتے ہوئے سورج کی پہلی کرن ہے' نہ کہ اس کی بھرپور روشنی کا ریلا ـــــــــ اگر ہمارے فن کار اللہ تعالےٰ کی راہ میں جمے رہے' اور اگر انہوں نے اس راہ کی تمام صعوبتوں کو پوری کشادہ دلی کے ساتھ انگیز کر لیا' تو ہو سکتا ہے' کہ کل کو اللہ کے چند بہتر بندے بڑھیں' اور ادب کے مورچوں کو جاہلی اور شیطانی ادب کے نمائندوں سے چھین لیں' اور پھر اس کے ساتھ ہی تاریکیوں میں دبی گھٹی انسانیت کا چہرہ ایک نئی صبح کی تابانیوں سے مطلع الانوار بن جائے' اندھیرے چھٹ جائیں' اور ابھرتے ہوئے سورج کی تمام کرنیں' عام یلغار کر کے تاریکیوں کا جگر چیر دیں' پھول سنسناہٹوں کو ہزارہا نئے سازوں اور نئی تانوں کے وفور سے معمور کر دیا جائے' دنیا کے وسیع شورزار میں ان گنت خیال کھل کر قدم قدم پر کیف گل فروش کا سماں پیدا کر دیں' اور تعفن کے بھبکوں سے لبریز موجودہ فضاؤں میں پاک نفس خوشبوؤں کا ایک سیلاب ہمہ گیر وارد ہو کر ان کے پیچھے پیچھے فردوسی لطافتوں سے بھرپور معطر کے فوارے رقصاں کر دے! ـــــــ

خدا کرے، کہ ایسا ہو' اور بہت جلد ـــــ اس قدر جلد' کہ اسے ہماری اور آپ کی ترسی ہوئی آنکھیں بھی آخری مرتبہ بند ہونے سے پہلے ایک نظر دیکھ لیں' آمین! ربّنا افرغ علینا صبرًا وّثبّت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین

میں ظلمتِ شب میں لے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو

شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا!

گرمی کا موسم

خشک اور پیاسی زمین کو سورج تمام دن اپنی جھلسا دینے والی کرنوں سے سکھائے دیتا ہے۔ کھیت سوکھے پڑے ہیں۔ درخت اور پودے جھلس کر ٹنڈ منڈ ہو گئے ہیں گرد و غبار سے آسمان میلا ہو گیا ہے۔ ایسے وقت میں زمین اور آدمی سبھی شدید پیاس محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت!



اثمار کا ایک گلاس

حد درجہ تسکین دیتا ہے:-

اثمار بڑی آسانی سے دستیاب ہونیوالا اچھا شربت ہے۔ جو اس تکلیف دہ موسم میں آپ کی پیاس بجھا کر آپ کو فرحت بخشتا ہے۔ اور کام کرنے کے لئے دل میں فرحت اور جسم میں تر و تازگی پیدا کرتا ہے۔

قیمت فی بوتل۔ دو روپے آٹھ آنے ۲/۸/-

تیار کردہ:- **حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی نمبر۱**

رمضان المبارک کا مہینہ

اپنی آمد آمد کے ساتھ

آپ سے پوچھتا ہے ———— کیا آپ نے

اشرف میڈیکل ہال کی

"فرحت افطار"

کا انتظام کر لیا ہے۔ جو موسم گرما کے طویل روزوں سے پیدا شدہ گرمی، پیاس کمزوری اور گھبراہٹ کا بہترین دفعیہ ہے۔

اگر اب تک نہیں کیا تو آپ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس کی تو ایک خوراک ہی انشاء اللہ پندرہ منٹ میں تسکین قلب نشاط روح اور مراجعت طاقت کا باعث ہوگی

روزے کا ثواب آپ کا ہوگا

اور روزے کی نقاہت فرحت افطار کی نذر ہو جائے گی۔ اس مرکب میں مفرح۔ مقوی۔ دافع پیاس اجزا از قسم نباتات اور جواہرات شامل کئے گئے ہیں۔ تیس یوم کیلئے بیس روپے۔ رمضان شریف کی آمد سے پہلے ہی اپنا حصہ وقف کرا لیجئے۔

اشرف میڈیکل ہال ———— لائل پور

مونچھیں

اسعد گیلانی

"آبا! امی اس کی مونچھیں کتنی سخت ہیں!" ننھے پپّو کی نے پہرے دار کی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دل ہی دل میں چیخ کر کہا اور وہ ضرور یہ بات الفاظ سے کہتا اگر وہ بول سکتا۔ لیکن وہ بیچارا تو صرف دو سال کا بچہ تھا۔ اور نہیں جانتا تھا کہ امی کو یہ بات سمجھانے کے لئے کہ ان پہریداروں کی مونچھیں بہت سخت تھیں کون سے الفاظ استعمال کرے۔ وہ تو صرف غوں غاں کر رہا تھا۔ اور ان مونچھوں پر زور زور سے ہاتھ پھیر رہا تھا۔

پیراگ جی مندر کے آہنی دروازے پر دونوں پہرے دار پورے سکون کے ساتھ لٹھ لئے کھڑے تھے۔ اگرچہ ان مورتیوں کے پوجنے والے بھاگ گئے تھے لیکن وہ پہریدار پوری مستعدی سے اب تک ان کی حفاظت کے لئے لٹھ بند پہرہ دے رہے تھے۔ تاکہ مندر کے اندر پپّو کی کی قسم کا کوئی شخص نہ گھس جائے۔ پپّو کی چاہے دو سال کا تھا اور بالکل ننھا بچہ تھا۔ لیکن اُف! اس کی رگوں میں بھی خون تو انہیں اسلاف کا گردش کر رہا تھا، جنہوں نے بیچارے دیوتاؤں کے ایک پورے گروہ کو ان کی بے حسی کی سزا دینے کے بعد ہمیشہ بڑے دیوتا کے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ کہ وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ پپّو کی کا بھی جی تو بہت چاہتا تھا کہ دروازہ توڑ کر مندر گھس جائے۔ اور وہیں کے مندر کے تاریک گوشوں میں دبکے ہوئے اوہام کے تمام سنگین مجسموں کو کان سے پکڑ کر کھینچ لائے۔ اور پورے صحن میں ان کو لمبی لمبی سونڈوں اور تھوتھنیوں کے ساتھ گھسیٹے پھرے۔ اور ان سے پوچھے کہ "تم اسے چپ خاموش مجسمو! بتاؤ کہ کارزارِ حیات کا کونسا کام تمہارے بغیر رُکا پڑا ہے۔ کہ تم نے خواہ مخواہ اتنے بڑے مکان پر قبضہ کر رکھا ہے اس مندر کے چاروں طرف انسان دھوپ اور سردی کا شکار ہو رہے ہیں"! اور اتنا تو وہ ضرور ہی چاہتا تھا کہ کم از کم ان پہریداروں سے کسی کی مونچھیں ہی توڑ پھینکے۔ لیکن ان پتھر کے چھوٹے چھوٹے پہریداروں کی پتھر کی مونچھیں کسی صورت اس کے قابو میں نہ آتی تھیں وہ پہرے دار دو سالہ پپّو کی کے لئے اچھا خاصہ معمہ بن گئے تھے۔ وہ بڑا امی کو اپنی بے معنی غوں غاں اور آجا آجا سے بلاتا لیکن امی کو روٹی پکانے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔

اور وہ اس کوشش میں مصروف رہتا تھا۔ کہ کسی صورت مندر کا دروازہ کھل جائے یا کسی پہرے دار کی سخت مونچھ ہی وہ نوچ لے اور وہ ننھا پپّو کی نہیں جانتا تھا۔ کہ اسے تو صرف پیراگ جی کے اس چھوٹے سے مندر کا دروازہ کھولنے کا شوق تھا لیکن وہ مضبوطی سے بند تھا۔ اور اس پر مونچھوں والے سنگین دل و دماغ والے پتھر کے پہرے دار اپنی سنگیں مونچھوں کے ساتھ پہرہ دے رہے تھے۔ اس غوں غاں کرنے والے بچے نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہ تھا ——— اور وہ سوچتا بھی کیا جبکہ وہ بول بھی نہ سکتا تھا ——— کہ پتھر کے ان مونچھوں والے پہریداروں کی شکایت اسے ہی نہ تھی بلکہ اس کے ابا کو بھی تھی۔ اسکے تایا کو بھی تھی۔ اسکے چچا کو بھی اور ہر اس شخص کو تھی جس کی فطرت میں اس اولوالعزم انسان کی پیروی کا جذبہ تھا۔ جس نے تمام بتوں کو مار کر تیشہ سب سے بڑے کے کندھوں پر رکھ دیا تھا اور وہ اس جد و جہد میں مصروف تھے کہ کسی صورت ان سنگیں پہرے داروں کے ہاتھوں سے لٹھ چھین انہیں نہتا کر سکیں۔ اور پھر ان سے مندر کی کنجیاں چھین کر اس میں گھس جائیں اور وہاں شہ نشینوں پر بیٹھے ہوئے تمام اوہام کو گھسیٹ

باہر لا سکیں۔ اور صحن کے ایک گوشے میں انہیں جمع کر کے ان پر آثار قدیمہ کا بورڈ لگا دیں۔

لیکن یہ بورڈ لگانا ہی تو ایک آفت ہو گیا تھا۔ پٹھو کی بیچارے کو کیا معلوم کہ اسکا ملک ایک وسیع بیراگ جی کا مندر بنا ہوا تھا۔ پھوکی کے ابا اور تایا اور چچا اور اس کے سارے سرپرستوں نے کتنی مصیبتوں سے یہ اتنی بڑی جگہ حاصل کی تھی۔ کہ یہاں وہ ایک خوبصورت مسجد تعمیر کر سکیں جہاں پٹھو کی اپنے دوسرے بھائیوں ساتھ بے روک ٹوک جاکر اپنا سبق یاد کیا کرے۔ لیکن اس مسجد کی جگہ پر پتھر کے ان پہرداروں نے زبردستی مندر تعمیر کر رکھا تھا۔ اس مندر کی چار دیواری پر لَآ اِلٰہ کے کتبے آویزاں تھے۔ اور اس کے اندر لمبی لمبی سونڈوں والے اونچی اونچی نشستوں والے۔ بڑے بڑے پیٹوں والے۔ بھاری بھاری گرزوں والے دیوتا ان پہرے داروں نے بٹھا رکھے تھے جو بت سمندر پار کے وحشی چھوڑ بھاگے تھے ان بتوں کی حفاظت کا ٹھیکہ ان پہرے داروں نے لے رکھا تھا۔

ایک شخص نے کہا۔

"بھلے مانسو۔ یہ تم نے کیا مذاق بنا رکھا ہے۔ باہر کتبے لَآ اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ کے ہیں۔ اندر بت لادینی جمہوریت کے ہیں۔ باہر مسجد کی تعمیر کے نام پر چندہ جمع ہو رہا ہے۔ اندر نفس کے دیوتاؤں کے چرنوں میں بھینٹ چڑھائے جا رہے ہیں۔ باہر اسلامی عدل و مساوات کے محراب تراشے جا رہے ہیں۔ اندر بے حیائی و فحاشی اور ظلم و ستم کے الاؤ جلائے جا رہے ہیں۔ یہ آخر کیا مذاق ہے!"

"ارے اٹھا تم نے یہ شخص کتنا بڑا غدار ہے۔ ابھی تعمیر ہو رہی ہے اور یہ تنقید کی تخریب میں مشغول ہے۔ اور ابھی عمارت بنکر تیار بھی نہیں ہوئی اور یہ کہتا ہے کہ یوں بناؤ۔ بنیادیں بن رہی ہیں اور یہ کہتا ہے کہ تم اسے مسجد کیوں نہیں بنا رہے ہو یہ تو کوئی تنخواہ دار جاسوس یا غدار معلوم ہوتا ہے بلکہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اسکا متولی بننا چاہتا ہے پکڑو اس کو جانے نہ پائے۔ اور دیکھو دیوار پر کچھ مؤذنوں کو کھڑا کر دو۔ کہ وہ چیخ چیخ کر اذانیں دیں۔ اور اس شخص کے خلاف فتوے صادر کریں۔ اور اندر مندر کی ہر گھنٹی کو پوری قوت سے بجا دو۔ تاکہ اس کی آواز ہی سنائی نہ دے۔ اور پھر اس شور و غوغا میں یہ جانے نہ پائے۔ اس کی آواز کو چھ ماہ کے لئے تو کم از کم بند کر ہی دو! اور پھر وہ بیچارہ کہاں جانے پاتا ——

پتھر کے دل و دماغ والے پہرے داروں نے اسلامی عدل و مساوات کی محافظت کے لئے اسے ایک کال کوٹھڑی میں بند کر دیا کہ ایسا نہ ہو وہ ان کے اس عدل کو متزلزل کر دے جو لاقانونی پر مبنی ہے۔ اور ان کی اس اسلامی مساوات کو منتشر کر دے۔ جو محلوں اور جھونپڑوں اور لاکھوں کی ضیافتوں اور چنوں کی ایک مٹھی کے تفاوت پر مبنی ہے۔ بھلا ایسے انتشار پھیلانے والوں کو کیونکر برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر جب تک پورا مندر بن کر تعمیر نہیں ہو جاتا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ مندر بن رہا ہے یا مسجد۔ ایسی بدظنی تو قطعاً تخریبی حرکت ہے۔

چنانچہ اپنے طور پر اسے بند کر کے انہوں نے اسلامی عدل کو محفوظ کر لیا ہے اور اس عدل کو جنگل کے قانون سے بہت تقویت پہنچ رہی ہے۔ یہ جنگل کا قانون وہی ہے۔ جس کا استعمال بھیڑیا بھی کرتا ہے۔ اگرچہ اسے اتنا علم و سلیقہ نہیں ہوتا کہ جس پر اس قانون کو استعمال کرے اس کی آواز بھی بند کر دے۔

پھر اس کلمے والی چار دیواری کی محافظت خود ایک اتنا بڑا خطرہ ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں اور کوئی بات نہیں سنی جا سکتی ظاہر ہے کہ اگر مسجد نہ بن سکے۔ تو پھر مندر تو بہرحال بن ہی جائیگا۔ آخر اس میں کیا حرج ہے کچھ نہ ہونے سے تو کچھ ہونا غنیمت ہی ہے۔ کم از کم یہ قطعہ زمیں تو محفوظ رہے گا اور یہ کیا کم حیرت اور تعجب کا مقام اور ان کا معجز نما کارنامہ ہے کہ یہ قطعہ زمین محفوظ ہے یہ جو لادینی اور فحاشی اور بے حیائی کے بتوں کے اخراج پر در در بیٹے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ یہاں محراب و منبر بنا کر عبادت

شروع کی جائے۔ ان سے کوئی پوچھے اگر یہ مندر بھی نہ ہوتا تو پھر تم کیا کرتے۔ ہاں پھر تم کیا کرتے۔ تم اس سوال کی مضحکہ خیزی پر ہنستے ہو۔ لیکن ان بیچاروں کے لئے تو یہ اس وقت بنیادی سوال ہے۔ اب جو کسی نے ایسی لغو حرکت کی جیسی اس شخص نے کی تھی۔ تو وہ اسے بھی اس کے پاس پہنچائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ وقار ملک کا تقاضا یہی ہے۔ یہ کیا کم غداری ہے کہ بار بار جرم کی وضاحت کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ ارے یہ جرم کیا کم ہے کہ تم اس کے اصلی پہرے داروں کو ان کے طور طریقہ بدلنے کے لئے کہتے ہو۔ اور مطالبہ کرتے ہو کہ وہ اپنے پیٹ چھوٹے کرلیں اور اپنے اوپر بہت سی لایعنی مصنوعی پابندیاں ہٹا لیں اور ان کے ہاتھوں میں جو ہتھیار ہیں صرف حق کے لئے استعمال کریں۔ ہاں تم تو چاہتے ہو کہ وہ اپنی ڈاڑھی بڑھا لیں اور مونچھیں کٹا دیں۔ ہاں یہ ان کی مونچھیں کٹانا چاہتے ہیں۔ جی ہاں مونچھیں اور یہ تو ان کے وقار (Prestige) کا معاملہ ہے۔ کوئی مرے یا جئے۔ کوئی بات سچ ہو یا جھوٹ کسی پر ظلم ہو یا ستم لیکن مونچھوں کو کیسے کٹوایا جا سکتا ہے۔ وقار جھوٹا سہی۔ لیکن اس سے کیسے ہٹا جا سکتا ہے۔ آخر کونسی حکومت اپنی (Prestige) کا خیال نہیں کر رہی رکھتی۔ کیا ان کے سابق آقا نہ رکھتے تھے۔ جو ( ) کے لئے لوگوں کو گولی سے اڑا دیتے تھے۔ اور انہوں نے تو سعادت منڈی میں صرف چند کو جیل میں بند کیا ہے۔ اور پھر تم کلرکوں اور مزدوروں کی بھوک کا ذکر کرتے ہو۔ تمہیں ان کی بھوک کا خیال ہے۔ لیکن ان کے وقار کا کوئی خیال نہیں۔ حالانکہ ان کا وقار ملک کا وقار۔ اس جگہ کا وقار۔ اس ملک کے سارے باشندوں کا وقار ہے۔ کیا ملک کے وقار کے لئے چند لاکھ مزدور! اور کلرک بھوکے نہیں مر سکتے اگر نہیں مر سکتے تو پھر وہ غدار ہیں اور ان کا مقام بھی وہی ہے جو ایسے غداروں کا ہوا کرتا ہے!

۱۰۔ پھوکی بار بار کوشش کرتا ہے۔ کہ کسی طرح ان چھوٹے چھوٹے پتھر کے پہرے داروں کی سخت سخت مونچھیں تو اکھاڑ ہی پھینکے بہت چیختا ہے اپنی بے لفظوں کی آواز سے امی کو پکارتا ہے لیکن اس کی امی چٹا لئے ہوئے اس کی مدد کو نہیں پہنچتی۔ اسے تو بس روٹی پکانے سے غرض ہے۔ روٹی پکانا اور کھانا۔ پھوکی سوچتا ہے۔ اگر اسکی امی چٹے کی ایک ضرب سے ان نامعقولوں کی ایک مونچھ ہی توڑ دے تو ان کی ساری شیخی کرکری ہو جائے۔ بنے پھرتے ہیں بڑے لٹھ باز۔ سمجھتے ہیں ان مونچھوں سے بھی بڑا وقار ہے۔ لیکن یہ وقار بھی بھلا کیا وقار ہے۔ جب چھچھوندروں نے ان کے مندر میں بل بنا رکھے ہیں۔ جب ان کے پہرے میں جھینگروں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جب مندر کے دروازے کو دیمک چاٹ رہی ہے۔ جب مندر کی ڈیوڑھی میں بھڑوں نے چھتے بنا رکھے ہیں۔ جب ٹڈیاں کونے کھدروں میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ جب چھپکلیاں دیواروں پر محو خرام رہتی ہیں۔ تو پھر ایک پھوکی کو باہر بند رکھنے سے کیا فائدہ ہے۔ پھوکی کے سامنے تم کتنے ہی آہنی سلاخوں والے پھاٹک کھڑے کردو تو ٹوٹ کر ہی رہیں گے۔ جو بیحیائی اور فحاشی کی چھچھوندریں اندر ہی اندر دیواروں کی بنیادیں کھوکھلی کر رہی ہیں۔ وہ ان بے جان پہرے داروں کو بھی ساتھ لے بیٹھیں گی۔

تم پھوکی کو اسی لئے تو مندر میں جانے نہیں دیتے ہو کہ وہ وہاں تمہاری خواہشات کے بتوں کو توڑے گا۔ لیکن وہ بت تو بہر حال ٹوٹ کر ہی رہیں گے۔ ان کی تو بنیادوں میں ہی کھنگی اور شکستگی گھر کئے ہوئے ہے۔ تم کب تک اپنی مونچھوں پر مصنوعی وقار کا ملمع کر کے انکی حفاظت کر سکو گے۔

پھوکی کی بات اب اس کی امی بھی سمجھنے لگی ہے۔ اور اس کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ چٹے کی ایک ہی ضرب سے ان مہمل بے جان پہریداروں کے مصنوعی وقار کی مونچھوں کو توڑ کر الگ پھینک دے۔ اور دروازہ کھول کر پھوکی کو اس عمارت میں گھس جانے دے۔ تم جو ہر چھ ماہ کے بعد اس مندر پر ایک موٹا قفل چڑھا دیتے ہو کہ کسی صورت اس لاوینی کے مندر میں تمہارے اوہام کے بت کچھ دن اور محفوظ رہیں۔ تو اب اس خیال کو اپنے سنگین دل و دماغ سے نکال پھینکو۔ اب کوئی دن جاتا ہے۔ کہ تمہارے ان اوہام کے

بت گرتے ہوئے صحن مسجد میں لائے جائینگے۔ اور ان پر آثار قدیمہ کی مہر لگا کر انہیں کسی ایک کونے میں ڈھیر کر دیا جائے گا۔ پھر محراب اور منبر بھی بننے سے انکار نہ کریں گے۔ اور فلاں فلاں کی چار دیواری کے اندر لادینی جمہوریت کے بت بھی تراشے نہ جا سکیں گے۔ تھوڑی سی دیر باقی ہے۔ پھونکی کی امی اپنے کاموں سے فارغ ہو کر پھونکی کی بات سمجھ لے پھر ان پتھر کے پہرے داروں کی مونچھ جلد شکستگی کے حوالے کر دی جائینگی۔ اور پھر یہ بھرم جلد ہی کھل جائیگا۔ کہ اس چار دیواری میں تم نے اسلام کو پردے کے اندر کیا کیا رکھا ہے۔

(بقیہ از صفحہ ۳۴)

کو تمہاری نظروں کے سامنے واضح طور پر پیش کر دوں۔ آگے تمہارے لئے ایک نازک وقت آنے والا ہے۔ جب میں تم سے بہت دور ہوں گا۔ نہ تم سے خطاب کر سکوں گا۔ نہ تمہارے پاس کوئی تحریر بھیج سکوں گا۔ ان الفاظ پر غور کرو۔ ہو سکے تو انہیں حفظ کر لو اور ان کو اپنے دلوں پر نقش کر لو۔ جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں معانی و مطالب کی ایک دنیا مضمر ہے۔

اخوان! تم محض ایک جماعت نہیں ہو۔ تم کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہو۔ مقامی مقاصد کے تحت تم کوئی مقامی جمعیت بھی نہیں۔ تم ملت کے لئے ایک نئی روح کی حیثیت رکھتے ہو۔ جس کے ذریعہ ملت میں قرآنی زندگی پیدا کرنا مقصود ہے۔ تم وہ روشنی ہو جو معرفت الہٰی سے منور ہو کر مادہ پرستی کی تاریکی کو دور کرنے والی ہے۔ تم وہ آواز ہو جس کے ذریعہ پیغام رسالت کی تبلیغ ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تم نے اس بار کو اس وقت اٹھایا ہے جب بہت سے لوگ اس سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔

اگر تم سے کہا جائے۔ کہ تمہاری دعوت کیا ہے تو کہو۔ ہماری دعوت "اسلام" ہے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر مبعوث ہوئے ـــــ حکومت اس کا ایک جز ہے اور حریت اس کا لازمہ!

اگر تم سے کہا جائے کہ یہ تو سیاست ہے تو تم کہو کہ یہ اسلام ہے اور ہم اس تقسیم (دین و سیاست) کو نہیں جانتے۔

اگر تم سے کہا جائے کہ تم تو انقلاب کی دعوت دے رہے ہو۔ تو کہو۔ ہم تو صرف حق اور اسلام کے داعی ہیں۔ ہمارا اس پر ایمان اور ہمیں اس پر فخر ہے اور اگر کوئی شخص اس سے باغی ہو کر ہماری دعوت کی راہ میں حائل ہونا چاہے۔ تو اللہ نے ہمیں اپنی مدافعت کرنے کی اجازت دی ہے اور جو شخص ہماری راہ میں حائل ہوگا۔ اس کی حیثیت اللہ کے باغی اور ظالم کی ہو گی۔

اگر تم سے کہا جائے کہ تم فلاں سے وابستہ ہو۔ تو تم کہو۔ ہماری وابستگی صرف اللہ سے ہے۔ لیکن اگر وہ اسی طرح غیر معقول اور فضول نکتہ چینیوں کا سلسلہ جاری رکھیں تو ان سے اعراض کرو۔ اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتے رہو۔

اخوان! اپنے فرائض کا خیال رکھو۔ اللہ پر ایمان رکھو۔ اسی پر بھروسہ کرو۔ اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اس نے جن چیزوں سے منع کیا ہے۔ ان سے اجتناب کرو۔ نکوکاری اختیار کرو۔ اور پوری کوشش کے ساتھ کسب کمال میں مصروف رہو۔ قوت ایمانی سے اپنے اندر وقار اور اپنے کردار میں پختگی پیدا کرو۔ قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ اس کا مطالعہ کرو۔ اور اس پر عمل پیرا رہو۔ سنت نبوی پر نگاہ رکھو۔ اور پورے طور سے اس پر عامل ہونے کی کوشش کرو۔ گفتار کے غازی نہیں۔ کردار کے غازی بنو۔ باہم ایک دوسرے سے محبت رکھو۔ ہمیشہ اخوان کی باہمی وابستگی پیش نظر رکھو۔ یہی تمہاری قوت کا راز ہے۔ اور اسی پر تمہاری کامیابی کا انحصار ہے۔ اپنی قیادت کے مطیع رہو۔ کیونکہ یہ کڑی ہے۔ جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے وابستہ ہو۔ اس کے لطف سے نصرت و کامرانی کی امید رکھو۔ ان شاء اللہ کامیابی یقیناً تمہیں کو ہو گی۔ اللہ پاک ہمیں اس عمل کی توفیق دے جو اسے پسند ہو ـــــ وہی صحیح راہ پر ہماری رہنمائی فرمائے۔ ہمیں عزت و مسرت کی زندگی اور شہادت کی موت عطا فرمائے۔ وہی مدد کرنے والا ہے۔ اور ہماری محافظت کرنے والا بھی وہی ہے! والسلام علیکم و رحمتہ اللہ!

جنتِ احمریں تیری منزل نہیں

م۔ نسیم

دلدار خاں نے جھکے ہوئے انداز سے پاؤں اُٹھا کر چوبی زینے کی آخری سیڑھی پر رکھا اور ریلنگ کا سہارا لے کر اس نے مڑ کر ایک بوجھل نگاہ چاروں طرف ڈالی۔

—— ریلوے لائن کے متوازی حد بندی کے تار کھنچے ہوئے تھے۔ اُن کے بعد ہی لمبے لمبے گڈھوں میں برسات کا باقی ماندہ مٹیالا پانی ہوا کے تموّج سے کبھی کبھی ننھے بچے کی طرح معصوم سے ہلکورے لینے لگتا۔ گڈھوں کے پار دُور تک ایک ہموار میدان تھا۔ جس میں کہیں کہیں گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے نظر آتے تھے۔ میدان کا ہرا کرم کے چند گھنے درختوں سے ملتا تھا جو ایک جھنڈ کی صورت میں کھڑے تھے۔ اور اس کے بعد نظریں پھیلتی ہوئی میدان اور جھنڈوں کے مسلسل نشیب و فراز کے بعد افق کے پاس کہرے کی ہلکی سی پیدا ہوتی تحریک تک پہنچ گئیں۔ اس سے اوپر ذرا دیر غروب ہوتے سورج کی باقی ماندہ شفق کہرے کی تحریک کے ساتھ مل کر ایک عجیب رنگ بنا رہی تھی —— خون کا رنگ!

دلدار خاں کی تھکی ہوئی آنکھوں میں لحہ بھر کے لئے چمک پیدا ہوئی اور پھر غائب ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے نفرت آمیز انداز سے بل کھا کر بھنچ گئے۔ اس نے ہینڈل پکڑ کر دروازے کو زور سے دھکا دیا اور کندھوں کو جھٹکا دے کر کیبن میں داخل ہو گیا۔

اس کے دل میں ایک عجیب کشمکش برپا تھی۔ اس کشمکش سے بہت زیادہ عجیب جو وہ پہلے کبھی محسوس کیا کرتا تھا۔ اور یہ کشمکش آج اس وقت سے ہو رہی تھی جب اس نے صبح شفق کو دیکھا تھا۔ سُرخ شفق! اسے اس سرخی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ صبح بھی سُرخی شام بھی سُرخی!

—— اسٹول کو کھڑکی کے پاس کھسکا کر وہ اس پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ پٹ کھولتے ہوئے اسے چوکھٹ پر سگرٹ کا پیکٹ رکھا نظر آیا۔ ایک سگرٹ نکال کر اس نے لبوں میں دبایا اور دیا سلائی کے لئے جیبوں کو ٹٹولا باہری جیبوں کی تلاش کے بعد وہ جیب پر سے اپنا ہاتھ اندرونی جیب تک لے گیا۔ پھر جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کا ہاتھ وہیں کا وہیں جیب میں رہ گیا۔ عمرِ رفتہ کی کوئی بھولی بسری ہوئی یاد اس کے دل میں آئی اور دوسرے لمحے چلی گئی۔

—— تھوڑے وقفے کے بعد اس نے کسی قدر کوشش کر کے جیب سے ہاتھ نکالا۔ اس کی انگلیوں میں ایک چوڑی دبی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی سفید چوڑی جس کے اندر بیچ میں بل کھائی ہوئی ایک سُرخ لکیر تھی۔ یہ چوڑی اس کی دو انگلیوں کے درمیان اس طرح لٹک رہی تھی جیسے وہ کسی ننھے سے ہاتھ کی منتظر ہو۔

یہ چوڑی اس کی بچی پروین کی تھی۔ جس کی ننھی سی فرمائش کو پورا کرنے کے لئے اس نے اس سے ایک چوڑی نمونہ کے لئے لے لی تھی۔ پروین کی فرمائش پوری نہ رہ گئی۔ افسوس وہ دن نمونے کا شکار رہ کر اُسے ششدر چھوڑ گئی۔ اس غیر متوقع حادثہ پر ششدر چھوڑ گئی۔ جس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔

—— اس نے پھر نڈھال سا ہو کر اپنا سر کھڑکی کے پٹ سے لگا دیا۔ سگرٹ اس کے لبوں کی گرفت سے آزاد ہو کر زمین پر

گر پڑا۔ اور پچھلی یادیں، بھلانے کی کوشش کرنے پر اُسے اُمڈ اُمڈ آنے لگیں ــــــــــ

پہلے پروین اس کے ذہن میں اُبھری۔ نیلا فراک پہنے ہوئے یہ تیتری جیسی بچی اُڑتی ہوئی اس کے ذہن سے نکل آئی اور پھر جیسے ٹھٹک کر حیران سی نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھنے لگی۔ اس کے پیچھے دو سائے اور اُبھرے۔ چھوٹے اور بڑے سائے اُدھیڑ اور جوان ــــــــــ اُدھیڑ جھکا نہ ہونے کے باوجود جھکا ہُوا اور دوسرا جوان لیکن کملایا ہوا۔ یہ اس کی بیوی تھی جو ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنی غمگین مسکراہٹوں سے اسے تسلی اور اطمینان دینے کی کوشش کر رہی تھی ــــ ناکام کوشش! اور یہ ــــــــــ یہ اس کی چھوٹی بہن رضیہ تھی۔ خیالات میں اپنے بھائی کی طرح آزادی پسند، لیکن شوہر کی پابند!

ــــــــــ اس نے گھبرا کر سر کو جھٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن خیالات اس کی آنکھوں کے ساتھ بند ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔

دو سال ہو گئے ــــــــــ اسکا ذہن پھر تیز بھاگا۔

دو سال پہلے جب اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی۔ جب وہ رضیہ کو بیاہ کر اپنے سر سے بڑی ذمہ داری کا بوجھ اُتار چکا تھا اور جب اس کی تمام خوشیاں پروین پر مرتکز ہو گئی تھیں۔ اپنی اس تیتری جیسی بچی پر جو ریلوے یارڈ میں کسی پریشان خیال کی طرح اِدھر اُدھر اڑی پھرتی تھی ــــــــــ دو سال کا فاصلہ! یہ دو سال اس کی زندگی میں آندھی، جھکڑ کی طرح آئے اور گذر گئے۔ اور جب وہ گذر گئے تب اس کی زندگی میں خوشی کا وہ مرکز بھی باقی نہیں رہا ــــــــــ دو سال گذر گئے لیکن ساری خوشیاں اور باقی ماندہ شکستہ مسرتیں نوچ کر لے گئے۔

وہ اچانک ریلوے ورکرز یونین سے واقف ہُوا۔ اور کام کے فطری شوق کے باعث بلا تامل اس میں انہماک سے کام کرنے لگا۔

پھر ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔

ہڑتالیں ــــــــــ!

یہ نام ہی تب اُسے جوش سے بھر دیتا تھا۔ اس کی لگن میں اس نے سب ساتھیوں سے زیادہ فاقوں کے کرب افزا لمحے گذارے۔ اسی کے لئے اُس نے گرم کپڑے بیچ کر دن کاٹنا شروع کئے۔ دانت پیس پیس کر اور مٹھیاں بھینچ بھینچ کر وہ بیوی کی نصیحتیں برداشت کرتا رہا اور بالآخر اسے میکہ بھیج دیا ــــــــــ جہاں وہ اب تک اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی کی تلخی کے باعث وہ اپنے بہنوئی عمر دین خاں لوانہ کے خیالات میں بورژوائیت سونگھ کر اپنی بہن کو واپس لے آیا۔ اور اس کی بات کو ادھورا سُن کر چھوڑ دیا کہ بھائی جان! دولت کے ساتھ ہر شخص کی ذہنیت قارونی نہیں ہو جاتی اور ..... لیکن ایسی باتوں کے لئے اس کے پاس کان کہاں تھے وہ تیزی سے سہمی ہوئی بہن کو ساتھ لئے یہ کہتا ہوا باہر نکل آیا "میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ سمجھے!" لیکن اس کی بہن رضیہ بھی اپنے بھائی کا زیادہ دن تک ساتھ نہ دے سکی۔ اور بھوک کی سختیوں سے تنگ آکر اپنے شوہر کے گھر کی یاد میں اُداس اپنی بھاوج کے پاس اس کے میکہ چلی گئی۔

پھر اس کے باعث تو اسے اپنی تیتری جیسی معصوم اور چنچل بچی کو نمونئے میں مبتلا دو دن تک بخار میں پھُنکتے اور تڑپتے دیکھنا پڑا۔ جس بعد وہ بھی اسے چھوڑ گئی۔ ہمیشہ کے لئے ــــــــــ اور وہ سوائے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ کر پیچ و تاب کھانے کے اس دوران میں اور کچھ نہ کر سکا۔

اور پھر ہڑتالیں ختم ہو گئیں۔

لیکن وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا جب اُس نے سُنا کہ مانگیں پوری نہیں ہوئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا بغیر مانگیں منظور کرائے بابا نے ہڑتال ختم کیسے کر دی۔ گجرو قلی نے اپنے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے جھک کر دھیرے سے کہا تھا۔" بابو جی: باری بابو بک گئے۔ بڑے بابو نے اُن کو دفتر میں بلوایا تھا۔ معلوم نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ پر کچھ تو ہوا ہی ہوگا۔" اس نے گجروں سے کچھ کہا نہیں۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن وہ ایسی اَن ہونی بات پر کیسے یقین کر لیتا باری! ———— اس کا مثالی کامریڈ جس کی تصویر اس نے اپنے کوارٹر کے رشیہ ہ کمرے میں لگا رکھی تھی۔ جس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے گلے کی رگیں جوش سے پھول جاتیں اور سر اکڑ جاتا ———— اس باری کے لئے وہ ایسی اَن ہونی بات کا کیسے یقین کر لیتا۔ اَور سُن بھی لی تھی تو دل کہاں قبول کرتا تھا۔ پر اُسے یقین کرنا پڑا جب دوسرے دن باری نے سِلور اسنو کیفے Silver Snow-Cafe میں باوجود روکنے کے پیتا پینا شروع کر دی اور بہکنے لگا۔ وہ اس وقت تک پینے پلانے کی حد تک روادار ہو گیا تھا۔ آخر اپنے غموں کی تلخی کو یہ لوگ کس طرح بھلا سکتے ہیں ———— یہی سوچ کر وہ پلا پیٹے اُن کے ساتھ شریک رہتا۔ گو اس پر بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ باری اس کے ساتھ کبھی زیادہ نہیں پیتا تھا۔ پر اُس دن تو مفت کی تھی۔ کسی صاحب نے آفر کیا تھا۔ نہ معلوم کس خوشی میں۔ باری نے ازراہ مذاق دو چار کے پیگ جھپٹ کر اپنے گلاس میں انڈیلنا شروع کر دئے۔ پانچ چھ پیگ اس کے لئے بہت تھے۔ دماغ کی گرہیں کھلتے ہی اس نے نہ جانے کیا کیا بکنا شروع کر دیا۔ وہ چپکا بیٹھا سنتا رہا پھر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا جب باری نے اس کی طرف مخمور نظروں سے دیکھ کر کہا۔

دلدار خاں! ارے یار آج تو مفت کی ہے۔ پی لو! یار۔ روز تھوڑے ہی یہ موقعے ملتے ہیں۔ اور آج تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ ادھر بھی جیب بھاری ہے۔ فکر نہ کرو! ہیں ———— ! دیکھتے کیا ہو؟ اچھا کسی سے کہنا نہیں ———— امے یار ———— گھورتا کیا ہے! ———— کیا مجھے ———— نشہ ———— ہیں ———— سمجھتا ———— ہے۔ دیکھو بھائی حصّہ وصّہ نہیں ملے گا ———— ہاں ———— اُس مینجر کے بچے ڈاکٹر خان ———— نے تین ہزار دئے ہیں ——— صرف تین ہزار ———— اور ———— وہ بھی بڑی مشکلوں سے پھر فکر کیا ہے تہلکہ مچا دوں گا۔ اب کی دفعہ کوئی موقعہ آنے دے۔ مجھے سب ورکر مانتے ہیں ———— ابے دلدار! یار وہ ——— نظم تو ———— سُنائیں ———— "تم ملک" ! ئے کیا بات ہے! ———— مار ولس !! - —— —— —— ——

- - - - - - - - — — — — — — — — — — — — —

اس نے نفرت بھرے انداز سے باری کا اپنے کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا اَور کھڑا ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھر ایک ایک کر کے وہ سارے خوش گمانیوں کے محل جو اس نے باری اَور دوسرے ساتھیوں کے لئے بنائے تھے ڈھینے لگے۔ اُس نے باری کی قربانی سے پُر زندگی اور ظرف کی وسعت کا طلسم پاش پاش ہوتے دیکھا۔ اس کی باتیں سنیں اور پھر اسکی زندگی دیکھی۔ وہ سارے اعتقاد جو اسے باری کے بارے میں تھے حقیقت کی ایک آنچ بھی نہ سہہ سکے اور برف کی طرح پگھل گئے ———— اَور اب وہ پانی پر کھڑا تھا۔

ایک دن ———— جب چارج دے کر وہ ڈیوٹی سے لوٹ رہا تھا کہ اُسے گڈز شیڈ کے پاس باری اَور ظفر

ایک بنچ پر بیٹھے رہے ۔ اندھیرا ہو چلا تھا ۔ اُس نے ٹوپی کا رُخ ٹھیک جھکا کر کالر ذرا اوپر کر لئے کچھ سرگوشی کے انداز میں باتیں کر رہے تھے ——— کچھ بھی ہو بہرحال وہ اسے پہچانے نہیں ۔ شیڈ کے کنارے کارنر پر پہنچ کر وہ رُک گیا ۔ جیسے کسی نے روک لیا ہو تا سے کچھ جھجک بھی ہوئی ۔ پر اُس نے باتوں پر کان لگا دئے ۔

ظفر کہہ رہا تھا ۔

"..... تم سمجھے نہیں ، میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی نیا نیا آیا ہے ۔ ابھی تو اس کو اچھی طرح پرکھنا ہوگا "

" ہشت ! تم کیا جانو ۔ میں نے تم سے پہلے نہیں کہا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں ۔ اچھی طرح پُرانا پاپی ہے ۔ معلوم کب سے پالا پڑا ہوا ہے ۔ پچھلے سال جب میں پی ۔ ڈبلیو میں تھا تو ایک اچھی آسامی ہاتھ لگ رہی تھی ۔ لوہے کی پٹڑیوں کے ٹنڈر میں دو ہزار کی صاف کمائی تھی ۔ یہ بھی اُس وقت کلرکوں میں تھا ۔ میں نے سب کو حصہ دینے کا کہہ کے راضی کر لیا ۔ لیکن یہ قابو میں نہیں آیا ۔ اور کچھ بھی نہیں ہو سکا کہنے لگا ۔ میں اپنے اصُول سے مجبور ہوں ۔ میں اپنی زندگی کا مقصد یہی سمجھتا ہوں کہ سوسائٹی کو اچھے اُصولوں پر چلتے ہوئے دیکھوں اور اس کوشش میں ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لوں جو سوسائٹی کو گندا کرنے کی کوشش کرے ۔ ہُنہ ! ——— معلوم نہیں پھر کیا کیا بکتا رہا ۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا ۔ جیسے میں بھی بچہ ہوں ابھی ۔ نمعلوم ایسے کتنوں کو منٹوں میں سیدھا کر چکا ہُوں ۔ پر کیا کروں کمبخت اب کے نمعلوم کس طرح افسر بن کے آیا ہے ۔ بات تو ابھی بنا کے رکھنی پڑے گی ورنہ جی چاہتا ہے کہ بچہ جی کو چٹکیوں میں یوں مسل دُوں ۔ بڑا ایماندار بنا پھرتا ہے سالا !

اور اس کو اک اور دھچکا لگا ۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ سب کس کے بارے میں ہے ——— صادق ——— ! جو ابھی نیا نیا ٹرانسفر ہُوا تھا ۔ جس کا چہرہ اس کے دل کی پاکیزگی کا آئینہ تھا ۔ جو ہمارے لئے اب تک ایک معمہ تھا ۔ جو ہائی گریڈ کی پوسٹ پر ہونے کے باوجود بھی افسری کی ترش رُوئی جانتا تک نہ تھا ۔ جس کے قریب سارے اسٹاف کے لوگ گرویدہ تھے لیکن بہت سے ——— باری جیسے دشمن بھی ہو گئے اور اُسے آج پتہ لگا کہ یہ سب اس جیسے بہترین افسر سے بیزار کیوں تھے ۔ اُن کی لامحدود آمدنیوں کے ذرائع اس کے آتے ہی ختم ہو گئے تھے ۔

——— سیٹی کی چیختی ہوئی آواز اس کے کانوں میں بڑے زور سے پہنچی ۔ وہ چونک پڑا کھڑکی سے جُھک کر اس نے انجن کی چوندھیا دینے والی آنکھ کو گھورتے ہوئے اپنا منظر پایا ۔ اس کے سامنے کی ساری لائٹیں نقرئی تاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں ۔ اور اندھیرا خوب گہرا ہو چکا تھا ۔ کسی قدر تعجب سے اس نے کلائی اونچی کر کے گھڑی میں وقت دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا ۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے تیسری لائن کا ہینڈل کھینچ لیا ۔ کھٹاک کی آواز ہوئی ۔ اور دُور سگنل کی لال روشنی ایک دم سبز ہو گئی ۔

ایک سیٹی دے کر انجن پھر پھرتا ہوا ، تھکی ماندی گاڑیوں کو زبردستی کھینچنے لگا ۔ پہیوں سے چیختی ہوئی ——— چوں چوں کی چند لمبی لمبی احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں لیکن کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر گھٹنیں پھر رینگنے لگیں ۔

گاڑی کے پاس ہونے پر اس نے ہینڈل پھر واپس کھینچ لیا ۔ اور تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ہری روشنی پھر لال ہو گئی ۔

——— مُڑتے ہوئے ۔ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی چیز چٹ سے بولی ۔ مدھم سی روشنی میں جُھک کر اُس نے دیکھا ۔ کوئی چیز چمک رہی تھی ۔ دو انگلیوں میں دبا کر اس نے اسے روشنی میں اُٹھا کے دیکھا ۔

گھونگھا ——— !! ——— !!! ——— جیسے کسی نے پھر اس کے دل پر ہتھوڑا سا مار دیا ہو ——— !

چھوٹی سی سفید چوڑی کا ایک ٹکڑا ! جس کے بیچ میں بل کھاتی ہوئی ایک سُرخ لکیر تھی ——— ! ———
سیدھا ہو کر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کی پیٹھ ہلکی سی دھمک کے ساتھ دیوار سے ٹکرائی اور وہ اسی طرح کچھ دیوار کے سہارے بے جان سا کھڑا رہا۔ دونوں ہاتھ بلا ارادہ اس کی پشت پر جا کر آپس میں مل گئے۔ پھر ایک اضطرابی کیفیت میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے بڑے زور سے جکڑ لیا۔ ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ اسے کوئی چیز دماغ میں سلگتی ہوئی معلوم ہوئی اس کی مٹھی کسی انتقامی جذبہ کے سبب زور سے بندھ گئی۔

دفعتہً اس کی ہتھیلی میں کوئی چیز بڑے زور سے چبھی کر کے پیچھے سے ہاتھ نکال کر اس نے دیکھا۔ چوڑی کا آدھا حصہ بھنچاؤ سے ٹوٹ کر کئی ٹکڑے ہو گیا تھا اور ایک نُکیلا ٹکڑا اس کی ہتھیلی کے اندر گھُنپا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھتا رہا ——— خونی اور انتقامی جذبہ سے پُر نظروں سے تکلیف کا احساس چند ثانیوں میں زائل ہو گیا۔ اُسے معلوم ہوا جیسے یہ ٹکڑا سُرخ رنگ کا ایک خونی بھالا تھا جو سفید لبادے میں لپٹا ہوا اُس کی زندگی کا ٹکڑا تھا ——— جیسے اس کی زخمی زندگی اس بھالے کے سرے پر پھڑ پھڑا رہی تھی۔

ایک وحشیانہ جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا ——— نیم پاگل کی سی حالت میں اس نے دانت کٹکٹا کر پوری قوت سے کھڑکی کے پٹ پر کھینچ مارا۔ ایک دھڑاکے کے ساتھ پٹ کھُل کر اپنے قبضوں پر باہر کی طرف گھوما اور دیوار سے زور سے پھر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ سے جا ٹکرایا۔ مگر اتنی ہی دیر میں وہ چوٹ کی جاں گسل تکلیف سے بے جان سا ہو گیا۔ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے آہ کی کرب ناک صدا نکلی اور وہ چکر کھا کر آگے کی طرف کھڑکی کی چوکھٹ پر اوندھا گر پڑا۔ اس کا جسم آدھے سے زیادہ کھڑکی سے لٹکا ہوا تھا۔ سر ایک طرف ڈھلک گیا تھا اور دونوں ہاتھ نیچے کی طرف اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ کسی معصوم سی رُوح کو اپنے آغوش میں کھینچ لینا چاہتے ہوں۔ اُس کی زندگی کی یہ اکیلی تمنا اُس کے اتھاہ تصور میں کھو گئی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اب تکلیف کے اعصابی اثر سے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ ہتھیلی سے ننھی سی سُرخ لکیر کسی آوارہ پہاڑی ندی کی طرح بل کھاتی ہوئی اس کی بیچ کی انگلی کے آخری سرے پر لرز رہی تھی۔ اور کسی ہوتے قریب المرگ مجرم کی طرح نیچے کی طرف دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی ——— بوند لرز رہی تھی۔ بوند اپنے ننھے سے چشمے سے نکل کر اس کی جگہ لینے اُسی سُرخ لکیر پر اپنے انجام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور جیسے گر اس کے انجام کو دیکھ رہی تھی ——— بوند لرز رہی تھی اور سرخی ختم ہو رہی تھی - - - -

× × × × ×

اِن طویل کرب افزا لمحوں کو پانی کی چند موٹی موٹی سکون بخش سفید بوندوں نے ختم کر دیا —— اور پھر زور سے مینہ برسنے لگا۔

اس کی حِس نے اُسے نیم بیہوشی کے عالم سے اُٹھایا۔ اپنے آپ کو بمشکل اندر گھسیٹتے ہوئے اُس کی نگاہ سیدھی میز پر گئی اور وہ پھر ساکت ہو گیا۔

وہاں ——— پانچ سُرخ روشنیاں اندھیری فضا میں معلق اُس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ چار بہ ایک لو بچی ——— الگ، نمایاں ہولناک جیسے تباہی کے خیالی دیوتا مہادیو کی تیسری پُر غضب آنکھ تھی کو جلا کر بھسم کر دیتی معلوم ہوتی تھی۔ اس آنکھ سے ذرا مدھم چار اور آنکھیں اُسے تک رہی تھیں ———

کے پیکر آہستہ آہستہ اس کے تصور میں وہ چہروں کے نقوش نمایاں ہوتے گئے۔ وہ نظریں جماتے اور سر گڑھا گئے۔ عجیب طرح اُن چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان مہیب چہروں کو جو خیالی دیوؤں کی طرح آدم خوری کے ہیجانہ اشتیاق کے ساتھ انسانوں کی بستی کی طرف بڑھ رہے تھے ——— سب کچھ تباہ و برباد کر دینے ——— ! ان کے منہ کھلے تھے اور ان میں کچھ انسانی جسم تڑپ رہے تھے۔ ان کے نیچے بند تھے اور ان میں کچلے ہوئے انسانی اعضاء دبے ہوئے تھے۔

وہ شدتِ خوف اور ہراس سے چیخ اٹھا۔ ایک اور ننھی سی انسانی مخلوق بھی اس کے دانتوں کے درمیان پھڑک رہی تھی ننھی سی تیتری جیسی بچی۔ اس کی پروین۔ وہ کندھے تک ایک بازو کے ساتھ اس کے دانتوں میں لٹکی ہوئی، دوسرا ہاتھ خلاء میں کسی غیر مرئی چیز کے سہارے کے لئے پکار رہی تھی۔

پلک جھپکتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پروین۔ میری بچی۔ اس کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز میں نکلا۔ دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کر وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اُس مہیب چہرے کو دیکھنے لگا۔ حیرت اور خوف کے شدید احساس سے اسکا منہ آدھا کھل گیا پیشانی کی لکیریں تن گئیں، پھر جیسے وہ اس پہلے چہرے کو پہچان کر لڑکھڑا گیا۔ "پارسی" اس کی آواز بھیانک انداز میں اندھیری فضاء میں پھیل گئی۔ اس کے ناخن شدتِ جوش سے چوکھٹ کی لکڑی میں گھس گئے۔ ابھی اس کی چیخ کا تموج فضاء میں باقی تھا کہ اُسے ایسا لگا جیسے اُس ہیبت ناک چہرے نے اپنے بڑے بڑے سیاہ ہونٹوں میں دبا کر پروین کو منہ میں ڈال لیا ہو ——— !

——— !! ——— !!!

"ہائے پارسی!" ——— کھا گیا۔ میری بچی کو کھا گیا بھیڑیا!"

بجلی کی سی تیزی سے مڑ کر جنونی کی طرح اس نے لائن بدلنے کے کانٹے، اور سگنلوں کے ہینڈل سب کو گھسیٹنا شروع کر دیا ...... اور سرخ آنکھیں جھپک جھپک کر سبز ہوتی جا رہی تھیں۔ دُور سے ایک سفید چمکتی ہوئی روشنی میل کے آنے کا پتہ دے رہی تھی۔

——— × ——— × ——— × ——— × ——— ×

دوسرے دن تمام اخباروں کی پانچ کالمی سرخیاں ایک دہشت ناک خبر پر مشتمل تھیں۔ اخبار بیچنے والے چلا چلا کر چوراہوں پر اخبار بیچ رہے تھے۔

" پشاور ایکسپریس کی مال گاڑی سے زبردست ٹکر! بے اندازہ ہلاک اور زخمی۔ ساری لائنیں اور سگنل غلط تھے۔ سگنل انچارج جیل میں ——— وہ آسنے میں"

ایک ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے کچھ شخص اخبار سامنے رکھے، اس خبر پر تبصرہ کر رہے تھے:۔

" شاید کمیونسٹ تھا؟"

" نہیں پاگل تھا!"

" ہش! کیا بات کرتے ہو!"

ارے! میں خود تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ اخبار میں لکھا ہے بھئی۔ یہ دیکھو" اس نے نیچے کے کالم کی سطریں پڑھنی شروع کیں۔ ..... حادثہ کے بعد تفتیش کے دوران میں سگنل کیبن ایسٹ میں اُس دن کا انچارج ملدا رمضان بیہوش پایا گیا۔ پولیس کو اُسے حراست میں لینے میں بڑی دقت ہوئی کیونکہ وہ پاگلوں کی طرح چلاتا اور اُٹھ اُٹھ کر دوڑتا تھا۔ تفصیل کا انتظار!

پس اے نبیؐ! آپ اسی — "الدین" — کی طرف[1] دعوت دیجئے۔ ہمارے احکام کے مطابق راستی پر ڈٹ جائیے (گم کردہ راہوں) کے رجحانات کے پیچھے ہرگز نہ چلئے![2]
اور (صفائی کے ساتھ) ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ نے (ہدایت انسانی کے لئے) جو کتاب اتاری ہے میں تو اسی[3] پر یقین رکھتا ہوں اور مجھے اس فرض پر مامور کیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں! — اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔! ہمیں اپنے اعمال سے غرض ہے۔ اور تمہیں[4] اپنے اعمال سے! ہمارے تمہارے درمیان کسی حجت یا ضرورت نہیں۔! اللہ (انجام کار) ہم کو (محاسبے کے لئے) خود ہی اکٹھا کرے گا — اور ہم سب کا ٹھکانا اسی کی طرف ہے!

پ ۲۵ – ع ۲

اِن سے خبردار رہیئے!

اور اے نبیؐ! (اللہ نے چاہا ہے) کہ آپ ان (یہود و نصاریٰ) کے درمیان اللہ کے نازل کردہ ضابطہ کے مطابق فیصلہ کریں اور ان کے رجحانات نفس کے پیچھے نہ چلئے۔ پھر ان سے خبردار رہیئے کہ وہ کہیں اللہ کی طرف سے آپ پر اتارے ہوئے دین کے جزو سے آپ کو بہکا نہ دیں۔
پھر آپ کے فیصلوں سے وہ اگر روگردانی کریں تو آپ کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ انہیں ان کے جرائم کا کچھ مزہ چکھانے کا ارادہ اللہ نے کر لیا ہے — اور حقیقت یہ ہے کہ لوگوں میں اکثریت فاسقین کی ہے!
کیا یہ لوگ دورِ کافری کے سے فیصلے چاہتے ہیں! — (وہ دور تو گیا)! — اور (ان کے برعکس) ایمان لانے والے گروہ کی نگاہ میں اللہ سے بہتر فیصلہ دینے والا اور کون ہو سکتا ہے؟
اے اہلِ ایمان: یہود و نصاریٰ سے رفاقت نہ رکھو۔ (یہ تو بس) باہم ایک دوسرے کے رفیق ہی ہو سکتے ہیں۔ اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جس کسی نے ان سے رفاقت اختیار کی۔ وہ (ہماری نگاہ میں) انہیں کے زمرہ میں شمار ہوگا۔
اللہ (اس طرح کی حرکت کرنے والے) ظالموں کو قطعاً ہدایت نہیں دیتا۔

پ ۶ – ۱۲-۱۱ ع

---

[1] ایک مسلم فرد یا قوم یا حکومت یا قیادت کا کام یہ ہے کہ وہ مشرکین اور اہل کتاب اور دوسرے غیر مسلموں کو برابر اسلامی نظام کی طرف دعوت دیتے رہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی راہِ راست پر پوری مضبوطی سے قدم جمائیں۔ اور کسی طرح Compromising attitude اختیار نہ کریں۔

[2] آج کل کے خدامِ اسلام کو اگر اس آیت کے مطالبے سے آگاہ کیا جائے تو وہ فوراً آپ پر "ملّا ازم" کی پھبتی کسیں گے اور "تھیوکریسی" اصطلاح کو سامنے رکھ کر اسلام کے نظام سیاست و معیشت پر طنز فرمائیں گے۔

[3] یہ ہے اہلِ ایمان کا مسلک۔ جن سے یہ بات کہے بغیر کام نہیں چل سکتا کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور ہم تو صرف اللہ کی کتاب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ نہ یہ کہ اللہ کی کتاب کو درکنار رکھ کے دنیا کے اکابر مجرمین سے جا کے کہا جائے کہ ہم آپ سے تمدن کے گر سیکھنے آئے ہیں۔

[4] یہ اعلیٰ اختلاف کا صاف صاف اعلان ہے۔ یعنی تم لوگ اگر حق کو نہیں مانتے تو تم اپنے اصولوں پر عمل کرو۔ ہم اپنے اصولوں پر ہیں۔ تم اپنے اعمال کے انجام کی فکر کرو اور ہم اپنے اعمال کے انجام کی فکر کرتے ہیں۔ آپ اپنے لئے ہیں ہم اپنے لئے: ہمارے درمیان اب تو کسی مصالحت کی گنجائش نہیں ہے۔

عزت کے بھکاری

(اے نبی) منافقین کو نوید مسرت دیجئے۔ اس بات کی کہ ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے ــــ وہ جو اہلِ ایمان کو چھوڑکر کفار سے یارانہ گانٹھتے ہیں۔

کیا یہ لوگ کافروں کے ہاں عزت کی بھیک[1] مانگنے جاتے ہیں؟ ــــ (اگر ایسا ہے) تو (ان پر واضح کردیا جائے کہ) عزت تو یکسر اللہ ہی کے لئے ہے۔　　پ۵ - ۱۷ع

دشمنانِ حق کے عزائم

اور وہ (دشمنانِ حق) تو آپؐ کو اُس (دین) سے بہکانے ہی لگے تھے۔ جسے ہم نے آپؐ پر نازل کیا ہے ــــ تاکہ آپؐ اس دین سے ہٹ کر ہمارے نام سے اور کچھ گھڑ لیں ــــ آپؐ اگر ایسا کر لیتے۔ تو پھر وہ آپ کو دلی رفیق بنا لیتے۔!

(اس حالت میں) اگر ہم آپؐ کے قدموں کو جمائے نہ رکھتے۔ تو (ہوسکتا تھا کہ) آپ ان کی طرف کسی قدر جھکنے لگتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر آپؐ کو اس لغزش کا مزہ ہم دنیا میں بھی چکھاتے اور آخرت میں بھی! ــــ پھر تمہیں ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی ہرگز نہ ملتا۔　　پ۱۵ - ع

مسلم کی رفاقت کس سے ہے؟

(اے مسلمانو!) تمہارے لئے رفیق صرف اللہ ہے۔ اس کا رسولؐ ہے اور ایسے ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ جو نماز کو قائم کرتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں[3]!

اور جو کوئی اللہ سے، اس کے رسولؐ سے اور اہلِ ایمان سے رفاقت اختیار کرے۔ تو اُسے جان لینا چاہیئے (کہ اللہ) ہی کی پارٹی ہے جو غالب آنے والی ہے!

اے اہلِ ایمان! کفار اور اہلِ کتاب سے رفاقت نہ رکھو۔ جنھوں نے تمہارے (محبوب) دین کو سامانِ استہزاء و تفریح بنا رکھا ہے ــــ اور اگر تم واقعی ایماندار ہو۔ تو (اس معاملے میں) اللہ سے ڈرو!

اور (تمہیں معلوم ہے) کہ جب تم نماز کے لئے اذان کہتے ہو تو وہ اس کا مذاق[4] اڑاتے ہیں۔ اور ایک تماشا بنا لیتے ہیں۔ یہ (روش) اس وجہ سے ہے۔ کہ یہ عقل باختہ لوگ ہیں۔　　پ۶ - ۱۳ع

۱۔ آج تو معاملہ صرف "اہلِ ایمان کو چھوڑ کر" پر ہی بس نہیں کرتا۔ بلکہ اہلِ ایمان کو جیل میں ڈال کر بھری مجلسوں میں غیر مسلموں پر باقاعدہ احسان دھرا جاتا ہے کہ تمہاری خاطر سے ہم نے فلاں کو حوالۂ زندان کر رکھا ہے اور یہ قید بے میعاد مسلسل جاری رہے گی۔

۲۔ آج کل کے عزت کے بھکاریوں کو بھی معززِ منزل اگر کوئی نظر آتا ہے تو وہ اٹیلی ہے یا ٹرومین۔

۳۔ ان اوصافِ حمیدہ سے آج جو شخص آراستہ ہو وہ "ملا" قرار پاتا ہے اور اس کی رفاقت میں ترقی پسند مسلمانوں کو عار محسوس ہوتی ہے۔

۴۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اسلام کے ایک ایک جزو کا مذاق کفار ہی نہیں اڑاتے خود احیاءِ اسلام کے مدعی اڑاتے ہیں۔ نظامِ اسلامی کی دعوت پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں۔ اسلام کی اخلاقی قدروں کی تضحیک کی جاتی ہے۔ شعائرِ اسلام کی ہنسی اڑائی جاتی ہے۔ پردے اور نکاح و طلاق کے ضابطے کا "مذاق" ــــ اور پھر دعوائے مسلمانی بھی زندہ و سلامت رہتا جاتا ہے۔

"شاکر" دی نصیحت

عبداللہ

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

اگلیاں ممبراں کڈھی بنب   لائی دنیا تائیں لنب   سمجھے سی اساں مٹھے انب   نکلے کوڑے وانگ دہ

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

رگئی دکھاں وچہ خدائی   انہاں کدے نہ جھاتی پائی   دردنہ ونڈیا رتی رائی   الٹے پاسے بیلنے چہ

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

ٹھگے پھوکے نعرے لاکے   مکراں والا جال وچھاکے   لے گئے ووٹ فریب بناکے   بہہ گئے مڑکے لاکے ٹہ

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

رہ گئی دل وچہ خواہش دل دی   گل نہ ساڈے دل دی کھل دی   تنگی روٹی مشکل بل دی   ایہہ کھاندے نے مکھن سو

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

لے لے کے اللہ دا نام   شیطانی دا دتا جام   کفر نوں ایہناں نال اسلام   دتا دھوکے نال چپیک

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

بہہ ویہاں دے کیتے کارے   دے دے کے اسلام دے لارے   دین نبیؐ دے حق نکارے   ایہ بندے نے انگلش مَ

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

تلیا انہاں اپناں لچ   ٹھگاں وانگ لیا سب کچھ   ہو گئے ممبری نال گڑچ   مڑکے رہیا نہ ساڈا ایک

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک

لبھو ممبر نیکو کار   عملاں دے وچہ جو سردار   مکے جھگڑا ساڈا بھار   جس دی رب دسے تقدیر

سو گلاں دی گل جے ایک   ممبر لبھو بندہ نیک



قند و نمک

از حرم تاصقی

حضور کفر میں اسلام کا نمائندہ
گیا ہے عرض اسلام نیاز کرنے کو
اذاں حرم میں کبھی تھی مگر امام حرم
کلیسا میں کھڑے ہیں نماز کرنے کو
خدا تو ہے ہی خدا اپنا، دھر کی لگری کیا
صنم سے سعی ہو کچھ ساز باز کرنے کو

تھے بدگمان بہت لا الٰہ سے اصنام
کیا گیا ہے بہت خوب ازالہ وہاں
بہت صفائی سے تصریح کی گئی اسکی
کہ ہم تو آپکے پیچھے چلیں گے گام بگام
یہ وہ نہیں جو تمہیں ناگوار گذرے گا
ہمارے ساتھ ہے صاحبو یہی کوئی اسلام

نہ ہم سے کیجئے "ملا گری" کا اندیشہ
ہم ایسے تیرہ دماغ و کہن خیال نہیں
کچھ امتیاز کریں مسلم اور کافر میں
حضور! ایسے خلا کی ہیں مجال نہیں
وہ کیش جسکو حرام آپنے قرار دیا
وہ عین سایۂ کعبہ میں بھی حلال نہیں

نہیں ہم آپ سے خیرات مانگنے آئے
یہ ذوق پست، اس سے بسا لبشیا ہم
جو بام چرخ کے کنگروں پہ جا کے پہنچے تھے
ستارے دیں گے شہادت کہ وہ کہتے ہیں ہم
ہم اپنے ساتھ ہیں لیس ایک آرزو لائے
کرم ہو ہم پہ کہ لائے نیاز مند ہیں ہم

لڑے سے تھے آپ ہمارے بچا نگی خاطر
ہمارے کھیتوں میں باغوں میں کوہساروں میں
بھلا یہ آپکا احسان بھول سکتا ہے؟
ہو کیوں نہ جوش تشکر وفا شعاروں میں
بیکالیسی ہوئی ہیں آپ کی حسیں یادیں
ہمارے سینوں کے جذبات کی بہاروں میں

بتوں کو دور کی نسبت تو تھی ہوا کعبہ سے
اب اسکے گم شدہ آثار آشکار ہوئے
ملا کہیں نہ کہیں سے یگانگی کا سراغ
تھے شرق و غرب جدا بڑھ کے ہمکنار ہوئے
دماغ پہلے ہی برہن بت فرنگی تھا
جناب دل بھی تو قدموں پہ جانثار ہوئے

کتاب پاک بغل میں اور یہ کلام؟
"یہاں ہم آئے ہیں درس حیات لینے کو"
جو بے ثبات ہیں خود ان کے آستانے پر
گرے ہیں آپ اصول ثبات لینے کو
جو دیتے آئے تھے دنیا کو ملک کی خیرات
جھکے وہ غیر کے آگے زکوٰۃ لینے کو

اٹھائے دوش مبارک پہ آپ لوٹیں گے
وہ جنہیں آتی ہوئی ڈالروں کی زنجیریں
خرید لائے ہیں بازار بندگی سے جناب!
عوام کے لئے پھر بندگی کی تصویریں
نظر بر اور کرشمے ہم ابھی ہیں تو اقبال
مچل رہی ہیں لبوں میں ہزار تکبیریں